خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ
حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع و تحقیقی کتاب

مُرتّبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

ادارہ اسلامیات
لاہور — کراچی

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ،
حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع و تحقیقی کتاب

مرتبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

ادارۂ اسلامیات
۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ،
حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع و تحقیقی کتاب

مُرتبہ
مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

ادارۂ اسلامیات
۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

بار اوّل : جمادی الثانی سنہ ۱۴۱۰ھ
باہتمام : اشرف برادران سلّمہم الرحمٰن
ناشر : ادارۂ اسلامیات ، لاہور
مطبع :
قیمت مجلّد :

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز ، بک سیلرز ، ایکسپورٹرز
★ دینا ناتھ مینشن ، مال روڈ ، لاہور — فون [illegible] فیکس [illegible]
★ ۱۹۰ ، انارکلی ، لاہور ، پاکستان — فون [illegible]
★ ارجن بلڈنگ ، موہن روڈ چوک اُردو بازار ، کراچی فون [illegible]

ملنے کے پتے
ادارۂ اسلامیات ۔ ۱۹۰ ، انارکلی ، لاہور
دارالاشاعت ، اُردو بازار ، کراچی ۱
ادارۃ المعارف ، کورنگی کراچی ۱۴
مکتبہ دارالعلوم ، کورنگی کراچی ۱۴

فہرست مضامین صدیق اکبرؓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ومقام کیا ہے؟ اُس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ۔

لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاماً کدنا نہلك فیہ لو لا ان اللہ منّ علینا بابی بکرٍ	ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسے حالات میں گھر گئے تھے کہ اگر اللہ نے ابوبکرؓ کے ذریعہ ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم ہلاک ہو جاتے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق کو زیادہ شہرت حاصل ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر خلیفۂ اوّل پورے عرب کو ایک اسلام کے عَلَم کے نیچے لاکر جمع نہ کر دیتے تو حضرت عمر نے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ان کے لیے راہ ہموار نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوبکر کی مدتِ خلافت دو برس اور تین مہینے کے قریب ہے لیکن اس قلیل مدت میں بھی آپ نے جو کام کئے ہیں وہ نوعیت کے اعتبار سے نہایت عظیم الشان ہونے کے ساتھ اس قدر چند در چند اور گوناگوں ہیں کہ مؤرخین متقدمین نے اُن پر ضخیم مجلدات لکھی ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں (جلد ۲ص ۳۲۵) ابن عساکر کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تذکرہ میں ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ حافظ عماد الدین ابنِ کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں جہاں عہدِ صدیقی کے واقعات لکھے ہیں اس موضوع پر خود اپنی ایک مستقل کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔

متقدمین نے اس سلسلہ میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ دو قسم کی ہیں:۔

۱۔ وہ کتابیں جو حضرت ابوبکر صدیق کے تذکرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی آپ کے تمام حالات و سوانح پر مشتمل ہیں۔

۲۔ وہ کتابیں جو عہدِ صدیقی کے بعض خاص خاص اور اہم واقعات مثلاً فتنۂ ارتداد۔ مالک بن نویرہ کا واقعہ وغیرہ پر لکھی گئی ہیں:

ابن ندیم کی الفہرست، خطیب بغدادی اور ابن خلکان وغیرہما کے بیانات سے عہدِ صدیقی سے متعلق جن تالیفات کا سراغ ملتا ہے۔ ہم ذیل میں اس کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

مصنف کا نام	سال وفات	تالیفات
ابو مخنف لوط بن یحییٰ	۱۷۰ھ	کتاب الردۃ (الفہرست ص ۱۳۶ مصری)
سیف بن عمر الاسدی التمیمی	خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں وفات ہوئی	کتاب الردہ (الفہرست ص ۱۳۷)
اسحٰق بن بشر	۲۰۶ھ	ابن الندیم نے اس کی کتاب الردہ کا ذکر کیا ہے (الفہرست ص ۱۳۷) اس کے علاوہ اس کی ایک کتاب کا نام کتاب المبتدا بھی ہے (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۲۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۸۶)
ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی	۲۰۷ھ	ابن الندیم نے عہدِ صدیقی سے متعلق ان کی کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام یہ ہیں (۱) کتاب الردہ (۲) کتاب السقیفۃ و بیعۃ ابی بکر (۳) کتاب سیرۃ ابی بکر و وفاتہ۔ (الفہرست ص ۱۴۴)
ابوالحسن علی بن محمد المدائنی	۲۱۵ھ	انہوں نے اس موضوع پر ۲ کتابیں لکھی تھیں، ایک کا نام "کتاب الردہ" اور دوسری کا "کتاب حجۃ ابی بکر الصدیق" تھا (الفہرست ص ۱۴۸)
ابواسحٰق اسماعیل بن عیسیٰ العطار	۲۳۲ھ	اسحٰق بن بشر کا شاگرد اور اس کی کتابوں کا راوی تھا (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۶۲) ابن الندیم نے اس کی کتاب الردہ کا ذکر کیا ہے۔ (الفہرست ص ۱۵۹)
ابوزید وثیمہ بن موسیٰ ابن الفرات الوشاء	۲۳۲ھ	ابن خلکان نے اس کی کتاب الردہ کا طویل اقتباس مالک بن

مصنف کا نام	سال وفات	تالیفات
		نویرہ کے واقعہ کے ذیل میں درج کیا ہے (ج ۵ ص ۶۴ رقم ۷۴۰ مطبوعہ مصر ۱۹۴۹ء) یہی اقتباس ابن شاکر کی فوات الوفیات میں بعینہ منقول ہے (ج ۲ ص ۶۲۵ رقم ۴۷۹ مطبوعہ مصر ۱۹۵۱ء) حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں اس کتاب کے اقتباسات جگہ جگہ دیئے ہیں، انھیں اقتباسات کو ایک جرمن مستشرق نے کتاب کی شکل میں ایک جا مرتب کر دیا ہے۔
ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی	تاریخ وفات صحیح معلوم نہیں مقتدر باللہ کے آخری عہد تک زندہ تھا۔	اس کتاب کا نام "کتاب الفتوح" ہے۔ اس کے ابتدائی حصہ میں ارتدادِ عرب کی تاریخ پر مفصل بحث ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ اصل عربی کی بہ نسبت زیادہ مشہور ہے۔
ابوریاش احمد بن ابی ہاشم القیسی۔	۳۳۹ھ	اس نے حضرت خالد بن الولید اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا (خزانۃ الادب ج ۲ ص ۲۳۶) خطیب بغدادی نے بھی اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے یاقوت نے معجم الادباء ج ۲ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ پٹنہ میں

واقدی کو مؤرخین میں جو شہرت و اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اس کی کتاب الردہ کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کریں۔ اس کتاب کی نسبت اربابِ علم کے حلقہ میں مشہور ہے کہ اس کا واحد نسخہ کتب خانہ شرقیہ بانکی پور پٹنہ جو عام طور پر خدابخش لائبریری کے نام سے معروف ہے اس میں محفوظ ہے۔ چنانچہ خان بہادر عبدالمقتدر خان مرحوم کی فہرست میں زیر شمارہ ۱۰۴۲ (ج ۱۵ ص ۱۰۸) اس نسخہ کا مفصل حال مذکور ہے اور لوگوں نے اسی کو واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اندرونِ کتاب صفحہ کے اوپر کتاب الردۃ کی بجائے ذیل کی سرخی ملتی ہے۔

هذا مما كان من اخبار اهل الردة من مسيلمة الكذّاب وطليحة و كندة وبني بكر بن وائل وغيرهم من القبائل ـ

اس سرخی سے قیاس ہوتا ہے کہ زیر بحث نسخہ مستقل کتاب ہونے کی بجائے کسی بڑی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ پھر کتاب کی سند پر غور کیا جائے تو اس قیاس کی مزید تائید ہوتی ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب دراصل واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ نہیں ہے اگرچہ اس میں واقدی کی روایات کا حصہ بھی ضرور شامل رہا ہے' یہ سند جس کا ہم نے ذکر کیا حسب ذیل ہے۔

روی ابوالقسم عبداللہ بن حفص بن مهران البردعی اعزہ اللہ تعالیٰ قال حدثنی ابومحمد احمد بن اعثم الکوفی قراءۃً علیہ قال حدثنی ابوجعفر بن عبد العزیز بن المبارك قال حدثنی نعیم بن مزاحم النقری قال حدثنی محمد بن عمر بن الواقد الواقدی السلمی وحدثنی ابراهیم ابن عبداللہ بن العلاء القرشی المدنی قال حدثنی احمد بن الحسین الکندی ونصر بن خالد الغوی وابی حمزۃ القرشی من محمد بن اسحٰق بن یسار المطلبی قال حدثنی الزهری زید بن رومان وصالح بن کیسان ویحیی بن عروۃ عن الزبیر بن العوام ومعوذ بن لبید وعاصم بن عمر بن قتادۃ کل هذا یذکرانه لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم شمتت الیهود والنصاری باهل الاسلام الخ

اس سند سے جن امور کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ کتاب کا راوی ابوالقسم عبداللہ البردعی ہے۔

۲۔ راوی کو اس کتاب کی باقاعدہ اجازت احمد بن اعثم الکوفی سے حاصل ہے۔

۳۔ اس کتاب میں جو روایتیں درج ہیں وہ احمد بن اعثم کو دو سلسلوں سے پہونچی ہیں، پہلا سلسلہ ابوجعفر عبدالعزیز بن المبارک کا ہے جو ایک واسطے سے محمد بن عمر الواقدی کا شاگرد ہے اور دوسرا سلسلہ ابراہیم بن عبداللہ القرشی المدنی کا ہے جس میں واقدی کا کہیں ذکر نہیں۔ خان بہادر عبدالمقتدر مرحوم نے اس سند کو ناقص نقل کیا ہے اور واقدی کے بعد کے سلسلہ کو حذف کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف فہرست پر اعتماد کرنے والوں کو اس کتاب کے اصل مصنف کے بارہ میں غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ حالانکہ پوری سند جب سامنے آتی ہے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب سے واقدی کا تعلق مؤلف ہونے کی حیثیت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مؤلف

لہ کذا فی الاصل ۱۲

جس شخص کو قرار دیا جا سکتا ہے وہ دراصل ابومحمد احمد بن اعثم الکوفی ہے جس نے واقدی اور دوسرے متقدمین کی روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اپنے روایتی سلسلوں کو یکجا کتاب میں درج کر دیا ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب الفتوح کا عربی نسخہ ہمارے علم میں کہیں نہیں ہے۔ اور اب اس کا فارسی ترجمہ ہی ملتا ہے جو کسی زمانہ میں بمبئی سے شائع ہوا تھا اور اب وہ بھی نایاب ہے۔ البتہ اس کے قلمی نسخے عام طور پر کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ اس وقت ایشیاٹک سوسائٹی کے دو قلمی نسخے ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی مدد سے ابن اعثم کی کتاب اور واقدی کی طرف منسوب کتاب الردہ دونوں کے سیاق و سباق کا مقابلہ کیجئے تو ان میں اصل اور ترجمہ کے ناگزیر فرق کے علاوہ کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آئیگا۔ ہم ذیل میں کتاب الردہ کی فصول کے متوازی کتاب الفتوح کی سرخیاں درج کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا دعویٰ ثابت ہوگا۔

فصول کتاب الردہ للواقدی نسخہ پٹنہ	اوراق	فصول کتاب الفتوح لابن اعثم فارسی نسخہ کلکتہ	اوراق
۱۔ اخبار سقیفۂ بنی ساعدہ	2 a	۱۔ اخبار سقیفۂ بنی ساعدہ	2 a
۲۔ ذکر اخبار الردہ	6 a	۲۔ ذکر اخبار اهل ردہ	7 a
۳۔ ذکر خروج اسامہ بن زید	7 a	۳۔ قصۂ رفتن اسامہ بشام	8 a
۴۔ ذکر فجاءۃ بن عبد یالیل	10 a	۴۔ ذکر فجاءۃ عبد یالیل اسلمی	11 b
۵۔ خبر مالك بن النویرہ ومسلمۃ الکذّاب	16 a	۵۔ الف۔ ذکر رفتن خالد بن الولید بجنگ مالک (ب) قصۂ مسیلمہ و جنگہائے کہ خالد ابن الولید را با او وقتاد	16 b
۶۔ ذکر ارتداد اهل البحرین	25 a	۶۔ ذکر مرتد شدن اہل بحرین	22 b
۷۔ ذکر ارتداد ارض حضرموت من کندہ وغیرها	26 a	۷۔ قصۂ مرتد شدن حضرموت و کندہ	25 b
۸۔ بندۃ فی ذکر المثنی بن حارثۃ الشیبانی وهو اوّل الفتوح بعد قتال اهل الردۃ	40 b 43 b	۸۔ ذکر فتحہا کہ بعد از مرتد شدن این جماعت در بلاد روم و فرس مسلمانان را میسر شد	35 b - 39 b

کتاب الردہ کی آخری فصل خان بہادر مرحوم کی مرتبہ فہرست میں اسی طرح ہے لیکن اصل نسخہ میں پوری عبارت یہ ہے:۔

نبذة فی ذکر المثنی بن حارثه الشیبانی وهو اول الفتوح بعد قتال اهل الردة وهو ایضاً من روایة الاعثم الکوفی ۔

جیسا کہ گزر چکا ہے شروع سند سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ واقدی کی کتاب دراصل ابن اعثم کی روایات کا مجموعہ ہے جو واقدی کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ابن اعثم کو پہونچی تھیں اب کتاب کی آخری فصل کے کشیدہ الفاظ سے بھی اس کی تائید ہوجاتی ہے کہ یہ نسخہ واقدی کی کتاب الردہ یا تنہا اس کی روایات کا مجموعہ نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ضرور مسلّم ہے کہ اس نسخہ میں واقدی کی ان روایات کا ضروری حصہ بھی شامل ہے جس سے واقدی کی اصل کتاب الردہ خالی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس امر واقعی کی بنیاد پر زیر بحث نسخہ کو واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ سمجھ لینا قطعاً درست نہیں۔

واقدی کی کتاب الردہ اور کتاب الفتوح لابن اعثم کی عبارتوں کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن بہر حال اصل اور ترجمہ میں ناگزیر فرق ہوتا ہے اُس کے علاوہ قلمی نسخوں کے جملہ اختلافی اسباب وعلل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ بدقسمتی سے کتاب الردہ کا یہ واحد نسخہ جدید الخط ہونے کے ساتھ نقص وفتور سے بھی پُر ہے اور دوسری طرف ابن اعثم کی کتاب الفتوح کے پیش نظر نسخے بھی کچھ اسی قسم کے ہیں۔ اب آپ عبارتوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔

(نسخہ کتاب الردہ کی عبارتیں)	(فتوح ابن اعثم کی فارسی عبارتیں)
۱۔لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بے دیناں وضعیف یقیناں
شمتت الیهود والنصاریٰ باهل	از ہر طرف در گفتگو وجستجو
الاسلام وظهر النفاق فی المدینة	آمدند وفرصت جویاں از کمین
ممن کان یخفیه قبل ذالك وماج	حسد جائے غرض بیروں جستند
الناس واضطربوا واقبل مالك	وبہر جائے مجلسے وبہر گوشہ
بن التیهان الانصاری متی وقف	محفلے پدید آمد۔ در مجمعے کہ وجوہ
علی قومه فقال یا معشر الانصار	مہاجر وانصار حاضر بود

انصتوا واسمعوا مقالتی وتفهموا	ابوالہیثم التیہان برخاست
ما القیه الیکم اعلموا انه قد شمتت	وبرحسب ایں فتور وحادثہ
الیهود والنصاری بموت نبینا	شعرے فصیح برخواند کہ ترجمۂ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم	آن اینست ....
وقد ظهرت حسیکة اهل	ودر حوادث با علیہ الصلوٰۃ
الردة وعظم المصائب علینا	والسّلام کفار کہ گردن
ان مسیلمة الکذاب بارض	فروشکستہ بودند امروز
الیمامة یرعد ویبرق و	سر بر آوردند وسینہا پُر کینہ
قد تعلمون انه یدعی النبوة	کردند۔ خصوصاً ایں سہ طائفہ
فی حیاة نبینا محمد صلی اللہ علیہ	یکے جہودان دوم ترسایان
وسلم۔ والآن قد بلغنی ان	سوئم منافقان وازیں جماعت
طلیحة بن خویلد الاسدی	مسیلمۂ کذاب می جوشد وجوشن
ایضاً قد ادعی النبوة ببلاد	محاربت ومقاتلت می پوشد و
نجد (اس کے بعد ابن التیہان کے بارہ	بقدر امکان بدست وزبان
شعر درج ہیں جو فتوح ابن اعثم میں بھی	می کوشد وطلیحہ بن خویلد
موجود ہیں۔)	کاسۂ او می لیسد۔

۲۔حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر حضرت علی کی بیعت کی بحث میں آخری الفاظ یہ ہیں۔

قال فانصرف علی الی منزله فلم	علی بیعت ناکردہ از مجلس بازگشت
یبایع حتی توفیت فاطمة ثم بایع	جماعتے گویند کہ از وفاتِ فاطمہ
بعد خمس وسبعین لیلة من	بدو نیم ماہ بیعت کرد واز عائشہ
وفاتها وقیل الی بعد ستة	روایت کنند کہ بعد از شش ماہ
اشهر واللہ اعلم ای ذالك کان	بیعت کرد۔ باقی واللہ اعلم
فهذا اکرمك اللہ ما کان من	وازیں جا سخن بیارست کہ روافض

سقیقة بنی ساعدة وهذا روایة	وغیر آنہا بر سبیل غلو و مبالغہ گویند
العلماء ولما اردان اکتب هٰهُنا	وانا ایراد آں جز تعرض
شیئاً من زیادات الرافضة فیقع	تہمت فائدہ نہ بیند
هذا الکتاب فی ید غیرك فتنسب	خدائے تعالیٰ نویسندہ و خوانندہ
انت الی امرٍ من الامور والله یقیك	را از آنچہ خلاف رضائے
(ورق ۶ ؍الف)	اوست نگاہ دارد ۔

۳۔ کتاب الردہ کے آخری الفاظ یہ ہیں :۔

قال کان خالد بن الولید	و ہر موضعے کہ مسلم شدے
کلما افتتح موضعاً من	خمس از غنائم آں بیروں
العراق اخرج من غنائمه	کردے و نزدیک صدیق
للخمس فیوجه به الی المدینة	فرستادے و باقی بر لشکر
الی ابی بکر الصدیق ویقسم	برقضیت شرع غنیمت
باقی المغنم فی اصحابه	کردے و ہم بریں روزگارے
قال الی ان تحرکت الروم	گزشت و لشکر
بارض الشام فنرجع الآن الی	بر ہر طرفے گماشت
ذکر فتوح الشام بعون الله	ذکر در حرکت آمدن
وکرمه انشاء الله تعالیٰ۔	لشکر روم در ولایت
(ورق ۴۳ ب)	شام الخ

احادیث سیرت الصدیق کے مآخذ کی حیثیت سے

عہدِ نبوت یا عہدِ صدیقی کے لیے مآخذ اصولاً دو ہیں۔ ایک کتب حدیث اور دوسرے تاریخ و سیر کی کتابیں۔ ان میں ظاہر ہے اوّل نمبر کتب حدیث کا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی کو مقدم رکھا ہے اور جہاں تک ہم احادیث صحیحہ سے مدد حاصل کر سکتے تھے اس میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جن احادیث میں کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے ان کی

نوعیت اور حیثیت ان احادیث سے کسی قدر مختلف ہے جن میں کوئی شرعی حکم یا اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل بیان کیا گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام صحابہ اپنے طبائع، رجحانات اور مزاج کے اعتبار سے یکساں نہیں تھے، اس بنا پر بعض معاملات میں ان کا باہم دگر مختلف الرائے ہونا ضروری تھا۔ اور اس اختلاف کے باعث کبھی لب و لہجہ میں تلخی یا شکوہ و شکایت کا موقع بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی احادیث کو دیکھ کر ایک نکتہ رس محقق محسوس کر سکتا ہے کہ روایت میں کتنی بات درست ہے اور کتنی بات محض باہمی اختلاف کے باعث روایت میں جگہ پا گئی ہے۔

اس بنا پر اس نوع کی احادیث سے استدلال کرتے وقت ایک صاحبِ تحقیق کا فرض ہے کہ اصولِ روایت کے علاوہ درایت کے ان اصول کو بھی پیشِ نظر رکھے۔

۱۔ واقعہ کا جو اصل راوی ہے اس کے تعلقات صاحبِ واقعہ یعنی جس کے متعلق وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اُس کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

۲۔ جو واقعہ اُس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کیا اُس کے مسلّمہ اوصاف و کمالات کے پیشِ نظر اس واقعہ کا صدور اُس سے ہو سکتا تھا۔

۳۔ نفسِ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ صاحبِ واقعہ کی شخصیت سے قطعِ نظر کیا وہ واقعہ اس ماحول میں پیش بھی آ سکتا تھا۔

۴۔ اگر واقعہ کو صحیح مان لیا جائے تو طبعاً اس پر جو نتائج مرتب ہونے چاہئیں وہ ہوئے یا نہیں بہر حال ایک تاریخی واقعہ کے نقد و جرح کے جو اصول ہیں ان کا اطلاق اس واقعہ پر بھی ہونا چاہیے جو کسی صحیح حدیث میں مذکور ہو۔ اگرچہ وہ روایت صحیحین میں ہی ہو۔ کیونکہ راوی یا رواۃ کے بہمہ وجوہ ثقہ اور معتبر ہونے کے باوجود یہ ممکن ہے کہ راوی کو اس کے متعلق اشتباہ پیش آ گیا ہو اور اس لیے اس واقعہ کو اپنی دانست میں سچا سمجھ کر ہی نقل کر دیا ہو۔ مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کو محض اس بنا پر قبول نہ کرے کہ حدیث کی کتاب میں وہ مندرج ہے بلکہ اُسے اصول نقد و جرح کی کسوٹی پر پرکھے، اس سلسلہ کی جملہ روایات کو پیشِ نظر رکھے اور پھر اس باب میں کسی قطعی فیصلہ تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

ہم نے کسی واقعہ کے لیے حدیث سے استدلال کرتے وقت انہیں اصول کو پیش نظر رکھا ہے
مثلاً حضرت ابوبکر صدیق سے حضرت علی کی بیعت کے سلسلہ میں محدثین اور مورخین سب میں عام
طور پر یہ مشہور ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد جب کہ حضرت ابوبکر کی خلافت
پر چھ ماہ گزر چکے تھے، بیعت کی، اس خیال کی اصل بنیاد صحیح بخاری کی وہ روایت ہے
جو حضرت عائشہ سے منقول ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے۔
اس روایت کو دیکھ کر ایک محقق کے ذہن میں قدرتی طور پر حسب ذیل سوالات پیدا
ہوتے ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہ اور حضرت علی کے تعلقات کس قسم کے تھے؛

۲۔ کیا حضرت ابوبکر کی بیعت عامہ کے وقت حضرت عائشہ خود موجود تھیں؟

۳۔ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کا چرچا اور شہرہ عام ہونا چاہیئے تھا۔
تو پھر کیا حضرت عائشہ کے علاوہ چند اور صحابہ سے بھی یہ روایت منقول ہے؟

۴۔ تاخیر بیعت کا جو سبب روایت میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ خلافت کے معاملہ میں اُن
سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ کیا یہ چیز حضرت علی کی بے نفس اور پاکباز و پاک طینت شخصیت کے
ساتھ مطابقت رکھتی ہے؟

۵۔ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے سب سے بڑا حادثہ ہو سکتا تھا تو کیا
اُس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی فوراً اسلام کی مخالفت کا طوفان امنڈ
پڑا تھا۔ حضرت علی جیسی عظیم المرتبت شخصیت یہ کبھی گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے کسی فعل
سے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا ہو۔

۶۔ حضرت ابوبکر صدیق کا اسلام میں جو مرتبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر جو اعتماد و
اعتبار تھا جس کے باعث آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً اپنا رجحان
ظاہر فرمایا تھا۔ حضرت علی سے زیادہ ان سب سے اور کون واقف ہو سکتا تھا اس بنا پر
کیا حضرت علی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بایں ہمہ وہ بیعت عامہ کے وقت سب مسلمانوں
سے الگ رہیں۔ حضرت ابوبکر تو ابوبکر! حضرت علی کا کیرکٹر تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت

عثمان کی بیعت خلافت کے وقت بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں رہے اور اپنے لیے کوئی
دعویٰ یا مطالبہ نہیں کیا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

۷۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت علی نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب
یہ ہے کہ اس مدت میں جو اہم واقعات و حوادثات پیش آئے اور جو در حقیقت اسلام کے لیے
زندگی اور موت کا سوال تھے حضرت علی ان سب سے بے تعلق رہے اور انہوں نے حضرت ابوبکر کے ساتھ
کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟

۸۔ اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی نے بیعت نہیں کی تو کیا حضرت ابوبکر اس گومگو کی
صورت کو برداشت کر کے اسلامی وحدت کی دیوار میں یہ ایک رخنہ کھلا رہنے دے سکتے
تھے؟ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا ان کو کم از کم بنو ہاشم کی
حمایت و نصرت سے محروم کر دیتا ہے۔

۹۔ کیا صحیح بخاری کی اس روایت کے بالمقابل کچھ اور روایات ایسی ہیں جو اگرچہ صحیح بخاری
میں نہ ہوں لیکن اور کتب حدیث میں ہوں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت علی نے بیعت
عامہ کے دن ہی حضرت ابوبکر سے بیعت کی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ صحیحین کا مرتبہ کتب حدیث میں سب سے اونچا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ حکم
بحیثیت مجموعی اور اکثر کے اعتبار سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحیحین کی ہر روایت
دوسری کتب حدیث کی ہر روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ وجوہ قبول اگر غیر صحیحین کی روایت
کے ساتھ زیادہ ہوں تو بیشک اس کو ترجیح ہونی چاہیئے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی صحیحین کی اُن چند احادیث کا جن پر بعض ائمہ حدیث
نے کلام کیا ہے۔ تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فان هٰذه المواضع متنازعٌ فی صحتها فلم یحصل لها من التلقی ما حصل لمعظم الكتاب وقد تعرض لذالك ابن الصلاح فی قوله الا مواضع

پس یہ مقامات ایسے ہیں کہ ان کی صحت میں اختلاف ہے۔ کیونکہ کتاب (صحیح بخاری) کے ایک بڑے حصہ کو امت نے جس طرح قبول کیا ہے (ان کی صحت پر اتفاق کیا) ان مقامات کو قبول نہیں کیا اور ابن الصلاح نے بھی یہ کہہ کر بخاری کے ان

يسيرةً انتقدها عليه الدارقطني و غيرهٗ وقال في مقدمة شرح مسلم له ما اخذ عليهما يعني على البخاري ومسلم وقدح فيه معتمدٌ من الحفاظ فهو مستثنى مما ذكرناه لعدم الاجماع على تلقيه بالقبول۔
(مقدمہ فتح الباری مطبوعہ مصر ۱۳۰۱ھ ص ۳۴۴)

چند مقامات کو چھوڑ کر جن پر دارقطنی وغیرہ نے تنقید کی ہے" اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور انہوں نے اپنی شرح مسلم کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ہم نے جو دعویٰ کیا ہے کہ صحیحین کو تلقی بالقبول حاصل ہے تو اس سے بخاری اور مسلم کی وہ روایات مستثنیٰ ہیں جن پر گرفت کی گئی ہے اور جن میں کسی لائق اعتماد حافظ حدیث نے قدح کی ہے کیونکہ ان روایات کے تلقی بالقبول پر اجماع نہیں ہے ۔

اگر ہمارے مؤرخین روایات کا ان اصول کے ماتحت جائزہ لیں تو اغلب یہ ہے کہ بعض کبارِ صحابہ سے تاریخ میں جو چند ایسی باتیں منسوب ہو گئی ہیں جو اُن کی شایانِ شان نہیں ہیں ان سب کی اصلاح ہو سکتی ہے ۔ حضرت علی کی بیعت کی بحث میں قارئین دیکھیں گے کہ صحیح بخاری کی روایت کو ہم نے ساقط الاعتبار یا موضوع نہیں کہا ہے بلکہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس کی جو تاویل کی ہے اور اس طرح انہوں نے اس روایت میں اور اس کی مخالف دوسری روایات میں جو تطبیق دی ہے ہم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے ۔ اور ہمارے نزدیک اس قسم کے مواقع پر محتاط طریقہ یہی ہے ۔ البتہ جہاں تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو وہاں نقد و جرح کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔

احادیث کے بعد دوسرا نمبر کتب تاریخ کا ہے ۔ ہم نے اس سلسلہ میں کسی روایت کو صرف اس بنا پر قبول نہیں کیا کہ وہ کسی متقدم مورخ کی روایت ہے ۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی مؤرخ متقدم ہونے کے باوجود کسی خاص معاملہ میں کوئی عصبیت رکھتا ہو یا وہ روایات کو نقد و جرح کے بغیر یوں ہی جمع کر دینے کا عادی ہو ۔ اور اس کے برخلاف دوسرا مؤرخ جو اگرچہ عہد کے اعتبار سے پہلے سے متاخر ہو لیکن اس کی بہ نسبت زیادہ نقّاد اور محتاط ہو ۔ تو ظاہر ہے اس صورت میں اس کی روایت زیادہ معتبر اور لائق اعتماد ہو گی ۔ قارئین کتاب میں جا بجا اس کی مثالیں دیکھیں گے ۔

اردو زبان میں مولانا شبلی کی کتاب "الفاروق" جو خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کے سوانح حیات اور آپ کے کارناموں کا محققانہ تذکرہ ہے ۔ اردو زبان کے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک یہ کتاب موجود ہے مولانا کا نام روشن رہے گا ۔ اگرچہ ترتیب اور اہمیت کے

اعتبار سے مولانا کو پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا تذکرہ لکھنا چاہئے تھا لیکن حضرت عمر کے دور میں جو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں اور پھر دَہ سالہ مدت خلافت میں آپ نے سیاسی نظم و نسق، اجتماعی و تمدُّنی ۔ اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ان سب کے پیش نظر مولانا نے ہیروز آف اسلام کی تاریخ کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے لیے سب سے زیادہ کشش حضرت عمر کے تذکرہ میں ہی تھی اور مولانا نئی نسل کو اسلام کی تاریخ سے متاثر کرنے کا جو جذبہ رکھتے تھے خلفائے راشدین میں اس جذبہ کی تکمیل کا سامان غالباً سب سے زیادہ الفاروق سے ہی ہو سکتا تھا ۔

مولانا کی وفات کے بعد اردو میں متعدد اہلِ علم نے حضرت ابوبکر صدیق کا بھی تذکرہ لکھا ۔ چنانچہ حاجی معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم نے "خلفائے راشدین" میں اور پھر انہیں کے ہم نام مولانا شاہ معین احمد صاحب ندوی نے تاریخ اسلام کی جلد اول میں خلیفۂ اول کے حالات و سوانح اور آپ کے کارنامے لکھے یہ دونوں کتابیں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہیں ۔ لیکن چونکہ یہ تذکرہ ضمنی تھا اس لیے مکمل اور مفصل نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس کے علاوہ بعض حضرات نے خاص حضرت ابوبکر پر ہی جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں ان کے نام یہ ہیں ۔

۱۔ "سیرت الصدیق" از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم
اصل کتاب اردو میں تھی ۔ بعد میں ڈاکٹر سید معین الحق نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر دیا تھا جس کو شیخ محمد اشرف لاہوری نے شائع کیا ۔

۲۔ "العتیق" کے نام سے بھی ایک بزرگ نے ایک کتاب لکھی تھی ۔

۳۔ چند سال ہوئے عطا محی الدین صاحب ملک نے انگریزی زبان میں "ابوبکر" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو لاہور سے شائع ہو چکی ہے ۔

۴۔ ابھی حال میں مصر کے مشہور فاضل محمد حسین ہیکل کے قلم سے بھی ایک کتاب ..... "الصدیق ابوبکر" کے نام سے نکلی ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ بھی

چھپ چکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "الفضل للمتقدم" کے مطابق ان سب حضرات کو خاکسار راقم الحروف پر شرف تقدم و فضیلت سبقت حاصل ہے لیکن با ایں ہمہ سیرت صدیق اکبرؓ پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت باقی تھی جس میں تمام حالات و واقعات مستند حوالوں کے ساتھ درج ہوں۔ جن میں روایات کو یوں ہی جوں کا توں قبول نہ کر لیا گیا ہو بلکہ علمی اصول تنقید کی روشنی میں ان پر بحث و گفتگو ہو۔ جس میں حضرت ابوبکر کے روحانی اور مادی دونوں قسم کے فضائل و کمالات یکساں طور پر اُجاگر کئے گئے ہوں سیرت صدیقؓ کے سلسلہ میں جو بعض روایات مشہور چلی آرہی ہیں ان کی تحقیق و تنقیح کی گئی ہو۔ اور اس ذیل میں جو بعض اہم مسائل پیدا ہوئے ان کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو اور جس میں حضرت ابوبکر سے متعلق جزئی واقعات کا حتی الوسع استقصاء کیا گیا ہو۔ یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے اسی ضرورت کی تکمیل کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ ضرورت کس حد تک پوری ہوئی؟ اس کا فیصلہ قارئین کرام ہی کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

سعید احمد اکبر آبادی

کلکتہ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۷ء

مقدمہ طبع دوم

صدیق اکبرؓ کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تو خدا کا شکر ہے انڈو پاک کے علمی اور اسلامی حلقوں میں اُس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اخبارات و رسائل میں اُس پر طویل تبصرے ہوئے۔ اہل علم نے خطوط کے ذریعہ اور زبانی بھی مصنف کی حوصلہ افزائی کی۔ بعض اکابر مشائخ نے اپنی خاص مجلسوں میں اسے حرفاً حرفاً پڑھوا کر سنا اور دعائیں دیں۔ علاوہ ازیں یورپ کے بعض اسلامیات کے اساتذہ نے اس کا مطالعہ کر کے داد لکھی اور بعض مباحث سے خاص طور پر استفادہ کا اعتراف کیا۔ لیکن کچھ مصنف کے سبقت قلم سے اور کچھ تصحیح کا پورا اہتمام نہ ہو سکنے کے باعث کتاب میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں راقم الحروف کو جب ان کا علم ہوا تو سخت ندامت ہوئی اور ان کو نوٹ کر لیا کہ دوسرے اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔ پھر میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو جن سے بڑھ کر فن حدیث و اسماء الرجال کا محقق و مبصر میرے نزدیک آج تک انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے۔ دیرینہ نیازمندی کی بنا پر خط لکھا کہ اگر آپ صدیق اکبر کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں اور اس میں جو غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی فرمادیں تو مجھے اطمینان ہوجائے۔ مولانا نے ازراہ شفقت بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا۔ میں نے نظر ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لیے صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

اس کے علاوہ مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن اور مولانا سجاد حسین صاحب کرتپوری صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی۔ ان دونوں حضرات کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے بہ طور خود صدیق اکبر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور غلطیوں کی نشاندہی کرکے مجھے اُن سے مطلع کیا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر غلطیاں وہ تھیں جنھیں میں خود نظر ثانی کے وقت اپنی یادداشت میں لکھ چکا تھا۔ پھر بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مَیں ان حضرات کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکا۔ تاہم تھوڑا بہت استفادہ میں نے ان حضرات کی تحریروں سے بھی کیا ہے اس لیے یہ حضرات بھی میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں فجزاھم اللہ عنی احسن الجزاء۔

کوئی انسانی کام نہ مکمل ہوتا ہے اور نہ احتمالِ خطا و نسیان سے بالکل محفوظ اس لیے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب کے اس دوسرے اڈیشن میں اب کوئی غلطی باقی نہیں رہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پہلے اڈیشن میں جن غلطیوں کا علم ہوا، ان کی تصحیح اس دوسرے اڈیشن میں خاص اہتمام اور توجہ سے کر دی گئی ہے۔

وَاللّٰہُ ھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ۔

سعید احمد اکبر آبادی

علی گڑھ - ۱۹ اپریل ۱۹۶۱ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام عبداللہ نام۔ ابوبکر کنیت اور عتیق و صدیق لقب تھا۔ والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی، والدہ ماجدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی۔ خاندانی رشتہ سے اپنے شوہر کی چچازاد بہن بھی تھیں [۱]

نسب حضرت ابوبکر قریش کی ایک شاخ تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کی طرف سے شجرۂ نسب یہ ہے عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانۃ اور والدہ کا نسب نامہ یہ ہے۔ سلمیٰ بنت صخر بن عمرو بن کعب [۲]

ابو قحافہ حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ مکہ کے معزز لوگوں میں سے تھے اور کافی عمر رسیدہ تھے ان کی تین اولادیں تھیں، ایک ابوبکر۔ اور دو لڑکیاں۔ جن کے نام ام فروۃ اور قُریبہ ہیں۔ ام فروہ کا نکاح پہلے قبیلہ ازد کے ایک شخص سے ہوا تھا جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر ان کا نکاح تمیم الداری سے ہوا۔ جو پہلے عیسائی تھا۔ پھر ۹ھ میں مدینہ آکر مسلمان ہوا۔ حضرت ام فروہ نے جب اسلام قبول کر لیا تو میاں بیوی میں تفریق ہو گئی اور اس کے بعد ان کا نکاح اشعث بن قیس سے ہو گیا۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ حضرت ابوبکر کی دوسری بہن قریبہ کی شادی حضرت قیس بن سعد بن عبادۃ الانصاری سے ہوئی تھی جو بلند پایہ صحابی اور اپنے عہد کے بڑے مدبر اور شجاع تھے۔ صحیح بخاری میں ان کا تذکرہ ہے۔ اسلام کی دعوت کا چرچا ہوا اور حضرت ابوبکر نے اس کو لبیک کہا تو ابو قحافہ اس کو جوانی کی ایک اپج سمجھتے تھے چنانچہ عبداللہ (غالباً عبداللہ بن مسعود) کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے ارادہ سے جب غار ثور چلے گئے تو میں آپ کی خبر معلوم کرنے کی غرض سے ابوبکر کے گھر آیا ابو قحافہ موجود تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی غصہ میں بھرے ہوئے عصا بدست باہر نکل آئے اور بگڑ کر بولے "یہ بھی انہیں لونڈوں میں سے ہے۔ جنہوں نے میرے بیٹے (ابوبکر) کو بگاڑ دیا ہے" [۳]

---

[۱] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر [۲] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۶۱۵
[۳] الاصابہ ج ۲ حرف عین ص ۴۵۳

فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر اپنے والد ابو قحافہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اس وقت تک ان کے سر اور داڑھی کے بال بگلے کی طرح بالکل سپید ہو چکے تھے۔ رحمتِ عالم ؐ نے دیکھا تو حضرت ابوبکر سے فرمایا "تم نے ان کو کیوں تکلیف دی میں خود اُن کے پاس جاتا" آپ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! وہ خود چلکر آپ کے پاس آتے یہ ان کے لیے اس سے بہتر تھا کہ آپ ان کے پاس تشریف لے جاتے" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور ان کو مشرف باسلام کیا۔ انہوں نے بڑی طویل عمر پائی ۱۴ھ میں ۹۷ برس کی عمر میں وفات ہوئی اس طرح ابو قحافہ پہلے شخص ہیں جو ایک خلیفہ کے وارث ہوئے [1]۔

حضرت ابوبکر کی والدہ حضرت ام الخیر سلمیٰ بنت صخر اپنے شوہر سے بھی پہلے اسلام لے آئی تھیں ان کے اسلام کا پورا واقعہ آگے آتا ہے۔ انہوں نے بھی طویل عمر پائی۔ حضرت ابوبکر کے بعد لیکن ابو قحافہ سے پہلے وفات ہوئی [2]

ولادت حضرت ابوبکر کی ولادت عام فیل کے ڈھائی برس بعد ہوئی۔ یعنی سن ہجری کے آغاز سے پچاس برس چھ مہینے قبل۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کم و بیش تین برس چھوٹے تھے اس حساب سے ۵۷۱ء آپ کا سن پیدائش قرار پاتا ہے۔

عتیق کہلانے کی وجہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر تین بھائی تھے اور ان کے نام عتیق، معتق، اور معتیق تھے لیکن اصل یہ ہے کہ عتیق نام نہیں بلکہ لقب تھا ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھا تو فرمایا "انت عتیق اللّٰہ من النار" (تم اللہ کی طرف سے دوزخ سے آزاد ہو) اسی وقت سے ان کا لقب عتیق پڑ گیا۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ سے بھی صاف تصریح ہے کہ عتیق آپ کا لقب ہی تھا [3]

صدیق کہلانے کی وجہ آپ کا دوسرا لقب صدیق تھا۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے اسلام سب سے پہلے قبول کیا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے:

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۴۵۴ [2] الاصابہ ج ۴ حرف الخاء المعجمہ ص ۴۲۹ [3] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴
[4] طبری ج ۲ ص ۶۱۵ ۔

اس کی زیادہ صحیح وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں جبریل امین سے پوچھا کہ میری قوم میں اس واقعہ کی تصدیق کون کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ابوبکر" آپ کی تصدیق کریں گے وہ صدیق ہیں [1]

تجارت قریش اگرچہ عزت و منصب اور مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نہایت سربلند و سرفراز تھے۔ لیکن آزاد ذریعہ معاش اختیار کرنے کو برا نہیں جانتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی ان کو عار نہیں آتی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر سوداگری کرتے تھے۔ سعد بن ابی وقاص تیر بناتے تھے۔ عثمان بن عفان بزازی کا پیشہ کرتے تھے۔ عمرو بن العاص قصاب تھے اور حد یہ ہے کہ حضرت علی دوسروں کے لیے کنویں سے پانی بھر کر اپنی معاش پیدا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر عہدِ جاہلیت میں بڑے پیمانہ پر کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں شام اور یمن کے متعدد سفر بھی کئے تھے۔ پہلا سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا جس کا تذکرہ الاصابہ اور اسد الغابہ میں ہے۔

عہد جاہلیت میں بلند مرتبہ عرب قبائل میں باقاعدہ کوئی بادشاہ نہیں ہوتا تھا۔ قریش سب سے ممتاز تھے اس لیے اس قبیلہ کی مختلف شاخوں نے مختلف خدمات اپنے ذمہ لے رکھی تھیں حضرت ابوبکر عقل و فہم۔ اصابت رائے اور حلم و بردباری میں مشہور تھے اس لیے اُشناق کی خدمت ان کی سپرد تھی یعنی اگر کوئی واقعہ قتل ہو جاتا تھا تو قاتل سے دیت یا خون بہا لینے کا معاملہ حضرت ابوبکر سے متعلق ہوتا تھا۔ اگر آپ قاتل کی طرف سے ضامن ہو جاتے تو اس کا اعتبار ہوتا تھا۔ کسی اور کی ضمانت معتبر نہیں تھی۔ علم الانساب و الاخبار کے ماہر تھے۔ ایک روایت ہے کہ شعر بھی کہتے تھے مگر اسلام کے بعد شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ ابن سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرثیہ میں آپ کے کچھ شعر نقل کئے ہیں۔

سلامت فطرت حضرت ابوبکر کی فطرت شروع سے ہی سلیم تھی۔ چنانچہ آپ کو اسلام سے پہلے بھی بت پرستی سے نفرت تھی اور شراب نوشی کو بُرا جانتے تھے۔ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ابو نعیم کے حوالے سے حضرت عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔

لقد حرّم ابوبکر الخمر   ابوبکر نے عہدِ جاہلیت میں بھی شراب

[1] طبقات ابن سعد تذکرۂ ابوبکر

علیٰ نفسه فی الجاهلیة اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی ۔

آپ کا مزاج اور افتادِ طبع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم سے کس درجہ مشابہ اور قرین تھا، اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ ایک موقعہ پر ابن الدغنہ نے آپ کے وہی اوصاف وکمالات بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی کے نزول کے موقعہ پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے ہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی ہم عمری کے ساتھ اسی ہم طبعی اور مزاجی توافق کا نتیجہ تھا کہ آپ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں دوستی تھی۔ حافظ ابن حجر نے میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ ابوبکر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیرا راہب کے واقعہ کے بعد سے ہی ایمان لے آئے تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً حضرت ابوبکر بھی سفرِ شام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ میں نکاح کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی حضرت ابوبکر واسطہ تھے[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر دونوں کے دوستانہ تعلقات دیرینہ تھے ۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ نبوت سے صرف ایک سال پہلے دونوں میں دوستی ہوئی۔ یہ صحیح نہیں ہے ۔ اسلام کے بعد یہ تعلق اس قدر گہرا ہوگیا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں" ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گزرا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر صبح وشام نہ آئے ہوں[2]

قبول اسلام حضرت ابوبکر کے قبول اسلام سے متعلق اسد الغابہ میں مختلف روایات نقل کی گئی ہیں جن میں سے بعض دور از کار اور بعید از قیاس ہیں ۔ صحیح بات اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر اس وقت تجارت کی غرض سے یمن گئے ہوئے تھے جب واپس آئے تو سردارانِ قریش ملنے گئے ۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا "کوئی نئی بات؟" ان لوگوں نے کہا "ہاں ایک نئی بات یہ ہے کہ ابوطالب کا یتیم بچہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔" یہ سن کر حضرت ابوبکر کا دل تڑپ اٹھا۔ سردارانِ قریش رخصت ہوگئے تو سیدھے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعثت کے بارے میں سوال کیا اور اسی جلسہ

[1] الاصابة ج ۲ حرف العین ص ۳۳۵ [2] صحیح بخاری مطبوعہ مطبع مجتبائی ج ۱ ص ۵۵۲

میں مشرف باسلام ہوئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے اسلام پیش کیا اس نے تھوڑی بہت جھجک ضرور محسوس کی لیکن جب ابوبکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہوں نے جھجک کے بغیر اس کو قبول کر لیا ۔

پہلے مسلمان کی بحث سب سے پہلا مسلمان کون ہے؟ اس میں مختلف روایتیں ہیں۔ بعض میں حضرت علی اور بعض میں زید بن حارثہ کو یہ شرف دیا گیا ہے ۔ محدثین نے تطبیق اس طرح دی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر، عورتوں میں حضرت خدیجہ، بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ سب سے پہلے اسلام لائے چنانچہ عمار بن یاسر کا بیان ہے کہ میں نے جب پہلی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس وقت آپ کے ساتھ صرف پانچ غلام دو عورتیں اور ایک ابوبکر تھے[1] حافظ ابن حجر نے مقدمۂ فتح الباری میں ان پانچ غلاموں اور دو عورتوں کے نام یہ بتائے ہیں ۔

بلالؓ ۔ زیدؓ بن حارثہ ۔ عامرؓ بن فہیرہ ۔ ابوفکیہ ۔ یاسر ۔ خدیجہؓ اور سمیہؓ والدہ عمار بن یاسر لیکن ابھی ایک اشکال یہ باقی رہتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا دعویٰ اپنے متعلق یہ ہے کہ جس روز میں نے اسلام قبول کیا اس روز کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا اور میں سات دن اس طرح رہا کہ میں تین مسلمانوں میں سے ایک تھا[2] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد کا اسلام حضرت ابوبکر کے اسلام پر بھی مقدم ہے ۔

علامہ کرمانی نے اس اشکال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ ممکن ہے حضرت ابوبکر اسی دن صبح کو اسلام لائے ہوں اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے شام کو اسلام قبول کیا ہو اور ان کو حضرت ابوبکر کے اسلام لانے کی اطلاع نہ ہو[3]

بہرحال ہمارے نزدیک صبح وشام کا فرق کوئی چیز نہیں ہے ممکن ہے کہ اس اعتبار سے حضرت سعد کو یا کسی اور کو بھی حضرت ابوبکر پر تقدم حاصل ہو۔[4] تاہم حضرت ابوبکر کے فخر کے لیے یہی کیا کم ہے کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بے چون وچرا اسلام قبول کر لینے کی داد دی ہے

[1] صحیح بخاری جلد ا ص ۵۱۶ [2] صحیح بخاری ج ا ص ۵۴۴ [3] حاشیہ نمبر ۵ صحیح بخاری ج ا ص ۵۴۴ [4] یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ خود سعد بن ابی وقاص حضرت ابوبکر کی ترغیب وتحریک پر اسلام لائے تھے ۔

چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی ہے اور اس سے حضرت ابوبکرؓ کو رنج پہونچا ہے تو آپ نے غصہ کے لب ولہجہ میں فرمایا "اللہ نے مجھ کو تم لوگوں کی طرف مبعوث کیا مگر تم نے مجھ کو جھٹلایا اور ابوبکر نے تصدیق کی اور اپنے نفس اور مال کے ساتھ میری غمگساری کی تو کیا تم پھر بھی میرے ساتھی (ابوبکر) کو میری خاطر نہ چھوڑ دگے؟ یعنی ان کو کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ گے راوی کا بیان ہے کہ حضور نے یہ جملہ دو مرتبہ فرمایا[1]

ابتلاء وآزمائش حضرت ابوبکر نے اسلام کی پہلی صدائے توحید پر ہی لبیک کہا تھا جبکہ مکہ کی پوری سرزمین اس دعوتِ ربانی کی مخالفت اور اس کے داعی وحامی کی دشمنی کے نعروں سے گونج اٹھی تھی چند غلاموں اور عورتوں کے مسلمان ہو جانے سے دشمنوں کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا حضرت ابوبکر ایسی بااثر اور ذی وجاہت شخصیت بھی جب اس دینِ حق اور اس کے داعی کی حمایت و نصرت کے لیے سامنے آگئی تو اب مخالفوں اور دشمنوں کا جتنا بھی غیظ وغضب حضرت ابوبکر پر ہوتا کم تھا۔

شیخ المحب الطبری نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب (ابتدائے اسلام میں) مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ۳۹ مسلمان ہو گئے تو ابوبکر نے اصرار کیا کہ اپنے آپ کو ظاہر کیا جائے مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم ابھی تھوڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے پھر اصرار کیا اور آنحضرتؐ نے پھر انکار فرمایا یہاں تک کہ آنحضرت آمادہ ہو گئے اب جتنے مسلمان تھے مسجد میں آکر بیٹھ گئے۔ ابوبکر خطبہ دینے کھڑے ہوئے۔ آنحضرتؐ بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں مشرکوں کو خبر ہو گئی انہوں نے مسجد میں گھس کر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو نہایت ظالمانہ طریقہ پر زدوکوب کرنا شروع کیا عتبۃ بن ربیعۃ ایک نہایت ظالم وشقی شخص تھا وہ حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہوا اور آپ کو اس بیدردی کے ساتھ مارنا شروع کیا کہ ناک چپٹی ہو کر چہرہ سے مل گئی۔ بنو تیم کو جو حضرت ابوبکر کا قبیلہ تھا خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے اور مشرکوں کو وہاں سے ہٹا کر حضرت ابوبکر کو ان کے گھر لے گئے۔ ان لوگوں کو اب حضرت ابوبکر کی موت میں کوئی شک نہیں تھا۔ ابوبکر بے ہوش پڑے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں ان کو ہوش آیا اور بنو تیم اور ان کے والد ابو قحافہ نے ان سے بات کرنی

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷

چاہی تو انہوں نے پوچھا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟" بنو تیم کو اس پر غصہ آگیا اور وہ ان کو ملامت کرتے ہوئے چلدیئے اب حضرت ابوبکر نے اپنی والدہ ام الخیر سے یہی سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ مگر ان کو بھی پتہ نہیں تھا۔ آخر حضرت عمر کی بہن ام جمیل آئیں اور ان سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخیر وعافیت ہیں اور دار ارقم میں ہیں تو اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گا پیوں گا نہیں جب تک خود چل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ لوں گا میں نے اس کی قسم کھالی ہے چنانچہ اسی حالت میں حضرت ابوبکر ام جمیل اور اپنی والدہ ام الخیر کے سہارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چہرۂ انور دیکھتے ہی گر پڑے اور اسے بوسہ دیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی یہ حالت دیکھی تو آپ کا بھی دل بھر آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ اور حضرت ابوبکر کی والدہ ام الخیر نے بھی اسی دن اسلام قبول کیا[1]

ہجرت حبش کا ارادہ کفارِ قریش کے ظلم وستم کا پارۂ حرارت جب بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی رہا اور حالت یہ ہو گئی کہ جان نثارانِ اسلام برملا خدا کا نام بھی نہیں لے سکتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبش کی ہجرت کا حکم دیا[2] حضرت ابوبکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے لیکن چونکہ یہ ہجرت مصائب وشدائد سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ آزادی

---

[1] الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ ج ۱ ص ۴۶ [2] یاد رکھنا چاہیئے کہ ہجرت کا یہ حکم اس لیے نہیں تھا کہ سرفروشانِ اسلام میں قریش کے مظالم سہنے کی طاقت نہیں رہی تھی بلکہ اس میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس بہانہ اسلام کی دعوت دوسرے ملکوں میں پھیلے گی اور غالباً اسی وجہ سے مہاجرین کی فہرست میں ان نامورانِ قریش کے نام نظر آتے ہیں جو اپنی شخصیت، طرزِ گفتگو اور عقل وفہم سے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کر سکتے تھے۔ دوسری حکمت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سبق دینا تھا کہ مسلمانوں پر اگر کہیں اس قدر ظلم کیا جائے کہ ان کو خدا کا نام لینے تک کی اجازت نہ ہو تو پھر بھی مسلمانوں کو وہیں نہ پڑا رہنا چاہیئے بلکہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری محفوظ جگہ میں اپنی تنظیم کرنی اور قوت بڑھانی چاہیئے۔

کے ساتھ عبادت الٰہی کرنے کی غرض سے تھی اس بنا پر حضرت ابوبکرنے بھی حبش کی ہجرت کا ارادہ کرلیا لیکن ابھی برک الغماد جو مکہ سے یمن کی جانب پانچ دن کی مسافت پر ہے وہاں پہنچے ہی تھے کہ ابن الدغنہ سے جو قبیلہ قارہ[1] کا سردار تھا ملاقات ہوگئی۔ ابن الدغنہ نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟" حضرت ابوبکرنے کہا "میری قوم نے مجھ کو نکالدیا ہے تو اب چاہتا ہوں کہ سیاحت کروں اور اپنے رب کی عبادت کروں" ابن الدغنہ بولا "تمہارے جیسے شخص کو کیسے شہر بدر کیا جاسکتا ہے۔ تم غریبوں کی مالی امداد کرتے ہو صلہ رحمی کرتے ہو۔ اپاہجوں کا سہارا ہو اور حق کی طرف سے حوادث کا مقابلہ کرتے ہو۔ چلو میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں وہاں تم خدا کی عبادت کرنا چنانچہ ابن الدغنہ حضرت ابوبکر کو اپنے ساتھ مکہ لایا اور حضرت ابوبکر کے جو اوصاف نے اوپر بیان کئے ہیں انہیں کا حوالہ دیکر کہا کہ کیا غضب ہے تم ایسے شخص کو شہر میں رہنے نہیں دیتے۔ قریش نے کہا کہ اگر وہ چھپ کر عبادت کریں تو ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ وہ یہاں رہیں تم نے جو ان کو پناہ دی ہے وہ ہمیں اس شرط پر منظور ہے۔ اس عہد کے مطابق حضرت ابوبکر کچھ دنوں تک تو پوشیدہ طور پر ہی عبادت کرتے رہے لیکن آخر نہ رہا گیا۔ اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنالی یہاں نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور روتے تھے ایک تو کلام الٰہی اور پھر حضرت ابوبکر کی درد آفریں واثر انگیز آواز جب قرآن کی تلاوت کرتے تو قریش کی عورتیں اور نوجوان ارد گرد جمع ہوجاتے اور اثر پذیر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی کہ ابوبکر معاہدہ کی خلاف ورزی کررہے ہیں ان سے کہو کہ اگر ان کو تمہاری پناہ میں رہنا ہے تو معاہدہ کے مطابق عبادت اور تلاوت چھپ کر کریں اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو تمہاری پناہ سے دست کش ہوجائیں ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر سے یہی بات کہی تو آپ نے فرمایا "مجھ کو تمہاری پناہ کی ضرورت نہیں اب میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔[2]

اسلام کیلئے ایثار و فداکاری

یہ دور پیروانِ اسلام کے لیے نہایت پُرآشوب اور حد

[1] یہ بنوالہون بن خزیمہ بن کنانہ کا قبیلہ ہے تیر اندازی میں ضرب المثل تھا کہتے ہیں انصف القارۃ من راماھا یعنی جس نے قبیلہ قارہ کے ساتھ تیر اندازی میں مقابلہ کیا اس نے اس کے ساتھ انصاف کیا النہایہ لابن الاثیر و تاج العروس ج ۳ ص ۵۱۰۔ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۲ - ۵۵۳

درجہ صبر آزما تھا۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ آپ کے جاں نثاروں کو اس قدر شدید تکلیفیں پہونچائی جاتی تھیں کہ آج ان کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ لیکن اسلام وہ نشہ نہیں تھا جس کو جسمانی تکلیفوں کی ترشی اتار سکتی۔ حضرت ابوبکر کو اپنی تو چنداں فکر نہیں تھی اس بات کا البتہ برابر دھیان رکھتے تھے کہ حضور سرور عالمؐ کو کوئی تکلیف نہ پہونچنے پائے۔ جب کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا فوراً موقع پر پہنچ جاتے اور آپؐ کی مدد کرتے چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں تقریر کررہے تھے کہ مشرکین آپ پر پل پڑے اور اس قدر گستاخی کی کہ آپ بیہوش ہوگئے۔ حضرت ابوبکر نے بڑھ کر کہا "کم بختو! کیا تم صرف اس لیے ان کو قتل کردوگے کہ یہ ایک خدا کا نام لیتے ہیں[1]

ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبۃ بن ابی معیط ادھر آنکلا۔ اس نے اپنی چادر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال کر اس کو اس طرح بل دیا کہ سردار دو عالمؐ کا دم گھٹنے لگا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر بھی پہونچ گئے عقبہ کو کاندھوں کے بل دھکا دیکر وہاں سے ہٹایا اور بولے "ارے ظالمو! کیا تم اس کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے[2]

مسند بزار میں حضرت علی سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ قریش نے آپ کو گھیر رکھا تھا کوئی آپ کو پکڑ کر کھینچتا۔ کوئی دھکا دیتا اور سب یہ کہتے جاتے تھے کہ تو وہی ہے جس نے سب خداؤں کو ملا کر ایک کردیا ہے حضرت علی کا بیان ہے کہ یہ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ ہم میں سے کسی کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ ہاں ابوبکر آگے بڑھے اور انہوں نے قریشیوں میں سے کسی کو مارا انہیں کسی کو دھکا دیا کسی کو پیچھے ہٹایا یہ سب کچھ کرتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ "بدبختو کیا تم اس کو قتل کردوگے جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے" راوی کا بیان ہے کہ یہ کہکر حضرت علی نے اپنی چادر اُٹھائی اور رونے لگے۔ یہاں تک کہ داڑھی تر ہوگئی۔ اسی حالت میں لوگوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ! آل فرعون کا مومن اچھا تھا یا ابوبکر؟ لوگ خاموش رہے آپ نے دریافت

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۱۲۹ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴۔

فرمایا کیا تم مجھ کو جواب نہیں دو گے؟ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ بخدا! ابوبکر کا ایک لمحہ آلِ فرعون کے مومن جیسے شخص کے ہزار دن لمحوں سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ شخص ایمان پوشیدہ رکھتا تھا اور ابوبکر اپنے ایمان کا اعلان کرتے تھے۔

غلاموں پر قریش کے مظالم اور حضرت ابوبکر کی داد رسی۔ دعوت اسلام کے اس پُرآشوب دور میں حضرت ابوبکر صدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست اور قوتِ بازو تھے جنہوں نے زندگی کا ہر سانس دعوتِ ربانی کی نشر و اشاعت اور اس کے استحکام و تقویت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ایک طرف وہ نامورانِ قریش کو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کھینچ کھینچ کر اسلام کی طرف لاتے تھے اور دوسری جانب اُن غریب دبے کس غلاموں کی داد رسی اور گلو خلاصی اپنے مال سے کرتے تھے جو دعوتِ حق کو قبول کر لینے کے جرم میں قریش کے ظلم و ستم کا سب سے بڑا نشانہ تھے۔ ہم نے ان غلاموں کے حالات "غلامانِ اسلام" میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ ذیل میں ان کے نام مع مختصر تعارف کے لکھتے ہیں۔

حضرت بلال حبشی اسلام کے سب سے پہلے موٴذن ہیں اور کیا عجب بات ہے کہ ارباب سیر انہیں کے متعلق لکھتے ہیں اول من اظہر الاسلام، یہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا، نسلاً حبشی اور اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اُمیہ ٹھیک دوپہر کے وقت جبکہ عرب کی زمین آگ کا توا بن جاتی تھی۔ حضرت بلال کو اسی توے پر لٹا دیتا اور پھر پتھر کی ایک چٹان سینہ پر رکھتا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ اور ان سے کہتا کہ اسلام سے توبہ کرو ورنہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا لیکن با ایں ہمہ حضرت بلال فرماتے "احد احد" خدا ایک ہے ایک ہے اب یہ شقی آپ کے گلے میں ایک رسی باندھ کر چھوکروں کے حوالہ کرتا جو اس حالت میں ان کو شہر میں گشت کراتے پھرتے لیکن اس عالم درد و کرب میں بھی زبان پر نعرہ تھا تو یہی "احد احد" حضرت ابوبکر صدیق نے جب یہ مظالم دیکھے تو امیہ بن خلف سے حضرت بلال کو خرید کر اللہ کے لیے آزاد کر دیا۔ حضرت عمر فاروق فرمایا کرتے تھے "ابوبکر سیدنا و اعتق سیدنا"[1] ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا۔

عامر بن فہیرہ طفیل بن عبداللہ جو حضرت عائشہ کے اخیافی (ماں شریک) بھائی تھے ان کے غلام تھے۔ حضرت بلال۔ حضرت عمار اور حضرت مصعب بن عمیر کے ساتھ عامر بن فہیرہ نے بھی اسلام قبول کیا اور ان کو بھی سخت شدائد و مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ اسلام پر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ جمے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کو ان حالات کا علم ہوا تو ان کو بھی خرید کر آزاد کیا اُن کا ذکر آگے ہجرتِ مدینہ کے سلسلہ میں بھی آئے گا[1]

حضرت ابوفکیہ قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اسلام کی صدائے کفر شکن مکہ میں بلند ہی ہوئی تھی کہ حضرت بلال اور حضرت صہیب کی طرح فوراً مسلمان ہو گئے ان پر سخت مظالم کئے جاتے تھے۔ صفوان آتش خیز دوپہر میں تپتے ہوئے ریت پر منہ کے بل اوندھا لٹا دیتا اور پھر کمر پر ایک بھاری پتھر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ حضرت ابوفکیہ تاب نہ لا کر بیہوش ہو جاتے۔ اس بدبخت کو پھر بھی رحم نہ آتا۔ اسی حالت میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو گھسیٹتا پھرتا ایک دن صفوان نے حضرت ابوفکیہ کو گرم ریت پر ڈال کر اُن کو اس بیرحمی و بے دردی سے مارا کہ ان کے مر جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکر کا اُدھر سے گزر ہوا حضرت ابوفکیہ کو اس حالت میں دیکھ کر بیساختہ جی امڈ آیا۔ فوراً ان کو خریدا اور آزاد کر دیا[2]

حضرت لُبینہ حضرت عمر فاروق رض کے گھرانہ کی باندی تھیں۔ ابھی حضرت عمر اسلام نہیں لائے تھے کہ یہ مشرف باسلام ہو چکی تھیں حضرت عمر کی درشت مزاجی مشہور ہے۔ اس غریب کو اس بیدردی سے مارتے تھے کہ مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے۔ "میں ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا لیکن حضرت لبینہ نہایت استقلال و پامردی سے جواب دیتیں" اگر تم نے اسلام قبول نہیں کیا تو اللہ اس کا بدلہ لے گا[3]

حضرت زنیرہ یہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانہ کی باندی تھیں۔ اسلام سے قبل حضرت عمر ان کو بھی بہت ستاتے اور پریشان کرتے تھے۔ ابوجہل نے ایک مرتبہ ان کو ایسا مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت لُبینہ اور حضرت زُنیرہ کے لیے کیا یہ شرف کچھ کم ہے کہ ان کو حضرت عمر فاروق رض

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۹۰ [2] اصابہ تذکرہ حضرت ابوفکیہ [3] استیعاب تذکرہ عمر بن الخطاب۔

ایسے اپنے آقا پر بھی قبولِ اسلام کے معاملہ میں تقدم حاصل ہے۔ حضرت ابوبکر کو ان غریبوں کے مصائب و شدائد کا علم ہوا تو ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔

حضرت نہدیہ اور ام عبیس یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں قبولِ اسلام کے جرم میں ان پر بھی سخت جبر و تشدد کیا جاتا تھا۔ آخر صدیقی جود و کرم کے دستِ غریب نواز نے ان ستم رسیدوں کو بھی غلامی سے نجات دلائی۔

طبرانی نے حضرت عروہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے جن غلاموں اور کنیزوں کو اپنے روپیہ سے خرید کر آزاد کیا ان کی تعداد سات ہے لیکن ہمارے خیال میں اس خاص معاملہ میں حضرت ابوبکر کو عام شہرت حاصل تھی وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل تعداد سات سے کہیں زیادہ ہو گی۔ لیکن چونکہ اور دوسرے غلاموں اور باندیوں کو یہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی اس بنا پر وہ شمار میں نہیں آئے [1]

حضرت ابوبکر کی یہ فیاضیاں خالصتاً لوجہ اللہ تھیں ایک مرتبہ ان کے والد ابو قحافہ نے کہا "ابوبکر تم زیادہ تر عورتوں اور ان میں بھی بوڑھیوں کو خرید کر آزاد کرتے ہو۔ بھلا یہ تمہارے کس کام آئیں گی۔ اگر ان کے بجائے تم تندرست و توانا غلام مردوں کو خرید کر آزاد کرو تو کبھی وقت پڑنے پر وہ تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔"

حضرت ابوبکر نے کہا "ابا! میں تو یہ سب کچھ انعام خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں [2]

اسلام جس نے آگے چل کر اقوام عالم کی تاریخ کے دفتر الٹ دیئے اس کے سب سے پہلے علمبردار حامی اور جان نثار کون تھے؟ یہی چند غلام اور کنیزیں جن میں سے کئی ایک پروردہ احسانِ صدیقی تھے۔ رحمتِ عالم کو ان کی دل جوئی اس حد تک منظور تھی کہ

---

[1] اصابہ اور اسد الغابہ دونوں میں حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تو سات ہی لکھی ہے لیکن ایک تو ان سات غلاموں کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کو عذاب دیا جاتا تھا اور دوسرے یہ کہ دونوں کتابوں میں تعداد کے ایک ہونے کے باوجود ناموں میں اختلاف ہے، یہ دونوں باتیں بھی اس امر کا قرینہ ہیں کہ حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد سات سے زیادہ ہو گی۔ [2] ابن جریر طبری ۱۲

اگر حضرت ابوبکر کی زبان سے بھی ان کے حق میں کوئی بات ایسی نکل جاتی جو ان کے لیے آزردگی کا باعث ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کو فوراً متنبہ فرما دیتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ابو سفیان (مسلمان ہونے سے پہلے) حضرت سلمان فارسی۔ حضرت بلال حبشی اور حضرت صہیب رومی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ان تینوں نے اس کو دیکھ کر کہا "اللہ کی تلوار نے اس دشمنِ خدا کی گردن نہیں اڑائی" اس وقت حضرت ابوبکر بھی کہیں پاس ہی تھے۔ یہ سُن کر بولے "تم لوگ قریش کے بزرگ کی نسبت ایسا کہتے ہو؟" پھر جب ابوبکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر فرمایا تو آپ نے فرمایا "ابوبکر" تم نے شاید ان (غلاموں) کو خفا کر دیا۔ اگر ایسا ہے تو گویا تم نے خدا کو ناراض کر دیا۔ حضرت ابوبکر یہ سُن کر فوراً پلٹے اور ان تینوں سے آکر کہا۔ "میرے پیارے بھائیو! کیا میں نے تم کو ناراض کر دیا ہے انہوں نے جواب دیا نہیں! ہم خفا نہیں ہیں۔" اے بھائی اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے [1]

حضرت ابوبکر کے انفاقِ مال کی اہمیت اسلام اس وقت حد درجہ غریب اور بے برگ و نوا تھا ایک طرف ان غلاموں کے استقلال اور ان کی پامردی نے مکہ کی سرزمین میں اسلام کے قدم جمائے تو دوسری جانب حضرت ابوبکر نے اللہ کی راہ میں دولت خرچ کر کے ان قدموں میں توانائی اور مضبوطی پیدا کی چنانچہ جیسا کہ تم نے ابھی دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ان غلاموں کی دل جوئی اور دل دہی فرماتے تھے حضرت ابوبکر کے انفاق مال کی اہمیت کا بھی سپاس گزارانہ اعتراف کرتے تھے حدیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد مواقع کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

ما نفعنی مال احد قط ما	ابوبکر کے مال نے مجھ کو جو نفع پہونچایا
نفعنی مال ابی بکر [2]	ہے کسی اور کے مال نے اتنا نہیں پہنچایا

ایک دوسرے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ امتنان و تشکر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

---

[1] التاج الجامع الاصول ج ۳ ص ۲۲۴ [2] جامع ترمذی مناقب ابی بکر الصدیق

اللہ لیس من الناس احدٌ امنّ علی فی نفسہ ومالہ من ابی بکرٍ ۔

بے شبہ جان ومال کے لحاظ سے ابوبکر سے زیادہ مجھ پر کسی اور کا احسان نہیں ہے ۔"

تو حضرت ابوبکر رونے لگے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ جان اور مال کیا کسی اور کے لیے بھی ہے ۔ [1]

قرآن مجید کا اعتراف

اسی بنا پر خود قرآن نے ان مخلصوں کو جو فتح مکہ سے قبل اپنے جان ومال سے اسلام کی مدد کرتے تھے (اور کوئی شبہ نہیں کہ ان میں حضرت ابوبکر کا نام سرفہرست ہے) اُن لوگوں کے مقابلہ میں خاص عظمت وبرتری کا مستحق قرار دیا ہے جو فتح مکہ کے بعد ایسا کرتے تھے ۔ چنانچہ ارشاد ہے ۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ۔ (سورۃ الحدید)

تم میں سے وہ لوگ جو فتح مکہ سے پہلے خرچ کرتے تھے اور قتال کرتے تھے وہ درجہ کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں ان لوگوں سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور قتال کیا ۔

حضرت ابوبکر جب اسلام لائے تھے ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے لیکن جب مدینہ پہنچے ہیں تو صرف پانچ ہزار درہم رہ گئے تھے [2] باقی سب کی سب اللہ کے راستہ میں خرچ کر دی ۔

حضرت عائشہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح

قریش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جن جن طریقوں سے ستا رہے تھے اُن سب کے باوجود آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ جو قریش کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ابوطالب جو آپ کے چچا تھے اور قریش میں بڑی با اثر شخصیت رکھتے تھے ان دونوں کے وجود سے آپ کو بڑی قوت اور دل جمعی تھی لیکن سنہ ۱۰ نبوی میں چند روز کے آگے پیچھے سے دونوں کی وفات ہوگئی ۔ طبعی طور پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حادثہ کا اس قدر ملال ہوا کہ آپ اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال کہتے تھے اور اکثر اداس اور غمگین نظر آتے تھے ۔ اسی اثنا میں خولہ بنت حکیم نے

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۳۱۶ [2] اصابہ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۲ ص ۸۳۱

حضرت عائشہ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کی تحریک کی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خواب کے ذریعہ اس قران السعدین کی اطلاع پہلے ہی دی جا چکی تھی [1] اس لیے آپ راضی ہوگئے ۔ اب خولہ نے حضرت عائشہ کی والدہ ام رومان سے اس کا ذکر چھیڑا انہوں نے حضرت ابوبکر سے تذکرہ کیا ۔ وہ بولے کہ میں جُبیر بن مطعم کو زبان دے چکا ہوں ۔ لیکن جب جبیر بن مطعم سے اس معاملہ میں بات چیت کی گئی تو اس نے انکار کر دیا ۔ اب حضرت ابوبکر آزاد تھے ۔ چنانچہ آپ نے چار سو درہم پر حضرت عائشہ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا ۔ اس وقت صرف نکاح ہوا تھا اور حضرت عائشہ کی عمر چھ برس کی تھی ۔ غرض کہ اس رشتۂ مصاہرت کے قائم ہوجانے سے حضرت ابوبکر صدیق کی قبائے شرف ومجد میں ایک اور تکمۂ زریں کا اضافہ ہوا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک ایسی رفیقۂ حیات کا انتظام ہوگیا جو آگے چل کر اسلامی احکام ومسائل کی تشریح وتوضیح اور دین حق کی تبلیغ واشاعت میں آپ کی دست وبازو ثابت ہوئیں ۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۱

ہجرت مدینہ

مدینہ میں اسلام کی مقبولیت اسلام کا جو آفتاب جہاں تاب مکہ کے افق سے طلوع ہوا تھا اس کی کرنیں مدینہ کو منور کرنے لگی تھیں۔ یہاں سے مختلف قبیلوں کے لوگ جو ہر سال حج کرنے کے لیے مکہ معظمہ آتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچکر قرآن مجید کی آیتیں سناتے اور دین حق کی دعوت دیتے۔ اکثر موقعوں پر حضرت ابوبکر بھی ہمراہ ہوتے۔ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ اختلاط و ارتباط رکھنے کی وجہ سے دین الٰہی کے تصور سے بے بہرہ نہیں تھے اور ساتھ ہی توراۃ کی پیش گوئی کے باعث ایک پیغمبر موعود کی بعثت کے منتظر تھے۔ اس بنا پر اب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ کی زبانِ حق ترجمان سے قرآن مجید سنا تو ان کو اسلام کی دعوت قبول کرنے میں زیادہ پس و پیش نہیں ہوا بلکہ انہوں نے جلدی اس لیے کی کہ کہیں مدینہ کے یہودی اس سعادت اندوزی میں ان پر سبقت نہ لے جائیں۔ یہ حجاج خود مسلمان ہوتے تھے اور پھر چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش کے مطابق اپنے مبلغین بھی مدینہ میں بھیجنے شروع کر دیئے تھے جو وہاں رہ کر دین حق کی نشر و اشاعت کا فرض انجام دے رہے تھے اس بنا پر اسلام جو خود اپنے وطن میں غریب الوطن تھا مدینہ کی سرزمین میں سرسبز و شاداب ہو رہا تھا اور وہاں روز بروز اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔

قریش کا ناپاک منصوبہ قریش نے جب دیکھا کہ اب تک انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کو ستانے۔ ڈرانے اور پریشان کرنے کی جتنی بھی تدبیریں کی ہیں ان میں سے ایک تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی یہاں تک کہ تین برس تک آل ہاشم شعب ابی طالب

میں محصور رہے اور اس مدت میں بھوک اور پیاس کی کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو انہوں نے اٹھائی نہ ہو مگر اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلا۔ بلکہ اور الٹا اثر یہ ہو رہا ہے کہ اسلام مدینہ میں پھیل رہا ہے اور اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا ہے تو اب ان لوگوں نے دار الندوہ میں جو اُن کا دار المشورہ تھا اپنا ایک اجتماع کیا اور باہم مشاورت کی کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس اجتماع میں نامور زعمائے قریش شریک تھے۔ مختلف رائیں پیش ہوئیں آخر ابوجہل نے کہا "ہر قبیلہ سے ایک ایک آدمی چنا جائے اور سب لوگ ایک ساتھ مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تلواروں سے حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دیں، اس صورت میں ان کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائے گا اور آلِ ہاشم کے لیے ان کا اکیلے مقابلہ کرنا آسان نہ ہوگا۔"

اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

ہجرت نبوی کے لیے حکم ربانی کا انتظار ادھر مدینہ میں اسلام کی پذیرائی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اکثر جاں نثاروں کو پہلے ہی مدینہ کی ہجرت کا حکم دے دیا تھا۔ اور اکثر صحابہ وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق بھی مدینہ پہنچنے کی جلدی کر رہے تھے لیکن ان کی قسمت میں رفیق غارِ ثور ہونے کی سعادت لکھی تھی اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ٹال رہے تھے اور خود اپنے لیے حکمِ خداوندی کے منتظر تھے۔ آخر وہ وقت بھی آگیا۔ ادھر دار الندوہ میں یہ قرارداد منظور ہو رہی تھی کہ رحمتِ عالم ؐ کے وجودِ مسعود سے عالم کو محروم کر دیا جائے اور ادھر رب السمٰوٰت والارض نے اپنے حبیب پاک ؐ کو یہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور اعلان کر دیا "اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ" اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہیں کرتے تو نہ کرو اللہ ان کی مدد کرے گا۔ امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ پوری داستان بڑی تفصیل سے سنائی ہے۔ چونکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت و توکل علی اللہ، اور حضرت ابوبکر صدیق کی ذات اقدس کے ساتھ غیر معمولی محبت اور شیفتگی اور ساتھ ہی حسن انتظام۔ نفاست پسندی اور لطافت طبع پر روشنی پڑتی ہے اس لیے ہم اس کو بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔ اصل روایت میں کہیں کہیں دوسری روایات سے مدد لے کر اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ پورا واقعہ ایک ہی جگہ آجائے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت عائشہؓ اگرچہ

اس وقت کم سن تھیں لیکن ظاہر ہے ان کی یہ روایت گویا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوبکر صدیق کی روایت ہے[1]۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

حضرت ابوبکر کی ہجرت کی نیت سے تیاری

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ مجھ کو تم لوگوں کا مقام ہجرت دکھا دیا گیا ہے اور وہ ایسا اور ایسا ہے تو بہت سے لوگوں نے مدینہ جانا شروع کر دیا یہاں تک کہ جو مسلمان حبش چلے گئے تھے انہوں نے بھی وہاں سے واپس آکر مدینہ کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکر نے بھی تیاری کر لی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ ابھی ذرا ٹھہرو "میں امید کرتا ہوں کہ مجھ کو عنقریب اجازت ملے گی۔ ابوبکر بولے "میرا باپ آپ پر قربان! کیا آپ کو اس کی امید ہے؟" ارشاد ہوا "ہاں" یہ سن کر حضرت ابوبکر نے طے کر لیا کہ بس اب وہ حضور پر نور کے ساتھ ہی چلیں گے، اُن کے پاس دو اونٹنیاں تھیں ان کو چار مہینے پہلے سے ببول کی پتیاں کھلانا شروع کر دیں تاکہ سفر ہجرت میں کام آئیں

ہجرت کے لیے روانگی

چار مہینے اسی طرح گزر گئے ایک دن دوپہر کا وقت تھا ہم سب لوگ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر سے کہا "وہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر ڈھانکے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔" "یہ وقت تو حضورؐ کے یہاں آنے کا نہیں ہے" حضرت ابوبکر نے سرکارِ دو عالم کو دیکھا تو بولے "میرے ماں باپ آپ پر قربان! اس ناوقت آپ ضرور کسی اہم کام کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہونچ ہی گئے دروازہ پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی اجازت دیدی گئی تو آپ گھر میں داخل ہوئے اور حضرت ابوبکر سے فرمایا "جو لوگ اس وقت تمہارے پاس ہیں ان کو ہٹا دو۔" حضرت ابوبکر نے جواب دیا "حضور! یہاں آپ کا غیر کون ہے" اب آپؐ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کا حکم مل گیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا "تو میں بھی ساتھ چلوں گا؟" ارشاد ہوا "ہاں" اب حضرت ابوبکر نے کہا "تو آپ میری ان دو اونٹنیوں میں سے کوئی ایک اونٹنی لے لیجئے۔" ارشاد ہوا۔ اچھا! مگر قیمت

---

[1] چنانچہ امام بخاری نے باب مناقب المہاجرین وفضلہم کے ماتحت واقعات ہجرت سے متعلق خود حضرت ابوبکر کی بیان کردہ ایک طویل روایت نقل کی ہے ہم نے یہ روایت اور حضرت عائشہ رض کی بیان کردہ روایت جو امام بخاری نے باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینہ کے ماتحت بیان کی ہے ان دونوں کو ملا کر ہجرت کی روئیداد مرتب کی ہے۔

کے ساتھ"[1]

اب جلدی جلدی سفر کی تیاری ہونے لگی۔ کئی دن کی راہ تھی اس کے لیے کھانا پکا کر ناشتہ دان (سُفرہ) میں رکھا گیا۔ ناشتہ دان کے منہ پر باندھنے کے لیے کچھ نہیں تھا حضرت ابوبکر کے حکم سے ان کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء نے اپنے نطاق یعنی کمر بند (پٹکہ)[2] کے دو ٹکڑے کئے اور اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ اسی بنا پر اُن کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔

غارِ ثور میں پوشیدگی

ادھر دار الندوہ کی قرارداد کے مطابق قریش کے لوگوں نے جو قتل کے ارادے سے آئے تھے سر شام پہونچکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ قریش زنان خانہ میں گھسنا بہت معیوب سمجھتے تھے اس لیے اس تاک میں تھے کہ حضورؐ باہر تشریف لائیں گے تو یہ اپنا منصوبہ پورا کریں گے حضورؐ کے پاس بہت سے لوگوں کی امانتیں تھیں ان کی واپسی کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ اس لیے وہ سب حضرت علی کے سپرد کیں[3] اور رات کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد جب ان محاصرین کی پلک جھپک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر حضرت ابوبکر کے گھر پہونچے[4] اور وہاں سے دونوں نے مکہ کو الوداع کہا اور روانہ ہو گئے۔ مکہ سے تین میل بجانب جنوب ایک پہاڑ ہے جس کا نام ثور ہے یہاں پہونچے اور ایک غار میں روپوش ہو کر بیٹھ گئے۔ غار میں تین شب قیام رہا۔ حضرت ابوبکر کے صاحبزادے عبداللہ جو نوجوان مگر نہایت فہیم اور سمجھ دار تھے وہ شب غار میں بسر کرتے تھے اور علی الصباح منہ اندھیرے

---

[1] غور کرو حسن معاملگی انتہا ہے کہ اس نازک وقت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر ایسے جاں نثار کی اونٹنی کو مفت میں قبول کر لینے کے لیے تیار نہیں اور ادھر حسن ادب و اطاعت کی حد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کو قیمت لینے میں انکار نہیں۔ چنانچہ واقدی کے بیان کے مطابق اونٹنی کی قیمت آٹھ سو درہم تھی [2] نطاق کے معنی پٹکہ ہیں اور عرب میں عام دستور تھا کہ عورتیں پٹکہ باندھتی تھیں تعجب ہے کہ مولانا عبداللہ العمادی نے کیونکر نطاق کا ترجمہ دوپٹہ، لکھدیا ہے (دیکھو ترجمہ طبقات ابن سعد جزء خامس حصہ اول ص ۵) حالانکہ دوپٹہ کے لیے عربی میں خمار کا لفظ بولا جاتا ہے [3] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت علی [4] بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے خروج من مکہ کا ذکر ہے۔ لیکن واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر کے مکان کی پشت میں جو کھڑکی تھی یہ خروج اس سے ہوا تھا۔ ہم نے دونوں بیانات کو جمع کر دیا ہے

ملاکر قریش سے گھل مل جاتے تھے یہاں قریش میں باہم جو مشورہ یا منصوبہ ہوتا اسے محفوظ کر لیتے اور جب اندھیرا ہوجاتا پھر غارِ ثور پہونچکر دونوں کو اس سے باخبر کر دیتے تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی بکر گھر سے کھانا بھی لاتے تھے۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکر صدیق کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ رات گئے بکری چرا کر لاتے اور رفیقانِ غارِ ثور دونوں اس پر گزارہ کرتے۔ منہ اندھیرے عامر بن فہیرہ نکل جاتے اور شام ہونے پر واپس آجاتے تینوں دن یہی معمول رہا۔

ادھر صبح کے وقت قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ نکلنے کی خبر ہوئی تو انہیں اپنے منصوبے کی ناکامی کا بے حد افسوس ہوا اور بڑے جز بز ہوئے چاروں طرف آپ کی تلاش میں آدمی دوڑلئے یہاں تک کہ ایک مرتبہ غار کے دہانہ تک پہونچ گئے ان کی آہٹ پاکر حضرت ابوبکر کو بڑی تشویش ہوئی اور عرض کیا "حضور! یہ لوگ اپنے قدموں کی طرف دیکھیں تو ہم انکو نظر آجائیں گے۔ سرکارِ دوعالم نے فرمایا۔

ماظنك يا ابابكر باثنين الله ثالثهما[1] اے ابوبکر ان دو کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جنکا تیسرا ساتھی اللہ ہو۔

عبداللہ بن اریقط جو عبد بن عدی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مسلمان نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کی امانت و دیانت پر اعتماد تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی رہنمائی کے لیئے اس کو اجرت پر مقرر کر لیا تھا اور دونوں اونٹنیاں اس کے حوالہ کر دینے کے بعد اس سے یہ بات طے کر لی تھی کہ وہ تین شب گزارنے کے بعد صبح کو اونٹنیاں لے کر غارِ ثور میں پہونچ جائیگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت ابوبکر اور عامر بن فہیرہ۔ عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں روانہ ہوئے۔

ایک دن اور ایک رات مسلسل چلنے کے بعد دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ بہت تیز ہوگئی تو حضرت ابوبکر نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی سایہ ملے تو وہاں ٹھہریں اتفاق سے ایک چٹان نظر آئی اس کے نیچے سایہ تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس جگہ کو ہموار کیا۔ فرش بچھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استراحت فرمانے کی درخواست کی۔ حضور لیٹ ہوگئے اب حضرت ابوبکر یہ دیکھنے نکلے کہ کہیں کوئی شخص تعاقب میں تو نہیں آرہا ہے یہ تلاش میں

[1] بخاری ۱۵۔ ص ۵۱۲ (باب مناقب المہاجرین)

ادھر ادھر پھر رہے تھے کہ ایک چرواہا نظر آیا جو سایہ کی جستجو میں اسی چٹان کی طرف اپنی بکریاں ہانکے چلا آرہا تھا۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا "تم کون ہو" اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو حضرت ابوبکر پہچانتے تھے اور کہا کہ میں اُس کا نوکر ہوں "حضرت ابوبکر نے پوچھا" تیری بکریوں میں دودھ ہے؟ وہ بولا "ہاں" پھر دریافت کیا "کیا تو ہمارے لیئے دودھ دوھدے گا"؟ اُس نے کہا "جی ہاں"

اب لڑکے نے حضرت ابوبکر کی فرمائش پر دودھ دوہنے کے لیئے ایک بکری کو اپنے قابو میں کیا تو حضرت ابوبکر نے (ازراہِ نفاست پسندی وحبِ نبوی) کہا کہ پہلے ان تھنوں کو غبار سے تو پاک وصاف کر لے اُس کے بعد خود اس سے کہا کہ تیرے ہاتھ غبار آلود ہیں ان کو بھی جھاڑ اور ساتھ ہی اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مار کر بتایا کہ اس طرح۔ لڑکے نے جب ایسا کر لیا تو اس نے دودھ دوھا۔ حضرت ابوبکر خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ایک چمڑے کا برتن لیکر آئے تھے۔ دودھ اس میں انڈیلا۔ برتن پر کپڑا باندھا۔ اور اُسے لیکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اسوقت آپ کچھ نیند لیکر بیدار ہوچکے تھے۔ عرض کیا "حضور دودھ پی لیں آپ نے درخواست قبول فرمائی تو حضرت ابوبکر کے دل کی باچھیں کھل گئیں۔ اب حضرت ابوبکر نے کہا "یارسول اللہ چلنے کا وقت ہوگیا ہے" ارشاد ہوا "بہت بہتر" اچنانچہ اب یہاں سے روانگی شروع ہوگئی۔

سراقہ بن جعشم کا واقعہ ادھر ادھر تلاش کے بعد جب آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکر کا کہیں پتہ نہیں چلا تو قریش نے چاروں طرف قاصد روانہ کر کے اعلان کرادیا کہ جو کوئی شخص آنحضرت صلعم یا حضرت ابوبکر کو قتل کریگا یا زندہ گرفتار کرے گا اس کو فی کس ایک خون بہا (سو اونٹ) کے برابر انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم جو بنو مدلج سے تعلق رکھتا تھا اس نے یہ اعلان سنا تو ایک شخص کے اتا پتہ بتانے پر وہ گھوڑے پر بیٹھ اور نیزہ ہاتھ میں لے ان دونوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا آرہا تھا کہ گھوڑے کی ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اب اس نے ترکش سے فال کے طور پر تیر نکالے کہ مجھ کو تعاقب کرنا چاہیئے یا نہیں جواب مرضی کے مطابق نہیں نکلا۔ مگر لالچ بری بلا ہے وہ پھر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور بالکل ہی قریب

پہونچ گیا حضرت ابوبکر نے اُسے دیکھا تو گھبرا کر بولے "یارسول اللہ ؐ! یہ ہماری طلب میں آگیا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (ترجمہ[1] گھبراؤ نہیں! اللہ بے شک ہمارے ساتھ ہے۔

خود سراقہ کا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ بیان ہے کہ میں ان دونوں کے اسقدر قریب پہونچ گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ پڑھنے کی آواز سُن رہا تھا اور پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں نے اس وقت دیکھا کہ آنحضرت ؐ التفات نہیں کر رہے تھے لیکن حضرت ابوبکر (فرطِ اضطراب میں) ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ اب گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نیچے گر پڑا۔ گھوڑے پر چیختا چلّایا۔ گھوڑا چاہتا تھا کہ اٹھے مگر وہ زمین سے اپنے پاؤں نہیں نکال سکا۔ اس مرتبہ سراقہ نے پھر فال لی اور وہی جواب ملا تو سمجھ گیا یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے اب اُس نے امان طلب کی۔ نبی و صدیق کا یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ امان پا کر سراقہ پھر سوار ہوا اور یہاں پہنچکر اس نے قریش کے اعلان اور انکی جستجو کی روئیداد سنائی کھانے پینے کا جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا وہ پیش کیا اور اپنے لیئے ایک پروانہ امن کا خواستگار ہوا۔ عامر بن فہیرہ نے چمڑہ کے ایک ٹکڑے پر یہ پروانہ لکھ کر اُس کے حوالے کیا۔

اتفاق سے حضرت زبیر مسلمان تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ شام سے آرہے تھے یہاں انکی ملاقات آں حضرت ؐ سے ہوئی حضرت زبیر نے چند بیش قیمت سفید کپڑے آنحضرت ؐ اور حضرت ابوبکر کی خدمت میں پیش کیئے۔ یہ پیش کش اس بے سروسامانی کے عالم میں بہت غنیمت تھی۔ ابن سعد نے حضرت زبیر کی بجائے طلحہ بن عبید اللہ کا نام لکھا ہے ممکن ہے یہ دونوں واقعے الگ الگ ہوں یا طلحہ بن عبید اللہ خود حضرت زبیر کے شریک تجارت ہوں۔ اب قافلہ پھر روانہ ہوا۔ آنحضرت ؐ اگرچہ عمر میں حضرت ابوبکر

[1] یہ الفاظ آنحضرت ؐ نے غار ثور میں بھی کہے تھے جیسا کہ قرآن میں صاف طور پر مذکور ہے اس لیئے روایات میں ان دونوں موقعوں کیلئے یہ الفاظ ملتے ہیں البتہ قرآن نے صرف واقعہ غارِ ثور کا ذکر کیا ہے اور سراقہ کے واقعہ سے ساکت ہے۔

سے بڑے تھے۔ لیکن صورت شکل سے نسبتاً کم عمر اور جوان اور حضرت ابوبکر بوڑھے نظر آتے تھے۔ تجارت کی تقریب سے چونکہ حضرت ابوبکر کا باہر آنا جانا رہتا تھا۔ اسلیئے راستہ میں اُن کے شناسا ملتے جاتے تھے۔ ان میں سے جو کوئی ان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھتا کہ یہ کون ہے؟ وہ توریہ وابہام کی زبان میں جواب دیتے۔ " یہ میرے راہنما ہیں"[1]

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۶

مدینہ طیبہ میں ابتدائی زندگی

کوکبۂ نبوی کا مدینہ میں داخلہ مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر مدینہ میں پہنچ چکی تھی اور یہاں آپ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند تھا۔ انصار کا بچہ بچہ ہمہ تن چشم شوق بنا ہوا تھا۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک بالائی آبادی ہے۔ جس کو حرۃ یا قبا کہتے ہیں دیوانگان جمالِ محمدی صبح سویرے یہاں پہونچ جاتے اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے کہ کوکبۂ نبوی کے راستہ کی اڑتی ہوئی گرد نظر آجائے تو چشم انتظار کے لیئے اسکو توتیا بنا کر رکھ لیں۔ دوپہر کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو حسرت و افسوس کے ساتھ گھر واپس لوٹ جاتے، روز کا یہی معمول تھا، ایک دن اسی طرح گھر واپس آچکے تھے کہ ایک یہودی کہ نیچے شیلہ پر سے دیکھ رہا تھا، چانک اس کی نگاہ آنحضرتؐ اور آپ کے رفقا پر پڑی جو سفید لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور بلبیا ختہ پکارا "اے عرب کے لوگو! جن کا تم کو انتظار تھا وہ آگئے۔ انصار نے سُنا تو جوش مسرت میں قابو سے باہر ہو گئے اور ہتھیار سج سجا استقبال کے لیئے آگے بڑھے۔ حرۃ کی پشت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔ یہاں عمرو بن عوف کا ایک ممتاز خاندان آباد تھا۔ شہنشاہِ دو عالم نے سب سے پہلے اس کو ہی میزبانی کا شرف عطا فرمایا۔ آنحضرتؐ تو سواری سے اتر کر خاموش بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر لوگوں سے بات چیت کیلئے کھڑے رہے انصار کے جن لوگوں نے اب تک آں حضرتؐ کو نہیں دیکھا تھا وہ آتے تھے تو حضرت ابوبکر کو ہی پیغمبر آخر الزمان سمجھ کر سلام کرتے تھے۔ اتنے میں دھوپ ذرا تیز..... ہو گئی تو حضرت ابوبکر صدیق

آنحضرتؐ پر اپنی چادر کا سایہ کر کے کھڑے ہو گئے اس سے ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ دراصل ان کا گوہر مقصود کون ہے۔[1]

امام بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ کا قبا میں قیام چودہ دن رہا یہیں آپ نے وہ مسجد تعمیر کی جس کا ذکر قرآن مجید میں "لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى"[1] کے عنوان سے ہے۔

ورودِ مدینہ کی تاریخ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق آنحضرتؐ دوشنبہ کے دِن مکہ سے روانہ ہو کر تین دن غارِ ثور میں رہے اور پنجشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوئے امام بخاری نے ورودِ قبا کا دن دوشنبہ اور مہینہ ربیع الاول کا بتایا ہے لیکن تاریخ میں اختلاف ہے کسی نے پہلی یا دوسری کسی نے سات۔ کسی نے بارہ کسی نے تیرہ اور کسی نے پندرہ تاریخ لکھی ہے[2] لیکن یہ ظاہر ہے کہ امام بخاری کی روایت کے مطابق اگر دن دوشنبہ کا متعین ہو جائے جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ جدید حساب سے بھی یہی دن ٹھیکتا ہے[3] تو ان مذکورہ بالا تاریخوں میں سے کوئی ایک تاریخ بھی درست نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے سن عیسوی کے لحاظ سے ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء تاریخ لکھی ہے[4]

قبا میں دو ہفتہ قیام کے بعد آپ اور حضرت ابوبکر شہر مدینہ کے لیئے روانہ ہوئے اور حضرت ابو ایوب انصاری کو شرفِ میزبانی عطا فرمایا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے مدینہ کے قرب و جوار میں سنح نام ایک جگہ ہے وہاں خارجہ بن زید بن ابی زہیر کے پاس قیام کیا اور یہیں تجارت کا کاروبار پھر شروع کر دیا۔ بعد میں خارجہ کی بیٹی حبیبہ سے نکاح بھی کر لیا اور ایک مستقل مکان میں رہنے لگے۔ چند روز کے بعد حضرت ابوبکر کی بیوی ام رومان۔ انکے صاحبزادہ حضرت عبداللہ اور صاحبزادیاں حضرت اسماء اور حضرت عائشہ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر آنحضرتؐ کی وفات کے بعد

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۵۹ [2] حاشیہ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [3] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۷۷ حاشیہ نمبر ۲ [4] عربوں کی تاریخ چوتھا اڈیشن ص ۱۱۶

چھ ماہ تک اسی جگہ رہتے رہے [1]

مدینہ کی آب وہوا کی عدم موافقت اور دعاء نبوی ﷺ
یہاں پہونچنے کے کچھ دنوں کے بعد حضرت ابوبکرؓ شدید تپ ولرزہ میں مبتلا ہوگئے حضرت عائشہؓ اس حالت میں باپ کی مزاج پرسی کرنے آئیں تو یہ شعر ورد زبان تھا۔

کُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِی اَهْلِه   وَالْمَوْتُ اَدْنیٰ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِه

ہر شخص اپنے بال بچوں میں داد عیش وطرب دیتا ہے   حالانکہ موت اسکے جوتہ کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے

حضرت عائشہؓ گھبرا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور آپ کا حال عرض کیا۔ آپ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ "اے اللہ تو مدینہ کو بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی محبوب بنادے جیسا کہ مکہ تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہاں کی آب وہوا کو صحت بخش کر دے اور یہاں کے ناپ تول میں برکت عطا فرما اور بخار کو یہاں سے منتقل فرما [2]

انہیں دنوں میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کو بخار آگیا تو حضرت ابوبکرؓ بڑے پریشان ہوئے گھر میں آتے بیمار بیٹی کو پیار کرتے اور پوچھتے "بیٹا! تم اب کیسی ہو"؟ [3]

حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کے علاوہ اور مہاجرین کو بھی مدینہ کی آب وہوا موافق نہیں آئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ آج مدینہ طیبہ پورے حجاز میں آب وہوا کے لحاظ سے بہترین جگہ ہے۔

عقد مواخات
مہاجرین جو محض اللہ کے راستہ میں اپنا وطن گھر بار سب کچھ چھوڑ کر گئے تھے مدینہ میں بے خانماں تھے۔ ٹھہرنے کا ٹھکانا تو کسی کا بھی نہ تھا۔ بہت سے تہیدست وبے سازوسامان بھی تھے اہل مدینہ جو بعد میں انصار کہلائے انہوں نے ان راہ حق کے پردیسیوں کی مہمانداری جس فیاضی اور عالی حوصلگی کے ساتھ کی ہے وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے آں حضرت ﷺ نے مدینہ پہونچکر مہاجرین اور انصار دونوں میں باہمی مواخات کا رشتہ قائم کیا۔ یعنی ایک کو دوسرے کا بھائی بنادیا یہ بھائی سگے بھائیوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ انصار نے یہاں تک کیا کہ ایک انصاری اپنے

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ [2] بخاری ص ۵۵۹ ج ۱ [3] بخاری ج ۱ ص ۵۵۷

بھائی مہاجر کو اپنے گھر لے آگئے اور اپنی تمام جائداد واملاک کا جائزہ دینے کے بعد بولے "اب میری ہر چیز آدھی میری ہے اور آدھی تمہاری۔ یہاں تک کہ دو بیویاں تھیں تو بولے کہ ایک کو طلاق دیتا ہوں تم اس سے عدت کے بعد نکاح کرلینا۔ مہاجر بھائی نے جواب دیا "آپ کی جائداد واملاک اور بیویاں آپ کو مبارک! مجھ کو ان میں سے کچھ درکار نہیں غرض کہ اس عقد مواخات کے ماتحت مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوگیا۔

عقد مواخات قائم کرتے وقت آنحضرت ﷺ طرفین کی حیثیت کا لحاظ رکھتے تھے چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کو عتبان بن مالک جو قبیلہ بنو سالم کے سردار تھے۔ ان کا بھائی قرار دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضرت خارجہ بن زید انصاری جو مدینہ سے قریب ایک مقام سنح میں قیام رکھتے تھے اور تجارت پیشہ تھے ان کا بھائی بنایا [1]

تعمیر مسجد
مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد ضروری تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جاتی تاکہ سب مسلمان ایک ساتھ جمع ہوکر عبادت خداوندی بجالاتے اور جہاں اور دوسرے اہم دینی اور اجتماعی امور کا بھی فیصلہ ہوتا۔ اس مقصد کیلئے آنحضرت ﷺ نے زمین کا جو ٹکڑا منتخب کیا وہ سہل اور سہیل نام کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا یہ بچے سعد بن زرارہ کی سرپرستی میں تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس قطعۂ زمین کا معاملہ کیا تو دونوں نے کہا "یہ آپ کی نذر ہے۔ اے اللہ کے رسول ﷺ لیکن آپ نے نذر قبول کرنے سے انکار فرمایا اور آخر قیمۃً [2] اس کو خرید کرلیا [3] قطعۂ زمین کی یہ قیمت جو بعض روایات کے مطابق دس دینار تھی۔ اس کے ادا کرنے کی سعادت بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہوئی۔ آپ نے صرف قیمت ہی ادا نہیں کی بلکہ جب سرور دو عالم خود مزدوروں کی طرح تعمیر مسجد کے کام میں شریک تھے۔ اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ رفیق غار ثور اس میں آپ کا شریک نہ ہوتا [4]

حضرت عائشہؓ کی رخصتی
پہلے گذر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نکاح حضرت عائشہؓ کے ساتھ مکہ میں ہوچکا تھا۔ اب مدینہ پہونچنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت ﷺ سے خود رخصتی کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "میرے پاس مہر ادا کرنے کو نہیں ہے" حضرت ابوبکرؓ نے

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۲۲۱ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [3] فتح الباری ج ۷ ص ۱۹۳

مہر کی رقم خدمت اقدس میں حاضر کر دی [1] ادھر حضرت ام رومان نے حضرت عائشہ کو نہلا دھلا اور نہایت سادہ طریقہ پر دلہن بنا کر حرم نبوی میں داخل کر دیا۔ اس وقت حضرت عائشہ کی عمر خود ان کے بیان کے مطابق نو سال تھی [2]

---

[1] مستدرک حاکم و استیعاب بحوالہ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۱ [2] بخاری باب تزویج عائشہ

غزوات میں شرکت اور دوسرے کارنامے قبل از خلافت

مکی زندگی مصائب و آلام کا مرقع تھی حلقہ بگوشانِ اسلام عبادتِ خداوندی کھلے بندوں کیا بجا لا سکتے انہیں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ قسم قسم کے بھیانک اور درد انگیز مظالم کیئے جاتے تھے لیکن بہرحال آنحضرت صلعم کو انہیں مصائب و آلام کی بھٹی سے گذار کر کندن بنانا تھا۔ اور ان سے تزکیۂ نفس۔ تطہیر قلب اور مسلمانوں کو ایمان میں مستحکم اور عمل میں پختہ کار بنانے کا کام لینا تھا۔ اس بنا پر اس دور میں صرف کامل انقیاد و اطاعت۔ صبر و تسلیم اور ضبطِ نفس جیسے اوصاف و کمالات درکار تھے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جتنی مکی سورتیں ہیں ان میں جگہ جگہ استعانت بالصبر والصلوٰۃ اور مصائب کے وقت رجوع الی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے

لیکن اب مدینہ طیبہ پہونچکر وہ وقت آیا جب اسلام کی پہلی اسٹیٹ قائم ہو رہی تھی اس اسٹیٹ کے ماتحت مسلمانوں کو دشمنوں سے جنگ کرنی تھی اپنی منتشر طاقتوں کی شیرازہ بندی کرنی تھی۔ غیر قوموں کے ساتھ معاہدے کرنے تھے اور خود اپنی اجتماعی اور قومی تنظیم کا ایک دستور مرتب کرنا تھا اور چونکہ حضرت ابوبکر تمام معاملات میں آنحضرت صلعم کے دستِ راست تھے اس بنا پر اب موقع تھا کہ حضرت ابوبکر کے دوسرے اوصاف و کمالات یعنی اصابت رائے حسن تدبیر دور بینی اور دانش وری بھی بروئے کار آئیں۔

چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد سے آنحضرت صلعم کی وفات تک جتنے غزوات ہوئے مہمیں پیش آئیں اور اہم معاملات و مسائل سامنے آئے ان سب میں حضرت ابوبکر صدیق آنحضرت صلعم کے ساتھ برابر شریک رہے۔ گو حیثیتیں مختلف تھیں۔ مثلاً میدانِ رزم میں وہ ایک

نہایت دلیر سپاہی نظر آتے ہیں اور مشورہ کے وقت ایک اعلیٰ درجہ کے مشیر اور وزیر باتدبیر ناموافق حالات میں پتھر کی چٹان کی طرح مضبوط اور سازگار حالات میں نہایت حلیم و باوقار۔ یہی دوگونہ اوصاف و کمالات ہیں جن کے اجتماع کے باعث مسٹر ڈبلیو منٹگمری واٹ کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکر جہاں ایک طرف اونچے درجہ کے فرماں بردار و مطیع تھے ساتھ ہی ایک بلند پایہ لیڈر اور قائد بھی [1]

غزوہ بدر آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کی ہجرت نے قریش کی آتش غیظ و غضب کو اور مشتعل کر دیا تھا وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ مدینہ طیبہ میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو رہی ہے جو سارے عرب پر مستولی ہو جائیگی۔ اور ان کا اقتدار ختم کر دیگی۔ اس بنا پر اس طاقت کو ختم کرنے کے لیے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے اس کے کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مدینہ کے ان لوگوں کو جو ان کے زیر اثر تھے برابر اکساتے رہتے تھے کہ آنحضرت صلعم کو وہاں سے نکال دیں۔ مدینہ کے قرب و جوار میں جو آبادیاں تھیں وہاں اپنی ٹولیاں بھیجتے رہتے تھے کہ اسلام کی دعوت سے جو لوگ متاثر ہو رہے ہیں وہ پریشان ہوں۔ آنحضرت صلعم بھی ان کے توڑ میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بھیجتے رہتے تھے۔ جن کو ارباب سیر کی اصطلاح میں سرایا کہا جاتا ہے۔

لیکن قریش کو جلد ہی یقین ہو گیا کہ اس طرح کی چھچھوری حرکتوں سے کام نہیں چلے گا اس بنا پر اب انہوں نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ طیبہ پر حملے کرنے کا منصوبہ باندھا۔ لیکن اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے سب سے مقدم ضرورت سرمایہ کے فراہمی کی تھی۔ اسلیئے انہوں نے ترکیب یہ کی کہ ابوسفیان (حضرت امیر معاویہ کے والد جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان تجارتی قافلہ شام بھیجا تاکہ اس سے جو آمدنی ہو اس سے دین حق کے مٹانے کا کام کیا جائے۔ ادھر سرمایہ کے فراہمی کی یہ تدبیر کی گئی تھی اور ادھر مکہ میں جوانان و نبرد آزمایان قریش مدینہ پر حملہ کرنے کے جوش میں فوجی تیاریاں کر رہے تھے۔

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

ابوسفیان شام میں اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد جب مکہ کیلیئے واپس روانہ ہوا ہے تو اس تزک و احتشام کے ساتھ کہ حسب روایات اس کے جلو میں ایک ہزار اونٹ تھے جن پر پچاس ہزار دینار لدے ہوئے تھے اور قافلہ چالیس یا ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ عظیم منافع تجارت درحقیقت گولہ بارود کا ایک میگزین تھا جو صرف اس غرض کے لئے فراہم کیا گیا تھا کہ اس سے اسلام اور اس کے جاں نثاروں کو برباد و ہلاک کیا جائیگا اس بنا پر اس وقت آنحضرت صلعم کیلئے صرف جائز ہی نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے نہایت ضروری تھا کہ اس وقت سامان کو مکہ تک نہ پہونچنے دیا جائے [1]

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

اِنَّمَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُرِیْدُ عِیْرَ قُرَیْشٍ (باب قصہ غزوۂ بدر)	آنحضرت صلعم قریش کے قافلہ کے ارادے سے نکلے۔

فوجی قریش کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ۔۔۔۔ساز و سامان کیساتھ لیس تو بیٹھے ہی تھے فوراً مکہ سے روانہ ہو گئے۔ ادھر آنحضرت صلعم اپنے تین سو تیرہ جانبازوں کے ساتھ ۱۲ رمضان سنہ ۲ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۱۷ رمضان کو مقام بدر کے قریب پہونچکر خیمہ زن ہو گئے۔

[1] سخت تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ اتنی سادہ حقیقت مولانا شبلی کی سمجھ میں نہیں آئی اور انھوں نے سیرت النبی جلد اول میں غزوۂ بدر پر ایک نہایت مبسوط و مفصل گفتگو کر کے تمام محدثین و ارباب سیر کے خلاف اس واقعہ کی تغلیط کی ہے، آج کل کی مہذب دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟ فریق محارب کے لیئے رسل و رسائل اور رسد کے ذرائع بند کر دیئے جاتے ہیں، اقتصادی ناکہ بندی کی جاتی ہے۔ تجارتی منڈیوں پر بمباری کر کے انہیں برباد کیا جاتا ہے۔ مال سے لدے ہوئے جہاز جہاں کہیں مل جاتے ہیں ان کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ قریش نے جب ہجرت کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری پوری قوت اور بڑے زور و شور سے کر رہے تھے اور یہ قافلہ تجارت اسی کا مقدمۃ الجیش تھا تو ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مہم بین الاقوامی قانون جنگ کے رو سے بالکل درست اور حق بجانب تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ آپ کی سیاسی بیدار مغزی اور دوراندیشی کی روشن دلیل ہے۔

یوں تو قریش اور دوسرے قبائل کے ساتھ اس سے پہلے بھی متعدد جھڑپیں ہو چکی تھیں لیکن حق و باطل اور اسلام و کفر کا یہ سب سے پہلا معرکہ تھا جس کے فیصلہ پر تاریخ عالم میں ایک نئے انقلاب کا دار و مدار تھا۔ آنحضرتؐ نے ایک طرف قریش کی تعداد ان کے ساز و سامان اور ان کی جنگی تیاریوں کا جائزہ لیا اور دوسری طرف اسلام کے ان سرفروش مجاہدوں کو دیکھا جن کے گھوڑوں کو دانہ بھی نصیب نہیں تھا اور جو تعداد کے لحاظ سے دشمن سے ⅓ حصہ تھے تو بے ساختہ جی بھر آیا اور بارگاہِ ایزدی میں قبلہ رُخ ہو کر ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعا کی۔ کہ

"اے خدا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر۔ اے خدا اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو تیرا پوچھنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"

آپ ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کرتے جاتے تھے اور فرطِ بیقراری میں چادر بار بار شانۂ مبارک سے گر گر پڑتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے چادر اٹھائی آپ کے کندھے پر ڈال دی اور اسکے بعد سرکار دوجہاں کی پشت سے لپٹ کر[1] کہنے لگے "حضور اب بس کیجئے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا" فوراً وحی آئی اور اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَكُمۡ اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُرۡدِفِيۡنَ۔ کا مژدۂ جاں فزا سنا گئی۔ بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے یہ کہنے کے بعد ہی آں حضرتؐ نے سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَيُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ کفار کی فوج جلد شکست کھائیگی اور یہ اُلٹے پاؤں واپس جائیں گے فرمایا اور باہر تشریف لے آئے موقع کی نزاکت دیکھ کر صحابۂ کرام نے آنحضرتؐ کے لیئے ایک سائبان بنا دیا تھا کہ آپ وہاں تشریف رکھیں اور مسلمانوں کو وہاں سے ہدایات دیتے رہیں اس سائبان میں رفاقت اور آنحضرتؐ کی نگرانی اور حفاظت کا شرف بھی حضرت ابوبکرؓ کو ہی حاصل ہوا۔

[1] میں نے یہ واقعہ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر سے لیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اولاً کتاب الجہاد میں اور پھر باب غزوۂ بدر میں اس کو نقل کیا ہے لیکن اس میں فاخذ ابوبکر بیدہٖ "یعنی ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کا ہاتھ پکڑ لیا۔" کے الفاظ ہیں۔

مسند بزار میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اس دن حضرت ابوبکرؓ تلوار نیام سے باہر نکالے آنحضرتؐ کا پہرہ دے رہے تھے جو کوئی حضورؐ کی طرف بڑھتا حضرت ابوبکرؓ اس پر پل پڑتے تھے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

فھو اشجع الناس۔ تو ابوبکرؓ سب سے زیادہ بہادر انسان ہیں۔

کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ اس اعتبار سے بڑا صبر طلب اور درد انگیز تھا کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں تو اچانک نظر آیا کہ باپ بیٹے کے ساتھ نبرد آزما تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اس وجہ سے مکہ میں ہی رہ گئے تھے۔ بدر میں قریش کی فوج کے ایک سپاہی وہ بھی تھے انہوں نے میدانِ جنگ میں بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلہ میں کون آتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ خود تلوار کھینچ کر مقابلہ کو نکلے۔ لیکن رحمتِ عالمؐ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ فوراً حضرت ابوبکرؓ کو روکا اور فرمایا۔

متعنی بنفسک تم مجھ کو اپنی ذات سے متمتع ہونے دو[1]

ایک اور روایت میں لا تفجعنا بنفسک کے الفاظ ہیں ان کا مطلب بھی یہی ہے[2] جنگ ختم ہوئی تو مالِ غنیمت کے علاوہ ستر قیدی ہاتھ آئے جن میں حضرت عباسؓ اور آنحضرتؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابوالعاص بھی تھے آنحضرتؐ نے مشورہ کیا اور ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ بولے کہ قیدیوں کو

[1] اسد الغابہ قسم اول جزء ثالث ص ۲۱۲ [2] اسد الغابہ جزء ثالث ص ۲۰۵ ذرا نطق مبارک کی بلاغت پر غور کرو۔ آنحضرتؐ کا اصل مقصد حضرت ابوبکرؓ کو بیٹے کے مقابلہ میں جانے سے روکنا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کے جوش حمایت میں جا رہے تھے۔ اس لیئے ممکن تھا کہ اگر صرف سادہ طریقہ پر حضور پر نور انکو اس سے روکتے اور یہ فرماتے کہ نہیں تم نہیں ہو تو اپنا منشا پورا ہوتا مگر وہ بددلی محسوس کرتے اسلیئے آپ نے ایک ایسی بات کا ذکر کیا جو حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک خود بہت اہم تھی۔ یعنی حضور کے پاس ہی رہکر آپکی حفاظت کرنا اسلیئے آپ نے متعنی بنفسک فرمایا جس کے لفظی معنی ہیں "تم اپنی ذات سے مجھ کو فائدہ پہونچاتے رہو"

قتل کر دینا چاہیئے لیکن حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے فرمایا کہ "یہ سب اپنے ہی عزیز و قریب ہیں ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ ہونا چاہیئے اس بنا پر زرِ فدیہ لیکر ان کو رہا کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔[1]

اس موقعہ پر یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ عام تاریخوں میں اور بعض روایات میں بھی مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی رائے کے مطابق آنحضرت ﷺ کا اسیرانِ بدر کو زرِ فدیہ لے کر آزاد کر دینا اور انہیں قتل نہ کرنا بارگاہِ ایزدی میں پسندیدہ نہیں ہوا اور اس پر یہ آیت بہ طور عتاب نازل ہوئی۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا	اگر خدا کا لکھا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو
أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال)	کچھ تم نے لیا اس پر تم کو بڑا عذاب ہوتا"

اس میں شک نہیں کہ یہ آیت عتاب الٰہی پر دلالت کرتی ہے لیکن عتاب کا اصل سبب قیدیوں کو قتل نہ کرنا اور زرِ فدیہ لیکر ان کو رہا کر دینا نہیں بلکہ مالِ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو جانا ہے۔ درانحالیکہ ابتک مالِ غنیمت سے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ چنانچہ امام مسلم نے اس واقعہ سے متعلق حضرت عمر فاروق کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ صاف الفاظ ہیں۔

فانزل اللّٰه عز وجل مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ	پھر جب اللہ تعالیٰ نے آیت ما کان النبی ان یکون
لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ الیٰ قولہ	لہٗ اسریٰ حتیٰ یثخن فی الارض سے کر فکلوا
فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا فاحل اللّٰہ	مما غنمتم حلالا طیبا تک نازل کی تو اللہ تعالیٰ نے
الغنیمۃ لھم (باب الامداد بالملائکۃ فی بدر)	مالِ غنیمت ان لوگوں کے لیے حلال کر دیا۔

غزوۂ احد ۳ھ بدر کی شکست نے قریش کو اور برافروختہ کر دیا۔ اور اب انہوں نے اس شکست کا بدلہ لینے کی تیاریاں بہت بڑے پیمانہ پر شروع کیں۔ شاعروں نے اپنی آتش بیانی سے آس پاس کے تمام قبیلوں میں آگ لگا دی اور ادھر عورتوں

[1] صحیح مسلم باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر و اباحۃ الغنائم [2] مدینہ منورہ کے شمالی جانب تقریباً تین میل (ایک فرسخ) کی مسافت پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔

نے مقتولین بدر کا نوحہ کر کر کے قریش کے ایک ایک نوجوان کو جوشِ انتقام سے اسطرح بھرپور کر دیا کہ ہر شخص کی زبان پر الثار الثار تھا۔ ابوسفیان کی سرکردگی میں جو کاروان تجارت شام سے واپس آیا تھا اس کا عظیم منافع اگرچہ تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن بہ طور امانت محفوظ تھا۔ عورتوں کی ایک بڑی جمعیت کا ساتھ ہونا اس کی دلیل تھا کہ اس مرتبہ قریش یہ طے کر کے چلے تھے کہ یا وہ اپنے مقتولین بدر کا انتقام لیں گے اور یا وہیں میدان جنگ میں لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں گے۔ حضرت عباس جو اگرچہ اسلام لے آئے تھے لیکن جاسوسی کے خیال میں مکہ ہی واپس آ گئے تھے انہوں نے ایک تیز رو قاصد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو قریش کی ان تیاریوں کی اطلاع کر دی آپ نے اس خبر کی تصدیق اور مفصل حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے انس اور مونس دو آدمیوں کو بھیجا تو انہوں نے خبر دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے اس قدر قریب آگیا ہے کہ انکے گھوڑوں نے عریضِ چراگاہ کو صاف کر دیا۔ قریش جبلِ احد پر خیمہ ڈالے پڑے تھے۔ آنحضرت ﷺ سات سو جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور احد کی پشت پر پہنچ کر صفیں آراستہ کیں۔ جب عام جنگ شروع ہوئی تو حضرت حمزہ حضرت علی اور حضرت ابو دجانہ اس بے جگری سے لڑے کر دشمن کی فوج میں گھس کر انکی صفیں الٹ دیں۔ قریش کے علمبردار ایک ایک بڑھتے تھے اور سرمستانِ بادۂ توحید کی ضرب کاری سے خاک کا ڈھیر ہو جاتے تھے۔ آخر فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان یہ دیکھ کر مال غنیمت کے جمع کرنے میں لگ گئے قریش کا ایک دستہ جو کوہِ احد پر تھا اس نے میدان خالی دیکھ کر عقب سے اس زور کا حملہ کیا کہ اب جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ یہ وقت اسلام کیلئے بے حد نازک تھا اسلامی فوج کے بڑے بڑے نبرد آزماؤں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ عام افراتفری میں خود مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں پر پڑ رہی تھیں دشمنوں نے خبر اڑا دی کہ سرورِ عالم ﷺ شہید ہو گئے۔ یہ سن کر حضرت عمر جیسے شیر بیشۂ شجاعت کا دل چھوٹ گیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ میدانِ جنگ کے ایک گوشہ میں اپنے چند جاں بازوں کے ساتھ کھڑے تھے جن میں ایک حضرت ابوبکر بھی تھے۔ قریش

کا دستہ تیر برسا رہا تھا۔ آنحضرت صلعم گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تو حضرت ابو طلحہ فرماتے "آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ گردن نہ اٹھائیں۔ دشمن تیر برسا رہے ہیں۔ میرا سینہ ان کا نشانہ بننے کیلئے حاضر ہے"[1] اسی حالت میں آپ مجروح ہوگئے، تو آپ کے جانثار پہاڑ پر لے آئے یہاں ابو سفیان بھی پہنچ گیا اور اُس نے پکار کر پوچھا "لوگو! کیا تم میں محمد صلعم ہیں؟ کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے پھر دریافت کیا ابو بکر ہیں؟ اُس کا بھی جواب نہ ملا تو اس نے حضرت عمر کا نام لیا[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قریش بھی آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابو بکر کو ہی مسلمانوں کا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔

مسلمانوں کو جب معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلعم زندہ ہیں۔ تو ان کا حوصلہ بندھا اور انہوں نے اپنی منتشر طاقتوں کو سمیٹ کر پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی کہ بہادران قریش کے "چھکے چھڑا دئیے" اور وہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ آں حضرت صلعم نے دریافت کیا ان کا تعاقب کون کرے گا"، ستر صحابہ نے اپنے نام پیش کئے۔ امام بخاری نے حضرت ابو بکر اور حضرت زبیر کے ناموں کی تصریح کی ہے[2]

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آنحضرت صلعم نے جو جنگیں کی ہیں ارباب سیر کی اصطلاح میں وہ دو قسم کی ہیں ایک کو غزوہ کہتے ہیں اور دوسری کا نام سریہ ہے عام طور پر ان میں فرق یہ ہے کہ غزوہ اسے کہتے ہیں جس میں آنحضرت صلعم نے بذاتِ خود شرکت فرمائی ہو اور سریہ جس کے معنی ٹولی یا گروہ کے ہیں، اسے کہتے ہیں، جس میں آپ بنفس نفیس شریک نہ ہوئے ہوں۔

حضرت ابو بکر چونکہ آنحضرت صلعم کے دست راست اور مشیر خاص تھے اس بنا پر آپ عموماً سرایا کی مہم پر نہیں بھیجے جاتے تھے اور مدینہ میں آنحضرت صلعم کے پاس رہ کر ہی ان کا بندوبست اور انتظام کرتے تھے چنانچہ حضرت حذیفہ

[1] صحیح بخاری باب غزوہ احد [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۸۴

سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ اطراف و اکناف میں لوگوں کے فرائض و سنن کی تعلیم دینے کی غرض سے اپنے آدمی بھیجوں جیسا کہ حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں کو بھیجا کرتے تھے۔ کسی نے عرض کیا" آپ ابو بکر اور عمر کو کیوں نہیں بھیجتے۔ ارشاد ہوا" میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا یہ دین کے کان اور آنکھیں ہیں[1]

غزوہ خندق | یہود مدینہ کا ایک قافلہ بنو نضیر جو مدینہ سے نکل کر خیبر آگیا تھا اس کے رؤسا نے قریش۔ بنو غطفان۔ بنو سلیم اور بنو اشد وغیرہ قبائل میں گھوم پھر کر اسلام کے خلاف ایک عظیم جنگ پر ان کو آمادہ کر دیا اور دس ہزار کا ایک لشکر جرار مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ آنحضرت صلعم نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکل کر خندق کھودی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ ماہ ذوالقعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ میں بھی ایک دستہ فوج کی کمان حضرت ابو بکر کے سپرد تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں کہ جس مقام پر حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے دستہ کو لے کر پڑاؤ ڈالا تھا وہاں مسجد صدیق کے نام سے اب تک ایک مسجد ہے جو اسی واقعہ کی یادگار ہے۔[2]

غزوہ بنی مصطلق | اسی سنہ میں غزوہ بنی مصطلق جس کو غزوہ المریسیع[3] بھی کہتے ہیں پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حارث بن ضرار جو بنو مصطلق کا سردار تھا۔ اس نے اپنے قبیلہ میں گھوم پھر کر آنحضرت صلعم کے ساتھ جنگ کرنے کا بڑا شدید جذبہ پیدا کر دیا تھا اور اپنے ساتھ جو عرب اس کو مل سکتے تھے ان کو بھی ملا لیا تھا آنحضرت صلعم کو ان حالات کا علم ہوا تو بریدۃ بن الحصیب الاسلمی کو تفتیش کے لیئے روانہ فرمایا۔ بریدہ خود حارث سے ملے اور گفتگو کی اور حارث جنگ کی جو تیاریاں کر رہا تھا اس کی اطلاع دی۔ آنحضرت صلعم یہ سن کر مسلمانوں کا ایک لشکر اپنے ساتھ

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۷۴، [2] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۳۰ [3] مریسیع مسعودی اور طبری کے بیان کے مطابق کسی تالاب یا کنوئیں کا نام تھا۔ اور چونکہ یہ غزوہ یہاں ہوا تھا اس لیئے اسکو غزوۃ المریسیع بھی کہتے ہیں۔

لے کر روانہ ہوئے تو حضرت ابوبکر اس غزوہ میں بھی آپ کے ہمرکاب تھے اور مہاجرین کا علَم آپ کے ہی ہاتھ میں تھا مقام مریسیع پہونچکر جنگ ہوئی کچھ دیر تک دونوں جانب سے تیر اندازی ہوتی رہی آخر آنحضرت صلعم کے حکم سے مسلمانوں نے اپنی تمام طاقت یکجا جمع کر کے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے [1]

یہی وہ غزوہ ہے جس سے واپسی پر وہ واقعہ پیش آیا جو حدیث افک کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ اس واقعہ کی یہ خصوصیت لایق ذکر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ (الآیۃ) تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے بہتان طرازی کی فرماکر ان لوگوں کی پردہ دری کی ہے جو خود یا بالواسطہ اس واقعہ میں ملوث ہو گئے تھے اور جیسا کہ خود اس آیت میں ہے یہ شر غالباً اسی لیئے پیدا کیا گیا تھا کہ اس بہانہ سے کتاب الٰہی کو جگر گوشۂ حضرت ابوبکر صدیق کی عصمت و عفت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا موقع میسر آجائے وکفیٰ بہ فخراً۔

اس کے علاوہ حدیث افک میں جو لوگ ملوث تھے اُن میں ایک شخص مسطح بن اثاثہ بھی تھا حضرت ابوبکر اس شخص کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب یہ افک کا واقعہ پیش آیا تو آپنے اس کی امداد سے دست کشی اختیار کر لی۔ پروردگار عالم کو صدیق اکبر کی ادا پسند نہیں آئی اور وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَۃِ فرماکر انکو تنبیہ کی گئی، چنانچہ حضرت ابوبکر کو بڑی ندامت ہوئی اور آپنے مسطح کی مالی سرپرستی پھر شروع کر دی۔

نزول آیت تیمم کے متعلق ایک اہم بحث اس موقع پر تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ حدیث افک میں جس طرح حضرت عائشہ کے ہار کے گم ہونے اور اسکی تلاش کا تذکرہ ہے ٹھیک اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی ہے جسکو امام بخاری نے اولاً کتاب التیمم میں اور پھر باب مناقب

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۲

المہاجرین و فضائلہم میں روایت کیا ہے یہ واقعہ خود حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں گئے ہوئے تھے جب ہم مقام بیداء (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے) یا ذات الجیش (یہ بھی ایک مقام کا نام ہے) میں پہونچے تو میرا ہار گم ہو گیا۔ اس کو تلاش کرنے کے لیئے رسول اللہ صلعم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ اور آپ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی وہاں ٹھہر گئے اس جگہ پانی کہیں نہیں تھا اور نہ ہمارے قافلے میں کسی کے پاس تھا اس بنا پر ابوبکر آئے اور اس وقت رسول اللہ صلعم اپنا سر میری ران میں رکھے ہوئے سو رہے تھے ابوبکر نے آتے ہی مجھ سے کہا کہ تو نے رسول اللہ صلعم کو اور لوگوں کو ایسے مقام پر رکوا دیا ہے جہاں پانی نہیں ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں "ابوبکر غصہ میں بھرے ہوئے تھے اسلیئے جو اُن کی زبان پر آیا مجھے کہتے رہے اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے میری کمر پر کچوکے بھی مارتے رہے لیکن میں نے رسول اللہ کی نیند کے اُچٹ جانے کے ڈر سے ذرا حرکت نہیں کی اور چپ چاپ بیٹھی رہی آخر صبح کے وقت جب رسول اللہ صلعم بیدار ہوئے اور پانی نہیں ملا تو تیمم کی آیت نازل ہوئی اور سب لوگوں نے تیمم کیا اس پر اُسید بن الحضیر نے کہا "اے آل ابی بکر یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اب ہم نے اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار ہوئی تھی تو دیکھا کہ ہار اسکے ہی نیچے پڑا ہوا تھا [1]

حافظ ابن حجر نے ابن سعد۔ ابن حبان اور ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہیں اور تیمم کا حکم غزوۂ بنی مصطلق میں نازل ہوا تھا۔ یہ حال تو محدثین کا ہے [2] انکے علاوہ یاقوت حموی نے بھی ذات الجیش کے جغرافیہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں غزوۂ بنی مصطلق سے واپس ہوتے ہوئے آنحضرت صلعم نے صحابہ کے ساتھ حضرت عائشہ کے گم شدہ ہار کی تلاش میں قیام فرمایا تھا اور یہیں آیت تیمم نازل ہوئی تھی [3]

[1] صحیح البخاری ج ۱ ص ۴۸ و ۵۱۸ [2] فتح الباری ج ۱ ص ۳۶۵ کتاب التیمم [3] معجم البلدان ج ۳ ص ۵۱۵

لیکن اگر دونوں واقعوں کو ایک مان لیا جائے تو بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار تلاش کرنے کیلئے حضرت عائشہؓ تن تنہا رہ گئی تھیں اور پورا قافلہ بہت آگے چلا گیا تھا چنانچہ اسی وجہ سے بدزبانوں کو تہمت طرازی کا بہانہ ملا۔ اسکے برخلاف آیت تیمم والے واقعہ کی روئداد سے ثابت ہوتا ہے کہ ہار کی تلاش کیلئے حضرت عائشہؓ تن تنہا نہیں رہی تھیں بلکہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابہ بھی اسی مقام پر فروکش ہو گئے تھے اور اسکے علاوہ غزوہ بنی مصطلق کے واقعہ میں کسی بے آب مقام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور تیمم والی آیت میں ایسے مقام کا تذکرہ موجود ہے جہاں پانی دور دور تک نہیں تھا۔ پس اگر دونوں واقعے ایک ہی تھے تو پھر روایتوں کے اس اختلاف کو رفع کرنے کی صورت کیا ہوگی۔ اسکے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ طبری کے ہاں حدیث افک کا ذکر مفصل ملتا ہے لیکن اسکے ضمن میں آیت تیمم کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔ پھر صحیحین کی روایات سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ تیمم کا حکم غزوۃ المریسیع میں نازل ہوا۔

اس سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دراصل حضرت عائشہ کے ہار گم ہونیکا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے اور مذکورۂ بالا دونوں واقعات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں جو مختلف اوقات میں پیش آئے۔ اسکی تائید آیت تیمم والے واقعہ میں حضرت اُسید بن الحضیرؓ کے اس فقرہ سے بھی ہوتی ہے کہ "اے آل ابی بکر یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے کہ تمہاری شان میں یا تمہاری وجہ سے قرآن کا کوئی حکم نازل ہوا" علاوہ ازیں حافظ ابن قیم نے معجم طبرانی کے حوالہ سے خود عائشہ کی جو ایک روایت نقل کی ہے اس سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ روایت یہ ہے۔

عن عائشۃ قالت ولما کان من امر عقدی ما کان قال اھل الافک ما قالوا فخرجتُ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ اخریٰ فسقط ایضاً

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ پہلے میرے ہار کا جو معاملہ ہوا اور اس پر اہل افک نے جو کچھ کہا وہ تو کہا ہی تھا ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ میں ایک اور غزوہ میں آنحضرت ﷺ کے

عقدی حتی حبس التماسُہ الناس ولقیتُ من ابی بکر ما شاء اللہ وقال یا بنیۃ فی کل سفر تکونین عناءً وبلاءً ولیس مع الناس ماءٌ فانزل اللہ الرخصۃ فی التیمم [1]

ہمراہ گئی اور اس سفر میں بھی میرا ہار گر پڑا جس کو تلاش کرنے کی وجہ سے لوگوں کو رکنا پڑا۔ اور اس وجہ سے ابوبکر کے جی میں کچھ آیا میں اس سے دوچار ہوئی اور ابوبکر نے کہا۔

اس روایت میں حضرت ابوبکر کا بگڑ کر حضرت عائشہؓ سے یہ فرمانا کہ بیٹی! تم ہر سفر میں مصیبت بن جاتی ہو۔ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ یہ سفر جس میں آیت تیمم کا نزول ہوا غزوۂ بنی مصطلق جس میں واقعہ افک پیش آیا اسکے علاوہ ہے چنانچہ علامہ ابن قیم معجم طبرانی کی یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وھذا یدل علی انّ قصۃ العقد التی نزل التیمم لاجلھا بعد ھذہ الغزوۃ وھو الظاھر ولکن فیھا کانت قصۃ الافک بسبب فقد العقد والتماسہ فالتبس علی بعضھم احدی القصتین بالاخری [2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار کا واقعہ جس کی وجہ سے تیمم کا حکم نازل ہوا اس غزوہ (بنی مصطلق) کے بعد پیش آیا ہے اور یہی ظاہر ہے لیکن چونکہ اس غزوہ میں ہار کی گم شدگی اور اسکی تلاش کی وجہ سے افک کا واقعہ پیش آیا تھا اسلئے بعض کے نزدیک دونوں واقعے خلط ملط ہو گئے

حافظ ابن حجر۔ ابن سعد۔ ابن حبان اور ابن عبد البر کا مذکورۂ بالا قول نقل کرنیکے بعد لکھتے ہیں کہ "ہمارے بعض شیوخ نے اس کو مستبعد جانا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہوں کیوں کہ مریسیع قدید اور ساحل کے درمیان مکہ کے نواح میں ہے اور یہ واقعہ خیبر کے اطراف میں پیش آیا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ میں بیداء یا ذات الجیش کا ذکر ہے اور یہ دونوں مقامات جیسا کہ امام نووی نے یقین کیساتھ لکھا ہے مدینہ اور خیبر کے درمیان میں واقع ہے۔ [3]"

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۳ [2] ایضاً [3] فتح الباری ج ۱ ص ۳۹۵

پھراس بحث کے آخر میں امام بخاری کے متعلق بھی یہی لکھتے ہیں کہ ان کا رجحان بھی تعدد واقعہ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ ان سب وجوہ کے باوجود حافظ ابن حجر کی اپنی رائے اسکے خلاف ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

وماتقدم من اتحاد القصة فهو اظهر[1] اور قصہ کے ایک ہونیکا جو تذکرہ اوپر ہوا ہے وہ زیادہ ظاہر ہے

صلح حدیبیہ | صلح حدیبیہ کا جو واقعہ ماہ ذی قعدہ سنہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسلام کی تاریخ کا نہایت اہم اور عظیم الشان واقعہ ہے جس پر آگے چل کر بڑے دوررس نتائج مرتب ہوئے، چنانچہ قرآن مجید میں اس کو فتح مبین (اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا) فرمایا گیا ہے اس بنا پر یہ کیونکر ممکن تھا کہ صدیق اکبر اس میں شریک نہ ہوتے۔

اصل میں یہ ہے کہ آنحضرت صلعم چودہ ۱۴۰۰ سو اور بروایت دیگر پندرہ ۱۵۰۰ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہونچکر جو اہل مدینہ کا میقات یعنی احرام باندھنے کی جگہ ہے۔ آپنے احرام باندھا۔ اور ایک خزاعی شخص کو جاسوسی کی غرض سے پہلے سے روانہ کر دیا۔ غدیر الاشطاط جو حدیبیہ کے سامنے ہے[2] آپ وہاں پہنچے ہی تھے کہ جاسوس مل گیا۔ اس نے بتایا کہ قریش آپکو زیارت بیت اللہ نہیں کرنے دیں گے اور انہوں نے آپکے ساتھ جنگ کرنے کی پوری تیاری کرلی ہے۔ آنحضرت صلعم نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! آپ تو بیت اللہ کی زیارت کے لیئے نکلے ہیں آپ نہ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور نہ کسی سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیئے آپ بیت اللہ کا رخ کیجیئے۔ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے ہم کو روکا اور مزاحم ہوا تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔ آنحضرت صلعم نے یہ سن کر فرمایا" تو بسم اللہ چلو "[3]

---

[1] فتح الباری ج ا ص ۳۶۹ [2] مکہ معظمہ سے بیس کیلومیٹر کی مسافت پر ایک کنواں ہے جس کا نام حدیبیہ ہے۔ چونکہ صلح نامہ یہیں لکھا گیا تھا اسیئے اسکو صلح حدیبیہ کہتے ہیں [3] صحیح بخاری ج ۲ باب غزوۃ الحدیبیہ

اب آنحضرت صلعم روانہ ہوئے اور مقام حدیبیہ میں فروکش ہو کر بُدَیل بن ورقاء الخزاعی کی معرفت قریش کو کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں بلکہ مقصد صرف عمرہ کرنا ہے اس لیئے بہتر یہی ہے کہ مصالحت کر لو۔ ورنہ خدا کی قسم جسکے ہاتھ میں میری جان ہے اس وقت تک لڑونگا جب تک کہ میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔

مسلسل جنگوں اور ان میں پیہم شکستوں کے باعث قریش کے دم خم پہلے سے ہی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کچھ حیص بیص کے بعد انہوں نے منظور کر لیا اور مصالحت کی گفتگو کرنے کیلیئے عُروہ بن مسعود کو جو قریش کا تجربہ کار اور نہایت چالاک شخص تھا اپنا نمائندہ بنا کر روانہ کیا۔ آنحضرت صلعم نے عروہ سے بھی وہی فرمایا جو بُدَیل کے ذریعہ پہلے کہلا بھیجا تھا عُروہ بولا" اے محمد (صلعم) اگر آپ نے جنگ کی اور قریش کا خاتمہ کر دیا تو آپ نے کیا اپنے سے پہلے بھی کسی ایسے شخص کا نام سنا ہے جس نے خود اپنی قوم کا قلع قمع کر دیا ہو۔ اگر جنگ کا نتیجہ دوسرا ہو (یعنی آپ کو شکست ہوئی) تو میں آپکے ساتھیوں میں ایسے ملے جلے آدمی دیکھتا ہوں جو آپکو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونگے۔ حضرت ابوبکر بڑے حلیم اور بردبار تھے۔ لیکن عروہ کی زبان سے یہ سن کر برہم ہو گئے اور بولے" بدمعاش! کیا ہم لوگ رسول اللہ صلعم کو چھوڑ کر بھاگ سکتے ہیں"؟ عروہ نے یہ تیور دیکھ کر پوچھا" یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا" ابوبکر!" اب عروہ نے حضرت ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا" قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تمہارا مجھ پر احسان نہ ہوتا جس کا بدلہ میں اب تک نہیں چکا سکا ہوں تو میں تم کو جواب دیتا "[1]

آخر معاہدہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ اور جب عہدنامہ لکھا جانے لگا تو اسکی بعض دفعات جو قریش کی طرف سے پیش کی گئی تھیں مسلمانوں کے لیئے بڑی ہی صبر آزما تھیں چنانچہ فاروق اعظم سے نہ رہا گیا اور انہوں نے آنحضرت صلعم سے شدت جذبات میں ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی جس کا ملال آخر دم تک ان کے دل سے نہیں نکلا۔

---

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب ج ص ۳۷۸

اسی حالت میں وہ حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے اور بولے کہ بھلا قریش سے دب کر صلح کیسے کر سکتے ہیں۔ لیکن صدیق اکبر نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ کرتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔ یقیناً اسی میں بھلائی ہو گی اللہ انکو کبھی ہلاک نہ کرے گا۔ اسکے بعد آیت فتح نازل ہوئی اور حضرت عمر کو بھی تسکین و طمانیت ہو گئی [۱]

غزوۂ خیبر ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے شروع میں غزوۂ خیبر کا اہم معرکہ پیش آیا۔ خیبر عرب میں یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جو متعدد مضبوط قلعوں پر مشتمل تھا۔ ایک قلعہ جسکا نام قموص تھا عرب کے مشہور پہلوان مرحب کے زیر سرکردگی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جب مختلف قلعوں کی فتح کرنے کی غرض سے متعدد دستے متعین کیے۔ اور ہر دستہ کا جدا جدا ایک امیر مقرر کیا تو قلعہ قموص کی سرانجام دہی حضرت ابوبکر کے سپرد ہوئی لیکن اسکو فتح کرنے کی سعادت حضرت شیر خدا حضرت علی مرتضیٰ کے لیئے مقدر ہو چکی تھی اسلیئے اولاً حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر دونوں اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکے [۲]

فتح مکہ ۸ھ میں فتح مکہ کی مہم پیش آئی یہ اسلامی تاریخ کا نہایت عظیم الشان واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کے بعد جب ابوسفیان قریش کے نمائندہ کی حیثیت سے مدینہ منورہ آیا اور تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو اس معاملہ میں اس نے پہلے ابوبکر کو اپنا سفارشی بنانا چاہا لیکن جب انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تو پھر وہ حضرت عمر کے پاس گیا بہرحال معاہدہ کی تجدید نہیں ہو سکی اور آنحضرت ﷺ نے دس ہزار جانثاروں کے ساتھ قریش پر چڑھائی کر کے مکہ فتح کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مکہ میں داخل ہو کر عورتوں کو دیکھا کہ دوپٹوں سے گھوڑوں کے منہ پر طمانچے مار رہی ہیں تو آپ نے حضرت ابوبکر کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور پوچھا "ابوبکر تم کو حسان بن ثابت کے وہ شعر یاد ہیں جنہیں انہوں نے اس منظر کو ذکر کیا ہے"؟ حضرت ابوبکر کو یہ شعر یاد تھے فوراً پڑھ کر سنا دیئے [۳]

---

[۱] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۶ باب صلح الحدیبیہ [۲] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۴ [۳] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۷۔

غزوۂ حنین حنین مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ عرب کا مشہور بازار ذوالمجاز اسی کے پاس لگتا ہے۔

مکہ مکرمہ کی فتح اور قریش کے مغلوب ہونے کے باعث دوسرے قبائل کا بھی زور ٹوٹ گیا اور انہوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہوازن اور ثقیف یہ دو قبیلے جو فنون سپہ گری و جنگ جوئی کے میدان کے شہسوار تھے۔ اسلام کی عداوت میں اور سخت ہو گئے اور انہوں نے بڑے زور سے دوبارہ حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ آنحضرت ﷺ کو اسکی اطلاع ہوئی اور بعد میں اپنا جاسوس بھیجکر آپ نے اسکی تصدیق بھی کر لی تو صحابہ کرام کو اطلاع ہوئی جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ چنانچہ ماہِ شوال ۸ھ میں یعنی فتح مکہ کے فوراً بعد ہی اسلامی فوج نے جس کی تعداد بارہ ہزار تھی حنین کیطرف پیش قدمی کی۔ جنگ شروع ہوئی تو پہلے معرکہ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ لیکن وہ مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہوازن جو نامور قدر انداز تھے انہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے [۱] جس سے اسلامی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور آنحضرت ﷺ چند جانثاروں کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ ان میں سے طبری نے بتصریح جن کا نام لیا ہے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیق کا نام سرفہرست ہے [۲]

آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر انصار اور مہاجرین جو منتشر ہو گئے تھے پھر جمع ہوئے اور اس مرتبہ انہوں نے جم کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کی صفیں الٹ گئیں اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اب مال غنیمت جمع ہونا شروع ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اعلان کیا کہ مَنْ قَتَلَ قَتِيلاً فَلَهٗ سَلَبُهٗ (جو شخص کسی کا قاتل ہوگا۔ مقتول کا سامان (اسلحہ وغیرہ جو جنگ کے وقت اسکے ساتھ ہوں) اسی کو ملے گا۔ حضرت ابو قتادہ نے ایک مشرک کو جو بڑا بہادر اور طاقت ور تھا قتل کیا۔ اب شہادت کی ضرورت ہوئی لیکن کوئی شاہد نہیں ملا تو انہوں نے اصل واقعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ ایک شخص بولا "ہاں"

---

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۷ [۲] طبری ج ۲ ص ۳۴۷

یہ (قتادہ) سچ کہتے ہیں اور جس شخص کو انہوں نے قتل کیا ہے اس کا متروکہ (سلب) میرے پاس ہے۔ اب یہ آپ مجھ کو ہی دیدیجئے۔ حضرت ابوبکر صدیق پاس ہی بیٹھے تھے۔ یہ سن کر بولے "نہیں قسم اللہ کی یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلعم قریش کے ایک بجو کو (یعنی ایسے بزدل آدمی کو جس نے جنگ میں حصہ نہیں لیا ہے) مقتول کا سامان دیدیں اور اللہ کے اس شیر کو نہ دیں جس نے اللہ اور رسول کی خاطر جنگ کی ہے۔ (اور اس شخص کو قتل کیا ہے) آنحضرت صلعم نے فرمایا "ابوبکر سچ کہتے ہیں" چنانچہ وہ سامان ابوقتادہ کو ہی دیدیا گیا[1]

غزوۂ طائف | حنین کی شکست خوردہ فوج طائف میں جو ایک نہایت محفوظ مقام تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آنحضرت صلعم حنین کے اموال غنیمت وغیرہ کو مقام جعرانہ میں چھوڑ کر طائف کیلئے روانہ ہوئے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اہل قلعہ بڑے ساز وسامان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے قلعہ سے اس زور کی تیر باری کی کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور قلعہ سر نہ ہو سکا۔ آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر سے فرمایا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کسی نے مجھ کو ایک لبالب پیالہ نذر کیا ہے لیکن ایک مرغے نے اس میں ٹھونگ ماردی اور جو کچھ پیالہ میں تھا گر پڑا" حضرت ابوبکر نے عرض کیا "اس خواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس محاصرہ میں کامیابی نہیں ہوگی"، ارشاد ہوا "ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں[2] چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

اسی محاصرہ میں حضرت ابوبکر صدیق کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ایسے زخمی ہوئے کہ حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت کے ابتدائی دنوں میں یہی زخم ان کی موت کا سبب ہوا[3]

غزوۂ موتہ | موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاء سے قریب ہے۔ یہاں کی

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ حنین [2] طبری ج ۲ ص ۲۵۵ مطبوعہ مطبعۃ الاستقامۃ بالقاہرہ ۱۳۵۷ھ کتاب میں غلطی سے آنحضرت صلعم کا جواب وانا لا اری ذالک چھپ گیا ہے جس کے معنی "میں ایسا نہیں سمجھتا" ہیں حالانکہ درحقیقت یہ لا اری نہیں بلکہ لاَاُرٰی ہے جس کے معنی تاکید کے ساتھ اثبات کے ہیں چنانچہ سیاق سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اسکو اسیطرح پڑھا ہے۔ دیکھو ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۶
[3] اصابہ تذکرہ عبداللہ ابن ابی بکر الصدیق

تلواریں مشہور ہیں بلقاء کا رئیس ایک عرب شرجیل بن عمرو تھا جو مذہباً عیسائی اور قیصر روم (ہرقل) کے ماتحت تھا۔ اس نے آنحضرت صلعم کے ایک نامہ بر حضرت حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے قصاص لینے کے لیئے ایک فوج روانہ کی جس میں اکابر مہاجرین وانصار شامل تھے لیکن اس لشکر کا امیر آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو نامزد کیا جو آزاد کردہ غلام تھے۔ بعض لوگوں نے اس پر نکتہ چینی کی۔ آنحضرت صلعم نے یہ سُنا تو سخت ناراض ہوئے۔ انہیں اکابر مہاجرین میں حضرت ابوبکر بھی تھے لیکن کیا مجال کہ انکے تیور پر ایک شکن بھی پڑی ہو بلکہ اطاعت وانقیاد کا یہ عالم تھا جیسا کہ اپنے موقع پر بیان ہوگا کہ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپ نے پہلا کام یہی کیا کہ حضرت زید کے صاحبزادہ حضرت اسامہ کو جو غلام زادہ بھی تھے اور کم عمر بھی۔ امیر لشکر بنا کر شام کی مہم پر روانہ کیا۔ اسلام کی مساوات کا یہ بھی ایک عجیب روح پرور مظاہرہ ہے کہ حضرت سلمۃ بن الاکوع نے ایک مرتبہ فرمایا۔ میں نے آنحضرت صلعم کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی ہے علاوہ ان کے نو اور مہموں میں شریک ہوا ہوں۔ ان میں ہمارا امیر لشکر کبھی حضرت ابوبکر ہوتے تھے اور کبھی حضرت اُسامۃ[1] یہ غزوہ موتہ بھی ۸ھ میں ہوا تھا لیکن فتح مکہ حنین اور طائف سے پہلے۔ لیکن چونکہ اس غزوہ کا رشتہ غزوۂ تبوک سے ملتا ہے جو ۹ھ میں ہوا تھا اس بنا پر ہم نے اس کا ذکر مؤخر کر دیا ہے۔

غزوۂ ذات السلاسل | ذات اطلاح شام کا ایک علاقہ ہے جہاں قبیلۂ قضاعۃ کے لوگ رہتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے عمرو بن کعب الغفاری کی زیر سرکردگی پندرہ آدمیوں کا ایک دستہ ان لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لیئے بھیجا تھا انہوں نے سب لوگوں کو قتل کر دیا تھا عمرو بن کعب سلامت بچے۔ اور مدینہ پہونچ سکے آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کی سرزنش کیلیئے ماہِ جمادی الآخر ۸ھ میں تین سو ۳۰۰ صحابہ کی ایک جماعت حضرت عمرو بن العاص کی امارت میں روانہ کی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تین سو آدمی کم ہیں تو آپ نے دو سو ۲۰۰ مہاجرین وانصار کا ایک دستہ

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۲

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ اس دستہ میں حضرت ابوبکر بھی شامل تھے
(طبری ج ۲ ص ۳۱۵)

غزوۂ تبوک غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا یہاں تک کہ آنحضرت صلعم کے محبوب ترین غلام حضرت زید بن حارثہ حضرت جعفر طیار جو حضرت علی مرتضیٰ کے سگے بھائی اور آنحضرت صلعم کے محبوب تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ جو مشہور انصاری تھے یہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب اسلامی لشکر واپس آیا ہے تو مدینہ منورہ پورا ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس بنا پر عرب اور شام کی درمیانی سرحد پر جو عرب قبائل آباد تھے اور جو عیسائی ہونے کے ساتھ قیصر روم کے زیر اثر تھے انکا حوصلہ بڑھا اور قیصر روم نے مزید حوصلہ افزائی کر کے ان میں اور جرأت پیدا کر دی۔

آنحضرت صلعم کو یہ اطلاعات پہونچیں تو آپ نے ایک فوج گراں ترتیب دی۔ اور ماہ رجب سنہ ۹ھ میں اسکو خود لیکر تبوک پہونچے جو مدینہ اور دمشق کے درمیان مدینہ سے چودہ منزل کی مسافت پر ایک مشہور مقام ہے۔

اکابر مہاجرین و انصار کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق بھی اس غزوہ میں شریک تھے لیکن آپ کی شرکت کا نمایاں امر امتیازی وصف یہ تھا کہ چونکہ یہ سال خشک سالی اور عام مالی تنگدستی و زبوں حالی کا تھا۔ جس کی وجہ سے جیسا کہ فتح الباری میں ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری اس لشکر کو جیش العسرۃ اور ابن عقیل اس کو غزوۃ العسرۃ کہتے ہیں۔ اس بنا پر آنحضرت صلعم نے صحابہ کرام سے چندہ کی پُر زور اپیل کی۔ اس کے جواب میں حضرت عثمان غنی نے اس فیاضی سے کام لیا کہ سب سے آگے نکل گئے [۱] لیکن اس کے باوجود جو شرف حضرت ابوبکر صدیق کو حاصل ہوا وہ کسی کو نہ ہو سکا حضرت عمر بن الخطاب کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم

[۱] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۱۰ - ابن عساکر کا بیان ہے کہ اس لشکر جرار کی تیاری اور اس کے ساز و سامان پر جتنا خرچ ہوا تھا حضرت عثمان نے اس کا ایک تہائی خرچ اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی ضرورت لشکر کی ایسی نہیں تھی جو پوری نہ ہو گئی ہو۔ آنحضرت صلعم نے فرط مسرت میں ارشاد فرمایا کہ اب اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان کو نقصان نہیں پہونچے گا۔ ما یضر عثمان ما فعل بعد۔

نے جب چندہ کی اپیل کی تو اس وقت میرے پاس کافی مال تھا میں اس کا نصف لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر میں کسی دن ابوبکر پر بازی لیجا سکتا ہوں تو وہ دن آج کا ہی ہے لیکن جب ابوبکر آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب اٹھا لائے حضور صلعم نے پوچھا "ابوبکر! تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟" انہوں نے عرض کیا "بس! میں نے ان کیلئے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے" حضرت عمر فرماتے ہیں "اب مجھ کو یقین ہو گیا کہ میں حضرت ابوبکر سے کبھی سبقت نہیں لے جا سکتا [۱]

ابن عساکر نے حضرت ابوبکر کے اس چندہ کی مقدار چار ہزار درہم بتائی ہے [۲]

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں کہ اس غزوہ میں حضرت ابوبکر کی شرکت کی مندرجہ ذیل خصوصیات بھی ہیں۔

(۱) اسلامی فوج کا جائزہ لینے اور اس کی امامت کی خدمت آپ کے سپرد تھی۔

(۲) اثنائے سفر میں آنحضرت صلعم نے چند لوگوں کے ساتھ ایک جگہ شب باشی کی اور لشکر سے دور ہو گئے اس حالت میں زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا "اگر لشکر صدیق اور فاروق کی پیروی کریگا تو راہ یاب ہوگا۔

اخرجہ مسلم و قصۂ آں طویلے وارد [۳]

سریۂ بنو فزارہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں عام طور پر سرایا جو بھیجے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ان میں شریک نہیں ہوتے تھے اور آنحضرت صلعم کے پاس ہی مدینہ میں قیام فرماتے تھے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے بعض سرایا جو کسی حیثیت سے اہم ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر کی سرکردگی میں جاتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۶ھ میں بنو فزارہ قبیلہ کی طرف جو سریہ گیا تھا عام روایت تو یہ ہے کہ حضرت [illegible] بن حارثہ کی امارت میں گیا تھا لیکن سلمۃ بن الاکوع سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر اس کے امیر تھے اور کامیاب واپس آئے تھے۔ قیدیوں میں فزارہ قبیلہ کی ایک عورت بھی تھی جو بہت

[۱] جامع ترمذی باب مناقب ابی بکر الصدیق و ابو داؤد و کتاب الزکوٰۃ
[۲] تاریخ ابن عساکر جلد اول ص ۱۱۰ [۳] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۶، ۱۷

خوبصورت تھی حضرت ابوبکر صدیق نے اس کو سلمہ بن الاکوع کو دے دیا تھا لیکن مدینہ پہونچنے پر آنحضرت صلعم نے اس عورت کو سلمہ سے مانگ لیا تھا۔ اور جو مسلمان مکہ میں قیدی تھے انکے فدیہ میں ان کو مکہ مکرمہ بھیجدیا۔ بنو فزارہ نہایت سرکش تھے اس سے پہلے حضرت زید بن حارثہ اور انکے ساتھیوں کے ساتھ نہایت بُرا معاملہ کر چکے تھے۔ یہ سریہ ان کی سرکوبی کرنے کے لیے گیا تھا [1]

اسی سال شعبان کے مہینہ میں بنو کلاب کی سرزنش کیلئے ایک سریہ بھیجا گیا حضرت ابوبکر صدیق اس کے بھی امیر تھے۔ [2]

امارتِ حج مکہ مکرمہ سنہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ اس کے بعد ہی غزوۂ حنین و طائف کی مہم پیش آگئی تھی اس بنا پر اس سال حج خالص اسلامی طریقہ پر ادا نہیں ہو سکا تھا سنہ ۹ھ میں سب سے پہلا موقع تھا کہ کعبۃ اللہ کو کفر و شرک کی ظلمتوں سے بالکل پاک و صاف کر دیا جائے اور ارکانِ حج سنت ابراہیمی کے مطابق ادا ہوں چنانچہ اس سال ذی قعدہ کے آخر یا ذی الحجہ کے اوائل میں آنحضرت صلعم نے تین سو (۳۰۰) مسلمانوں کا ایک کارواں حج کیلئے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر اس کے امیر کارواں یا امیر الحج تھے۔ کارواں کے ساتھ بیس اونٹ اور خود حضرت ابوبکر کے اپنے پانچ اونٹ بھی قربانی کے لیے ساتھ تھے۔

حضرت ابوبکر ابھی مقام عرج تک پہونچے تھے کہ انہیں پیچھے سے آنحضرت صلعم کی ناقہ جدعاء کے بلبلانے کی آواز آئی۔ کان تو اس مرکوب حبیب کی آواز سے آشنا تھے ہی فوراً پہچان گئے۔ مڑ کر دیکھا تو حضرت علی ناقہ پر سوار چلے آرہے ہیں حضرت ابوبکر کو خیال گذرا کہ شاید مدینہ منورہ سے اُن کی روانگی کے بعد کوئی وحی آئی ہو اور اُسکی وجہ سے آنحضرت صلعم نے امارتِ حج سے متعلق اپنا پہلا فیصلہ بدل دیا ہو۔ اسلیے حضرت علی سے پوچھا کہ آپ امیر ہو کر آئے ہیں یا قاصد بن کر" حضرت علی نے جواب دیا۔ قاصد ہو کر، سورۂ برأت کی چالیس آیتیں ہیں جن کے ساتھ

[1] طبری ج ۲ ص ۲۸۸ و صحیح مسلم باب التنفیل وفداء المسلمین بالاساری [2] زرقانی ج ۲ ص ۲۸۹

آنحضرت صلعم نے مجھ کو بھیجا ہے تاکہ میں حج کے موقع پر ان کا اعلان کر دوں"۔ [1]

اب سب لوگ روانہ ہوئے۔ حج کا زمانہ آیا تو حضرت ابوبکر نے یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) اور یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) تینوں دن امیر حج کی حیثیت سے خطبہ پڑھا اور حضرت علی نے سورۂ براۃ کی آیتوں کا اعلان عام کیا۔ منادی کرنیوالوں میں حضرت ابوہریرہ بھی تھے۔ جو اس زور سے منادی کرتے پھرتے تھے کہ گلا بیٹھ بیٹھ جاتا تھا۔ اعلان عام کے الفاظ یہ تھے۔

اس سال کے بعد نہ تو کوئی مشرک حج کرے گا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کریگا [2]

حجۃ الوداع نبوی ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلعم حج کیلئے تشریف لے گئے جس کو حجۃ الوداع بھی کہتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق بھی اس سفر میں ہمرکاب تھے اور خصوصیت یہ تھی کہ آنحضرت صلعم کا سامانِ سفر حضرت ابوبکر کی اونٹنی پر ہی بار تھا۔ حضرت اسماء اس سفر کا تذکرہ کرتی ہوئی فرماتی ہیں کہ ہم سب آنحضرت صلعم کے ساتھ حج کرنے جا رہے تھے اور ایک ہی اونٹ تھا جس پر حضور صلعم اور ہم سب کا سامان لدا ہوا تھا۔ مقام عرج میں پہونچے تو حضور سواری سے اُتر کر بیٹھ گئے۔ حضرت عائشہ آنحضرت صلعم کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں اور میں اپنے والد کے پہلو میں تھی جس اونٹ پر سامان بار تھا وہ حضرت ابوبکر کے ایک ملازم کی تحویل میں تھا۔ کافی انتظار کے بعد جب یہ ملازم منزل پر پہنچا تو حضرت ابوبکر نے پوچھا "اونٹ کیا ہوا" وہ بولا۔

[1] طبری ج ۲ ص ۳۸۳ پر ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر مقام ذوالحلیفہ سے خود واپس ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں پہونچے اور دریافت کیا کہ کیا میرے متعلق کوئی وحی آئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں لیکن جس چیز (سورۂ برأت کی وہ ابتدائی آیات جن میں فرمایا گیا ہے کہ جن مشرکوں کے ساتھ معاہدہ ہے اور انھوں نے نقض عہد بھی نہیں کیا ہے انکو چار مہینے کی مہلت دیجاتی ہے اسکے بعد انکو مکہ میں رہنے اور طواف کرنیکی اجازت نہیں دیجائیگی) کی تبلیغ ضروری ہو تو یا تو میں خود اسکی تبلیغ کرونگا یا میرا ہی کوئی اپنا کریگا۔ اے ابوبکر کیا تم اس پر راضی نہیں ہو۔ درانحالیکہ تم میرے رفیق غار ہو اور حوض کے میرے ساتھی ہو۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ ارشاد ہوا ایسے لو حضرت ابوبکر امیر حج اور حضرت علی نقیب بنکر روانہ ہوگئے۔

گذشتہ شب میں گم ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "ایک ہی اونٹ تھا وہ بھی تو نے گم کر دیا۔" اور یہ کہہ کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ آنحضرت ﷺ یہ دیکھ کر مسکراتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے کہ ذرا اس محرم (حج کا احرام باندھنے والا) کو تو دیکھو کیا کر رہا ہے[1] آنحضرت ﷺ نے صرف اسی قدر فرمایا اور وہ بھی مسکراتے ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ کو مارنے سے منع نہیں فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرب شدید نہیں تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے یوں ہی معمولی طریقہ پر دو چار طمانچے لگا دیئے ہوں گے۔

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۳۴۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ

تکمیل فرض کا اعلان حجۃ الوداع کے موقعے پر آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اسلامی دستور حیات کے نہایت اہم امروں پر روشنی ڈالی تھی اور انپر سختی سے عمل پیرا ہونے کی تاکید کی تھی یہ گویا نبوت کے فرض کی تکمیل کا اعلان تھا۔ چنانچہ خطبہ کے آخر میں آپ نے دریافت فرمایا۔

"کیا میں نے خدا کے احکام تم تک پہونچا دیئے ہیں؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "بیشک" آپ نے فرمایا "اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ" اے اللہ تو گواہ رہ[1] اسی دن عرفات میں یہ آیت اتری[2]

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے دین کے اعتبار سے اسلام کو پسند کیا ہے

حضرت ابوبکرؓ کا اندیشہ مدینہ طیبہ واپس آکر آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں یہ بھی ارشاد فرمایا "اللہ نے ایک بندہ کو دنیا میں اور اس چیز میں جو اللہ کے پاس ہے اختیار دیا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لے۔ اس بندہ نے مَاعِنْدَ اللّٰہِ یعنی قرب خداوندی کو اختیار کر لیا۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۱۹۶ / مناقب ابی بکر عبداللہ بن ابی قحافہ

[2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۶۲ –

حضرت ابوبکر یہ سنتے ہی رونے لگے۔ صحابۂ کرام کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں رونے کی کیا بات تھی! لیکن حضرت ابوبکر صدیق جو کہ محرم اسرار نبوت اور رمز شناس کلام رسالت تھے[1] فوراً سمجھ گئے تھے کہ یہ بندہ خود آنحضرت صلعم کی ذاتِ مبارک ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی دنیا سے رحلت کا وقت قریب آپہونچا ہے۔

آغازِ مرض چنانچہ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی ایک دن آنحضرت صلعم جنت البقیع سے تشریف لائے تو آپ کے سر میں شدید درد تھا۔ گھر میں داخل ہو کر حضرت عائشہ کو دیکھا کہ اتفاق سے وہ بھی درد سر کے مارے کراہ رہی ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی آپ ہر بیوی کے ہاں باری باری سے جاتے رہے۔ آخر حضرت میمونہ کی باری کے دن تکلیف زیادہ شدید ہوگئی تو ازواج مطہرات نے حضور صلعم کا ایما پاکر آپ کو حضرت عائشہ کے حجرہ میں ہی قیام فرمانے کی اجازت دیدی۔ لیکن اس وقت تک ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آپ یہاں تشریف لائے تو اس طرح کہ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چلا جاتا نہیں تھا۔ اور دو شخص حضرت فضل بن عباس اور حضرت علی آپ کو تھامے ہوئے تھے۔[2]

حضرت ابوبکر کو امامت صلوٰۃ کا حکم جب تک آمد و رفت کی طاقت رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے تشریف لاتے رہے۔ لیکن جب اس سے بھی معذوری ہوگئی تو حضرت عائشہ سے فرمایا "ابوبکر سے کہو نماز پڑھائیں" حضرت عائشہ نے عرض کیا "ابوبکر رقیق القلب ہیں۔ جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو فرطِ گریہ سے ان کی آواز کسی کو سنائی نہ دے گی۔ اس لیے عمر کو حکم کیجئے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ ساتھ ہی حضرت عائشہ کے کہنے پر حضرت حفصہ نے بھی اپنے والد حضرت عمر کی سفارش کی لیکن آنحضرت صلعم نے کوئی عذر قبول نہیں فرمایا اور پھر اصرار کے ساتھ حکم دیا کہ ابوبکر سے ہی کہو نماز پڑھائیں اور حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ سے بگڑ کر فرمایا "تم انہیں عورتوں میں سے ہو جنہوں نے یوسف کو جھل دیا تھا!" حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ سے یہ سن کر کہا "بھلا مجھ کو تمہاری طرف سے کوئی خیر کیوں پہونچنے لگا؟"[3]

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۲۴ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۳

اس حکم کے مطابق حضرت ابوبکر تین دن تک نماز پڑھاتے رہے۔ آخر ایک دن آنحضرت صلعم کو کچھ افاقہ محسوس ہوا۔ حجرہ سے باہر نکل کر خود تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر نماز شروع کر چکے تھے۔ حضور کو دیکھ پیچھے ہٹنے لگے۔ آنحضرت صلعم نے اشارہ سے منع فرمایا اور خود حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اب حضرت ابوبکر آنحضرت صلعم کی اور دوسرے نمازی حضرت ابوبکر کی اقتدار کر رہے تھے۔

ایک روز حسب معمول نماز پڑھانے کے لیے حضرت ابوبکر آگے بڑھ رہے تھے کہ دفعۃً حجرۂ نبوی کا پردہ اٹھا اور حضور پُرنور کا روئے مبارک دانز ظاہر ہوا۔ شمع رسالت کے پروانوں کی خوشی کی حد نہ رہی۔ حضرت ابوبکر پیچھے ہٹنے لگے۔ حضور نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انہوں نے نماز پڑھانی شروع کردی۔ حضور باہر تشریف لانا چاہتے تھے لیکن ایسا کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ پھر واپس اندر چلے گئے اور پردہ گرالیا۔[1] حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ آخری نماز جو حضرت ابوبکر نے پڑھائی نماز فجر تھی۔[2]

وصالِ نبوی صلعم صحابۂ کرام جن کے دل محبوب انس و جاں کی شدید علالت کے باعث مرجھائے ہوئے تھے۔ روئے منور کی جھلک دیکھ کر خوشی سے شگفتہ ہوگئے لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ یہ آخری جلوۂ عام اور آفتاب لب بام تھا۔[3]

حضرت ابوبکر نماز سے فارغ ہو کر حضرت عائشہ کے حجرہ میں آئے۔ چونکہ حضور کو قدرے افاقہ تھا اور درد کی شدت میں کمی محسوس ہوتی تھی اس لیے حضرت عائشہ سے اجازت لیکر مقام سنح چلے گئے جہاں ان کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ رہتی تھیں

[1] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے ابن سعد نے فضیل بن عمرو الفقیمی سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے آنحضرت صلعم کی حیات میں تین مرتبہ نماز پڑھائی۔ لیکن اس روایت کو نقل کرنیکے بعد ابن سعد خود ہی فرماتے ہیں کہ ان تین نمازوں سے وہ نمازیں مراد ہیں جن میں آنحضرت صلعم نے خود حضرت ابوبکر کی اقتدار کی تھی، ورنہ یوں تو انہوں نے سترہ مرتبہ نماز پڑھائی (ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر) [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۳ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۲۴

یہاں جب چاشت چڑھی تو سرورِ کائنات ؐ رحلت گزائے عالم جاودانی ہو کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے سالم بن عبید کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ کو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر پہونچی تو فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ آئے۔ یہاں مسجدِ نبوی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی، سیدھے گھر میں تشریف لائے جہاں آنحضرت ؐ ایک یمنی نقش و نگار کی چادر اوڑھے استراحت فرما تھے جسدِ اطہر کے قریب کھڑے ہو کر رُخِ روشن سے چادر اٹھائی اس پر جھکے بوسہ دیا اور پھر آپ ؐ کو خطاب کر کے اس طرح گویا ہوئے۔

بابی انت وامی طبت حیًّا ومیتًا
والذی نفسی بیدہ لا یذیقك
اللّٰہ الموتتین ابدًا اما
الموتۃ الّتی کتب اللّٰہ
علیك فقد مُتّھا

میرے ماں اور باپ دونوں آپ پر فدا ہوں
آپ زندگی میں بھی پاک وصاف رہے اور
اب موت کے بعد بھی پاک وصاف ہیں۔
جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم کہ
اللہ آپ کو ہرگز دو موتیں نہیں دیگا وہ موت
جو اللہ نے آپ کیلئے مقدر کی تھی وہ تو آپ کو آ ہی گئی۔

اس کے بعد مسجد میں تشریف لائے تو یہاں عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے قسم کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ؐ کی وفات نہیں ہوئی ہے جیسا کہ خود اُن کا بیان ہے انہیں یہ بات باور ہی نہیں ہوئی تھی کہ حضور کی وفات ہو بھی سکتی ہے حضرت ابوبکرؓ نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ بیٹھ جاؤ مگر وہ نہ مانے پھر کہا مگر وہ اب بھی نہیں مانے۔ آخر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "اے قسم کھانے والے ذرا ٹھہر اور جلدی نہ کر" حضرت عمرؓ اب بیٹھ گئے تو آپ نے تقریر شروع کی پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا۔

اَلَا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا
فَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ

جو شخص محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوجا کرتا تھا وہ سن
لے کہ بے شک محمد ؐ کی موت واقع ہو گئی۔ مگر ہاں
جو شخص اللہ کی بندگی کرتا ہے

یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ

تو بے شک اللہ زندہ ہے اور اس کیلئے موت نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے حسب ذیل آیات تلاوت کیں۔

(۱) اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ

اے محمدؐ آپ کو بھی موت آنی ہے اور سب شبہ وہ بھی مرنے والے ہیں۔

(۲) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ
عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا
وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ۔

اور محمدؐ نہیں مگر اللہ کے ایک رسول جن سے پہلے بھی اور
رسول گذر چکے ہیں پس اگر ان کو موت آجائے یا قتل کر دیئے
جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے کو لوٹ جاؤگے
اور جو شخص ایسا کریگا تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں
پہنچا سکتا اور اللہ شکر کرنیوالوں کو عنقریب جزا دیگا۔

یہ سن کر لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے مگر ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ آخری آیت انہیں معلوم ہی نہیں تھی۔ اب حضرت ابوبکرؓ نے اس کی تلاوت کی تو ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور اس قدر مؤثر و دل نشین ثابت ہوئی کہ ہر شخص اسکو ہی پڑھ رہا تھا[1]

سقیفۂ بنی ساعدہ یہاں آنحضرت ؐ کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر منافقین کی ریشہ دوانی نے یہ گل کھلایا کہ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جو ان کا دار المشورہ یا دار الندوۃ تھا جمع ہوئے اور آنحضرت ؐ کے جانشین کی بحث چھیڑ دی۔ سعد بن عبادۃ مشہور انصاری ہیں، غزوات میں انصار کا عَلَم انہیں کے ہاتھ میں رہتا تھا انصار کا خیال تھا کہ خلیفۂ رسول ؐ ان کو ہونا چاہیئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے جو کہتے تھے کہ بجائے ایک امیر کے دو امیر ہوں۔ ایک انصار سے اور دوسرے مہاجرین سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری شکل تو کسی طرح بھی قابلِ عمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسکے قبول کر لینے

---

[1] امام بخاری نے اس روایت کو جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کچھ لفظوں کے رد و بدل اور کمی بیشی کے ساتھ اپنی صحیح میں دو جگہ نقل کیا ہے۔ ایک باب الدخول علی المیت بعد الموت اذا ادرج فی اکفانہ کے تحت اور دوسرے باب مناقب المہاجرین وفضائلھم کے زیر عنوان۔ ہم نے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔

سے اسلامی وحدت کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہو جاتا۔ اب رہی پہلی صورت تو اس میں اشکال یہ تھا کہ قریش جو عرب میں سب سے زیادہ با اقتدار تھے اور جن میں موروثی طور پر امارت و ریاست کے اوصاف و کمالات بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پائے جاتے تھے یہاں تک کہ خود آں حضرت صلعم نے الائمۃ من قریش۔ امام تو قریش میں ہی پیدا ہوتے ہیں فرما کر قریش کی اس خصوصیت و امتیاز پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ وہ امارت سے محروم ہو جاتے اور اس کا نقصان یقیناً اسلامی معاشرہ کو پہنچتا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلعم کی اور اسلام کی انصار نے جو خدمات انجام دی تھیں وہ بھی بہت عظیم الشان تھیں اور ان کے فضائل و مناقب کا باب بہت وسیع تھا۔ پھر مہاجرین میں بھی قریش کا ایک گروہ جس میں ابوسفیان تھے اپنے سامنے کسی کو نظر میں نہیں لاتا تھا جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان میں بھی دو قبیلے تھے اوس اور خزرج ان میں باہمی رقابت اور منافست مدت سے چلی آ رہی تھی اسلام قبول کرنے کے بعد یہ کم ضرور ہوئی تھی لیکن معدوم نہیں ہوئی اس بنا پر اسلام کی وحدتِ اجتماعی کیلئے یہ انتہائی نازک وقت تھا اور خلافت کے معاملہ کو کامیابی کے ساتھ حل کر لینے پر ہی اسکی بقاء کا دار و مدار تھا۔ آخر اس عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی بھی حضرت ابوبکر صدیق کے ناخن تدبیر سے ہوئی اور اسلام میں جو رخنہ اور فتنہ پیدا ہو رہا تھا اس کا سدباب ہو گیا۔

چنانچہ حضرت[1] ابوبکر صدیق کو اس ہنگامہ آرائی کی اطلاع ہوئی تو سب کو چھوڑ چھاڑ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح جو امین ہذہ الامۃ کے لقب سے سرفراز

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳ پر مسند ابو لعلی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور سب آل بیت آنحضرت صلعم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے کہ ایک شخص نے دیوار کے پیچھے سے حضرت عمر کو آواز دیکر کہا کہ ذرا باہر تو آیئے فاروق اعظم نے جواب دیا "چلو ہٹو" ہم آنحضرت صلعم کے کام میں لگے ہوئے ہیں ہم کو فرصت نہیں۔ اب یہ شخص بولا" ارے دیکھئے بڑا غضب ہو گیا۔ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہیں آپ ذرا چل کر ان کی خبر لیجئے۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی ایسی چیز کھڑی کر دیں جو جنگ کا باعث ہو" یہ سن کر حضرت عمر نے صدیق اکبر سے کہا چلئے اور وہ روانہ ہو گئے۔

تھے ان کو ساتھ لیکر سقیفۂ بنی ساعدہ پہونچے یہاں دیکھا کہ عجیب ہنگامہ اور شور و غل برپا ہے جب یہ تینوں بیٹھ گئے تو انصار کا ایک خطیب کھڑا ہوا اور اس نے کہنا شروع کیا

ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور اے مہاجرین تم ہمارے نبی کے ساتھی (رھط) ہو۔ لیکن اب تم ہم سے برگشتہ ہو گئے ہو اور جو ہمارا مقام ہے اس سے ہم کو الگ کرنا چاہتے ہو۔[1]

یہ تقریر ختم ہوئی تو حضرت عمر نے بولنا چاہا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے انہیں روکدیا اور خود کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس کا ہر ہر لفظ فصاحت و بلاغت کی جان تھا۔ خود حضرت عمر کا بیان ہے کہ میں اس موقعہ کیلئے ایک بہت اچھی تقریر سوچ سانچ کے اور پہلے سے اس کو اپنے دماغ میں تیار کر کے گیا تھا اور خیال تھا کہ ابوبکر ایسی تقریر نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب ابوبکر خود کھڑے ہوئے تو انہوں نے وہ باتیں فی البدیہ اور انتہائی بلاغت کے ساتھ کہہ ڈالیں جنکو میں غور و فکر کے بعد اپنے دماغ میں جما کر لے گیا تھا[1]

حضرت ابوبکر کی تقریر | حضرت ابوبکر صدیق نے حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنی تقریر میں پہلے تو مہاجرین کے فضائل اسلام کے لیئے ان کی غیر معمولی قربانی اور آنحضرت صلعم کے ساتھ رشتہ و قرابت کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا[1] اے انصار تم جو کچھ اپنے متعلق کہتے ہو بے شک تم اس کے اہل ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت صلعم کے ساتھ بھی تم کو بڑا گہرا تعلق تھا۔ آپ کی بعض معزز ازواج مطہرات تم ہی میں سے تھیں[2] لیکن عرب اس معاملہ میں سوائے قبیلہ قریش کے ساتھ اور کسی کی اطاعت قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدۃ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ لو ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لو[2]

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۵۷۔ طبری نے سقیفۂ بنی ساعدہ کے اس جلسہ کی اور اس میں جو تقریریں ہوئیں ان سب کی تفصیل رو داد قلم بند کی ہے۔ لیکن ہم نے غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا ہے[2]

صحیح بخاری جلد دوم ص ۹۶۔ امام بخاری نے یہ ساری داستان خود حضرت عمر فاروق کی زبانی سنائی ہے حضرت ابوبکر نے خلافت کے لیئے جب حضرت عمر کا نام پیش کیا تو خود حضرت عمر کا بیان ہے کہ میرے لیئے یہ حد درجہ ناگوار بات تھی۔ خدا کی قسم! بغیر کسی گناہ کے میری گردن اڑا دی جاتی یہ بات میرے لیئے (باقی بر صفحہ ۸۶)

اِس پر شور و شغب زیادہ بڑھنے لگا اور انصار کی طرف سے حباب بن منذر نے سخت کلامی کی تو حضرت عمرؓ نے پیش قدمی کر کے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ نہیں! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے کیونکہ آپ ہم سب سے بہتر ہیں ہمارے سردار ہیں اور آنحضرتؐ سب سے زیادہ آپ سے محبت کرتے تھے۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بیعت کی حضرت عمرؓ کا بیعت کرنا تھا کہ مہاجرین اور انصار سب نے ہاتھ بڑھا دیئے۔[۱]

ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ بشیر بن الانصاری نے حضرت عمرؓ سے بھی پہلے بیعت کی تھی[۲] لیکن دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اس قدر ہجوم کے موقع پر اول تو اس کا ٹھیک پتہ چلنا مشکل ہے کہ کس نے سبقت کی اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ مہاجرین میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے ہوں اور حضرت بشیر بن سعد نے انصار میں سب سے پہلے بیعت کی ہو۔

سقیفۂ بنی ساعدہ کے ہنگامہ سے فارغ ہو کر کاشانۂ قدس پر حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ کی تدفین میں شریک ہوئے۔ یہاں صحابۂ کرام میں اختلاف تھا کہ کہاں دفن کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہؐ سے ایک حدیث سنی ہے جس کو میں نہیں بھولا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

ما قبض اللہ نبیاً الا فی الموضع الذی	اللہ کسی نبی کی روح اسی جگہ قبض کرتا ہے جہاں
یحب ان یدفن فیہ	اس کو دفن ہونا محبوب ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا" ادفنوہ فی موضع فراشہ" تم لوگ بھی رسول اللہؐ

(بقیہ صفحہ ۸۵) بہت آسان تھی۔ میری نسبت اسکے کہ میں ایک ایسی قوم کا امیر بنتا جسمیں کہ ابوبکر موجود ہوں حضرت ابوبکرؓ نے دوسرا نام حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح کا پیش کیا تھا۔ ان کے متعلق ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بعض لوگوں نے ان سے بیعت کرنی چاہی تو انہوں نے فرمایا ــــــ تم لوگ میرے پاس آتے ہو حالانکہ تم میں ثالث ثلاثہ (رفاقت غارِ ثور کی طرف اشارہ ہے) یعنی حضرت ابوبکرؓ موجود ہیں۔ (ابن سعد تذکرۃ حضرت ابوبکرؓ) [۲] صحیح بخاری ج۱ ص ۵۱۸ باب مناقب المہاجرین) [۱] صحیح بخاری ج۱ ص ۵۱۸ و جلد دوم ص ۱۰۰۹ باب رجم الحبلی من الزنا اذا احصنت [۳] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۷۔

کہ آپ کی اسی خواب گاہ میں دفن کرو" چنانچہ ایسا ہی ہوا[۱]

بیعتِ عامہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں تو چند لوگوں نے بیعت کی تھی۔ آنحضرتؐ کی وفات کے دوسرے دن یعنی بروز سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۶۳۲ء مسجد نبوی میں بیعت عامہ کا انتظام کیا گیا۔ سب مسلمان جمع ہوئے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا۔ اور فرمایا کہ" میں امید کرتا تھا کہ رسول اللہؐ ہم لوگوں کے بعد تک زندہ رہیں گے۔ لیکن اب اگر محمدؐ وفات پا گئے ہیں تو خیر اللہ نے تمہارے سامنے ایک ایسا نور رکھ دیا ہے۔ جس سے تم وہی ہدایت حاصل کر سکتے ہو جو رسول اللہؐ سے حاصل کرتے تھے بے شبہ ابوبکر رسول اللہؐ کے ساتھی اور غار کے رفیق ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے زیادہ بہتر تم لوگوں کے معاملات کی سربراہی کیلئے وہ ہی ہیں۔ پس کھڑے ہو اور ان سے بیعت کرو۔" حضرت عمرؓ تقریر سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ سے جو خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے۔" آپ منبر پر تشریف لائیے۔ لیکن صدیق اکبرؓ کو جنبش نہ ہوئی آخر جب کئی مرتبہ کہا تو آپ منبر پر چڑھے اور مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی[۲]۔ یہ بیعت عامہ تھی۔

پہلا خطبہ اس کے بعد آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کی نسبت ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ایسا خطبہ پھر کبھی کسی کی زبان سے سننے میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اور درود و سلام کے بعد فرمایا۔

اما بعد ایہا الناس فانی قد ولیت علیکم	لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں
ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی	تم سے بہتر نہیں ہوں پس اگر میں اچھا کروں تو تم
وان اساءت فقوّمونی۔ الصدق	میری مدد کرو۔ اور اگر برا کروں تو مجھ کو سیدھا
امانۃ والکذب خیانۃ۔ والضعیف	کر دو۔ سچائی ایک امانت ہے۔ اور جھوٹ
منکم قوی عندی حتی اُریح علتہ	خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے وہ میرے
ان شاء اللہ وَالقوی فیکم ضعیف	نزدیک قوی ہے۔ چنانچہ میں اس کا شکوہ دور
حتی آخذ منہ الحق ان شاء اللہ	کر دوں گا۔ اور تم میں جو قوی ہے وہ میرے

---

[۱] شمائل ترمذی مطبوعہ کانپور ص ۳۰ [۲] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۲ باب الاستخلاف

لایدع قومٌ الجهاد فی سبیل اللّٰہ الاضربهم اللّٰہ بالذل ولایشیع قومٌ قط الفاحشة الاعمهم اللّٰہ بالبلاء - اطیعونی ما اطعت اللّٰہ ورسوله فاذا عصیت اللّٰہ ورسوله فلا طاعة لی علیکم قوموا الی صلوتکم - رحمکم اللّٰہ [1]

نزدیک کمزور ہے۔ چنانچہ اس سے حق لوں گا جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے۔ اللہ اس پر ذلت کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور جس قوم میں بری باتیں عام ہو جاتی ہیں، اللہ ان پر مصیبت کو مسلط کر دیتا ہے۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اچھا اب جاؤ نماز پڑھو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔

متخلّفین

سیر و تاریخ کی کتابوں میں بعض ایسی شخصیتوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کی نسبت مورخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوبکر سے کسی دن بیعت نہیں کی تھی ان میں سب سے اہم نام حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ہے ان کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت زبیر بن العوام اور مشہور انصاری حضرت سعد بن عبادہ کے نام ہیں۔ اگرچہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جو دین کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ مورخین نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی اور وہ اس پر سرسری کلام کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہم ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک کی نسبت الگ الگ کلام کرتے ہیں۔

---

[1] البدایة والنہایة ج ۵ ص ۲۴۸۔

حضرت علی کی بیعت

حضرت علی کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ آپ نے چھ ماہ یعنی حضرت فاطمہ کی وفات تک خلیفۂ اول سے بیعت نہیں کی اور ناراض ہوئے گھر میں بیٹھے رہے۔ آخر جب حضرت فاطمہ بھی رہ گزائے عالم آخرت ہو گئیں تو آپ نے اور آپ کے ساتھ بنی ہاشم نے جو حضرت علی کے مکان میں مقیم تھے حضرت ابوبکر کو مکان میں بلایا۔ یہاں حضرت علی اور حضرت ابوبکر دونوں میں گفتگو ہوئی۔ شکوے شکایت ہوئے اور آخر جب صلح صفائی ہو گئی تو حضرت علی نے بیعت کی۔ مسلمانوں کو جب یہ خبر ملی تو بڑے خوش ہوئے۔

عام مورخین اور ارباب سیر کی اس روایت کا سرچشمہ دراصل صحیح بخاری کی روایت ذیل ہے۔

عن عائشة ان فاطمة بنت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ارسلت الی ابی بکر تسئله میراثها من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم مما افاء اللّٰہ علیه بالمدینة وفدك وما بقی من خمس خیبر فقال ابوبکر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال - لا نورث ما ترکنا صدقة انما یاکل ال محمد فی هذا المال وانی واللّٰہ لا اغیر شیئاً من صدقة

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ فاطمہ نے ابوبکر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ چیزیں جو اللہ نے رسول اللہ صلعم کو مدینہ میں دی تھیں اور فدک اور خیبر کے ⅕ کا جو کچھ بچا ہوا ہے ان میں سے جو میری میراث ہے وہ مجھ کو دیجئے۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔ اور آل محمد بھی اسی میں سے کھائیں گے قسم ہے اللہ کی آنحضرت صلعم کا صدقہ آپ کی زندگی میں جس حالت پر تھا۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
عن حالها التی کان علیها فی عهد
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
ولا عملن فیها بما عمل به رسول
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
فابی ابوبکر ان یدفع الی فاطمة
منها شیئاً فوجدت فاطمة علی
ابی بکر فی ذالک فهجرته فلم تکلمه
حتی توفیت وعاشت بعد النبی
صلی اللّٰہ علیہ وسلم ستة اشهر
فلما توفیت دفنها زوجها علی لیلاً
ولم یؤذن بها ابابکر وصلی علیها
وکان لعلی وجهٌ حیاة فاطمة فلما
توفیت استنکر علی وجوه الناس
مصالحة ابی بکر ومبایعته ولم
یکن یبایع تلک الاشهر فارسل
الی ابی بکر ان ائتنا ولا یاتنا احدٌ
معک کراهیة لیحضر عمر فقال
عمر لا واللّٰہ لا تدخل علیهم وحدک
فقال ابوبکر وما عسیتهم ان
یفعلوه بی واللّٰہ لاتینهم فدخل
علیهم ابوبکر فتشهد علی فقال
انا قد عرفنا فضلک وما اعطاک

میں اس میں کوئی تغیر نہیں کروں گا۔ اور میں
اُس سے متعلق وہی عمل کروں گا جو آنحضرتؐ
نے کیا تھا۔ یہ کہہ کر ابوبکر نے فاطمہ کو ان چیزوں
میں سے کوئی بھی چیز دینے سے انکار کر دیا۔ اس
پر فاطمہ ابوبکر سے ناراض ہو گئیں۔ انہوں نے ان کو
چھوڑ دیا اور وفات پانے تک ان سے کلام
نہیں کیا۔ فاطمہ آنحضرتؐ کے بعد چھ مہینے
زندہ رہیں جب ان کی وفات ہوئی۔ تو
انکے شوہر علی نے رات ہی کو انہیں دفن کرا
دیا اور ابوبکر کو اس کی خبر نہیں کی اور علی نے
ان کی نماز پڑھی، فاطمہ کی زندگی میں علی کا
بڑا وقار تھا لیکن جب فاطمہ کی وفات ہو گئی
تو علی نے محسوس کیا کہ اب لوگوں کے دلوں میں
وہ پہلی سی بات نہیں رہی اس لیئے انہوں نے
ابوبکر سے صلح کر لینی اور ان سے بیعت کرنی
چاہی اور انہوں نے ان مہینوں میں بیعت
نہیں کی تھی چنانچہ علی نے ابوبکر کو گھر بلایا اور
ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ آپ کے ساتھ
کوئی اور نہ آئے۔ کیونکہ وہ اس بات کو پسند
نہیں کرتے تھے کہ ان کے ساتھ عمر آئیں۔ عمر نے
ابوبکر کو مشورہ دیا کہ وہ تنہا نہ جائیں، ابوبکر
نے کہا کہ مجھ کو اُن (بنو ہاشم) سے یہ امید
نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایسا ویسا معاملہ

اللّٰہ ولم ننفس علیک خیراً ساقه
اللّٰہ الیک ولکنک استبددت
علینا بالامر وکنا نری لقرابتنا
من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
نصیباً حتی فاضت عینا ابی بکر
فلما تکلم ابوبکر قال والذی نفسی
بیده لقرابة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ
علیہ وسلم احب الی ان اصل من
قرابتی واما الذی شجر بینی وبینکم
من هذه الاموال فانی لم آل فیها
عن الخیر ولم اترک امراً رأیت
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
یصنعه فیها الا صنعته فقال
علی لابی بکر موعدک العشیة
للبیعة۔ فلما صلی ابوبکر الظهر
رقی علی المنبر فتشهد وذکر شان
علی وتخلفه عن البیعة وعذره
بالذی اعتذر الیه ثم استغفر و
تشهد علی فعظم حق ابی بکر وحدث
انه لم یحمله علی الذی صنع
نفاسةً علی ابی بکر ولا انکاراً
للذی فضله اللّٰہ به ولکنا
کنا نری لنا فی هذا الامر نصیباً

کریں گے۔ بخدا میں اُن کے پاس ضرور جاؤں
گا۔ چنانچہ ابوبکر اُن کے پاس آئے تو علی نے
کلمۂ تشہد پڑھا اور پھر کہا کہ ہم آپکے فضل کو
اور جو کچھ اللّٰہ نے آپکو دیا ہے اُس کو پہچانتے
ہیں اور جو چیز (خلافت) اللّٰہ نے آپکو بخشی ہے
ہم اسمیں آپکی ریس نہیں کرتے لیکن ہاں آپنے
خلافت کا معاملہ خود ہی طے کر لیا۔ حالانکہ
آنحضرتؐ کے ساتھ قرابت کیوجہ سے ہم بھی
اسمیں اپنا حصہ سمجھتے تھے ابوبکر یہ سن کر آ
آبدیدہ ہو گئے پھر جب انہوں نے بولنا شروع
کیا تو کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ
میں میری جان ہے رسول اللّٰہؐ کی قرابت
مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اپنے
اعزہ کے ساتھ صلہ رحمی کروں رہا وہ اختلاف
جو میرے اور تمہارے درمیان اُن اموال کے
بارے میں رونما ہو گیا ہے تو میں نے خیر کے کرنے
میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور میں نے کوئی
ایسا کام جسکو رسول اللّٰہؐ نے کیا ہو اس کو کئے
بغیر نہیں چھوڑا۔ یہ سن کر علی نے ابوبکر سے کہا
کہ اچھا آپ بیعت کیلئے دوپہر بعد آیئے پھر
جب ابوبکر نے ظہر کی نماز ادا کر لی تو انہوں
نے کلمۂ تشہد پڑھا اور علی کا حال اور بیعت سے
انکی علیحدگی اور اسکا جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا

واستبد علینا فوجدنا فی انفسنا
فسُرّ بذٰلک المسلمون وقالوا
اصبت وکان المسلمون الی
علی قریباً حین راجع الامر
بالمعروف [1]

وہ سب بیان کیا پھر استغفار پڑھا پھر اُس کے بعد علی نے تشہد پڑھا ابوبکر کے حق کی بڑائی بیان کی اور انہوں نے کہا کہ میں نے جو کہا تھا اُس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ابوبکر پر حسد کرتا تھا اور اللہ نے ان پر جو انعامات کئے ہیں میں اُن کا منکر تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہم لوگ بھی خلافت کے معاملہ میں اپنا کچھ حصہ سمجھتے تھے ابوبکر نے اس میں ہماری بات ہی نہیں پوچھی اسلئے ہمارے دل میں اسکا ملال تھا یہ سنکر سب مسلمان بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا "آپ نے درست فرمایا" اور مسلمان علی سے قریب ہوگئے جب وہ امر بالمعروف کی طرف لوٹ آئے۔

اِس کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی امام زہری سے روایت ہے کہ کسی شخص نے ان سے بیان کیا کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے حضرت فاطمہ کی وفات کے وقت بیعت نہیں کی تو انہوں نے کہا کہ نہیں! حضرت علی ہی نے نہیں بلکہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی نہیں کی لیکن حافظ ابن حجر نے بیہقی سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ زہری نے اسکی سند بیان نہیں کی [2] بیہقی نے اس روایت کی جو وجہ ضعف بیان کی ہے اس کے علاوہ اس روایت کا یہ جز بھی تمام روایات کے خلاف ہے کہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی بیعت نہیں کی۔

اب رہ گئی صحیح بخاری کی روایت تو اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت علی کا چھ ماہ تک بیعت نہ کرنا ایسی ایک بات ہے جو حضرت علی کی شان سے بھی بعید ہے اور حضرت ابوبکر کا اتنے دنوں تک اس پر صبر کرنا خود ابوبکر سے مستبعد ہے

[1] صحیح بخاری ج۲ ص ۶۰۹ ۶۰۸ باب غزوۂ خیبر [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۷۹

اِس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوبکر کو صحابۂ کرام میں جو بلند مرتبہ و مقام حاصل تھا آنحضرت صلعم کو ان پر جو خصوصی اعتماد و اعتبار تھا اور جس کی وجہ آپ نے صراحتہً واشارۃً (جس کا ذکر آگے آئے گا) حضرت ابوبکر کی خلافت کی طرف ایما فرمایا تھا حضرت علی اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے، علاوہ بریں خود حضرت علی درویشی و بے نفسی اور ولایت و انابت الی اللہ کے جس مرتبۂ اعلیٰ وارفع پر متمکن تھے وہ بھی کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے اس بنا پر یہ قطعی ناممکن ہے کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کو مستحق خلافت یا خلیفۂ برحق نہ سمجھتے ہوں چنانچہ صحیح بخاری کی اسی روایت میں حضرت علی صاف لفظوں میں حضرت ابوبکر کے خصائل و مناقب اور انکے استحقاق خلافت کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی بصراحت فرماتے ہیں کہ خلافت کے معاملہ میں حضرت ابوبکر کے ساتھ نہ کچھ اختلاف تھا اور نہ وہ اس پر انکے ساتھ کوئی منافست رکھتے تھے۔

بعض لوگوں نے اپنی پرانی عصبیت کی بنا پر اس وقت غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر کے حضرت علی کو مشتعل کرنا بھی چاہا تو آپ نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹ دیا چنانچہ ایک مرتبہ ابوسفیان نے جو حضرت امیر معاویہ کے والد تھے حضرت علی کو عار دلائی اور ان کو حضرت ابوبکر کی مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہا "یہ دیکھئے! جو قریش میں گھٹیا درجہ کا قبیلہ ہے خلافت اس میں چلی گئی خدا کی قسم اگر آپ اُس کے خواہاں ہوں تو میں مدینہ کو سوار اور پیادہ فوج سے بھر دوں گا حضرت علی یہ سنتے ہی برہم ہوگئے۔ اور بگڑ کر فرمایا۔ اے ابوسفیان تم اسلام اور مسلمانوں کے پرانے دشمن ہو تم ایسی باتوں سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے ہم نے ابوبکر کو خلافت کا اہل پایا ہے [1]

[1] ابن جریر طبری ج۲ ص ۴۴۹ ۔ یہ روایت طبری کی ہے لیکن کنز العمال میں یہ واقعہ دو سندوں سے مذکور ہے جن میں سے ایک سند کے آخری راوی سوید بن غفلہ ہیں جو ٹھیک اسوقت مدینہ میں حاضر ہوئے جب لوگ دفن نبوی سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑ رہے تھے اور وہ حضرت علی کے اصحاب خاص میں سے ہیں۔ دوسری سند کے آخری راوی حضرت علی کے پوتے زین العابدین ہیں۔ ان دونوں روایتوں میں ابوسفیان کے الفاظ تو وہی ہیں جو طبری میں ہیں لیکن حضرت علی کے جواب کے الفاظ بدلے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں لا واللہ ما ارید ان تملأ ها علیه خیلاً و رجالاً ولو لا انا رأینا ابابکر لذالک اهلاً ما خلیناه و ایاها یا اباسفیان ان المؤمنین قوم نصحة بعضهم لبعض متوادون وان بعدت دیارهم و ایدانهم وان المنافقین غششة بعضهم لبعض۔ کنز العمال مطبوعہ حیدرآباد جلد ۳ ص ۱۴۰-۱۴۱۔
[2] تاریخ یعقوبی جلد دوم ص ۲۴۰۔

ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ ابوسفیان نے حضرت علی سے کہا "ابسط یدک حتی ابایعک" اپنا ہاتھ پھیلائیے تاکہ میں آپ سے بیعت کر لوں لیکن حضرت علی نے شدت کے ساتھ انکار فرمایا، اور ابوسفیان کو جھڑک دیا۔[1]

حضرت ابوبکر تو ابوبکر تھے۔ حضرت علی کی شان تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے مقابلہ میں بھی اپنے لئے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور کبھی جمہور امت سے اس معاملہ میں الگ نہیں ہوئے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت علی سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت پر مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہوا لیکن آپ کی خلافت پر وہ متفق نہیں ہیں، تو حضرت علی نے جواب دیا کہ ابوبکر و عمر میرے جیسے مسلمانوں پر والی تھے اور میں تم جیسے مسلمانوں کا والی ہوں"۔[2]

ان بیانات سے صاف ظاہر اور ثابت ہے کہ حضرت علی کو حضرت ابوبکر کی خلافت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس معاملہ میں ان کے مخالف نہیں تھے البتہ ہاں جیسا کہ بخاری کی اسی روایت اور دوسری روایات میں ہے حضرت علی کو حضرت ابوبکر کی طرف سے ملال ضرور تھا جسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عین اس وقت جب کہ حضرت علی اور دوسرے آل بیت نبوی آنحضرت صلعم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے حضرت ابوبکر سقیفۂ بنو ساعدہ کی خبر سنتے ہی حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو ساتھ لیکر وہاں پہنچ گئے اور خلافت کا معاملہ طے کر آئے اور حضرت علی سے اس بارے میں کوئی مشاورت نہیں کی اس کے علاوہ دوسری وجہ حضرت فاطمہ کا حضرت ابوبکر کی طرف سے تکدر خاطر تھا جو بربنائے بشریت پیدا ہو گیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ حضرت علی کے ملال کی یہ دونوں وجہیں محض ذاتی اور شخصی تھیں۔ اس بنا پر ان کا اثر یہ تو ہو سکتا تھا کہ حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے تعلق باہمی میں وہ شگفتگی نہ ہو جو معاشرتی زندگی میں ہونی چاہئے تھی۔ لیکن چونکہ خلافت ایک قومی اور اجتماعی مسئلہ تھا اس بنا پر اس ذاتی رنجش کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت علی سرے سے بیعت

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۴۰   [2] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۷۶

ہی نہ کرتے اور تفرق بین المسلمین کا سبب بنتے۔ حضرت علی کی جمہوریت پسندی اور رائے عامہ کے احترام کی کیفیت تو یہ تھی کہ حضرت ابوبکر نے اپنے مرض الموت میں حضرت عمر کا نام اپنی جانشینی کیلئے تجویز کیا تو اگرچہ حضرت علی ذاتی طور پر اس سے متفق نہیں تھے چنانچہ انہوں نے اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن آخر جب حضرت عمر نامزد ہو ہی گئے تو پھر کوئی مخالفت نہیں کی اور سب مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے بھی بیعت کر لی۔ پس جب انکی یہ فطرت تھی تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ بیعت عامہ ہو جانے کے باوجود حضرت علی سب مسلمانوں سے الگ رہتے اور بیعت نہ کرتے۔

مازری اور اشعری نے حضرت علی کے تخلف عن البیعۃ کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا ہے کہ خلیفہ سے فرداً فرداً ہر مسلمان کا بیعت کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہزاروں مسلمان بیعت کر ہی چکے تھے اسلئے اگر حضرت علی نے بیعت نہیں کی تو اس کو مخالفت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔[1] لیکن ہمارے نزدیک یہ عذر صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت علی اپنی ذات سے تنہا ایک شخص نہیں تھے بلکہ پوری ایک جماعت۔ ایک قوم اور ایک گروہ تھے، انکا بیعت نہ کرنا اسلامی وحدت کیلئے عظیم ترین رخنہ کا باعث ہو سکتا تھا اور اپنی اس حیثیت سے یقیناً وہ خود بھی بے خبر نہیں تھے۔[2]

صحیح بخاری کی روایت پر ہم نے اشکال کی جو تقریر سطور بالا میں کی ہے وہ درایت کے اعتبار سے تھی روایتی حیثیت سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس روایت کے مقابلہ میں چند ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے چھ مہینے تک بیعت نہ کرنے کی تردید ہوتی ہے اس سلسلہ میں سب سے اہم وہ بات ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے لیکن ان دونوں کی شرط پر ہے اور اس لیے صحیح ہے۔ روایت یہ ہے۔

ان عبدالرحمٰن بن عوف کان مع   عبدالرحمٰن بن عوف بھی عمر بن الخطاب کے ساتھ

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۸۰ و فیض الباری ج ۴ ص ۱۴۲ [2] جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی انہوں نے تصحیح بھی کی ہے کہ حضرت علی نے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں جب تک قرآن کو جمع نہیں کر لوں گا گھر سے نہیں نکلوں گا۔ بعض حضرات نے اس جمع قرآن کو حضرت علی کی طرف سے بیعت نہ کرنے کا عذر بتایا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ کوئی عذر ہے بھی تو عذر بارد ہے۔ چند منٹ کیلئے بیعت کے واسطے آ جانا قرآن جمع کے کام میں خلل انداز کیونکر ہو سکتا تھا۔

عمر بن الخطاب وان محمد بن مسلمة کسر سیف الزبیر ثم قام ابوبکر فخطب الناس واعتذر الیهم وقال واللہ ما کنت حریصاً علی الامارة یوماً ولا لیلةً قط ولا کنت فیها راغباً ولا سألتها اللہ فی سر وعلانیة ولکنی اشفقت من الفتنة ومالی فی الامارة من راحة ولکن قلدت امراً عظیماً مالی به من طاقة ولا ید الا بتقویة اللہ عزوجل ولوددت ان اقوی الناس علیها مکانی الیوم فقبل المهاجرون منه ما قال وما اعتذر به قال علی والزبیر ما غضبنا الا لانا قد اخرنا من المشاورة وانا نری ابابکر احق الناس بها بعد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم انه لصاحب الغار وثانی اثنین وانا لنعلم بشرفه وکبره ولقد امره رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بالصلاة بالناس وهو حی -

تھے اور محمد بن مسلمہ نے زبیر کی تلوار توڑ دی تھی پھر ابوبکر کھڑے ہوئے انہوں نے خطبہ دیا اور معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "اللہ کی قسم مجھ کو امارت کا لالچ کسی دن یا کسی رات بالکل بھی نہیں تھا اور نہ مجھ کو اس کی کوئی رغبت تھی اور نہ میں نے پوشیدہ طور پر یا علانیہ طور پر اس کا اللہ سے سوال کیا تھا۔ لیکن ہاں ایک فتنہ سے ڈرتا تھا، اور امارت میں میرے لیئے کوئی راحت نہیں ہے۔ بلکہ میرے گلے میں ایک اتنے بڑے کام کا طوق ڈالدیا گیا ہے جس کی بجز توفیق الٰہی کے مجھ میں طاقت نہیں ہے میں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے زیادہ قوی آدمی آج میری جگہ ہوتا۔ ابوبکر نے جو کچھ کہا تھا مہاجرین نے اس کو قبول کرلیا۔ علی رضی اللہ عنہ اور زبیر نے کہا" ہم کو صرف اس بات پر غصہ تھا کہ مشورہ کے وقت ہمیں پس پشت ڈالدیا گیا۔ ورنہ ہم بے شبہ رسول اللہؐ کے بعد امارت کا سب سے زیادہ مستحق ابوبکر ہی کو سمجھتے تھے۔ وہ صاحب غار اور ثانی اثنین ہیں اور ہم انکے شرف اور عظمت کو جانتے ہیں اور رسول اللہؐ نے ان کو نماز پڑھانے کا حکم اپنی حیات میں ہی دیا تھا۔

(المستدرک جلد۳ ص ۶۶)

اب ایک اور پہلو سے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ بالفرض حضرت علی بیعت نہ کرتے تو حضرت ابوبکر ان معاملات میں جس قدر سخت تھے اس کے پیش نظر ان سے یہ بالکل

بعید بات تھی کہ وہ صبر کر کے خاموش بیٹھے رہتے اور فتنہ کے اس دروازہ کو کھلا چھوڑ دیتے۔ چنانچہ اس ذیل میں ہم ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے بیعت کے معاملہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت علی دونوں کے طرز عمل پر ایک ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایت حضرت ابوسعید الخدری کی ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعہ کے ابتدائی اجزاء بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

فلما قعد ابوبکر علی المنبر نظر فی وجوه القوم فلم یر علیاً فسأل عنه فقام ناس من الانصار فاتوا به فقال ابوبکر ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وختنه اردت ان تشق عصا المسلمین فقال لا تثریب یا خلیفة رسول صلی اللہ علیه وسلم فبایعه هٰذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه [1]

جب ابوبکر منبر پر بیٹھ گئے تو انہوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علی کو نہیں دیکھا تو ان کی نسبت پوچھا اس پر کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جاکر علی کو لے آئے۔ اب ابوبکر نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی اور داماد بھی ہیں کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں علی نے کہا اے خلیفۂ رسول اللہؐ ملامت نہ کیجیئے اس کے بعد علی نے ابوبکر سے بیعت کرلی امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ شرط شیخین پر ہے اور انہوں نے صحیحین میں اسکو درج نہیں کیا ہے۔

ابن سعد میں حضرت حسن سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے فرمایا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے خلافت کے معاملہ میں غور و خوض کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو نماز میں آگے کر دیا تھا۔ اس بناپر ہم اپنی دنیا کے واسطے اس شخص سے راضی ہوگئے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین

---

[1] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۷۶

کے لئے راضی ہوئے تھے، اب ہم نے بھی ابوبکر کو آگے کر دیا یعنی بالاتفاق انہیں خلیفہ بنا دیا [1]

اب ان تمام روایات کو سامنے رکھو ان سب پر یکجائی نگاہ ڈالو حضرت ابوبکر اور حضرت علی دونوں کی جلالتِ شان اور آنحضرت ؐ کے ساتھ ان کا قرب و اختصاص، پھر نفس خلافت کی اہمیت اور آنحضرت ؐ کی وفات کے بعد اس وقت تبلیغ و اشاعت اور استحکام اسلام کے لئے باہمی اتفاق و اتحاد کی سخت ضرورت ان سب کو بھی پیش نظر رکھو اور بتاؤ کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ بیعت کی ہے۔ پہلی بیعت بیعت خلافت ہے جو آنحضرت ؐ کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ کے موقع پر کی گئی، اور دوسری بیعت بیعت رضا ہے جو آپ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد کی ہے۔ اس بیعت کا مقصد آپس میں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر از سر نو خوشگوار کر لینا تھا۔

چنانچہ حافظ ابن حجر حضرت ابوسعید الخدری کی روایت جو مستدرک کے حوالہ سے اوپر گذر چکی ہے اور جس سے حضرت علی کا پہلے ہی موقع پر بیعت کر لینا ثابت ہوتا ہے اس کو اصح بتاتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔

وجمع غیرہ بانہٗ بایعہ بیعۃً ثانیۃً مؤکدۃ للاولی لازالۃ ما کان وقع بسبب المیراث کما تقدم وعلی ھٰذا قول الزھری لم یبایعہ علی فی تلک الایام علی ارادۃ الملازمۃ [1]

اور دوسرے لوگوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے پہلی ہی بیعت کو موکد کرنے کی غرض سے دوسری بیعت کی تھی تاکہ میراث کی وجہ سے جو تکدر پیدا ہو گیا تھا وہ جاتا رہے، اس قول کی بنا پر زہری جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے بیعت نہیں کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کے ساتھ

---

[1] ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکر

والحضور عندہٗ وما اشبہ ذالک فان فی انقطاع مثلہ عن مثلہ ما یوھم من لا یعرف باطن الامر انہٗ بسبب عدم الرضا بخلافتہ فاطلق من اطلق ذالک وبسبب ذالک اظھر علی المبایعۃ التی بعد موت فاطمۃ علیھا السّلام لازالۃ ھذہ الشبھۃ [1]

اٹھتے بیٹھتے اور ان کے پاس آتے جاتے نہیں تھے، کیونکہ جو شخص حقیقت حال سے واقف نہیں تھا وہ حضرت علی جیسے شخص کو حضرت ابوبکر جیسی شخصیت سے کنارہ کش دیکھ کر یہی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کا یہ طرز عمل اس بنا پر ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کی خلافت سے راضی نہیں ہیں۔ پس جس نے بیعت کی نفی کی ہے اسی وہم اور غلط فہمی کی وجہ سے کی ہے اور حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد حضرت علی نے جو بیعت کی تھی وہ درحقیقت اسی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے کی تھی۔

تاریخ اسلام کے نہایت مشہور محقق اور نقاد حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ حضرت ابوسعید الخدری کی مذکورہٗ بالا روایت اور اسی مضمون کی دوسری روایات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وھذا اللائق بعلی رضی اللّٰہ عنہٗ والذی یدل علیہ الاثار من شھودہ معہ الصّلوۃ وخروجہ معہ الی ذی القصہ بعد موت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کما سنوردہ وبذلہ لہ النصیحۃ والمشورۃ بین یدیہ [2]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے شایان شان یہی تھا اور اس پر دوسرے آثار بھی دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ نمازوں میں شریک ہونا ذوالقصہ کے معرکہ میں جس کا بیان آگے آئیگا، اور جو آنحضرت ؐ کی وفات کے فوراً بعد پیش آیا تھا حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ رہنا اور ان کو مشورہ دینا اور نصیحت کرنا۔

اس کے بعد حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کرنے کی روایت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں۔

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۲ - اس عبارت میں حضرت علی کا جس ذوالقصہ کی مہم میں حضرت ابوبکر کیساتھ شرکت کا ذکر ہے اس کا تذکرہ اپنے موقعہ پر آئندہ آئے گا اسے وہاں دیکھنا چاہیئے

واما ما یاتی من مبایعتہ ایاہ بعد موت فاطمۃ۔ وقد ماتت بعد ابیہا علیہ السلام بستۃ اشہر۔ فذالک محمول علی انہا بیعۃ ثانیۃ ازالت ماکان قد وقع من وحشۃ بسبب الکلام فی المیراث۔

اور رہی وہ روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی نے فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسری بیعت تھی جس نے اس باہمی تکدر اور شکر رنجی کا ازالہ کر دیا جو میراث کے بارے میں گفتگو سے پیدا ہو گئی تھی۔[1]

حضرت علی کا تکدر طبع جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اپنی جگہ مسلم! لیکن اس کا اثر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خالص دین کے معاملہ میں حضرت علی کی طرف سے کسی طرح کی مداہنت صادر ہوتی۔ امام قرطبی فرماتے ہیں: "حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے درمیان جو شکر رنجی ہوئی اور بعد میں حضرت علی نے اس کے لیے جو معذرت خواہی کی جو شخص بھی اس پوری داستان پر غور و خوض کرے گا اس کو اسمیں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف تھا اور دونوں میں ایک دوسرے کی محبت اور احترام تھا۔ اگرچہ بشری طبیعت کبھی کبھی غالب آجاتی تھی۔ لیکن دیانت اسکو رد کر دیتی تھی"[2]

جہاں تک حضرت عائشہ کی روایت کا تعلق ہے جو صحیح بخاری میں ہے یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عائشہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جبکہ حضرت فاطمہ نے میراث کا مطالبہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ ٹھیک آنحضرت ﷺ کی وفات کے یا بیعتِ عامہ کے دن نہیں ہوا ہو گا۔ بلکہ چند روز کے بعد جبکہ حضرت ابوبکر بحیثیت خلیفۂ اول کے معاملات و امورِ خلافت کو باقاعدہ انجام دینے لگے ہوں گے۔ اس بنا پر عین بیعتِ عامہ کے دن حضرت فاطمہ کی رنجش کے باعث حضرت علی کا بیعت سے الگ رہنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ وجہ رنجش ابتک پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کے ساتھ گفتگو کے وقت اپنی رنجش کی وجہ میراث کے معاملہ کو نہیں بتاتے بلکہ اُس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۲

[2] بحوالہ فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۹

آنحضرت ﷺ کے ساتھ تعلق خصوصی کے باعث اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ خلافت کا معاملہ طے کرتے وقت حضرت ابوبکر حضرت علی کو بھی اپنے اعتماد میں لیتے اور جس طرح انہوں نے حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ کو اس موقع پر اپنے ساتھ رکھا تھا حضرت علی کو بھی اپنے ساتھ رکھتے۔ اور ان کی غیر موجودگی میں بالا ہی بالا سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کا مرحلہ طے نہ کرتے۔ اس سے آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکر کا کتنا قصور تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ حضرت علی کی کشیدگی کی اصل وجہ حضرت فاطمہ کا ہی تکدر طبع تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر نے میراث کے متعلق آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی پڑھ کر سنا دیا تو اب حضرت علی کے لیے گنجائش نہ تھی کہ وہ میراث کے معاملہ کو اپنی رنجش کا سبب قرار دیں۔ اس بنا پر جب صلح صفائی کا وقت آیا تو حضرت علی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ صرف امر خلافت کے بارہ میں ان کی بات نہ پوچھنے کا گلہ کیا۔ یہ وہی بات ہے جس کو ارباب معانی کی زبان میں نکتہ بعد الوقوع کہتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ حضرت عائشہ حضرت علی کے بیعت نہ کرنے کو "وما کان بایعہ" وغیرہ صاف لفظوں سے بیان نہیں فرماتیں جیسا کہ امام زہری کی روایت میں ہے بلکہ "ولم یکن یبایع تلک الاشہر" جیسے غیر واضح لفظوں میں بیان فرماتی ہیں تو گویا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عائشہ دراصل فرمانا یہ چاہتی ہیں کہ حضرت علی نے بیعت تو کر لی تھی۔ لیکن چونکہ اس کے بعد ہی رنجش پیدا ہو گئی اور اسکی وجہ سے وہ کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔ اسلئے ان کا بیعت کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ انہوں نے رسمی طور پر اگرچہ بیعت کر لی تھی مگر عملاً ایسا تھا کہ گویا بیعت کی نہیں تھی۔ اسکے علاوہ طبری کی مندرجہ ذیل دو روایتیں بھی دیکھو۔

قال عمرو بن حریث لسعید بن زید اشہدت وفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نعم قال فتی بویع ابوبکر قال یوم مات رسول اللہ کرھوا

عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے پوچھا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا ہاں پھر پوچھا کہ ابوبکر سے بیعت کب کی گئی؟ تو بولے کہ جس دن

ان یبقوا بعض یوم ولیسوا فی جماعة قال فخالف علیه احدٌ قال لا الا مرتد او من قد کاد ان یرتدّ لو لا ان الله عزّ وجل ینقذهم من الانصار قال فهل قعد احد من المهاجرین قال لا تتابع المهاجرون علی بیعته من غیر ان یدعوهم [1] ۔

آنحضرت ؐ کی وفات ہوئی اسی دن صحابہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ دن کا ایک حصّہ بھی اس طرح گذاریں کہ وہ جماعت کیساتھ منسلک نہ ہوں، اب عمرو بن حریث نے پوچھا کہ کیا ابوبکر کی کسی نے مخالفت کی تھی؟ سعید بن زید نے جواب دیا کہ نہیں البتہ مرتد نے یا انصار میں سے اس شخص نے مخالفت کی جو قریب تھا کہ مرتد ہو جاتا اگر اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بچا نہ لیتا اسکے بعد عمرو بن حریث نے دریافت کیا کہ کیا مہاجرین میں سے بھی کسی نے بیعت سے پہلو تہی کی تھی۔ سعید بن زید نے کہا کہ نہیں، مہاجرین تو دعوت بیعت کے بغیر ہی بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے ۔

اِس روایت میں تو عام مہاجرین کی بیعت کا تذکرہ ہے جن میں خود حضرت علی بھی شامل تھے، لیکن جہاں تک خاص حضرت علی کی ذات کا تعلق ہے اس کا ذکر بھی ایک اور روایت میں ہے اور اس قدر وضاحت و صراحت کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ۔

حدثنا عبید الله بن سعید قال اخبرنی عمی قال اخبرنی سیف عن عبد العزیز بن سیاه عن حبیب بن ابی ثابتٍ قال کان علی فی بیته اذا اُتی فقیل له قد جلس ابوبکر للبیعة فخرج فی قمیص ما علیه ازارٌ ولا

....

....

......حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ علی اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ ابوبکر بیعت لینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ علی یہ سنتے ہی صرف قمیص پہنے ہی باہر نکل آئے اسوقت ان کے بدن پر نہ چادر تھی اور نہ تہمبند، اُن کو جلدی اسلئے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۷

رداؤہٗ عجلاً کراهیة ان یبطئ عنها حتی بایعه ثمّ جلس الیه وبعث الی ثوبه فاتاه فتجلله ولزم مجلسه [1] ۔

تھی کہ وہ بیعت میں پیچھے رہ جانے کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ انہوں نے ابوبکر سے بیعت کی پھر اُن کے پاس جاکر بیٹھ گئے، اور اپنے کپڑے منگوائے جب وہ آگئے تو انہوں نے کپڑے پہنے اور ابوبکر کی مجلس میں بیٹھے رہے ۔

اِس پوری بحث سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت علی صدیق اکبر سے بیعت کے معاملہ میں عام مسلمانوں سے نہ الگ رہے اور نہ پیچھے رہے لیکن آگے چل کر جو سیاسی اختلافات پیدا ہوئے ان کا اثر روایات پر بھی پڑا اور اس کی وجہ سے ایک واقعہ کچھ تھا اور اختلاف تعبیر و ادا سے کچھ سے کچھ ہو گیا۔

حضرت زبیر بن عوام

حضرت علی کے بعد دوسرا نام حضرت زبیر کا ہے جو اس بحث میں لائق ذکر ہے۔ حضرت زبیر آنحضرت ؐ اور حضرت علی کے پھوپی زاد بھائی تھے انکی والدہ عبد المطلب کی بیٹی صفیہ تھیں، آٹھ یا بارہ برس کے تھے کہ اسلام لائے جن دس صحابہ کو اُنکی زندگی میں ہی جنت کی خوشخبری دی گئی اُن میں ایک حضرت زبیر بھی ہیں، ان کا لقب حواریِ رسول اللہ ؐ تھا جو خود حضور ؐ نے ان کو عطا فرمایا تھا [2] روایت ہے کہ حضرت زبیر نے حضرت ابوبکر کی بیعت کا حال سنا تو تلوار میان سے باہر نکال لی اور بولے لا اُغمدهٗ حتی یُبایَعَ عَلِیٌّ، ،، میں اس وقت میان میں نہیں رکھوں گا جب تک علی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جائیگی۔ حضرت زبیر کی یہی تلوار تھی جس کو محمد بن مسلمہ نے توڑ دیا تھا۔

لیکن مستدرک حاکم کی وہ روایت جو حضرت علی کی بحث میں گذر چکی ہے۔ اسی میں حضرت زبیر کا بھی ذکر ہے صفحہ اُلٹ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جب حضرت ابوبکر نے تقریر کی اور فرمایا کہ میں ہرگز خلافت کا متمنی نہیں تھا لیکن البتہ اس سے ڈرتا تھا

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۷ [2] اصابہ ج ۱ ص ۵۲۶ (مطبوعہ مصر)

کہ کہیں مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑ جائے تو حضرت علی اور حضرت زبیر دونوں کھڑے ہوئے اور بولے کہ ہم کو اس بات کا رنج ضرور تھا کہ خلافت کے معاملہ میں جو مجلس مشاورت ہوئی اُس میں ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ ورنہ ہماری رائے میں ابوبکر تمام لوگوں میں خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں [1]

اس کے بعد جلد سوئم ص ۷۶ پر جو روایت ہے اس میں جہاں حضرت علی کا ذکر ہے حضرت زبیر کا بھی ہے۔ حضرت ابوبکر نے بیعتِ عامہ کے دن حضرت زبیر کو نہیں دیکھا تو پوچھا کہاں ہیں؟ جب لوگ جا کر اُن کو لے آئے تو حضرت ابوبکر نے انکو خطاب کر کے فرمایا "آپ آنحضرت صلعم کے حواری ہیں تو کیا پھر بھی آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں؟ حضرت زبیر نے اس کے جواب میں پہلے تو وہی کہا جو حضرت علی نے کہا تھا اور اس کے بعد فرمایا کہ "اے خلیفہ رسول صلعم! اب ملامت نہ کیجئے۔ پھر جہاں حضرت علی نے بیعت کی حضرت زبیر نے بھی کر لی۔

حضرت سعد بن عبادة مدینہ کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ امام بخاری کے بیان کے مطابق انہوں نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی تھی اگرچہ بعض دوسری روایتوں سے اسکی تردید ہوتی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ کبار صحابہ میں سے ہیں جن غزوات میں یہ شریک ہوئے انصار کا علَم انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ اس بنا پر یہ انصار کے اور خصوصاً خزرج کے سردار سمجھے جاتے تھے۔ بیحد سخی اور فیاض تھے۔ لیکن متعدد واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مزاج میں کسی قدر تشدد تھا اور اپنی رائے پر انہیں اصرار بھی ہوتا تھا۔

سقیفہ بنو ساعدہ کی مجلس میں انصار نے انہیں کو خلیفہ بنانا چاہا تھا اور انہوں نے انصار کے فضائل و مناقب پر ایک بڑی پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کی تھی لیکن جب حضرت ابوبکر منتخب ہو گئے تو ان میں (سعد بن عبادہ میں) اور حضرت عمر میں بڑی تلخ اور گرم گفتگو ہوئی جس کی تفصیل طبری میں موجود ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ خلافت صدیقی میں ہی ملک شام میں جا کر آباد ہو گئے تھے اور

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۶۶ کتاب ہذا ص
[2] کتاب ہذا ص

وہیں مقام حوران میں ۱۵ھ میں وفات پائی۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ان میں اور حضرت عمر میں جو سخت کلامی ہوئی تھی اور پھر وہ شام چلے گئے۔ اس سے مورخین نے قیاس کیا ہے انہوں نے حضرت ابوبکر سے بیعت نہیں کی تھی۔ اور تو اور خود حافظ ابن حجر کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

وقصتہ فی تخلفہ عن بیعۃ ابی بکرٍ مشھورۃ [1]	ابوبکر سے ان کی بیعت نہ کرنے کا قصہ مشہور ہے۔

ابو محمد نے کلبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے سعد بن عبادة کے پاس شام آدمی بھیجا اور تاکید کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کو بیعت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس شخص نے شام پہنچکر مقام حوران میں ایک باغ میں سعد بن عبادة سے ملاقات کی اور انکو بیعت کرنے کی دعوت دی، انہوں نے کہا "میں ایک قریشی سے کبھی بیعت نہیں کروں گا۔ اس شخص نے کہا "تو میں آپ سے جنگ کروں گا"، سعد بن عبادہ بولے "اگرچہ تم مجھ سے جنگ کرو۔ وہ بولا "کیا امت جس پر اتفاق کر چکی ہے آپ اُس سے باہر رہیں گے؟" انہوں نے جواب دیا۔ ہاں میں بیعت کے معاملہ میں تو امت سے الگ ہی رہوں گا" اس پر اس شخص نے تیر مار کر سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا" [2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض افسانہ ہی ہے اصل یہ ہی ہے کہ حضرت زبیر اور حضرت علی کی طرح حضرت سعد بن عبادہ نے بھی بیعت کر لی تھی۔ طبری میں جابر سے روایت ہے کہ ایک دن سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ اے گروہ مہاجرین تم نے میری امارت پر حسد کیا اور اے ابوبکر آپ نے اور میری قوم نے مجھ کو بیعت پر مجبور کر دیا۔ اس پر مہاجرین نے جواب دیا کہ اگر ہم آپ کو افتراق پر مجبور کرتے مگر آپ اتحاد کی حمایت کرتے تو آپ کیلئے بڑی گنجائش ہوتی (یعنی آپ حق پر ہوتے) لیکن ہم نے تو آپکو اتحاد پر مجبور کیا ہے اسلئے اس پر معذرت خواہی کی ضرورت نہیں ہے، اسکے بعد ان سے کہا گیا۔ لئن نزعتَ یداً من طاعۃٍ او فرقت اگر آپ طاقت سے دست کشی کرتے یا جماعت میں

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۲۸
[2] العقد الفرید ج ۵ ص ۱۶

جماعة لنفر بن الذی فیه عیناک[۱] پھوٹ ڈالتے تو البتہ ہم آپ کا سر اڑا دیتے۔

اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر سے بیعت تو کر لی تھی لیکن کسی قدر ناگواری کے ساتھ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ واضح اور صاف مسند امام احمد بن حنبل کی روایت ذیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے بطیب خاطر بیعت کی تھی۔

حضرت ابوبکر نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جب خطبہ دیا تو انصار کی کوئی فضیلت نہ تھی جو آپ نے بیان نہ کی ہو۔ اس کے بعد سعد بن عبادہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے جب قریش ولاة هذا الامر یعنی قریش امر خلافت کے سربراہ ہوں گے فرمایا تھا تو اے سعد آپ اُس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہے نا۔؟ سعد بولے "جی ہاں! آپ سچ فرماتے ہیں" اس کے بعد سعد بن عبادہ نے کہا۔ نحن الوزراء وانتم الامراء ہم یعنی انصار وزیر ہوں گے اور آپ لوگ یعنی قریش امیر۔ یاد ہوگا کہ یہ بعینہ وہی بات ہے جو سقیفہ کی مجلس میں حضرت ابوبکر نے انصار کو خطاب کر کے کہی تھی۔ مسند امام احمد کی اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد حضرت سعد بن عبادہ بالکل صدیق اکبر کے ہمنوا ہو گئے تھے اور دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن حجر الہیثمی اس کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ابن عبد البر نے جو یہ لکھا ہے کہ سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر سے بیعت نہیں کی یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی۔ اس روایت سے اس کی تغلیط ہوتی ہے[۲] بلکہ طبری میں تو ایک روایت میں بالکل صاف صاف ہے کہ تتابع القوم علی البیعة وبایع سعد[۳]

(طبری ج ۲ ص ۴۵۹)

حافظ ابن حجر اور ابن عبد البر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں ہی ان سے ناراض ہو کر شام میں جا بسے تھے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں شام گئے ہیں۔

ج ۲ ص ۴۶۰ ۔ [۲] تغلیط ۔ [۳] الصواعق المحرقہ ص ۷

اس بحث سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ انصار اور مہاجرین میں کوئی لائق ذکر شخصیت ایسی نہیں تھی جس نے حضرت ابوبکر سے بیعت نہ کی ہو اور اس معاملہ میں جمہور اُمت سے الگ اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا ہو۔ البتہ ہاں اس میں شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو کھلم کھلا یا درپردہ صدیق اکبر کے انتخاب پر نکتہ چینی کرتے اور اس ذریعہ سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن یہ وہی لوگ تھے جو محض برائے بیت یعنی کسی غرض کیلئے مسلمان ہوئے تھے۔ ورنہ حقیقت میں مسلمان نہیں تھے یہ وہی لوگ ہیں جو بعد میں مرتد کہلائے۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق انہیں کی نکتہ چینی کے جواب میں فرمایا کرتے تھے۔

اَلَسْتُ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ[۲] کیا میں وہ نہیں ہوں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔

ایک شبہ کا ازالہ کسی خوش فہم کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ انتخاب کے وقت خلیفۂ اوّل نے جو خطبہ دیا تھا اس میں تو صاف فرمایا تھا کہ میں اپنے آپ کو تم سب سے زیادہ خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا۔ پھر اب انہوں نے کیسے احق بالخلافہ ہونے کا دعویٰ کیا؟ اصل یہ ہے کہ خطبہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ صدیق اکبر کا طبعی انکسار تھا لیکن اشارۂ چشم و ابروئے نبوت کا رازداں آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ آپ نے خلافت کا بارگراں محض ان ارشادات و ایماءات نبوی کی تکمیل کے جذبہ میں اپنا فرض سمجھ کر برداشت کیا تھا جو آپ کی خلافت کے بارے تھے اور جو کسی پر بھی مخفی نہیں تھے۔ پس جب آپ نے خلافت کو قبول فرما لیا تو اب بحیثیت خلیفہ آپ کا فرض تھا کہ اپنی اس خلافت کو حق ثابت کریں۔ اور اسطرح کسی شخص کو بھی فتنہ انگیزی کا موقع نہ دیں۔ ورنہ جس شخص کو خود اپنے اوپر اعتماد نہ ہو وہ دوسروں سے وفاداری کا مطالبہ کیونکر کر سکتا ہے؟۔

---

[۱] الصواعق المحرقہ ص ۷ [۲] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳

خلافت

بیعت عامہ کے بعد حضرت ابوبکر بالکل بجا اور حق طور پر خلیفہ منتخب ہوگئے۔ لیکن خلافت صدیق کی تاریخ اور اس کے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ خلافت کی تعریف، اس کا مرتبہ و مقام اور اس کیلئے جن اوصاف و کمالات کی ضرورت ہے ان سب پر کلام کیا جائے اور ساتھ ہی آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر کی خلافت کی طرف قولاً وعملاً جو اشارے کئے تھے ان کا بھی ذکر کیا جائے۔

خلافت کی تعریف | خلیفہ کا لفظ خلافت سے مشتق ہے۔ خلافت کے لغوی معنی نیابت جانشینی اور کسی کی قائم مقامی کے ہیں، خلیفہ کو خلیفہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کا قائم مقام نائب اور جانشین ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ خلیفہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے۔ اور ان کا استدلال آیات ذیل سے ہے۔

(۱) اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط	یاد کرو اس وقت کو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانیوالا ہوں۔
(۲) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ۔	اور وہ خدا وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب کر کے ارشاد ہوا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ — اے داؤد ہم نے البتہ تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

اس بنا پر ان علماء کے نزدیک ایک خلیفہ کو اگر خلیفہ اللہ کہہ کر پکارا جائے تو جائز ہے لیکن جمہور علماء اس کو ناجائز اور کسی کو خلیفہ اللہ کہہ کر پکارنے والے کو فاسق اور فاجر

کہتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ قائم مقامی کسی غائب کی ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ پھر اس کی نیابت کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر صدیق کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر خطاب کیا تو آپ نے فرمایا۔

"میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ صلعم کا خلیفہ ہوں" [۱]

خلیفہ کا منصب اور اس کے فرائض و واجبات | چونکہ ایک خلیفہ رسول اللہ صلعم کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے اس بنا پر پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ آپ کا منصب کیا تھا اور آپ کے فرائض و واجبات کیا تھے؟۔

آنحضرت صلعم کے ذمہ جو فرائض تھے اصولی طور پر وہ دو قسم کے تھے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ احکام و ہدایات لینا اور انکو امت تک پہنچانا۔ (۲) امت کے لیئے ایک ایسا مرکز اطاعت و فرماں برداری بننا کہ خواہ کسی قسم کا کوئی معاملہ ہو معاد سے متعلق ہو یا معاش سے، مادی زندگی سے اس کا تعلق ہو یا روحانی۔ کوئی سیاسی امر ہو یا سماجی، کوئی اخلاقی مسئلہ ہو یا اقتصادی ہر ایک میں آپ کا قول ایک آخری اور قطعی حکم کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جس سے انحراف وسرتابی جائز نہیں تھی۔ قرآن مجید کا اعلان ہے۔

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ط	رسول اللہ صلعم تم کو جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس کسی چیز سے تم کو روکیں ترک کر جاؤ۔

ظاہر ہے کہ پہلا فرض صرف آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص تھا۔ آپ خاتم النبیین تھے۔ جب آپ کی وفات ہوئی تو وحی کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا اور اب کسی شخص کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

البتہ ہاں دوسرا فرض وہ برابر قائم ہے اور قائم رہے گا۔ آنحضرت صلعم کی جب وفات ہوئی تو اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے ارشاد کے مطابق شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ احکام و مسائل کی قانونی تنقیحات متعین ہو چکی تھیں اور اب آپ کے

---

[۱] الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴

بعد والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قانون کی روشنی میں امت کی رہنمائی کریں پھر اس دوسرے فرض کے دو پہلو ہیں۔ ایک احکام الٰہی کی تبلیغ واشاعت اور دوسرے ان احکام کا اجراء اور ان کی تنفیذ تبلیغ واشاعت ہر صحابی کا فرض تھا لیکن احکام کی تنفیذ اور اُن کا اجرا بغیر سیاسی طاقت واقتدار کے ممکن نہیں تھا۔ پس اس سیاست کا جس کو ہم سیاستِ شرعیہ بھی کہہ سکتے ہیں جو مرکز ہوگا وہی خلیفہ یا امام کہلائے گا۔

ایک خلیفہ اپنے عہد میں پوری امت کا مرکز اطاعت ہوتا ہے اور اسکو مسلمانوں پر روحانی اور جسمانی سیاسی اور اخلاقی ہر قسم کا اقتدار حاصل ہوتا ہے چونکہ اس کی حیثیت قانون کی شارح[1] اور احکام کو نافذ کرنیوالے کی ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس کا ہر قول قولِ فیصل اور اس کا ہر حکم واجب الاتباع ہوتا ہے۔ اس سے بغاوت کرنا یا اس کی نافرمانی ایسا ہی گناہ ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلعم کی، چنانچہ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ جن "اولوالامر" کی اطاعت کا حکم ہے ان سے مراد وہی لوگ ہیں جو منصب خلافت پر سرفراز ہوں۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے۔

من اطاعنی فقد اطاع اللہ	جو شخص میری اطاعت کرتا ہے اس نے
ومن عصانی فقد عصی اللہ	اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی
ومن اطاع امیری فقد اطاعنی	اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس شخص نے میرے
ومن عصی امیری فقد عصانی	امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی۔ اور میرے
(کتاب الاحکام)	امیر کی جس نے نافرمانی کی اُس نے خود میری نافرمانی کی۔

[1] یہ واضح رہنا چاہیئے کہ خلیفہ کی حیثیت صرف قانونِ شریعت کے شارح کی ہے۔ خود قانون ساز کی نہیں ہے۔ قانون وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خلیفہ اسلامی شریعت کے مسلمہ قانون (معروف) کے خلاف کوئی حکم دے تو چونکہ اس نے یہ کام اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کیا ہے۔ اس بنا پر اسکی اطاعت کا حکم نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے لاطاعۃ الافی معروف۔

اس حدیث میں لفظِ امیر سے بھی خلیفہ مراد ہے چنانچہ امام بخاری نے جس باب کے ماتحت اس روایت کو نقل کیا ہے اس کا ترجمہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ مقرر کیا ہے۔

خلیفہ کیلئے ضروری اوصاف وکمالات

چونکہ سوائے وحی الٰہی کے اور تمام پیغمبرانہ فرائض کی انجام دہی خلیفہ کے ذمہ ہوتی ہے اس بنا پر ظاہر ہے اسکو ان روحانی جسمانی اور اخلاقی کمالات وفضائل سے متصف ہونا چاہیئے جن سے ایک پیغمبر متصف ہوتا ہے اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ان کمالات کے ساتھ اس کا درجۂ اتصاف وہ نہیں ہو سکتا جو ایک پیغمبر کا ہوگا کیونکہ اصل بہرحال اصل ہے اور فرع بہرحال فرع۔ تاہم ان پیغمبرانہ اوصاف وشمائل کا عکس اس کے اندر ضرور ہونا چاہیئے۔

اسی حقیقت کا تجزیہ وتحلیل کر کے علماء نے خلافت وامامت کے شرائط کا تعین اپنے اپنے مذاق کے مطابق کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون کے نزدیک اس منصبِ جلیل وعظیم کے لیے چار شرطیں ہیں۔

(۱) علم:۔ جب تک خلیفہ کو احکام ومسائل شریعت اور ان کے منابع ومآخذ کا علم نہ ہوگا۔ وہ احکامِ خداوندی کا اجرا کیونکر کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں علماء کی رائے میں صرف عالم ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو صاحب اجتہاد بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ تقلید نقص ہے اور امامت چاہتی ہے کہ اوصاف واحوال میں کمال ہو۔

(۲) عدالت:۔ چونکہ خلافت ایک منصب دینی ہے اس بنا پر خلیفہ میں عدالت یعنی راست بازی اور نیکوکاری کا ملکہ راسخ ہونا ضروری ہے۔ اگر خلیفہ ممنوعات ومحرمات شرعیہ کا ارتکاب کرتا ہے تو عدالت بالاتفاق ختم ہو جائیگی۔ البتہ اعتقادی بدعتوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں اختلاف ہے۔

(۳) کفایت:۔ اس سے یہ مراد ہے کہ خلیفہ میں حدود شرعیہ کو قائم کرنے، مملکت اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے جس سمجھ بوجھ حسن تدبیر عزم وہمت اور استقلال وجفاکشی کی ضرورت ہے۔ یہ سب اس میں پائے جائیں۔

(۴) سلامتِ حواس واعضا جس کی وجہ سے اس کی کسی رائے اور عمل پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے یعنی خلیفہ کو آنکھ ناک کان ہاتھ پاؤں غرض ہر جسمانی عضو وجارحہ کے اعتبار سے تندرست وتوانا اور صحیح وسلامت ہونا چاہیئے۔ اسی طرح باطنی قوتوں یعنی ذہانت وفطانت۔ حسن تدبیر اور اعتدال مزاج وطبیعت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہیئے۔ [1]

امام ابوالحسن الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے انہیں اوصاف وشروط کو ذرا پھیلا کر لکھا ہے تو نسب کو چھوڑ کر جس کی بحث آگے آتی ہے چھ کر دیا ہے [2]

مذکورہ بالا اوصاف وشروط تو وہ ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے ان کے علاوہ ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا خلیفہ کے لیئے نسب کی بھی شرط ہے؟ اور اگر ہے تو کیا اسکو خاندان نبوت میں سے ہونا چاہیئے۔ یا صرف قریشی ہونے کی شرط ہے۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی سیاسی اعتبار سے کچھ ایسی صورتِ حالات پیدا ہو گئی کہ یہ مسئلہ نہایت اہم بن گیا۔ ورنہ درحقیقت بات بالکل واضح اور صاف ہے۔

خلافت کے لئے قرابتِ رسول کی شرط

جہاں تک خلافت کیلئے قرابت رسول ؐ کی شرط کا تعلق ہے تو ہر شخص جس نے اسلام کا اور آنحضرت ؐ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے جانتا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان والوں کے ساتھ مرتبہ، ومنصب وراحت وآسائش یا دولت وثروت کے اعتبار سے کبھی کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا۔

آپ کو حضرت فاطمہ زہرا کے ساتھ جو محبت تھی اہل بیت میں کسی کے ساتھ نہیں تھی اور پھر حضرت علی ابن عم بھی تھے اور چہیتی بیٹی کے شوہر بھی، ایک شہنشاہِ کونین اگر چاہتا تو ان دونوں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن جس ذاتِ قدسی صفات نے کونین کی شہنشاہی کے باوجود فقر کو اپنے لئے فخر کہا ہو،

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۶۱ [2] الاحکام السلطانیہ ص ۴

اس سے اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی تھی کہ جب اُس کی جگر گوشہ (حضرت فاطمہؓ) نے شکایت کی کہ چکی چلاتے چلاتے ہاتھ میں گٹے پڑ گئے ہیں۔ تو کسی غلام یا باندی کا انتظام کرنے کی بجائے ایک تسبیح بتا دی۔

پھر چونکہ اسلام اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے) کی حقیقت کو دنیا میں ثابت اور قائم کرنا چاہتا تھا اس بنا پر رنگ ونسل اور حسب ونسب کے امتیازات کا خاتمہ کرنا اس کے لئے ضروری تھا آنحضرت ؐ نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح ایک غلام زید بن حارثہ سے کر کے اور پھر حضرت زید کی طلاق کے بعد خود ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرما کر اسلام کی اس تعلیم کیلئے ایک نمونہ قائم کر دیا تھا، اس بنا پر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ؐ نے خلافت کے معاملہ میں اپنے خاندان کی تخصیص کی ہو۔

صرف یہ نہیں کہ آپ نے اس معاملہ میں کوئی تصریح ہی نہیں کی۔ بلکہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر آنحضرت ؐ سے آل بیت میں سے کسی کی خلافت کے بارہ میں دریافت کیا جاتا تو آپ نفی میں جواب دیتے۔ چنانچہ حضور کے مرض وفات میں ایک مرتبہ حضرت عباس حضرت علی سے ملے۔ تو کہا کہ مجھ کو آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ؐ اس مرض سے جاں بر نہیں ہوں گے۔ تو ذرا آپ سے دریافت کر لو کہ کیا آپ کے بعد خلافت ہم کو یعنی بنو ہاشم کو ملے گی۔ اگر ایسا ہو گا تو حضور بیان فرما دیں گے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں ہرگز آپ سے دریافت نہیں کروں گا کیونکہ اگر آپ نے اس وقت انکار فرما دیا تو پھر کبھی ہم کو خلافت کی توقع نہیں ہو سکتی۔ [1]

علاوہ ازیں خلافت ایک عالمگیر دینی منصب ہے اور خلیفہ کو پورے عالم اسلام

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۳۷

میں اپنے روحانی اور جسمانی واخلاقی کمالات واوصاف کے اعتبار سے بلند تر ہونا چاہئے
پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کو کسی ایک خاص خاندان کے ساتھ خواہ وہ اپنے بانی اور
مورثِ اعلیٰ کی طرف نسبت کی وجہ سے کتنا ہی موقر و ممتاز اور سرفراز و سربلند ہو مخصوص
کر دیا جاتا۔ ایسا کر دینا اسلامی نظامِ حکومت کی جمہوری اسپرٹ کے سرتاسر خلاف
تھا اور اس سے اسلام اسماعیلی مذہب یا پاپائیت کی شکل اختیار کر لیتا۔

اہل بیت میں سے اگر آنحضرت ؐ کسی کو خلافت کے لئے نامزد فرماتے تو وہ حضرت
علیؓ کے سوا دوسرا کون ہو سکتا تھا۔ جامۂ خلافت فاتح خیبر کے قامتِ موزوں پر
راست آتا تھا اور وہ بجا طور پر اس کے مستحق بھی تھے لیکن آنحضرت ؐ نے ایسا نہیں کیا۔
جس کا اعتراف خود حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کو بھی تھا کیوں؟ اس میں دو مصلحتیں تھیں۔
(۱) آنحضرت ؐ یہ سمجھتے تھے کہ اگرچہ آپ حضرت علیؓ کا استخلاف ان کے ذاتی اوصاف
وکمالات کی بنا پر کریں گے لیکن مسلمانوں کو اس سے یہ اشتباہ ہو سکتا ہے
کہ خلافت خاندانِ نبوت میں محدود ہو گئی اور یہ چیز قطعاً اسلام کی اصل روح
اور اس کی تعلیمات کے خلاف تھی۔ پھر
اس بات کی کون ضمانت لے سکتا تھا کہ خاندانِ نبوت میں ہمیشہ اسد اللہ الغالب
ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔

(۲) آنحضرت ؐ نے اپنی چشمِ دُور بیں سے دیکھ لیا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد ہی
فتنہ و فساد اور کفر و ارتداد کا ایک عظیم طوفان اُمنڈنے والا ہے اور اس کا مقابلہ
کرنے کے لیئے نہ فقط جلالِ فاروقی کافی ہو سکتا ہے اور نہ صرف شجاعت حیدری
بلکہ دلبری کے ساتھ قاہری، جوش کے ساتھ ہوش اور نرمی کے ساتھ گرمی مل کر
ہی اس زہر کا تریاق ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے جاہ و جلال رعب و
داب اور طاقت و قوت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن سقیفۂ بنی ساعدہ
میں حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام خلافت کے لیئے پیش کیا اور فرمایا کہ
تم مجھ سے زیادہ قوی ہو تو فاروقِ اعظمؓ نے جواب میں کس قدر بلیغ فقرہ ارشاد فرمایا۔

"ان قوتی لک مع فضلک"[1] "میری ساری قوت تو آپ کیلئے ہی وقف ہے اور آپ میں تو فضل بھی ہے"
خلافت کے لئے

قریشی ہونیکی شرط

اسی سلسلہ میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط ہے؟
اس مسئلہ کا تعلق دراصل علم الفقہ سے ہے اور وہ علم الکلام کے دائرہ بحث
میں نہیں آتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت
دیدی گئی اس بنا پر اس کی حیثیت بجائے جزائی مسئلہ ہونے کے اصولی مسئلہ کی ہو گئی
ہے اور اسی وجہ سے اسکو علمائے کلام نے فقہ کے دائرہ سے نکال کر علم الکلام کے مباحث
میں شامل کر لیا ہے۔

ماوردی نے خلافت کیلئے جو شروطِ معتبرہ گنوائی ہیں ان میں ساتویں شرط
قریشیت بیان کی ہے اور اس کو متفق علیہ کہا ہے[2] علامہ ابن خلدون نے بھی اس
شرط کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کو مختلف فیہ کہتے ہیں۔

واختلف فی شرطٍ خامس وھو النسب القرشی[3] — اور پانچویں شرط یعنی قریشی النسب ہونا اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور صحیح بھی یہی ہے چنانچہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک خلیفہ کے لئے قریشی ہونا
ضروری نہیں ہے حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیریؒ مواہب الرحمٰن سے

---

[1] ابن سعد بحوالہ الصواعق المحرقہ ص ۷۔ حضرت ابو بکر کی نرمی اور رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاطمہؓ نے
مکان پر اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرماتی ہیں اور آنحضرت ؐ کو ان کے ساتھ جو محبت تھی اسکا حوالہ دیتی ہیں تو بے
ساختہ رو نے لگتے ہیں اور ہچکی بندھ جاتی ہے۔ حضرت علی انکی طرف سے اپنے ملال کا اظہار کرتے ہیں تو پیشانی
پر بل نہیں پڑتا بلکہ لجالجا کر معذرت پیش کر رہے ہیں۔ سعد ابن عبادہ کے ساتھ حضرت عمر تلخ کلامی کرتے ہیں تو
انکو روک رہے ہیں لیکن ساتھ ہی قہر کا عالم یہ ہے کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کے بارہ میں فاروق اعظم
ذرا پس و پیش کرتے ہیں تو حضرت ابو بکر ان کو طعنہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں اجبار فی الجاھلیۃ
وخوار فی الاسلام" واہ کیا خوب اسلام سے پہلے آپ بڑے سخت اور متشدد تھے۔ مگر
اب اسلام کے عہد میں یہ کمزوری [2] الاحکام السلطانیہ ص ۴ [3] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۹۱۔

نقل کرتے ہیں کہ۔

انہا لیست بشرط عند امامنا۔ قریشیت ہمارے امام صاحب کے نزدیک امامت کیلئے شرط نہیں ہے

اس کے بعد تحریر المختار فی المناقضات علی رد المختار کے حوالہ سے فرماتے ہیں

کہ امام ابو یوسف کی رائے بھی یہی ہے [1]

ابن خلدون کی رائے اور ان کے دلائل | ابن خلدون نے اگرچہ اس کو مختلف فیہ بتایا ہے لیکن وہ خود اس شرط کی حمایت میں ہیں اور خلافت و امامت کے لئے اس کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

موصوف نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے ہیں اگر ان کو ترتیب وار بیان کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے "الائمۃ من قریش"

(۲) سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار نے حضرت سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب ابو بکر صدیق نے ان کو آنحضرت ؐ کا مذکورہ بالا ارشاد گرامی یاد دلایا تو سب خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اس وقت کسی نے بھی حضرت ابو بکر کی تردید نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کا قریشیت کی شرط پر اجماع تھا اور وہ سب ارشاد نبوی الائمۃ من قریش سے واقف تھے۔

(۳) صحیح حدیث میں ہے کہ یہ امر یعنی خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "اسی طرح کی دلیلیں کثرت سے وہ ہیں۔ لیکن جب قریش کے حالات کمزور ہو گئے اور راحت پسندی و آرام طلبی میں پڑ جانے کی وجہ سے انکی عصبیت (خاندانی خصوصیت) پارہ پارہ ہو گئی تو وہ خلافت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان پر عجمی غالب آگئے اور وہی ارباب حل و عقد بن گئے۔ اس سے اکثر محققین کو اشتباہ پیدا ہو گیا اور وہ سرے سے قریشیت کی شرط کے ہی منکر ہو گئے [2]

---

[1] فیض الباری ج ۴ ص ۴۹۸ [2] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۶۲

علامہ ابن خلدون کے دلائل پر بحث | غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابن خلدون کی تینوں دلیلوں میں سے کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی اعتراض یا اشکال وارد نہ ہوتا ہو۔ سب سے زیادہ مؤثر اور قوی پہلی دلیل ہے اس پر چند وجوہ سے اشکال وارد ہوتا ہے۔

(الف) الائمۃ من قریش کا مطلب کیا ہے؟ یعنی یہ انشا ہے یا خبر۔

(ب) اگر خبر ہے اور اس کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ؐ دے رہے ہیں کہ امت میں جو امام پیدا ہونگے وہ قریش میں سے ہی ہونگے تو ظاہر ہے کہ یہ خبر صادق نہیں ہے تاریخ اسلام میں سب نہ سہی وقتاً فوقتاً ایسے خلفا ضرور پیدا ہوتے رہے ہیں جو اقامت دین کا فرض ادا کرتے تھے اور جملہ شرائط امامت کے جامع تھے لیکن قریشی نہیں تھے۔

(ج) اگر انشا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضور ؐ حکم دے رہے ہیں کہ جو امام منتخب کیا جائے اس کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے تو پھر ان روایات کا کیا جواب ہوگا جن میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک عبد حبشی بھی تمہارا امام ہو تو اس کی اطاعت کرو۔

عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کأن راسہ زبیبۃ [1]	انس بن مالک سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا۔ تم سمع و اطاعت سے کام لو اگرچہ تمہارا امام ایک حبشی غلام ہو جس کا سر ایک کشمش کے دانہ کی طرح نظر آتا ہو۔ یعنی بدصورت و کریہہ المنظر ہو۔

ایک غیر قریشی کی امامت اگر منعقد ہی نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی اطاعت کا حکم کیسا؟ یہ واضح رہنا چاہئے کہ امام بخاری نے اسی روایت کو کتاب الصلوۃ میں

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۷ کتاب الاحکام۔ کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ حدیث میں "استعمل" کا لفظ ہے۔ نہ کہ "استخلف" کا کیونکہ امام بخاری نے اس روایت کو جس باب کے ماتحت درج کیا ہے اس کا ترجمہ "السمع والطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ" ہے اس سے معلوم ہوا کہ "استعمال" سے مراد استخلاف ہے۔

باب امامة العبد والمولی" کے ماتحت بھی درج کیا ہے جس سے مقصد اس بات کیطرف اشارہ کرنا ہے کہ جب ایک عبد کو امامتِ کبریٰ کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو وہ امامتِ صغریٰ یعنی نماز میں امام بننے کا اہل کیوں نہیں ہوگا؟۔

علاوہ ازیں صحیح بخاری میں ہے۔

ان هٰذا الامر فی قریش لا یُعادیہم احد الا کبہ اللہ علی وجہہ ما اقاموا الدین [1]

جب تک قریش دین کی اقامت کرتے رہیں گے یہ امر (خلافت) انہیں میں رہیگا جو کوئی اس میں ان سے جھگڑا کرے گا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔

اب فرض کرو اس حدیث کے مطابق اور جیسا کہ خود تاریخ سے ثابت ہے ایک ایسا وقت آگیا جبکہ قریش اقامتِ دین کے قابل نہیں رہے تو اب سوال یہ ہے کہ چونکہ منصب امام پوری امت پر فرض کفایہ ہے اس لئے ایسی صورت میں امام کا انتخاب کیونکر کیا جائے گا؟ جو قریشی ہے وہ اقامتِ دین سے عاجز ہے اور جو اقامتِ دین کر سکتا ہے وہ بد قسمتی سے قریشی نہیں۔ ان دونوں میں کس کو امام بنایا جائے؟ اگر قریشی کو ہی تو پھر "ما اقاموا الدین" کا مطلب کیا ہوا؟ اور اگر غیر قریشی کو تو پھر ظاہر ہے کہ الائمۃ من قریش انشا کے لئے نہیں ہوا اور اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہوئی کہ امام وخلیفہ کے لئے قریشی النسب ہونا ضروری ہے۔

سالم حضرت ابوحذیفہ کے غلام تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت عجیب خوش الحانی سے کرتے تھے جب یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تو لوگ کہتے تھے۔ ذھب ربع القرآن [2] حضرت عمر فاروق کو ان کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ لوکان سالم حیا لولیتہ' اگر سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو امیر بناتا۔ حضرت عمر خود اجلۂ قریش میں سے تھے اور حضرت ابوبکر نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب حدیث "الائمۃ من قریش" پڑھی تھی تو اس وقت وہ خود بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت

---

[1] کتاب الاحکام باب الامراء من قریش [2] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۲۲۶

عمر فاروق کا ایک غلام کی نسبت یہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمر حدیث زیر بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں سمجھتے تھے کہ امام کا قریشی ہونا ضروری ہے اور اس کے بغیر امامت کا انعقاد ہو ہی نہیں سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اچھا جب الائمۃ من قریش نہ انشا ہے اور نہ خبر تو پھر آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جس طرح ہر خاندان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور عام بول چال میں اس خصوصیت کو اس خاندان کے لوگوں میں محدود کر کے بولتے ہیں۔ مثلاً ہم یوں کہیں کہ علما تو دیوبندیوں یا فرنگی محلیوں میں ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ علماء دیوبند اور فرنگی محل کے علاوہ کہیں اور پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کا منشا یہ ہے کہ امامت کے لئے جن اوصاف و کمالات کی ضرورت ہے مثلاً۔ تدبیر۔ شجاعت شہامت، قیادت کی صلاحیت یہ سب قریش میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اوصاف قریش کے علاوہ کسی اور خاندان یا قبیلہ کے کسی شخص میں پائے ہی نہیں جا سکتے۔ بہر حال مدار امامت وہ اوصاف و کمالات ہوئے جو قریش کا طغرائے امتیاز تھے، نہ کہ خود قریشی النسب ہونا۔

علامہ ابن خلدون کے کلام میں تضاد

عجیب بات ہے کہ علامہ ابن خلدون جنھوں نے شرط قریشیت کی بڑی پرزور حمایت کی ہے اسی بحث میں جب اس شرط کی حکمت پر گفتگو کرتے ہیں تو ایسی تقریر کر جاتے ہیں جس سے شرط قریشیت کی نفی ہوتی ہے اور اگرچہ پیرایۂ بیان بدلا ہوا ہے لیکن اس تقریر کا حاصل بھی وہ ہی نکلتا ہے جو ہم نے ابھی حدیث زیر بحث کی توجیہ میں لکھا ہے۔ چونکہ اس تقریر میں بعض بڑی اہم باتیں بھی قلم سے نکل گئی ہیں اسلئے کسی قدر طویل ہو جانے کے باوجود ہم اسی کو بجنسہ نقل کرتے میں لکھتے ہیں۔

"اب ہم امامت وخلافت میں نسب (قریشیت) کی شرط کی حکمت پر کلام کرتے ہیں تاکہ ان مذاہب میں جو حق ہے وہ ظاہر ہو جائے اور ہم کہتے ہیں کہ تمام احکام شرعیہ کے مقاصد بھی ہوتے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی ہوتی ہیں، جہاں تک قریشی النسب ہونے کی شرط کا تعلق ہے تو اس میں شارع کی حکمت صرف اس قدر ہی نہیں ہے۔

کہ اس ذریعہ سے آنحضرت صلعم کی قرابت سے برکت و سعادت حاصل کی جائے۔ اگرچہ یہ برکت بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن تبرک مقاصدِ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔

جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نسب کی شرط لگانے میں حکمت اور مقصدِ شارع یہ ہے کہ اس ذریعہ سے امت میں استحکام اور مضبوطی رہے اور ان میں آپس میں گروہ بندی اور تفرق و تشتت پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ قریش مضر سے زیادہ طاقت و سطوت اور دبدبہ و رعب رکھتے تھے اور پورا عرب ان کی سیادت و عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے برعکس قبائل مضر میں یہ بات نہیں تھی اس لیئے اگر خلافت غیر قریش میں چلی جاتی تو پھوٹ پڑ جاتی اور وحدت کلمہ باقی نہیں رہتی ابن اسحٰق نے بھی کتاب السیر وغیرہ میں یہی لکھا ہے۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرشیت کی شرط دفع تنازع اور اتحادِ کلمہ کی بقا کی غرض سے ہے اور ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شارع اپنے احکام کسی گروہ۔ زمانہ یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کرتا ہے تو اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ قرشیت کی شرط کا دراصل مفہوم وہ ہی ہے جو کفایت[1] کا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص بھی مسلمانوں کا والی یا امام ہو اُس کیلئے ہم نے اس بات کی شرط لگائی ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت یا ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کی سیادت اور عظمت مسلّم ہو۔ اور مسلمانوں میں جس کو اعتبار و وقار حاصل ہو، جیسا کہ قریش کو عرب میں حاصل تھا[2]

اس تقریر کے اخیر فقروں کو غور سے پڑھو اور بتاؤ کہ کیا اس کا حاصل اور مطلب ٹھیک ٹھیک وہی نہیں ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے یعنی آنحضرت صلعم نے قریش کو بطور تمثیل پیش کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ امام اپنے زمانہ میں ایک ایسی با اقتدار جماعت کا فرد ہو جیسا کہ قریش عہدِ نبوت و خلافت میں تھے تاکہ اس میں امامت کے اوصاف و کمالات بدرجۂ اتم پائے جائیں تو گویا اصل مقصد وہ اوصاف و کمالات ہیں جن کے مظہر اس زمانہ

---

[1] کفایت کی تعریف اس بحث کے شروع میں ہی گزر چکی ہے اسے پھر دیکھ لیا جائے۔ [2] تاریخ ابن خلدون جلد اوّل ۱۶۲ - ۱۶۳

میں قریش تھے نہ کہ محض نسباً قریشی ہونا۔ فشتان ما بینهما۔

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق نے الائمۃ من قریش سے جو استدلال کیا تھا اور صحابۂ کرام اس پر خاموش رہے تھے اس وقت اس سے ان کی مراد کیا تھی؟ بے شبہ انکا مطلب صرف اس قدر تھا کہ اس وقت کی سوسائٹی میں اور اُن حالات میں قریش کو ہی یہ مرتبہ و مقام حاصل تھا کہ مسندِ امامت پر متمکن ہوں۔ غیر قریشی کے امام بننے سے ملت اسلامی میں استحکام اور اجتماعیت کا قیام ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت ابوبکر نے جو تقریر کی تھی اس میں آپ نے فرمایا تھا۔

وان العرب لا تعرف هذا الامر الا لهذا الحی من قریش[1] — اور عرب اس قبیلۂ قریش کے سوا کسی اور کی ولایت و امارت سے آشنا ہی نہیں ہیں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود قریش میں ابوبکر و عمر اور عثمان و علی جیسی شخصیتیں موجود ہوں تو پھر وہاں کسی اور کو بھی امامت و خلافت کا استحقاق ہو سکتا ہے؟۔

اب رہی یہ بات کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی، تو اول تو یہ ارشاد مطلقاً نہیں ہے بلکہ "ما عدلوا"، یا "ما اقاموا الدین" کی قید کے ساتھ ہے اور اس قید کیساتھ اس کا جو مطلب ہو وہ ظاہر ہی ہے اس کے علاوہ ہر چیز کا بقا اس کے اوصاف و خصائص کی بنا پر ہوتا ہے ارشاد گرامی کا منشا یہ ہے کہ جب تک قریش قریش رہیں گے یعنی اپنے امتیاز و اوصاف پر قائم رہیں گے۔ ان میں خلافت رہے گی اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر قریش میں ابوبکر و عمر برابر پیدا ہوتے رہتے تو پھر کس کی مجال تھی کہ ان سے خلافت سلب کر سکتا۔

خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ | اس سلسلہ میں دوسرا اہم مسئلہ انتخابِ خلیفہ کا ہے اس کے لیئے کیا طریقہ ہونا چاہیئے۔ قرآن مجید میں یا حدیث میں صراحت کیساتھ اس بارہ میں

---

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۴۴ ان الفاظ کیساتھ ساتھ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اگر اوس میں سے کوئی خلیفہ ہوا تو خزرج والے نہیں مانیں گے اور اگر خزرج میں سے کوئی ہوا تو اوس نہیں مانے گا۔

کوئی حکم نہیں البتہ چند اشارات ہیں جن سے خلفائے راشدین کے تعامل کی روشنی میں کچھ اصول مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ مسلمانوں کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوگا

اس معلوم ہوا کہ شخصی استبداد اور تحکم کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں جب خود آنحضرت صلعم کو بحکم وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ مشورہ کرنے اور دوسروں سے استمزاج کا حکم ہے تو پھر کسی اور کا کیا ذکر؟

اب رہی یہ بات کہ استمزاج واستصواب آج کل کی جمہوریتوں کے قانون و دستور کے مطابق مملکت کے ہر بالغ مرد سے کیا جائے جس کو Adult franchise کہا جاتا ہے یا صرف اربابِ حل وعقد سے جن کی حیثیت آجکل کی آئینی اصلاح میں نمائندگان اسمبلی یا ممبران پارلیمنٹ کی ہوتی ہے اس معاملہ میں قرآن نے پہلی صورت یعنی بالغوں کے حق رائے دہندگی کو تسلیم نہیں کیا ہے اور دوسری صورت کا اثبات کیا ہے اور صاف کہا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ — کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا۔

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ — اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو۔

اسلام حقانیت وصداقت کا مذہب ہے۔ ہر چیز کو اس کی اصل ماہیت ونوعیت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور عوام فریب الفاظ واصطلاحات کا طلسم نہیں باندھتا۔ اس بناء پر وہ اس بات کا قائل نہیں کہ ایک جاہل، کندۂ ناتراش اور شریر وفتنہ پرور انسان کو بھی ووٹ دینے کا ایسا ہی حق ہے جیسا کہ ایک صاحبِ علم وفہم اور متقی وصالح کو ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اربابِ حل وعقد کا تعین کیونکر کیا جائیگا؟ ہمارے زمانہ میں لوگ عوام سے جھوٹے سچے وعدے کرکے اور چند نمائشی کارنامے انجام دے کر ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اس طرح اسمبلی کونسل یا میونسپل بورڈ کے

منتخب ہوجاتے ہیں وہی قوم کے نمائندے اور اس کے اربابِ حل وعقد سمجھے جاتے ہیں لیکن اسلام ان لوگوں کو اربابِ حل وعقد سمجھتا ہے جو قوم میں اپنے فہم وتدبر، عملِ صالح اور بلند کیرکٹر کی وجہ سے عوام کے مرجع اور اُن کے معتمد علیہ ہوں۔ انہوں نے اپنے لئے قوم سے کوئی ووٹ نہ مانگا ہو۔ اور ووٹ حاصل کرنے کیلئے اپنے کارناموں یا آئندہ کے منصوبوں کی کوئی طویل فہرست نہ شائع کی ہو لیکن اس کے باوجود ملتِ اسلامیہ نے انکی ذہنی اور عملی سربلندیوں سے متاثر ہوکر خود ان کو اپنا امام یا لیڈر تسلیم کرلیا ہو پس قرآن مجید میں جن لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم ہے وہ یہی لوگ ہیں۔

ان اصولی اشارات کے علاوہ خاص خلیفہ کے انتخاب سے متعلق قرآن وحدیث میں کسی مخصوص نظام یا طریقہ کا حکم نہیں دیا گیا اسی بنا پر حضرت عمرؓ ان تین چیزوں کا ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے کہ اگر آنحضرت صلعم ان کی حقیقت بتا جاتے تو مجھ کو دنیا اور مافیہا سے زیادہ عزیز ہوتی۔ ان میں سے ایک خلافت بھی ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر جب لوگوں نے آپ سے جانشینی کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ میں کسی کو نامزد کردوں یا نہ کردوں میرے لئے دونوں راستے موجود ہیں کیونکہ آنحضرت صلعم نے کسی کو نامزد نہیں کیا لیکن ابوبکرؓ نے مجھ کو نامزد کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے اس قول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں ان کے ذہن میں کوئی قطعی حکم نہیں تھا اور اسکو مسلمانوں اور ان کے اربابِ حل وعقد کی رائے پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ موقع اور محل کے مناسب جو طریقہ پسندیدہ ہو اختیار کرلیں، چنانچہ چاروں خلفاء میں سے ہر ایک کا انتخاب ایک جداگانہ طریقہ پر ہوا۔ ہم ذیل میں اس کی تفصیل درج کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ایک انتخابی مجلس مشاورت میں ہوا جس میں سب انصار اور اکابر مہاجرین موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب اپنی تقریر سے انصار کو مطمئن کردیا اور ان سے یہ تسلیم کرالیا کہ خلیفہ کوئی قریش میں ہی سے ہونا چاہئے تو پھر آپ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کے نام پیش کئے، اتنے میں جھٹ حضرت عمرؓ نے بیعت کیلئے حضرت ابوبکرؓ کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ حضرت عمرؓ کا پیش قدمی کرنا تھا کہ

انصار و مہاجرین ٹوٹ پڑے اور حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہوگئے

حضرت ابوبکر کا یہ انتخاب اگرچہ انتخاب عام تھا یا کم از کم کثرتِ آراء سے ہوا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک فوری کارروائی تھی۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ جب کوئی شخص چاہے حضرت عمر کی طرح اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں کسی نے کہا کہ امیر المؤمنین (عمر فاروق) کا انتقال ہوگیا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔ چونکہ بغیر کسی مشورہ کے محض شخصی پسند پر کسی کو خلیفہ مان لینا اسلام کی تعلیم کے خلاف تھا اس پر جب حضرت عمر کو اس شخص کا یہ قول پہونچا تو آپ سخت غضب ناک ہوئے اور حضرت ابوبکر کی بیعت کو ایک استثنائی مثال قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فلا یغترن امرؤ ان یقول انما کانت بیعۃ ابی بکر فلتۃ وتمت الا وانہا قد کانت کذالک ولکن اللہ وقی شرھا۔

کوئی شخص دھوکہ میں پڑکر یہ نہ کہے کہ ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی تھی اور پھر بھی درست ہوگئی خبردار ہاں وہ ایسی ہی اچانک ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جلدبازی کے شر سے محفوظ رکھا۔

اس کے بعد فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ یہ بیعت اچانک اور دفعۃً سہی لیکن آخر بیعت تھی کس کے ہاتھوں پر! صدیق اکبر کے ہاتھ پر! جن سے زیادہ مستحق خلافت کوئی اور دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ حضرت عمر کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

ولیس منکم من تقطع الاعناق الیہ مثل ابی بکر

اور تم میں ابوبکر جیسا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے پاس دور دراز سے لوگ سفر کرکے آتے۔

حضرت ابوبکر کی بیعت کا یہ واقعہ جو ایک استثنائی حیثیت رکھتا تھا اگر حضرت ابوبکر کا واقعہ نہ ہوتا تو خود حضرت عمر کے نزدیک ایک عظیم شر اور فتنہ کا باعث ہو سکتا تھا، اسی بنا پر بطور اصول کے حضرت عمر نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرلینا اس شخص کو خلیفہ نہیں بنا دیتا ہے۔

من بایع رجلاً عن غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبایع ھو [1]

جس شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے بیعت کی تو اس سے وہ شخص خلیفہ نہیں بن گیا۔

پہلے دن حضرت ابوبکر کا انتخاب ایک خاص مجلس میں ہوا اور اگرچہ اچانک ہوا لیکن اس وقت کی سب سے پارٹیوں کے نمائندوں کی موجودگی میں ہوا اور بلا مقابلہ ہوا اسکے بعد دوسرے روز مسجد میں بیعتِ عامہ ہوئی اور ایک لائق ذکر شخص بھی ایسا نہیں رہا جس نے بیعت نہ کی ہو یا کم از کم اس انتخاب کی مخالفت میں آواز بلند کی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کا انتخاب اور پھر بیعت کے ذریعہ تمام مسلمانوں کا اس انتخاب پر اپنی رضامندی کا عملاً اظہار ضروری ہے۔

(۲) خلیفۂ رسول صلعم کے بعد خلیفۂ دوم کا انتخاب اس طرح ہوا کہ اگرچہ حضرت ابوبکر کو اس کا یقین تھا کہ حضرت عمر سے بڑھ کر دوسرا کوئی شخص ان کی جانشینی کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تاہم اس معاملہ میں انہوں نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور بحث و تمحیص کے بعد آخر حضرت عمر کے حق میں عہد نامۂ خلافت لکھوایا اور اپنے غلام کو دیا کہ مجمع عام میں جاکر سنا دے پھر خود بالاخانہ پر پہونچکر لوگوں سے جو نیچے جمع تھے پوچھا کہ میں عمر کو نامزد کرتا ہوں تم لوگ اس کو پسند کرتے ہو؟ سب نے سمعنا اطعنا کہا۔

(۳) خلیفہ سوم حضرت عثمان کا انتخاب اس طرح ہوا کہ ایک زخم کاری کے بعد حضرت عمر کو اپنے جانبر نہ ہوسکنے کا یقین ہوگیا تو چھ نامورانِ قریش حضرت علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کی ایک کونسل بنادی اور وصیت کی کہ چھ آدمی اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ فاروق اعظم کی وفات کے بعد کونسل کا جلسہ ہوا۔ دو روز تک بحث ہوتی رہی۔ لیکن فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر تیسرے دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجویز کے مطابق تین حضرات نے اپنے نام واپس لے لئے اور اب خلافت بجائے چھ کے تین شخصوں میں دائر رہ گئی۔ جن میں سے ایک خود عبدالرحمٰن بن عوف بھی تھے۔ بعد میں انھوں نے بھی اپنا نام واپس لے لیا۔ اب

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۰۹ باب رجم الحبلیٰ من الزنی اذا احصنت

سلے دے کے صرف دو رہ گئے ایک علی اور دوسرے عثمان ان دونوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنا حکم تسلیم کر لیا۔ اب عبدالرحمٰن بن عوف اور سب صحابہ مسجد میں جمع ہوئے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ایک مؤثر تقریر کی اور پھر حضرت عثمان کی طرف بیعت کیلئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ان کے بعد حضرت علی نے بیعت کی۔ آپ کا بیعت کرنا تھا کہ صحابہ ٹوٹ پڑے اور حضرت عثمان اتفاقِ آرا سے مسند آرائے خلافت ہو گئے۔

(۴) خلیفۂ چہارم حضرت علی کا انتخاب نہایت ہنگامی حالات میں ہوا۔ حضرت عثمان کے شہید ہوتے ہی فتنہ و فساد کے دروازے کھل چکے تھے۔ طوائف الملوکی نے اسلامی جمعیت و اتحاد کا شیرازہ پراگندہ کر دیا تھا۔ مدینہ میں خاک اڑنے لگی تھی صحابۂ کرام جو اس وقت حیات تھے منتشر تھے۔ ان میں سے بہتیرے تو مدینہ سے باہر ادھر ادھر کے علاقوں میں تھے۔ قاتلینِ حضرت عثمان کی آئی تھی۔ مدینہ پر چھائے ہوئے منڈلاتے پھرتے تھے انہیں لوگوں نے حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہا تو حضرت علی نے پہلے پہل انکار کیا لیکن آخر جب ان کا اصرار شدید ہوا تو اسلامی جمعیت کو مزید انتشار و پراگندگی سے بچانے کی غرض سے ہامی بھر لی اور آپ کی خلافت کا اعلان ہو گیا اور عام مسلمانوں کے علاوہ جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے حضرت طلحہ اور زبیر جن کی طرف سے اندیشہ ہو سکتا تھا انہوں نے بھی بیعت کر لی لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں نے بیعت نہیں کی اور مدینہ سے نکل کر شام کی طرف چلے گئے۔ چونکہ یہ انتخاب ہنگامی تھا اور حضرت علی نے خلافت کی ذمہ داری صرف ایک قومی اور اجتماعی ضرورت سے قبول کی تھی اس بنا پر اس انتخاب کو بطور ایک شرعی اصل کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جہاں تک پہلے تینوں خلفاء کے انتخاب کا تعلق ہے اس سے امورِ ذیل صاف طور پر سمجھ میں آتے ہیں۔

(الف) خلیفہ کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

(ب) چند اربابِ رائے سے مشورہ کرنے کے بعد خلیفہ نے اپنی جانشینی کے لئے ایک شخص کو نامزد کیا۔ اور اس کو استصوابِ رائے عامہ کی خاطر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

(ج) خلیفہ نے ایک کونسل مقرر کر دی کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کرے گی اور پھر اس کونسل کے فیصلہ کو استصوابِ رائے عامہ کی غرض سے مسلمانوں کے عام مجمع میں پیش کیا جائیگا۔

(د) کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کا تو ذکر کیا اپنے کسی رشتہ دار کو نامزد نہیں کیا۔ اس معاملہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت علی حضرت عمر کے دست و بازو اور بغایت معتمد علیہ تھے لیکن چونکہ بعض روایات کے مطابق حضرت ام کلثوم بنت علی سے نکاح کر لینے کے بعد دونوں میں رشتۂ مصاہرت بھی قائم ہو گیا تھا اس بنا پر حضرت عمر نے چھ آدمیوں کی جو کونسل بنائی اس میں حضرت علی کا نام تو رکھا لیکن نامزد نہیں کیا حالانکہ اگر نامزدگی کی بات ہوتی تو حضرت علی سے زیادہ اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

(ہ) آخری فیصلہ بہرحال جمہور کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک بیعتِ عامہ نہیں ہو گی کوئی شخص خلیفہ نہیں ہو سکے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا استحقاقِ خلافت

یوں تو جتنے بھی صحابۂ کرام تھے سب ہی فلکِ اسلام و ایمان کے مہر و ماہ تھے۔ اگرچہ ایک حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیئے اور وہ بھی ان حالات میں جو اس وقت درپیش تھے۔ دل اور دماغ کے جن اعلیٰ کمالات و ملکات کی ضرورت ہے۔ تمام صحابہؓ ان میں برابر اور مساوی حیثیت و مرتبہ کے نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن جو حضرات خلافت کے بجا طور پر مستحق اور اہل تھے جیسے حضرت عمر، عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر و سعد رضی اللہ عنہم وہ بھی دو چار نہیں بڑی تعداد میں تھے۔ قرآن مجید نے جن لوگوں کی صلاحیتِ حکمرانی کی گواہی ان الفاظ میں دی تھی۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا	وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار دیدیں تو
الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	وہ نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ دیں۔ بھلائیوں کا
وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (الحج)	حکم کریں اور بُری باتوں سے روک ٹوک کریں۔

وہ ظاہر ہے اِکّادُکّا نہیں۔ ایک پورا گروہ ایک جماعت تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب صورتِ حال یہ تھی تو پھر آخر اس کی وجہ کیا تھی کہ ایک پیغمبر آخرالزمان کی براہِ راست خلافت و نیابتِ پیغمبری کے بعد جس سے بڑھ کر کوئی اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے حصہ میں ہی آئی۔ یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے اسباب و وجوہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ہم کو امورِ ذیل پہ غور کرنا چاہئے۔

(۱) صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ کس کے متعلق قرآن مجید کی آیات نازل ہوئی ہیں اور ان آیات سے اس کی شخصیت پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

(۲) آنحضرتؐ کے ساتھ سب سے زیادہ کس کو رفاقت کا شرف حاصل رہا۔

(۳) سب سے زیادہ ادا شناس و مزاج دانِ نبوت کون تھا۔

(۴) آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر تھا۔

(۵) صحابۂ کرام میں اُس کو کیا مرتبہ و مقام حاصل تھا۔

(۶) کیا آنحضرتؐ نے قولاً یا عملاً اس کی خلافت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۷) اُس نے اپنے کارناموں سے یہ حقیقت کہاں تک ثابت کی کہ وہی خلیفۂ رسولؐ ہونے کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔

اب ہم مذکورۂ بالا تنقیحات میں سے ہر ایک پر علی الترتیب کلام کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر قرآن مجید میں

یہ واقعہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ یہ شرف اور سعادت حضرت ابوبکر کو ہی حاصل ہے کہ قرآن نے آنحضرتؐ کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کو، آپ کے خاص خاص اعمال و افعال کو جن سے اسلام کو بڑا فائدہ پہونچا اور آپ کے عہدِ خلافت کے بعض نہایت شاندار کارناموں کو پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور ان پر مدح کی ہے۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر کا قبل از بعثت جو دوستانہ تعلق تھا اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ	یہاں تک کہ جب جوانی کو پہونچا اور چالیس برس
سَنَۃً (الاحقاف)	کا ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ بیس سال کے اور حضرت ابوبکر اٹھارہ برس کے تھے۔ دونوں تجارت کے سلسلہ میں شام جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک منزل پر قیام کیا۔ یہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ حضورؐ اس درخت کے سایہ میں جا کر بیٹھ گئے اور ابوبکر وہاں ایک راہب رہتا تھا کچھ دین و مذہب کی باتیں پوچھنے کی غرض سے اسکے پاس جا بیٹھے، راہب نے ابوبکر سے حضورؐ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا

کہ یہ نوجوان جو درخت کے نیچے بیٹھا ہے کون ہے؟ وہ بولے "محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب" راہب نے کہا "خدا کی قسم! یہ نبی ہوگا کیونکہ عیسٰی بن مریم کے بعد سوائے محمد رسول اللہ کے کوئی اور شخص اس درخت کے سایہ میں نہیں بیٹھ سکتا" راہب کی یہ بات ابوبکر کے دل میں ایسی بیٹھی کہ سفر ہو یا حضر کسی حالت میں بھی حضور کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے چنانچہ جب آنحضرتؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ابوبکر نے ہی اس کو قبول کیا اور اسلام لائے۔ اسوقت ابوبکر کی عمر اڑتیس سال یعنی آنحضرتؐ سے دو برس کم تھی جب ابوبکر چالیس برس کے ہوئے تو انہوں نے وہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ (الآیۃ) [1]

اسلام لانے کے بعد حضرت ابوبکر نے اپنی دولت اللہ کے راستہ میں اور اسلام کی مدد کیلئے جس فیاضی اور بے جگری سے خرچ کی ہے قرآن اس کی داد اس طرح دیتا ہے۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولٰئک اعظم درجۃً من الذین انفقوا من بعدُ (الحدید)	تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے روپیہ خرچ کیا اور جہاد کیا تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ بہ نسبت اُن لوگوں کے جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا ہے۔

محمد بن فضیل کلبی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت ابوبکر صدیق کی شان میں نازل ہوئی ہے اس لیئے کہ وہی سب سے پہلے اسلام لائے اور انہوں نے ہی سب سے پہلے اللہ کے راستہ میں اپنی دولت خرچ کی [2] امام ابوالحسن الواحدی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے اس سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ کے پاس حضرت ابوبکر ایک عبا پہنے ہوئے بیٹھے تھے جو سینہ پر سے اُدھڑی ہوئی تھی اتنے میں جبرئیل امین آگئے۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ ابوبکر کی عبا سینہ پر سے چاک ہو رہی ہے حضورؐ نے جواب دیا۔

[1] اسباب النزول للواحدی ص ۲۸۷ مطبوعہ مصر [2] ازالۃ الخفا ص ۴۸

"اے جبرئیل! ابوبکر نے اپنی ساری دولت میرے اوپر فتح مکہ سے پہلے ہی خرچ کر دی" اب جبرئیل امین بولے "آپ اللہ کا سلام ابوبکر کو پہونچا دیجئے اور ان سے پوچھئے کہ آپ اپنے اس فقر پر اللہ سے راضی ہیں یا ناراض؟ حضورؐ نے حضرت ابوبکر سے یہ دریافت کیا تو وہ رونے لگے اور عرض کیا کہ کیا میں اپنے رب سے ناراض ہونگا؟ نہیں بلکہ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ اپنے رب سے راضی ہوں" [1]

اس آیت میں تو صرف دولت خرچ کرنے کا ذکر ہے ایک اور آیت میں انفاق کے ساتھ دوسری صفات کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی (وَاللَّیْل)	پس وہ شخص جس نے دیا۔ پرہیزگاری برتی۔ اور نیکیوں کی تصدیق کی ہم اُس کیلئے آسانیاں بہم پہونچائیں گے۔

الواحدی نے اس آیت کے ذیل میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر غلام خرید خرید کر آزاد کیا کرتے تھے یہ غلام اکثر ضعیف و ناتواں ہوتے تھے۔ ایک دن ان کے باپ ابوقحافہ نے کہا کہ بیٹا اگر تم کو غلام آزاد کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو پھر کڑیل نوجوان غلام خرید کر آزاد کرو تاکہ وہ کسی وقت تمہارے کام بھی آئیں۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا ابا! میری نیت تو اُن غلاموں کے آزاد کرنے سے کچھ اور ہی ہے [2]

حضرت ابوبکر نے بلال حبشی کو خرید کر آزاد کیا تو مشرکین مکہ نے کہنا شروع کیا کہ ابوبکر پر بلال کا کوئی احسان تھا۔ انہوں نے اس کا بدلہ چکایا ہے۔ قرآن نے اس کی بھی تردید کی اور اعلان کیا۔

وما لاحدٍ عندہ من نعمۃٍ تجزیٰ ہ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ ہ ولسوف یرضیٰ ہ	اور ان (ابوبکر) پر کسی کا کوئی احسان نہیں تھا جس کا بدلہ چکایا گیا ہو۔ بجز رب اعلیٰ کی رضا جوئی کے اور یہ عنقریب راضی ہوگا۔

حضرت ابوبکر راتوں کو بیدار رہ کر جو عبادتِ الٰہی کرتے تھے اس کا ذکر قرآن میں [3]

[1] اسباب النزول ص ۳۰۳ [2] اسباب النزول ص ۳۳۶ [3] اسباب النزول ص ۲۷۶

اسطرح کیا گیا ہے۔ اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ (زمر)

حضرت ابوبکرؓ جب اسلام لائے اور آنحضرت صلعم کی تصدیق کی تو عثمانؓ طلحہؓ زبیر وغیرہم ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا آپ ایمان لے آئے ہیں؟ حضرت ابوبکر نے جواب اثبات میں دیا تو یہ سب بھی مسلمان ہوگئے۔ قرآن نے اس واقعہ کو بھی بیان کیا ہے جس سے حضرت ابوبکر کی مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ ارشاد ہے [1]

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

پس اے محمدؐ آپ خوشخبری سنا دیجئے ان لوگوں کو جو قول سنتے ہیں اور اس اچھے قول کا اتباع کرتے ہیں

ان متفرق واقعات و محامد کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت ابوبکر کا سب سے اہم تذکرہ وہ ہے جو غار ثور میں رفاقت سے متعلق ہے۔ فرمایا گیا۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ

غار ثور میں دو جو تھے ان کا دوسرا۔

یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت آپ کی اتنی بڑی اہم اور مستند دستاویز ہے کہ علماؒ نے کہا ہے کہ چونکہ حضرت ابوبکر کی معیت و صحبت نبوی صلعم قرآن مجید میں منصوص ہے اس بنا پر اس کا منکر کافر ہے، یہ صرف صدیق اکبرؓ کی خصوصیت ہے۔ کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے پھر حضرت ابوبکر کی آنحضرت صلعم کے ساتھ رفاقت فی الغار کے عنداللہ و عندالناس مقبول ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ گہری دوستی کے لیے "یارِ غار" بطور استعارہ ہی بولا جانے لگا ہے۔"

پھر جس طرح قرآن مجید میں بعض مواقع پر آنحضرت صلعم کو تنبیہہ کی گئی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم جو نابینا تھے آپ صلعم کی خدمت میں آئے اور آپ نے ان کی طرف زیادہ التفات نہیں فرمایا تو عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى کی آیات نازل ہوئیں، ٹھیک اسی طرح کا معاملہ حضرت ابوبکر صدیق کیساتھ بھی ہے واقعہ افک میں حضرت ابوبکر نے مسطح بن اثاثہ کی مالی اعانت و امداد سے دست کشی اختیار کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا تو قرآن میں ان لفظوں کے ساتھ تنبیہہ کی گئی۔

[1] اسباب النزول ص ۲۷۶

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلْیَعْفُوْا (النور) پارہ ۱۸

تم میں جو لوگ صاحب فضل و مقدرت ہیں وہ رشتہ داروں مسکینوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کرنے کی قسم نہ کھائیں اور ان کو چاہئے کہ معاف کریں۔

حضرت ابوبکر نے آیت سن کر کہا خدا کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھے بخشدے اور عہد کیا کہ اب آئندہ برابر وہ مسطح کے کفیل رہیں گے۔ اگرچہ یہ تنبیہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی قرب و اختصاص کی دلیل ہے جس کو بے شبہ مختصات حضرت ابوبکر میں شمار کرنا چاہئے۔

پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت کا جو سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ ہے یعنی مرتدین عرب سے جنگ و قتال اس کا تذکرہ بھی قرآن میں کیا گیا ہے اور نہ صرف حضرت ابوبکر بلکہ وہ تمام صحابہ کرام جنہوں نے اس قتال میں حصہ لیا ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوبیت کا طغرائے امتیاز عطا فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ اس اہم اور عظیم الشان کارنامہ کی ابتدا و انتہا اور اس کی قیادت و زعامت کا سہرا صدیق اکبرؓ کے ہی سر ہے اس بنا پر محبوبیت الٰہی کے اس تمغہ اعزاز میں حضرت ابوبکر کا حصہ بھی سب سے زیادہ ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے۔

یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

اے ایمان والو تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے دین سے پھر جائے تو عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے بدلے میں ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ لوگ مومنین پر ہلکے پھلکے ہیں، کافروں پر غالب، اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت

واللہ واسع علیم ـ والا ہے۔ اور علم والا ہے۔

(پ۶ مائدہ ۸۴)

امام بیہقی نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوبکرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے جب عرب مرتد ہو گئے تو انہوں نے اور ان کے رفقاء نے جہاد کیا اور آخر کار ان کو اسلام کی طرف لوٹا دیا۔ یونس بن بکیر قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ آیت ابوبکر کے بارہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے ہی مرتدین عرب سے قتال کیا تھا۔ ۱؎

آنحضرت ﷺ کے ساتھ رفاقت

آنحضرت ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ کس کو رفاقت وہمراہی کا شرف حاصل ہوا ہے اور سب سے زیادہ آپ کا شریک جلوت وخلوت کون ہے؟ اس سوال کا جواب بھی ظاہر ہے "حضرت ابوبکرؓ اوّل من اسلم" ہیں پھر اسلام سے قبل بھی دونوں ساتھ اور بعض معاملات میں ایک دوسرے کے شریک ورفیق رہے ہیں اسلام قبول کرنے کے بعد تو معیت ورفاقت کا یہ عالم رہا کہ حضرت ابوبکرؓ گویا ایک دن کے لئے بھی آپ سے جدا نہ ہوئے قیام مکہ کے زمانہ میں بعض لوگ حبشہ گئے لیکن صدیق اکبر نہ گئے۔ پھر ہجرت مدینہ کا وقت آیا تو بہت سے صحابہ جن میں حضرت عمر بھی شامل ہیں پہلے سے مدینہ پہونچ گئے۔ لیکن حضرت ابوبکر نے ہجرت کی تو آنحضرت ﷺ کے ساتھ اور اسطرح رفیق سفر وحضر رہے۔ غزوات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جن غزوات میں حضور تشریف لے جاتے تھے حضرت ابوبکر بھی ساتھ ہوتے تھے، سرایا میں لوگ کہتے تھے کہ ابوبکر کو بھیجئے تو حضور فرماتے تھے .... کہ نہیں یہ میرے پاس رہیں گے۔ اور مجھ کو ان کی ضرورت ہے۔ اس طویل ترین رفاقت کے باعث ظاہر ہے جو تربیت اور تعلیم حضرت ابوبکر کی ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے کی نہیں ہو گی تھی

اداشناسی اور مزاج دانی نبوت

اس قرب واتصال، ہر وقت کی معیت ورفاقت اور پھر خود اپنی ذاتی استعداد وصلاحیت کے باعث جس درجہ کے اداشناس ومزاج دان

۱؎ الصواعق المحرقہ ص ۹

نبوت صدیق اکبر ہو سکتے تھے کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ واقعات کا تتبع کیا جائے تو صاف نظر آئیگا کہ حضرت ابوبکر صدیق اور آنحضرت ﷺ کا مزاج اور انداز طبیعت ایک ہی خمیر سے تیار ہوا تھا، عادات وخصائل، اور امیال وعواطف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جتنے قریب حضور پُرنور اور صدیق اکبر تھے کوئی اور نہیں تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں بحث صرف مزاج کی ہم رنگی سے ہے نہ کہ شریعت کے اصل احکام ومسائل سے چنانچہ پہلے ایک روایت گزر چکی ہے جس میں ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر کے اوصاف وکمالات ٹھیک ٹھیک وہی بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے سرور کونین ﷺ کے بیان کئے تھے اس کے علاوہ چند اور واقعات بھی ہیں جن سے اس پر مزید روشنی پڑے گی۔

عبداللہ بن ابی جو مشہور منافق تھا اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا عبداللہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اپنی قمیص مرحمت فرما دیجئے۔ تاکہ ابن ابی کو اس میں کفنا دیا جائے۔ حضور ﷺ نے قمیص عطا فرما دی اس کے بعد اس نے کہا کہ اب نماز بھی پڑھ دیجئے، رحمت عالم نے اس درخواست کو بھی شرف قبول عطا فرمایا لیکن آپ نماز کے ارادہ سے کھڑے ہو رہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن پکڑ کر کھینچا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ اس شخص کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ آپ کو اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ارشاد ہوا " اللہ نے "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" فرما کر مجھ کو اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو میں نہیں بخشونگا۔ تو میں اب ستر سے بھی زیادہ مرتبہ استغفار کر دوں گا، حضرت عمرؓ نے کہا " وہ تو منافق تھا"، لیکن آپ نہ مانے اور نماز پڑھی۔ اس پر یہ آیت اتری۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ط ۱؎ — آپ کبھی ان میں سے کسی کی نماز نہ پڑھیں اور اس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر کی رائے اور منشاء کے مطابق اس آیت کا نزول حضرت عمر کی فضیلت وبزرگی کی دلیل ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے جو کچھ کیا تھا غایت شفقت

۱؎ صحیح بخاری کتاب التفسیر ج ۲ ص ۶۷۳

علی الخلق اور رحمۃ للعالمین کے جذبہ سے کیا تھا جو آپ کے مزاجِ گرامی مرتبت کا ایک خاص جوہر تھا اور چونکہ اس وصفِ خاص میں حضرت عمرؓ کو آپ کے ساتھ اس درجہ قرب و اختصاص نہیں تھا جتنا کہ حضرت ابوبکرؓ کو تھا اس بنا پر حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلعم کے اس فعل پر اچنبھا ہوا لیکن صدیق اکبرؓ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

اس طرح کا ایک موقع صلح حدیبیہ کے واقعہ میں پیش آیا تھا۔ ابوجندلؓ جن کو کافروں نے بڑی بے رحمی سے مارا تھا جب انھوں نے صحابۂ کرام کے سامنے آکر اپنے زخم دکھائے اور کہا کہ کیا آپ لوگ اس حالت میں بھی مجھ کو مکہ واپس کر دینا چاہتے ہیں تو پورا مجمع تڑپ اٹھا۔ حضرت عمرؓ میں برداشت کہاں تھی! آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر بولے "کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں" اور اس طرح کے اور سوال و جواب کیے آخر جب یہاں تسلی نہ ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور گفتگو وہی کی حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔

ایھاالرجل انّہ رسول اللّٰہ	اے شخص! وہ بے شبہ اللہ کے رسول ہیں۔
ولیس یعصی ربّہ وھو ناصرہ	اور اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے۔ خدا انکی
فاستمسک بغرزہ فواللّٰہ	مدد کرنے والا ہے۔ پس تم ان کے دامن کو
انّہ علی الحق۔	پکڑ لو۔ قسم اللہ کی وہ یقیناً حق پر ہیں۔

اب حضرت عمرؓ نے کہا "کیا آپ آنحضرت صلعم ہم سے یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ ہم جلد ہی بیت اللہ آئیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "ہاں کیوں نہیں لیکن حضور نے کیا یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم اسی سال بیت اللہ پہونچو گے"[1]

اسی طرح تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت صلعم کی وفات ہوئی تو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر سنتے ہی حضرت عمرؓ کا کیا حال ہوا تھا لیکن جب ابوبکرؓ نے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْل (الآیۃ) آیت پڑھی تو حضرت عمرؓ کی یکایک آنکھ کھل گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا اب تک انہوں نے یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط ج ا ص ۳۸۰

ان سب واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کی تعلیم و تربیت کے سانچہ میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ فکر، ذہن اور مزاج و طبیعت تک میں یگانگت اور مکمل مماثلت پیدا ہو گئی تھی اور اس بنا پر اداشناسیِ نبوت میں کسی کو اُن کے ساتھ دعویٰ ہم سری نہیں ہو سکتا تھا۔

آنحضرت صلعم کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر تھا

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو سب سے زیادہ اعتماد حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ دونوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

ان اللّٰہ یکرہ فوق سمائہ	اللہ تعالیٰ آسمان پر اس بات کو ناپسند
ان یخطأ ابوبکر[1]	کرتا ہے کہ ابوبکر خطا کریں۔

اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ فرمایا "عائشہ" پھر دریافت کیا مردوں میں؟ "ارشاد ہوا" عائشہ کے باپ"[2]

ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک عورت آئی۔ آپ نے فرمایا "پھر آنا" عورت بولی "اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں تو کیا کروں" آنحضرت صلعم نے جواب دیا۔

ان لم تجدینی فاتی ابابکر[3]	اگر تو آئے اور مجھ کو نہ پائے تو ابوبکر کے پاس آ۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

لایبقین فی المسجد باب الّا سُدّ	مسجد میں جتنے بھی دروازے ہیں ان کو بند
الّا باب ابی بکر[4]	کر دیا جائے البتہ ہاں باب ابی بکر کھلا رہے۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا۔

---

[1] اصابہ ج ۲ ص ۸۳۲ [2] صحیح بخاری ج ا ص ۵۱۷ [3] صحیح بخاری ج ا ص ۵۱۶
[4] صحیح بخاری ج ا ص ۵۲۲

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ اُمَّتِیْ خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَکْرٍ وَّلٰکِنْ اَخِیْ وَ صَاحِبِیْ۔ [1]

اگر میں اپنی اُمت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ لیکن وہ میرا بھائی اور دوست ہے۔

غزوۂ بدر کے بیان میں گذر چکا ہے کہ میدانِ جنگ میں آنحضرت ﷺ کے خیمہ میں آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق ہی تھے اور جب وہ عبدالرحمٰن سے جنگ کرنے کے لئے جانے لگے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو روکا اور فرمایا تم یہیں خیمہ میں رہ کر مجھ کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتے ہو یعنی مشورہ وغیرہ کے سلسلہ میں۔

کیا آنحضرت ﷺ نے قولاً و عملاً کسی کے استخلاف کی طرف اشارات کئے ہیں

اگرچہ آنحضرت ﷺ نے کسی کو بھی صراحۃً اپنی جانشینی کیلئے نامزد نہیں فرمایا لیکن اگر آپ کے قول و عمل سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس باب میں آپ کا گوشۂ چشم خاطر کس کی جانب تھا تو بے شبہ وہ خوش قسمت ذات اور شخصیت حضرت ابوبکر صدیق کی ہی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب امامتِ صلوٰۃ تھا۔ جس کو امامتِ صغریٰ بھی کہتے ہیں۔ تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے یہ منصب مرض الوفات میں حضرت ابوبکر ہی کو تفویض فرمایا تھا اور وہ بھی کس اصرار کے ساتھ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ کے اشارہ پر حضرت ابوبکر صدیق کی رقتِ قلب کا عذر کرتی ہیں اور اپنے باپ کے بجائے حضرت عمر فاروق کا نام تجویز کرتی ہیں، لیکن آپ ہیں کہ نہیں مانتے اور کوئی عذر نہیں سنتے۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو "صواحب یوسف" کہتے ہیں اور پھر اصرار کے ساتھ حضرت ابوبکر کی ہی امامت کرنے کا حکم دیتے ہیں اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جیسا کہ حضرت عائشہ کی روایت ہے آپ نے یہاں تک فرمایا کہ

لَا یَنْبَغِیْ لِقَوْمٍ فِیْھِمْ اَبُوْبَکْرٍ اَنْ یَّؤُمَّھُمْ غَیْرُہٗ [2]

جس قوم میں ابوبکر ہوں اس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ ابوبکر کے علاوہ کوئی اور شخص امامت کرے

صحابۂ کرام کیلئے صرف یہ ایک اشارہ ہی کافی تھا چنانچہ حضرت علی اور حضرت عمر

---

[1] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴ ۔ [2] ابواب المناقب

نے جہاں حضرت ابوبکر صدیق کے استحقاقِ خلافت پر تقریر کی یا اس کا تذکرہ کیا ہے اُن کے "اوّل من اسلم" ہونے کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔

امامتِ صلوٰۃ کے بعد ایک اہم دینی منصب امارتِ حج ہے اور تم پڑھ آئے ہو کہ اس منصب میں بھی آنحضرت ﷺ کی حیات ہی میں آپ کی نیابت و جانشینی کا شرف حضرت ابوبکر صدیق کو ہی حاصل ہوا تھا۔

علاوہ بریں متعدد روایات میں آنحضرت ﷺ نے اشارات قولاً بھی کئے ہیں ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ اگر تم ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو ان کو امین پاؤ گے" [1] کسی شخص نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا کہ اگر آنحضرت ﷺ کسی کو اپنا جانشین نامزد کرتے تو کس کو کرتے؟ فرمایا "ابوبکر کو" [2]

ایک مرتبہ مرض الوفات میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اللہ کا ایک بندہ ہے جس کو خدا نے اختیار دیا کہ دنیا یا وہ نعمتیں جو اللہ کے پاس ہیں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرلے تو اس بندہ نے اللہ کی نعمتوں کو اختیار کر لیا۔ حضرت ابوبکر سمجھ گئے کہ اس بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی اپنی ذات ہے۔ اس لئے بیساختہ رونے لگے اور عرض کیا "ہم سب کی جانیں اور اولاد آپ پر قربان ہوں"، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اے ابوبکر ذرا ٹھہرو" اس کے بعد صحابہ سے خطاب کرکے فرمایا "یہ مسجد کے جتنے دروازے ہیں سب بند کردو البتہ ہاں ابوبکر کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میری صحبت میں اُن سے زیادہ کوئی افضل ہو"۔ [3]

یہ روایت ابھی اوپر گذر چکی ہے کہ ایک عورت کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا "اگر تم مجھ کو دنیا میں نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس جانا۔"

آنحضرت ﷺ نے مرض الوفات میں ایک مرتبہ یہاں تک ارادہ کیا کہ صاف صاف حضرت ابوبکر کی خلافت کی وصیت لکھ دیں لیکن آپ نے اس ارادہ کو عملی جامہ اس لئے نہیں پہنایا کہ کہیں اس سے نامزدگی کی رسم جاری نہ ہو جائے اور جمہور اپنے

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۴ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳ باب فضائل ابی بکر [3] طبری ج ۲ ص ۴۳۴

حق انتخاب سے محروم ہو جائیں صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں

قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری
فی مرضہ ادعی لی ابابکر اباکِ واخاکِ	میں فرمایا کہ ذرا ابوبکرؓ اپنے والد اور اپنے بھائی
حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنیٰ	کو میرے پاس بلا دو۔ تو میں ایک تحریر لکھدوں
متمنٍ ویقول قائل انا اولیٰ۔ ویابی اللہ	کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی تمنا کرنے اور کہنے
والمؤمنون الا ابابکرٍ [1]	والا کہے کہ میں زیادہ بہتر ہوں حالانکہ اللہ اور

مومنوں کے نزدیک ابوبکرؓ کے سوا کوئی دوسرا بہتر نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ جمعرات کے دن (یعنی وفات سے تین دن پہلے) آنحضرتؐ کی درد کی تکلیف شدید ہوگئی۔ فرمایا "میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے لیئے ایک ایسی تحریر لکھدوں کہ پھر کبھی تم گمراہ نہ ہو اور جھگڑا نہ کرو، لوگوں کو تعجب ہوا کہ آج حضورؐ کیسی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے دوبارہ حاضر ہو کر معلوم کرنا چاہا کہ اصل مطلب حضورؐ کا کیا تھا؟ اب آپؐ نے فرمایا کہ اچھا! اب مجھ کو تم میری حالت میں چھوڑ دو۔ اُس کے بعد آپؐ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ دوسری یہ کہ وفد سے جس طرح کا معاملہ میں کرتا تھا تم بھی وہی معاملہ کرو۔ رہی تیسری وصیت تو وہ آپ نے قصداً بیان نہیں کی یا راوی یعنی عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ میں اس کو بھول گیا ہوں" [2]

حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت دوسری جگہ ان لفظوں کے ساتھ ہے "جب آنحضرتؐ کو درد کی تکلیف شدید ہوئی تو ارشاد فرمایا "تم میرے پاس کتاب لاؤ۔ تاکہ میں ایک کتاب لکھدوں اور تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔ عمرؓ نے کہا کہ نبی کریمؐ پر درد کا غلبہ ہے اور ہم لوگوں کے پاس اللہ کی کتاب ہے ہی وہ ہمارے لئے کافی ہے اس پر بڑا اختلاف اور شور و غل ہوا حضورؐ نے فرمایا "اچھا تم یہاں سے ہٹو۔ تم کو میرے سامنے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس

[1] ج ۲ ص ۲۷۳ باب من فضائل ابی بکرؓ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۸ باب مرض النبیؐ و وفاتہ

کو اس وقت حضورؐ کی وصیت کے قلم بند نہ ہونے کا بڑا افسوس ہوا جب کبھی وہ اس روایت کو بیان کرتے تھے اس افسوس کا اظہار کرتے تھے" [1]

اگرچہ ان روایتوں سے یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کے اختلاف کے باعث کچھ لکھنے لکھانے کا معاملہ اس وقت رفت و گزشت ہو گیا۔ لیکن محدثین نے قیاس آرائیاں کی ہیں کہ آخر وہ چیز کیا تھی جو حضورؐ قلم بند کروانا چاہتے تھے۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ وہ کتاب الاحکام کی کوئی چیز ہوگی۔ اور بعضوں کے نزدیک آپ خلافت کے بارہ میں وصیت کرنا اور خلفا کے اسماء گرامی لکھانا چاہتے تھے [2]

ہمارے نزدیک مذکورۂ بالا دوسرا خیال زیادہ قرین قیاس ہے اور اغلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی ہی وصیت فرمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی جو روایت تم ابھی پڑھ آئے ہو اس سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے، یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے [3] لیکن چونکہ راوی کو الفاظ میں شک پیدا ہو گیا ہے اس لئے روایت کے ساتھ ساتھ اپنا شک بھی ظاہر کرتا گیا ہے۔ بہرحال شروع کے الفاظ جو آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائے یہ ہیں۔

لقد هممت او اردت ان ارسل	میں نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے کو بلا
الی ابی بکر وابنہ واعھد	بھیجوں اور خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دوں

بہرحال صحیحین کی اس روایت کی روشنی میں قرین قیاس یہی ہے کہ آنحضرتؐ مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ کیلئے خلافت کی وصیت لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن صحابۂ کرام میں جو اس وقت موجود تھے اس پر اختلاف ہو گیا کہ ایسے وقت میں جبکہ آپ کو درد کی شدید تکلیف تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں نے درد کی ایسی شدید تکلیف

[1] باب کتابۃ العلم ج ۱ ص ۲۲ [2] فتح الباری جلد اول ص ۱۸۶ [3] جلد دوم ص ۸۴۶ کتاب المرضیٰ بخاری شریف

کسی شخص کو بھی نہیں دیکھی [1] آپ کو لکھنے لکھانے کی زحمت دی جائے یا نہیں اس بنا پر آنحضرت صلعم نے یہ ارادہ ہی ترک کر دیا۔

حدیث قرطاس پر بحث صحیح بخاری کی یہ روایت جو اوپر گزری حدیث قرطاس کہلاتی ہے۔ مولانا شبلی نے الفاروق میں اس پر بحث کر کے ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے دلائل نہایت کمزور ہیں اور ان سے ہرگز ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

مولانا کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت صلعم کم وبیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

(۲) کاغذ و قلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں تصریح مذکور ہے اور چونکہ آنحضرت صلعم نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اسلئے واقعہ کے بعد آنحضرت صلعم چار دن تک زندہ رہے۔

(۳) اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرت صلعم کی نسبت اور کوئی واقعہ اختلالِ حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں ہے۔

(۴) اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے۔ لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے باایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

(۵) عبداللہ ابن عباس کی عمر اس وقت ۱۳-۱۴ برس کی تھی۔

(۶) سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر عبداللہ بن عباس خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا۔

(۷) تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلعم نے جب کاغذ و قلم مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ [2]

اب ان دلائل کی حقیقت کیا ہے وہ سنئے۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۸ [2] الفاروق مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ حصہ اول ص ۴۹-۵۰

(۱) نمبر ایک سے لیکر تین تک اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ مولانا نے "ھجر" کے معنی ہذیان کے مراد لے رکھے ہیں اس سے قطعاً بحث نہیں کہ پیغمبر کو ہذیان ہو سکتا ہے یا نہیں جہاں "ھجر" کے معنی انوکھی سی بات کہنے کے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے بیماری میں قلم کاغذ لانے کے متعلق اچانک جس انداز سے فرمایا صحابہ کو اس پر سخت حیرت و استعجاب دو وجہوں سے ہوا ایک یہ کہ ان کو یہ خیال ہوا کہ کہیں خدانخواستہ حضور ہم سے جدا تو نہیں ہو رہے ہیں اور دوسری یہ کہ جب قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ دونوں ان کے پاس ہیں تو پھر اب، آنحضرت صلعم کے بعد ان کے گمراہ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ حضرت عمرؓ ہوں یا کوئی اور جس کسی نے بھی ھجر کہا ہے اس سے اسی درد آمیز حیرت و تعجب کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اوپر حدیث کا جو ترجمہ لکھا ہے اس میں ھجر کا ترجمہ "حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں" کیا ہے۔

(۲) نمبر (۴) کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ایک واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے ہزاروں ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود واقعہ کی روایت، جو نمایاں شخصیت کے مالک ہوتے ہیں، انہیں کے حوالہ سے کی جاتی ہے۔ پھر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ مولانا شبلی کے بقول اس وقت صحابہ کثرت سے موجود تھے۔ اس بنا پر اگر عبداللہ بن عباس کی روایت خلافِ واقعہ ہوتی تو ضرور دوسرے صحابہ اس کی تردید کرتے۔ ان کا خاموش رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ روایت کو صحیح مانتے تھے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر ۱۳-۱۴ سال ضرور تھی لیکن وہ عاقل بالغ تھے۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے "قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا ختین" اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ کوئی شخص ختین اسی وقت کہلاتا تھا جبکہ وہ بالغ ہوتے [1]

(۴) مولانا کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ عبداللہ بن عباس خود اس واقعہ کے وقت نہیں تھے۔ اس کے ثبوت میں حاشیہ میں فتح الباری کے حوالہ سے صرف اتنا

---

[1] الاصابہ جلد دوم ص ۳۲۲ مطبع مصطفیٰ محمد مصر

لکھتے ہیں کہ محدثین نے بدلائلِ قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ (عبداللہ بن عباس) موجود نہ تھے اس موقعہ پر مولانا کو عجیب مغالطہ پیش آیا ہے جس کو وہ دلائل قطعیہ فرماتے ہیں اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حدیث کا ایک ٹکڑا فخرج ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ بھی ہے اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس واقعہ مذکورہ کے بعد آنحضرت صلعم کے مکان سے نکلے تو اس وقت ان الرزیۃ کل الرزیۃ کہتے ہوئے نکلے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ عبید اللہ بن عبداللہ جو کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے اس روایت کی راوی ہیں وہ تو اس واقعہ کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے پھر انہوں نے کیسے دیکھا کہ عبداللہ بن عباس یہ کہتے ہوئے نکلے تھے۔ اس کے جواب میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ آنحضرت کی وفات کے عرصہ بعد جب عبداللہ بن عباس نے عبید اللہ سے یہ روایت بیان کی تو اس کے بعد عبداللہ بن عباس کے دل میں اس واقعہ کا صدمہ تازہ ہو گیا اور اس بنا پر وہ "ان الرزیۃ کل الرزیۃ" کہتے ہوئے چلے گئے [1] بس بات اتنی تھی جس کو مولانا نے کیا سے کیا سمجھ لیا۔ حافظ ابن حجر کے اس بیان سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اصل واقعہ کے وقت خود عبداللہ بن عباس موجود ہی نہ تھے۔

اچھا! اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت عبداللہ بن عباس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے تو اس سے روایت کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیونکہ اس صورت میں روایت مرسل ہو گی اور باتفاقِ محدثین مراسیل صحابہ مقبول و معتبر ہیں۔

(۵) مولانا نے (۷) میں پھر وہی ہذیان والی بات دہرائی ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ہذیان کا یہاں کوئی ذکر مذکور ہی نہیں۔

مولانا اس روایت کو حضرت عمر کی شان کے خلاف بتاتے ہیں حالانکہ محدثین لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عمر کی کتابِ فضائل کا ایک روشن باب ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے وہ منصبِ نبوت کی کوئی چیز نہیں تھی اس واقعہ کے بعد بھی آپ تین

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۷

روز تک عالمِ ناسوت میں رہے۔ اگر منصبِ نبوت کی کوئی چیز ہوتی تو ضرور لکھواتے یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ کے بحکم آپ اس پر مامور تھے حضرت عمر نے اس کو محسوس کر لیا تھا اس بنا پر آنحضرت صلعم کے ساتھ غایتِ محبت و عشق اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی موجودگی میں اپنے اور دوسرے صحابہ پر یہ اعتماد کر وہ راہ سے بے راہ نہیں ہونگے۔ ان وجوہ سے انہوں نے خیال کیا کہ حضور کو اس وقت درد کی شدید تکلیف ہے۔ اس حالت میں آپ کو لکھنے لکھانے کی کیوں تکلیف دی جائے۔

حدیثِ قرطاس کی یہ بحث ضمناً آگئی بہرحال سطور بالا سے ثابت ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلعم نے اپنی جانشینی سے متعلق کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں کی لیکن آپ کا گوشۂ چشمِ التفات اور رجحانِ قلبی حضرت ابوبکر کی ہی طرف تھا۔

حضرت ابوبکر خود اس راز سے آگاہ تھے اسی وجہ سے اس منصبِ جلیل کا بارِ عظیم انگیز کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ورنہ وہ جس طبیعت کے انسان تھے ہرگز اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک قاصد محمد بن الزبیر کی معرفت حضرت حسن بصری سے سوال کیا کہ کیا آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر کو خلافت کیلئے نامزد کیا تھا؟ حسن بصری یہ سوال سنتے ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا "خدا کی قسم آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ اس درجہ کے متقی اور اللہ کو جاننے والے تھے کہ ان کو اگر حکم نہ ہوتا تو وہ ہرگز مسلمانوں پر یہ چھلانگ نہ لگاتے" (یعنی جھٹ خلیفہ نہ بن جاتے) [1]

صحابۂ کرام میں حضرت ابوبکر کا مرتبہ و مقام

اس سلسلہ میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں تمام صحابۂ کرام حضرت ابوبکر کے مرتبہ و مقام سے اچھی طرح باخبر تھے اور اسی کے مطابق آپ کا ادب واحترام کرتے تھے حضرت عبداللہ ابن عمر کا بیان ہے کہ ہم آنحضرت صلعم کے عہد میں آپس میں ایک دوسرے کے مدارج و مراتب متعین کرتے تھے تو حضرت ابوبکر کو سب سے بہتر سمجھتے تھے [2] ایک موقع پر آنحضرت صلعم نے اپنی وفات

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۲ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے قریب آجانے کا اشارہ استعارہ کے پیرایہ میں کیا صحابہ میں سے کسی کا ذہن اُدھر منتقل نہیں ہوا حضرت ابوبکر فوراً سمجھ گئے اور رونے لگے، صحابہ کو حیرت ہوئی کہ اس میں رونے کی کونسی بات تھی۔ آخر جب ان کو بھی اصل حقیقت کا علم ہوا تو صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ وکان ابوبکر ھو اعلمنا۔ [1]

دربارِ نبوت کے شاعرِ خاص حضرت حسان بن ثابت کہتے ہیں۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد	طاف العدو بہ اذ صعد الجبلا
اور مبارک غار کے رفیق ہیں اور جب وہ پہاڑ	(احد) پر چڑھے تو دشمن نے ان کو گھیر لیا
وکان حب رسول اللہ قد علموا	من البریۃ لم یعدل بہ رجلاً
اور رسول اللہ کے محبوب ہیں سب لوگ جانتے	ہیں کہ پوری دنیا میں انکی برابر کوئی آدمی نہیں ہے

آنحضرت صلعم نے یہ اشعار سُنے تو تبسم فرمایا جس سے دندانِ مبارک نظر آنے لگے اور ارشاد مبارک ہوا اے حسان! تم نے سچ کہا وہ (ابوبکرؓ) ایسے ہی ہیں۔ [2]

ہم نے حضرت ابوبکر کے براہ راست خلیفۃ الرسول ہونے کے استحقاق پر بحث کرنے کیلئے جو سات معیار مقرر کئے تھے ان میں سے چھ کا ذکر ہو چکا اور ان سے ثابت ہو گیا کہ اس معیار پر صدیق اکبر ہی پورے اُترتے ہیں اور اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ وہ ہی اس مرتبہ و مقامِ بلند کے مستحق تھے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ حضرت ابوبکر کے کارنامہائے خلافت سے اس کی تصدیق کہاں تک ہوتی ہے کہ وہ ہی تمام صحابہ میں اعزاز کے ساتھ اوّلین مستحق تھے۔ اس کا جواب آئندہ صفحات میں ملے گا۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ باب فضل ابی بکر بعد النبیؐ۔ [2] ابن سعد تذکرہ ابی بکر۔

کارنامہائے خلافت

حضرت ابوبکر صدیق نے جس وقت عنانِ خلافت ہاتھ میں لی یہ مسلمانوں کے لیے ایک نہایت ہی نازک اور بڑا صبر آزما وقت تھا۔ سب سے بڑا زخم جو ان کے قلب و جگر پر لگا تھا آنحضرت صلعم کا حادثۂ وفات تھا جس نے دنیا ان کی نگاہوں میں تیرہ و تار کر دی تھی خود مدینہ میں منافقوں کا ایسا گروہ موجود تھا جو فتنہ انگیزی کے لئے موقع و بہانہ کی تلاش میں بیٹھا رہتا تھا۔ جھوٹے مدعیان نبوت اور مرتدین عن الاسلام کے فتنہ نے خود آنحضرت صلعم کی زندگی میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اس ایک چنگاری کو ہوا دیکر جہنم بنا دینے کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ جن قبیلوں کو مدینہ کی سیادت کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی وہ کل پرزے درست کرنے کی فکر کرنے لگے تھے۔ غرضیکہ دقتوں اور دشواریوں کا ایک پہاڑ تھا جو خلیفۂ رسول اللہ صلعم کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد ہی ہم مسلمانوں کو ایسے حالات سے سابقہ پڑا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوبکر ہم کو عطا فرما کر ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم ہلاک ہو جاتے [1]

حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

"رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی اور میرے باپ پر حوادث و مصائب ٹوٹ پڑے کہ اگر بڑے بڑے مضبوط پہاڑوں پر بھی نازل ہوتے تو انکو ریزہ ریزہ کر دیتے۔ ایک طرف مدینہ میں نفاق گھسا ہوا تھا اور دوسری جانب عرب مرتد ہونے لگے تھے۔ [2]

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۱ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۲

ان سب اندرونی و بیرونی دشواریوں کے باوجود ایک اہم معاملہ یہ درپیش تھا کہ جیسا کہ گذر چکا ہے آنحضرت صلعم نے اپنی حیات میں ہی اسامہ بن زید کی سرکردگی میں شام کی طرف ایک لشکر روانہ کیا تھا جو ابھی مقام جرف میں پہونچا تھا کہ حضور کی شدید علالت کی خبر پہونچی اور وہ وہیں ٹھہر گیا۔ یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

صحابۂ کرام اور حضرت ابو بکر کی گفتگو اب سوال یہ تھا کہ اس لشکر کو جس مہم پر بھیجا گیا تھا اُس پر اُسے جانے دیا جائے یا پہلے مرتدین کی سرکوبی کی جائے۔ جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی صحابہ کرام اس سے گھبرائے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ لے دے کے اب یہی مسلمان ہیں جو آپ کے سامنے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ عرب کا کیا حال ہے، وہ آپ سے ٹوٹتے جا رہے ہیں اس لیے مناسب نہیں ہے کہ آپ اس وقت مسلمانوں کو الگ الگ کریں [1] لیکن وہ جو خلیفۂ رسول تھا۔ وقت کے دریا میں اُن اُبھرنیوالی امواجِ حوادث سے کہیں سراسیمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے سامنے سب سے پہلا کام جو کرنے کا تھا اور ضروری تھا یہ ہی ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ صلعم اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو مہم روانہ فرما گئے تھے وہ تکمیل کو پہنچے اور ادھوری نہ رہے حضرت ابو بکر نے جواب دیا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مدینہ اس طرح خالی ہو جائے کہ میں ہی اکیلا رہ جاؤں اور درندے اور کتے مجھ کو بھنبھوڑ کھائیں میں اس وقت بھی اسامہ کو آنحضرت صلعم کے حکم کے مطابق اس مہم پر روانہ کر دوں گا۔" [2]

خلیفۂ رسول کا یہ قطعی فیصلہ معلوم ہو جانے کے بعد حضرت عمر نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس لشکر میں سن رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ شامل ہیں اور اسامہ نوجوان ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ امیر لشکر کسی معمر آدمی کو بنا دیجئے۔ حضرت ابو بکر یہ سنتے ہی غصہ میں قابو سے باہر ہو گئے اور فرمایا "اے خطاب کے بیٹے! رسول اللہ صلعم نے اسامہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا اور اب تم کہتے ہو کہ ان کو معزول کر دوں حضرت عمر یہ سن کر واپس گئے اور لوگوں کو برا بھلا کہا کہ ان کی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیق رض

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۶۱ - [2] طبری ج ۲ ص ۴۶۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۱۷

سے سخت سست سننا پڑا۔ [1]

جیشِ اُسامہ کی روانگی بہر حال حضرت ابو بکر نے اعلان عام کر دیا کہ جیشِ اسامہ میں جانے کے لئے جو لوگ نامزد کئے گئے تھے ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے۔ سب مقام جرف میں پہونچ جائیں اور خود وہاں پہونچکر لشکر کو روانگی کا حکم دیا۔ لشکر روانہ ہوا تو پا پیادہ اس کی مشایعت کو چلے۔ حضرت اُسامہ جو گھوڑے پر سوار تھے بولے "یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی پا پیادہ ہوا جاتا ہوں۔" فرمایا "تم کو خدا کی قسم جو اُترو۔ اور میں بھی ہرگز سوار نہیں ہوں گا۔ کیا ہوا اگر اللہ کی راہ میں کچھ دیر کے لئے میرے پاؤں غبار آلود ہو گئے۔ غازی کے ہر ہر قدم کے عوض سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔" اس کے بعد حضرت اسامہ سے فرمایا۔ "اگر تم نامناسب نہ سمجھو تو عمر کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ مجھ کو ان کے مشورہ کی ضرورت ہوگی۔" حضرت اسامہ اس پر بخوشی رضامند ہو گئے۔ اب حضرت ابو بکر نے لشکر کو روک کر نہایت قیمتی ہدایات دیں جن کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ اور لشکر روانہ ہو گیا [2]

مہم کی اہمیت اس مہم کی اہمیت خاص طور پر اس وجہ سے تھی کہ جیسا کہ غزوۂ موتہ کے بیان میں گزر چکا ہے عرب و شام کی سرحد کے ایک رئیس شرحبیل بن عمرو نے آنحضرت کے قاصد حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا اور آنحضرت صلعم نے ان کا انتقام لینے کی غرض سے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تھی۔ لیکن اس فوج کو شدید نقصان پہونچا۔ حضرت زید بن حارثہ اور ان کے یکے بعد دیگرے ان کے قائم مقام سب شہید ہو گئے اور فوج واپس ہو گئی۔ اسلامی لشکر کے اس حادثہ نے عرب و شام کی سرحدوں کے رؤوسا نے قبائل کو جو عیسائی تھے اس قدر ہمت دلا دی تھی کہ یہ لوگ اب مدینہ پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے اور خود مدینہ میں ان لوگوں کے حملہ کا اندیشہ اس قدر عام ہو گیا تھا کہ ایک مرتبہ (ایلاء کے واقعہ میں) عتبان بن مالک نے حضرت عمر فاروق سے دفعتہً آکر کہا تھا کہ "غضب ہو گیا" تو حضرت عمر نے گھبرا کر پوچھا خیر تو ہے؟ کیا

[1] طبری ج ۲ ص ۴۶۲ [2] ایضاً [3] صدیق اکبر ص ۵۔

عیسائی آگھے،، [1]

آنحضرت ؐ غزوۂ تبوک کے نام سے جو مہم لیکر گئے تھے۔ اہی دشمنِ اسلام قبائل کی سرکوبی کرنے اور حضرت زید بن حارثہ وغیرہ کا انتقام لینے کی غرض سے گئے تھے لیکن حالات ایسے پیش آگئے کہ آپ تبوک سے ہی پلٹ آئے۔ بہرحال ان قبائل کا زور توڑنا ضروری تھا اور آپ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں جتنے دیر ہوگی ان لوگوں کا حوصلہ بڑھیگا اسی بنا پر آپ نے اپنی ناسازیِ طبع کے باوجود حضرت اسامہ کی سرکردگی میں یہ لشکر روانہ کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکر جیش اسامہ کی اس اہمیت اور آنحضرت ؐ کا جو مقصد تھا اس سے پوری طرح باخبر تھے اسی وجہ سے آپ نے جب لشکر کو الوداع کہا تو اور باتوں کے ساتھ امیر لشکر کو اس کی بھی تاکید کی کہ "رسول اللہ ؐ نے تم کو جیسا حکم دیا تھا ویسا ہی کرنا۔ اور وہاں دیکھو اس کی تعمیل میں ذرہ برابر کوئی کوتاہی نہ ہو،، [2]

آنحضرت ؐ کا حکم کیا تھا؟ آپ نے فرمایا تھا۔

ان یوطی الخیل تخوم البلقاء والداروم من ارض فلسطین — فلسطین کی سرزمین میں بلقا اور داروم کے جو علاقے ہیں اسلامی لشکر اُن کو پامال کر کے آئے

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں۔

وامرہ ان یوطی من آبل الزیت من مشارق الشام الارض بالاردن۔ — اردن کی زمین جو شام کی سرحدوں میں ابل الزیت کے علاقہ میں ہے اس کو پامال کریں۔

چنانچہ اب لشکر جو تین ہزار مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا جن میں سے ایک ہزار سوار فوج تھی روانہ ہوا (آنحضرت ؐ کی وفات کے انیس ۱۹ دن بعد) مدینہ کے شمال میں جہاں قبائلِ قضاعہ رہتے تھے وہاں پہونچا۔ یہاں سے روانہ ہو کر جب وادی القریٰ پہونچا تو حضرت اسامہ نے پہلے سے دو جاسوس روانہ کر دئے۔ یہ جاسوس حالات کی تحقیقات کرکے واپس ہوتے ہوئے ابنی تک جو وادی القریٰ سے دو دن

[1] صحیح بخاری واقعہ ایلاء [2] طبری ج ۲ ص ۴۶۲ و ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۲

کی مسافت پر ہے۔ پہونچے ہی تھے کہ اسامہ بھی مع فوج کے پہونچ گئے۔ جاسوسوں نے حالات امید افزا بیان کئے تو حضرت اسامہ نے فوراً حملہ کی تیاری کرنے کا حکم دیا اور اس وقت فوج کو خطاب کرکے فرمایا۔

حضرت اسامہ کا فوج کو خطاب

اے مجاہدینِ اسلام! حملہ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ دشمن اگر بھاگ پڑے تو اُس کا پیچھا نہ کرنا۔ آپس میں متحد و متفق رہو۔ ہلکی آواز سے بولو۔ اللہ کو اپنے دلوں میں یاد کرو۔ اور تلواریں جب ایک مرتبہ نیام سے باہر نکال لو تو پھر جب تک تم اپنے دشمنوں کا جو تم پر ہتھیار اٹھائے ہوئے ہوں سر قلم نہ کر دو۔ ان تلواروں کو نیام میں مت رکھو۔،،

اس تقریر کے بعد حملہ شروع ہوا۔ دشمن مقاومت نہ کر سکا۔ اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت حضرت اسامہ سبجہ نامی اسی گھوڑے پر سوار تھے جس پر اُن کے والد حضرت زید بن حارثہ شہادت کے وقت سوار تھے چند مقامی لوگوں نے اُس شخص کی بھی نشاندہی کی جس نے حضرت زید کو قتل کیا تھا۔ اسے امیر لشکر کے سامنے لایا گیا تو اس کے حکم سے اس شخص کی گردن اڑا دی گئی اور اس طرح موتہ کا انتقام آج پورا ہوا۔

مقام ابنی میں ایک دن قیام کرکے حضرت اسامہ نے مال غنیمت اہلِ لشکر میں شرعی طور پر تقسیم کر دیا۔ اور دوسرے دن یہاں سے روانہ ہو کر وادی القریٰ ہوتے ہوئے بخیریت و عافیت مدینہ پہونچ گئے اس پوری مہم میں ایک مسلمان کا بھی جانی نقصان نہیں ہوا حضرت اسامہ نے وادی القریٰ پہونچکر مہم کی کامیابی اور اپنی واپسی کی اطلاع دربارِ خلافت کو کر دی۔ اس خبر سے مدینہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جب لشکر مدینہ میں داخل ہوا ہے تو حضرت ابوبکر اور دوسرے صحابہ کے علاوہ خواتین تک اسکے استقبال کیلئے موجود تھیں حضرت اسامہ مدینہ میں داخل ہوئے تو اس شان سے کہ اپنے باپ زید بن حارثہ کے گھوڑے پر سوار تھے اور انکے آگے آگے حضرت بریدہ پرچم اٹھائے چل رہے تھے یاد ہوگا کہ یہ وہی پرچم تھا جو آنحضرت ؐ نے وفات سے چند روز پہلے اسامہ کو سپرد کیا تھا۔

جس کے متعلق جیش اسامہ کی روانگی کے مخالفوں کو جواب دیتے ہوئے حضرت ابوبکر نے کہا تھا کہ جس پرچم کو رسول اللہؐ نے کھولا تھا میں اسے کس طرح لپیٹ کر رکھ دوں

اس منظر نے سب کو بیقرار کر دیا لیکن کون بتا سکتا ہے کہ اس وقت اپنے محبوب آقا و مولا کی آخری خواہش کو اس طرح اپنے ہاتھوں مکمل دیکھ کر خود صدیق اکبر کے قلب و جگر پر کیا کیفیت گزری تھی خوشی میں حضرت ابوہریرہ کا یہ حال ہوا کہ تین مرتبہ انکی زبان سے نکل گیا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۔ اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی پوجا نہ ہوتی [1]

مہم کا نتیجہ اور فائدہ | سیاسی اعتبار سے اس مہم کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قیصر روم پر جو اس وقت حمص میں تھا اس قدر اثر ہوا کہ اس نے ملک کے بطارقہ (بشپ پادری) کو جمع کیا اور کہا "دیکھو یہ وہی لوگ ہیں جن سے میں تم کو خبردار کرتا تھا لیکن تم نہیں مانتے تھے تم ان عربوں کی ہمت و جرأت دیکھتے ہو! ایک مہینہ کی مسافت پر آ کر تم پر چھاپہ مارتے ہیں اور صحیح سلامت اسی وقت واپس بھی چلے جاتے ہیں [2] اس کے علاوہ عرب و شام کی سرحدوں پر جو قبائل آباد تھے اور جو آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سن کر ہی علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ تھے ان کو یقین ہو گیا کہ اگر مدینہ میں مسلمانوں کی جمعیت بڑی مضبوط نہ ہوتی تو ان حالات میں یہ لشکر ہرگز مدینہ سے اتنی دور دراز مسافت پر نہیں بھیجا جا سکتا تھا اس خیال نے ان کے دلوں پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بٹھا دی اور وہ مرعوب ہو گئے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار ڈبلیو ورٹ منٹگمری لکھتا ہے کہ۔

پیغمبر اسلام نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جب تک شام کی طرف مہمیں روانہ نہیں کی جائیں گی عرب قبائل پُر امن نہیں رہ سکتے۔ ابوبکر اس کی سیاسی اہمیت سے واقف تھے اسی وجہ سے باوجود شدید مخالفت اور سخت خطرات کے انہوں نے اسامہ کی زیر قیادت ایک بڑا لشکر شام روانہ کیا تھا،، [3]

ایک بحث | عام طور پر مورخین لکھتے ہیں کہ اس مہم کی تکمیل میں چالیس دن صرف ہونے

[1] جزئی طور پر یہ واقعہ تمام تاریخوں میں مذکور ہے لیکن ہمنے یہ تمام تفصیلات تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۳ تا ۱۲۴ سے لی ہیں۔ [2] ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۴ [3] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

بلکہ ابن عساکر نے تو ۳۵ دن کی بھی ایک روایت نقل کی ہے۔ لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت اسامہ نے جو کاروائی کی اس کا دائرہ بلقا تک جو شام کے جنوب غرب میں واقع ہے وسیع تھا اور مدینہ سے یہاں تک کی مسافت کسی حالت میں چھ سو ساڑھے پانچسو میل سے کم نہیں ہے۔

(۲) جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ ہرقل نے اس مہم کی خبر سن کر بطارقہ سے کہا کہ دیکھو یہ لوگ (عرب) ایک مہینہ کی مسافت پر آ کر چھاپہ مار گئے۔ ہرقل کے اس قول کے بموجب آنے جانے میں کم از کم دو ماہ لگنے چاہئیں۔

(۳) یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر نے یہ مہم ماہ ربیع الاول ۱۱ھ کے آخر میں روانہ کی تھی [1]

(۴) پھر یہ بھی ثابت ہے کہ طلیحہ کے اکسانے پر چند قبائل نے جن کا ذکر آگے آئے گا مدینہ کا جو محاصرہ کیا اور وہاں لوٹ مار مچائی تھی۔ یہ واقعہ ماہ جمادی الاخریٰ میں پیش آیا تھا۔ اور اس وقت تک حضرت اسامہ یقیناً واپس نہیں آئے تھے۔ کیونکہ ان قبیلوں کا یہ حوصلہ ہوا ہی اس لئے تھا کہ ان کے وفد نے مدینہ سے واپس ہو کر ان کو اطلاع دی تھی کہ مسلمانوں کی تعداد مدینہ میں کم اور ان کی دفاعی طاقت کمزور ہے [2] اس کے علاوہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے تصریح بھی کی ہے کہ حضرت اسامہ اس واقعہ کے بعد آئے تھے۔

ثم قدم اسامة بن زيد بعد ذالك بليالٍ [1]	اس واقعہ (اعراب) کے چند روز بعد اسامہ واپس آئے۔

ماہ جمادی الاخریٰ جو البدایۃ والنہایۃ میں مذکور ہے اس سے اگر شروع ماہ بھی مانا جائے تو ربیع الثانی اور جمادی الاول پورے دو مہینے پھر بھی ہو جاتے ہیں۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۵ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۴
[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۲۰۴

ابن کثیر نے چالیس دن کی روایت نقل کرکے ایک قول ستر (۷۰) کا بھی نقل کیا ہے [1] ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے۔ اس کی تائید طبری کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

وکان فراغه فی اربعین	اور اسامہ کی فراغت چالیس دن میں ہوئی
یوماً سوی مقامه و	تھی اور یہ دن اُن کے قیام اور واپسی کے دنوں
منقلبه راجعاً [2]	کے علاوہ ہیں۔

چنانچہ اسلامیات کے فاضل اور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس لشکر کی مدت واپسی ستر دن ہی لکھی ہے [3]

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۴ [2] طبری ج ۲ ص ۴۶۳

[3] رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۲۷۹ مطبوعۂ ادارۂ اسلامیات لاہور

ارتداد وبغاوت اور اسکے اسباب

آنحضرتؐ کا دنیا سے رخصت ہونا تھا کہ باستثنائے مکہ و مدینہ پورے عرب میں یکایک ارتداد وبغاوت کا طوفان اس زور شور سے اٹھا کہ اسلام کی عمارت کے در و دیوار ہل گئے اور صحابۂ کرام اس میں محصور ہو کر رہ گئے۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق مسلمانوں کی اس وقت حالت اس بکری جیسی تھی جو کہ موسم سرما کی بارش والی رات میں کھڑی ہو [1]

بعض یورپین مصنفین نے عرب قبائل کی اس شورش وبغاوت سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام بزور شمشیر اور جبر پھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے باعث اسلام کی طاقت میں کچھ ضعف پیدا ہوا تھا کہ عرب نے علم بغاوت بلند کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے پھر ان کو تلوار کے زور سے اسلام میں داخل کر لیا۔ [2] اس اعتراض سے قطع نظر تاریخ کے ایک طالبعلم کو یہ خیال ضرور ہو سکتا ہے کہ آخر اسلام جو ایک دین حق اور مذہب فطرت ہے اس کا یہ نشہ کیسا تھا کہ چڑھا اور فوراً ہی اُتر گیا۔ اس خیال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مؤرخ اس فتنہ کو عام طور پر فتنہ ارتداد کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں اور ہم نے ان کی پیروی میں "ارتداد" کا ہی لفظ لکھا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے ارتداد نہیں تھا۔ اور جو لوگ مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرا ہوئے وہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جنہوں نے اگرچہ اسلام کو رسمی طریقہ پر کسی لالچ یا دباؤ سے قبول کر لیا تھا مگر قرآن کے لفظوں میں اسلام اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترا تھا۔ اسی بنا پر بعض مستشرقین تو ان لوگوں

[1] طبری ج ۲ ص ۴۶۱ [2] تاریخ الاسلام السیاسی ص ۲۶۹

کو سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے اور ان کی بغاوت کو سیاسی بغاوت کہتے ہیں

مستشرقین کی رائے | پروفیسر فلپ ہٹی لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ وسائل آمد و رفت کی کمی مبلغین کی باقاعدہ تنظیم کا فقدان اور قلت وقت (آنحضرت صلعم اور صحابہ ۹ھ تک غزوات اور اپنی اندرونی تنظیم میں ہی مصروف رہے، مبلغین کو بیرون مدینہ بھیجنے کا وقت کم ملا) یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے پیغمبر اسلام کی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی مسلمان نہیں ہو سکی تھی خود حجاز جو پیغمبر اسلام کی سرگرمیوں کا اصل میدان تھا اس کا حال یہ تھا کہ آپ کی وفات سے ایک یا دو سال پہلے مکمل طور پر مسلمان ہوا تھا جو وفد پیغمبر اسلام کی خدمت میں آتے تھے ظاہر ہے ان کو پورے عرب کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ اور کسی وفد کے مسلمان ہو جانے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ ایک قبیلہ کے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔" [1]

یورپین مصنفین میں سے مسٹر جے ولہاسن (J. WELLHAUSEN) اور پروفیسر کیتانی (Z. CAETANI) کی رائے یہ ہے کہ جو کچھ ہوا سرتاسر سیاسی بغاوت تھی اور مذہب کے ساتھ اس کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ [2]

وفاتِ نبوی کے وقت عرب قبائل میں دو گروہ | اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے علاوہ جو حجاز اور طائف میں آباد تھے [3]

---

[1] ہسٹری آف دی عربس ص ۱۴۱ [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جدید اڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰ [3] مکہ مدینہ اور طائف کے جو قبیلے اس کے علاوہ قریش کے اسلام پر ثابت قدم رہے انکے نام یہ ہیں۔ مزینہ، غفار، جہینہ بلی، اشجع، اسلم اور خزاعہ طائف کا قبیلہ ثقیف بھی مرتد ہو گیا تھا۔ لیکن وہاں آنحضرت صلعم کے مقررہ کردہ عامل عثمان بن العاص تھے۔ انہوں نے بڑی تدبیر سے کام لیا۔ اور ان لوگوں سے کہا کہ اے اولاد ثقیف تم سب سے آخر میں مسلمان ہوئے ہو

باقی صفحہ ۱۵۷ میں

عرب قبائل دو قسم کے تھے جن کے تفصیلی حالات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اعراب | ایک قسم تو اُن قبیلوں کی تھی جو مدینہ طیبہ کے قرب و جوار میں آباد تھے مثلاً عبس ذبیان، بنو کنانہ، غطفان اور فزارہ۔ یہ وہ لوگ تھے جن تک اگرچہ اسلام کا پیغام پہنچا تھا لیکن چونکہ آنحضرت صلعم نے بیرون حجاز میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کے تمام فرائض و واجبات کی تعلیم کا باقاعدہ پروگرام وفات سے صرف ڈیڑھ دو برس پہلے ہی شروع کیا تھا اور اس مقصد کے لئے معلمین و مبلغین کا تقرر عمل میں آیا تھا اس بنا پر مدینہ کے قرب و جوار میں رہنے والے قبائل نے اس پیغام کو سُنا اور اسے قبول بھی کیا۔ لیکن چونکہ ان کو براہِ راست آنحضرت صلعم کی صحبت و خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا اس لئے اسلام کی اصل روح سے وہ آشنا نہیں ہو سکے تھے۔ اور ان کا ایمان پختہ نہیں تھا۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کو اعراب کہا گیا ہے اور جگہ جگہ ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہے۔ سورۂ الحجرات میں ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔	اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اے محمد آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو لیکن ہاں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے درانحالیکہ ایمان تمہارے دلوں میں نہیں داخل ہوا ہے اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو تمہارے عملوں میں سے اللہ کچھ کم نہیں کرے گا۔ بے شبہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

ان اعراب میں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں میں کیا فرق تھا؟ قرآن نے اس کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ کسی شخص کو اعراب کے

(باقی صفحہ ۱۵۶)

اس لئے اب سب سے پہلے مرتد نہ ہو۔ عثمان بن العاص کا یہ فقرہ کام کر گیا اور یہ لوگ ارتداد سے باز آ گئے۔ (الصدیق ابوبکر از محمد حسین ہیکل ص ۸۲ مطبوعہ مصر)

سمجھنے اور پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہو۔ فوراً ہی ارشاد ہوا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ط أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

مومن تو صرف وہ ہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں پھر وہ شک بھی نہیں کرتے اور اللہ کے راستے میں اپنے مال وجان کے ساتھ جد وجہد کرتے ہیں اور بس وہی لوگ سچے ہیں۔

یہ اعراب وہی لوگ ہیں جو آگے چل کر مانعینِ زکوٰۃ بنے اس چیز کو ذہن میں رکھو اور دیکھو کہ قرآن کس بلاغت سے اعراب اور مومنوں میں فرق بتاتے ہوئے خبردار کر رہا ہے کہ۔

(۱) ان اعراب نے اسلام کی ظاہری شوکت وسطوت اور اس کے سیاسی اقتدار واستیلا کو دیکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن درحقیقت ایمان ابتک ان کے دلوں میں اترا نہیں ہے اور (۲) چونکہ یہ ابھی تک مومن نہیں ہوئے ہیں۔ اس بنا پر ان کو ابتک شکوک وشبہات ہیں اور یہ اللہ کے راستہ میں جان ومال خرچ کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہے۔

چنانچہ اعراب کی اس شتر گربگی کو ایک اور آیت میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔

سیقول لک المخلفون من الاعراب شغلتنا اموالنا واھلونا فاستغفر لنا یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم ط قل فمن یملک لکم من اللہ شیئاً ان اراد بکم ضراً او اراد بکم نفعاً ط بل کان اللہ بما تعملون خبیراً۔ (الفتح)

جو اعراب بچھڑ گئے ہیں وہ آپ سے کہیں گے کہ ہم کو ہمارے مال اور متعلقین نے مشغول کر لیا۔ اب آپ ہمارے لئے مغفرت طلب کیجئے۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے ایسی بات کہتے ہیں جو انکے دل میں نہیں ہے۔ اے محمد آپ ان سے کہدیجئے کہ اگر اللہ تم کو نقصان پہونچانے یا نفع تو اللہ کے اس ارادہ کو تمہارے لیے کون روک سکتا ہے؟ بلکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے

پھر اس کو قرآن کے اعجاز کے علاوہ اور تم کیا کہہ سکتے ہو کہ اس نے ان اعراب کی ایمانی کمزوریوں کی ہی پردہ دری نہیں کی ہے۔ بلکہ اس بات کی بھی پیش گوئی کر دی کہ حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں یہ اعراب بچے مسلمان ہو جائیں گے اور پھر اُن کو فارس وروم جیسی طاقتور قوموں کے مقابلہ میں جنگ کرنے کیلئے بھیجا جائیگا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (الفتح)

آپ پچھڑنے والے اعراب سے کہہ دیجئے اگر تم سخت رعب وداب والی ایک قوم کی طرف بلائے جاؤ گے تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے پس اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم نے ایسی ہی روگردانی کی جیسی کہ تم نے پہلے کی تھی تو اللہ تم کو سخت عذاب دے گا۔

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ مدینہ کے قرب وجوار میں جو قبائل آباد تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے اعراب کہا ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ (التوبہ)

اہلِ مدینہ اور وہ اعراب جو اُن کے ارد گرد یعنی اطراف واکناف میں رہتے ہیں ان کیلئے مناسب نہیں کہ وہ رسول اللہؐ سے پیچھے رہ جائیں۔

یہ وہی لوگ تھے جن کی خاطر خواہ تہذیب نفس اور تنظیم نہیں ہو سکی تھی۔ اور اسلام کی پوری حقیقت ان کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی اور اہلِ بدوات ہونیکی وجہ سے ان کا ذہن امر حق کو فوراً کما ینبغی قبول کرنے کی استعداد سے بے بہرہ تھا۔ اس بنا پر خود ان اعراب میں بھی دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو دل وجان سے مؤمن ہو چکے تھے اور دوسرے وہ جو عصبیتِ جاہلیہ اور اسلام کے درمیان کشمکش سے دوچار تھے اور ابھی تک اپنے لئے کوئی قطعی راہِ عمل متعین نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن نے اعراب کی ان دونوں قسموں کو بھی الگ الگ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

الاعراب اشدّ کفراً ونفاقاً واجدر الا یعلموا حدود ما انزل اللّٰہ علیٰ رسولہٖ ط واللّٰہ علیمٌ حکیمٌ ۝ ومن الاعراب من یتخذ ما ینفق مغرماً ویتربّص بکم الدوائر علیھم دائرۃ السوء ط واللّٰہ سمیعٌ علیمٌ ۔

(التوبۃ)

اعراب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں اور اس لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو احکام اتارے ہیں اُن کے حدود کو نہ جانیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور اعراب میں بعض وہ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو ایک ڈنڈ سمجھتے ہیں اور (اے مسلمانو) اس کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ تم کو چشم زخم پہونچے۔ یہ وبال انہی پر پڑیگا اور البتہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اعراب ہیں جن کا ذکر اس طرح کیا گیا۔

ومن الاعراب من یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر ویتخذ ما ینفق قربٰتٍ عند اللّٰہ وصلوٰت الرسول ط الا انھا قربۃٌ لّھم ط سیدخلھم اللّٰہ فی رحمتہٖ ط انّ اللّٰہ غفورٌ رحیمٌ ۝

(التوبۃ)

اور اعراب میں بعض وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو اللہ سے تقرب کا اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں ہاں بیشک وہ ان کیلئے تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ عنقریب ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بلیشک اللہ غفور و رحیم ہے۔

غور کرو پہلی قسم کے اعراب کی خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو ڈانڈ سمجھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ طبعاً بخیل و کنجوس تھے یا کم از کم انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اُن کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے بھی تھے ان کے نزدیک اسلام صرف نماز اور روزہ کا نام ہوگا۔ ان کا اصولِ زندگی "گر زر طلبی سخن دریں است" تھا [1]

---

[1] اسی قسم کا ایک اعرابی تھا جو ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں آیا اور اسلام پر بیعت کی اس کے بعد اسے بخار آگیا۔ تو اب اس نے حضور سے کہا کہ "میری بیعت کو منسوخ کر دیجئے" آپ نے ایسا کرنے سے انکار فرمایا۔ اعرابی پھر آیا۔ اور وہی درخواست کی۔ آپ نے پھر انکار فرمایا (باقی صفحہ آئندہ)

اِس کے بعد ایک بات یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کا باقاعدہ حکم فتح مکہ کے بعد ۸ھ کے آخر میں نازل ہوا ہے اور آنحضرت صلعم نے ۹ھ کے شروع میں اس حکم کی تبلیغ و اشاعت اور زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے اپنے عمّال و عفر اطراف و جوانب میں روانہ کئے ہیں اس بنا پر ان خاص اعراب کا ذہن زکوٰۃ کے بارہ میں صاف نہیں تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ ان میں شرارت پسند بھی تھے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ انمیں اکثر و بیشتر ایسے بھی تھے جو آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد یہ سمجھ بیٹھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم صرف آنحضرت صلعم کی زندگی تک کیلئے تھا۔ یا اگر اَب بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زکوٰۃ مدینہ ہی بھیجیں۔ اپنے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کر کے ہم خود اپنے فقرا پر بھی خرچ کر سکتے ہیں اپنی زکوٰۃ جمع کر کے مدینہ بھیجنے کو وہ لوگ ایک طرح کی زبردستی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو بن العاص رض عمان سے واپس ہوتے ہوئے بنو عامر کے علاقوں سے گزر رہے تھے کہ درمیان میں قرۃ بن ھبیرہ کے پاس قیام کیا۔ قرہ نے خوب خاطر مدارات اور تواضع کی جب عمرو بن العاص رخصت ہونے لگے تو قرہ اُن کو تنہائی میں لے گیا۔ اور بولا کہ اگر آپ لوگ (یعنی مدینہ والے) ہم سے مال لینا چھوڑ دیں تو ہم سب عرب آپ کے مطیع و فرماں بردار رہیں گے۔ ورنہ ہم اس تاوان کو قبول نہیں کر سکتے اور آپ کے ساتھ متفق نہیں ہوں گے۔ حضرت عمرو بن العاص قریش کے نامور اربابِ سیاست میں سے تھے قرہ کی اس دھمکی کے جواب میں بولے "کیا تو کافر ہو گیا ہے اور تو ہم کو عرب کی دھمکی دیتا ہے۔ میں تم لوگوں کو گھوڑوں سے پامال کر دوں گا۔" یہ کہا اور روانہ ہو گئے [1]

ان لوگوں کے اِس خیال کو تقویت اس سے بھی ہوئی ہوگی کہ جو قبائل عرب مسلمان ہوتے جاتے تھے آنحضرت صلعم ان کی آزادی اور اعلیٰ خالص مالی خود مختاری قائم رکھتے تھے۔ باذان یا بدھان (علی اختلاف الروایات) جو حکومت فارس کی طرف سے

بقیہ صفحہ گذشتہ: اب اعرابی اسی حالت میں مدینہ چھوڑ کر چلا گیا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: "مدینہ ایک بھٹی کی مانند ہے جو کھوٹے کھرے کو الگ کر دیتی ہے۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۰ باب بیعۃ الاعراب [2] طبری ج ۲ ص ۴۸۱

یمن کا گورنر تھا مسلمان ہوا تو آنحضرت ؐ نے اُسکی سیادت کو جوں کا توں برقرار رکھا بحرین اور حضرت موت کے امراء نے اسلام قبول کیا تو آپ نے اُن کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا اور حکم دیا ان علاقوں کے مالداروں سے جو زکوٰۃ وصول کی جائے وہ انہیں کے فقیروں، غریبوں پر خرچ کی جائے[1] ان وجوہ کی بنا پر جب تک آنحضرت ؐ اِس عالم ناسوت میں تشریف فرما رہے یہ لوگ مطیع اور فرماں بردار رہے لیکن آپ کی وفات کے بعد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ اب مدینہ کی اسٹیٹ کو زکوٰۃ دینا گویا اس کا باج گزار ہونا ہے اور اپنی قبائلی عصبیت کی وجہ سے وہ اس ننگ کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

قبائلِ عرب میں اعراب کا یہی وہ طبقہ ہے جن کو ہمارے مؤرخین مرتد لکھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ مرتد نہیں تھے۔ بلکہ مسلمان تھے۔ البتہ مختلف اسباب کی بنا پر جن کا ذکر ابھی ہوا۔ اپنی زکوٰۃ مدینہ اسٹیٹ کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ اپنے موقع پر ہم بیان کریں گے۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابۂ کرام ان لوگوں سے جہاد و قتال کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

سرکش و باغی قبائل (۲) ان اعراب کے علاوہ دوسرے قبائل وہ تھے جو مدینہ سے دور دراز اس کے جنوب میں یمن اور اس کے گرد و نواح میں شمال مشرق کی جانب عرب و شام کی سرحدوں پر آباد تھے۔ مؤرخین ان کو مرتد کہتے ہیں اور اسکی وجہ یہ ایک عام غلط فہمی ہے آنحضرت ؐ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے سارا عرب مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ طبری نے سدی کے واسطے سے روایت کی ہے حجۃ الوداع کے موقع پہ آنحضرت ؐ کی طرف سے اعلانِ برأت کے بعد کفار عام طور پہ مسلمان ہو گئے تھے۔ اس بنا پر اب بغاوت و سرکشی کا طوفان اٹھا تو اس کو ارتداد کے سوا اور کیا کہیں؟

---

[1] حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو آنحضرت ؐ نے جب اسلام کی دعوت اور اسکی تبلیغ و اشاعت کیلئے یمن بھیجا تو جہاں اور ہدایات کیں آپ نے معاذ بن جبل کو خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ اخبرھم ان اللہ قد فرض علیکم صدقۃ تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۳ باب بعث ابی موسیٰ و معاذ الی الیمن)

لیکن حق یہ ہے کہ یہ قبائل سرے سے اسلام کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوئے تھے فتح مکہ کے بعد جب قریش بھی سب کے سب مسلمان ہو گئے اور اسلام کی ایک زبردست اسٹیٹ مدینہ میں قائم ہو گئی تو عرب کے ان قبائل نے آنحضرت ؐ کی خدمت میں اس کثرت سے وفد بھیجنے شروع کئے کہ سنہ ۹ ھ کا نام ہی عام الوفود ہو گیا لیکن ان وفود نے آنحضرت ؐ سے جس طرح آکر گفتگو کی ہے اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اگرچہ ہر قبیلہ کے دو چار آدمیوں نے اسلام کو صدق دل سے قبول کر لیا تھا لیکن قبائل کا عام انداز یہ تھا کہ گویا وہ ایک سیاسی طاقت کے سامنے سر خم کر رہے ہیں اور ایک فاتح سے اپنے معاملات طے کر کے اپنے قبیلہ کیلئے معاشی اور سیاسی مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں دین اور روحانیت کا ان کی گفتگو میں بہت کم شائبہ تھا۔ اس بنا پر اگرچہ ان قبائل نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا لیکن یہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب ان کو موقع ملے اور یہ اسلام کے یا بالفاظ صحیح تر مدینہ کی ریاست کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیں چنانچہ آنحضرت ؐ کی وفات کے بعد ہی ان کو موقع ملا اور وہ جھٹ اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے ذیل میں اُن قبائل کے وفود کی آنحضرت ؐ کے ساتھ گفتگو کی مختصر روئیداد لکھتے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے۔ کہ جن لوگوں کا آنحضرت ؐ کیساتھ یہ طرز گفتگو ہو کیا ان کو صحیح صحیح مسلمان کہا جا سکتا ہے؟ اور جب وہ مسلمان ہی نہیں تو پھر ارتداد کا کیا ذکر؟

بنو تمیم اِس شورش و بغاوت میں جن قبیلوں نے حصہ لیا ان میں پیش پیش بنو تمیم اور بنو حنیفہ تھے۔ سنہ ۹ ھ میں بنو تمیم کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا آنحضرت ؐ نے ان کو جنت کی بشارت کی پیش کش کی۔ لیکن یہ لوگ اسکی قدر دانی نہیں کر سکتے تھے۔ بولے "قد بشرتنا فاعطنا" آپ نے ہم کو خوش خبری دی ہے تو کچھ دیجیئے بھی"۔ آنحضرت ؐ کو اس جواب سے بڑا صدمہ ہوا۔ یہاں تک کہ چہرہ کا رنگ بدل گیا اس کے بعد یمن کا ایک وفد آیا تو آپ نے اس کو خطاب کر کے فرمایا بنو تمیم نے تو اس پیش کش

کو قبول نہیں کیا، تم بھی کر لو تو ان لوگوں نے کہا "قبلنا یا رسول اللہ"

بنو حنیفہ اس قبیلہ کو شروع سے ہی اسلام اور آنحضرت صلعم کے ساتھ بیر تھا چنانچہ ہجرت سے قبل ایک مرتبہ عکاظ کے میلہ کے موقع پر اور قبیلوں کے علاوہ۔ اس قبیلہ بنو حنیفہ کے لوگوں کے پاس بھی آنحضرت صلعم تشریف لے گئے تو یہ لوگ نہایت بدتہذیبی اور تلخ کلامی سے پیش آئے تھے[۱] مکہ اور یمن کے درمیان ایک مقام یمامہ ہے، یہ قبیلہ یہیں کا رہنے والا تھا۔ مسیلمہ کذاب اس قبیلہ کا ایک فرد تھا جس نے بعد میں نبوت کا دعویٰ کیا اسی قبیلہ کا ایک وفد بھی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ مسیلمہ ساتھ تھا۔ اس نے کہا اگر محمد صلعم مجھ سے یہ وعدہ کر لیں کہ ان کے بعد میں سردار ہونگا۔ تو میں ان کی تابعداری قبول کر لونگا آنحضرت صلعم کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی اسے لئے ہوئے مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس گئے اور فرمایا کہ اگر تو مجھ سے یہ شاخ بھی مانگے گا تو نہیں دونگا"[۳]

اِس قبیلہ کا ایک سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ اگرچہ اس نے بھی ہجرت سے قبل مکہ میں آنحضرت صلعم کے ساتھ نہایت شوخ چشمی کا معاملہ کیا تھا[۲] اور پھر ۶ھ میں اسی کے علاقہ میں عامر بن الطفیل نے مسلمان مبلغوں اور مہمانوں کو دھوکہ سے قتل کر دیا تھا۔ لیکن ۹ھ میں یہ گرفتار ہو کر مدینہ آیا تو آنحضرت صلعم نے اس کو معاف کر دیا اور یہ مسلمان ہو گیا۔ بنو حنیفہ کے کسی شخص نے مذہب بدل دینے پر طعنہ دیا۔ لیکن یہ آخر وقت تک اسلام پر قائم رہے اور نامور صحابی ہوئے[۵]

مضر یمن کا مشہور قبیلہ ہے۔ یہ لوگ کفر میں اس قدر شدید تھے کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کی خدمت میں آنا چاہتے تھے ان کی راہ میں بھی رکاوٹیں ڈالتے تھے اسی سال قبیلۂ عبد القیس کا ایک وفد خدمتِ گرامی میں آیا تو عرض کیا "ہم لوگ قبیلۂ ربیعہ

۱؎ بخاری ج۲ ص۶۲۶ باب وفد بنی تمیم ۲؎ سیرت ابن ہشام ۳؎ صحیح بخاری ج۲ ص۶۲۸ ۴؎ اصابہ تذکرہ ثمامہ ۵؎ بخاری ج۲ ص۶۲۸ اگرچہ طبری نے واقدی کے حوالہ سے ثمامہ بن اثال کا نام بھی مرتدین کی فہرست میں لکھا ہے۔ (دیکھو طبری ج۲ ص۲۲۱) لیکن ظاہر ہے ہم بخاری کے مقابلہ میں واقدی کا بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے

سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے آپ کے درمیان مضر کے کفار حائل ہیں[۱]۔ ان لوگوں کے اس تشدد طبع کی وجہ سے ہی ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے اُنکے حق میں بددعا بھی کی تھی[۲]

دوس یہ قبیلہ بھی یمن کا ہے۔ ۹ھ میں طفیل بن عمرو الدوسی خدمتِ سامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ قبیلۂ دوس کے لوگ آپ کی اطاعت قبول کرتے نہیں اور سرکشی پر تلے ہوئے ہیں آپ اُن کے حق میں بددعا کر دیجئے۔ لیکن رحمتِ عالم صلعم نے دعا کی تو یہ کہ "اے اللہ تو دوس کو ہدایت دے اور ان کو مسلمان بنا دے"[۳]

اہلِ نجران نجران یمن کا مشہور شہر ہے جو مکہ سے سات دن کی مسافت پر ہے۔ عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔ اس شہر کے دو سردار عاقب اور سید بھی اسی سال بارگاہِ رسالت میں حضور صلعم سے مباہلہ کرنے آئے تھے لیکن بعد میں ان کی رائے بدل گئی اور آخر نہ اسلام لائے اور نہ مباہلہ کیا۔ یوں ہی واپس لوٹ گئے[۴]

اہلِ حضر موت اِس شورش و بغاوت میں اہلِ حضر موت نے بھی کافی حصہ لیا تھا اسلام سے قطع نظر۔ ان بدبختوں کو خود آقائے دوجہاں کی ذاتِ والا صفات کے ساتھ بھی اس درجہ شدید دشمنی تھی کہ جب بنو عامر بن عوف کے ایک شخص کے ذریعہ یہاں آنحضرت صلعم کی خبر وفات پہونچی تو یہاں کی عورتوں نے جن میں شریف و وضیع دونوں قسم کی عورتیں تھیں باقاعدہ جشنِ مسرت منایا۔ انہوں نے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور دف بجائے یہ عورتیں پہلے سے آنحضرت صلعم کی موت کی دعائیں مانگتی تھیں۔ ابو جعفر محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ نے ان عورتوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ بتائی ہے اور ان میں سے خاص خاص عورتوں کے نام اور اُن کے نسب بھی لکھے ہیں۔ موصوف کے بیان کے مطابق یہ عورتیں حضر موت کے مختلف علاقوں مثلاً تریم، مشطہ، الحجر اور تنعہ وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں یعنی وہ ان علاقوں کی نمائندگی کر رہی تھیں[۵] پس جب عورتوں کی آنحضرت صلعم کے ساتھ دشمنی کا یہ عالم تھا تو اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا جن قبیلوں

۱؎ بخاری ج۲ ص۶۲۷ ۲؎ العقد الفرید ج۱ ص۲۳۶ جدید ایڈیشن ۳؎ بخاری ج۲ ص۶۳۰ ۴؎ بخاری ج۲ ص۶۲۹ ۵؎ کتاب المحبر ص۱۸۴-۱۸۵ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔

سے تعلق تھا وہاں کی عام فضا کیا ہوگی۔؟

بنوعامر پھر معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ بعض قبیلوں نے آنحضرتؐ کو دھوکہ سے قتل تک کر دینے کی سازش کی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۰ھ میں عامر بن الطفیل اربد بن قیس اور جبار بن سلمی کی سرکردگی میں بنوعامر کا ایک وفد خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوا تو اسی ناپاک منصوبہ کو لے کر آیا تھا۔ عامر بن الطفیل اور اربد دونوں میں قرارداد ہوئی تھی کہ عامر بن الطفیل حضور کو باتوں میں لگا کر اپنے ساتھ مشغول کرلیگا اور اُدھر اربد موقع پا کر آپؐ پر تلوار کا وار کر دے گا۔ لیکن یہاں پہونچکر اربد پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ عامر کے اشارہ کرنے کے باوجود ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکا۔ اور آخر دونوں واپس چلے گئے [1]

یہی عامر بن الطفیل ہے کہ جب اس کو بعض لوگوں نے اسلام کی دعوت دی تو اس نے بپھر کر جواب دیا تھا "میں نے تو قسم کھالی ہے کہ میں اسوقت تک چین نہیں لونگا جب تک سارا عرب میرا مطیع نہیں ہو جائیگا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں قریش کے ایک حوصلہ مند شخص کی پیروی کردوں [2]۔

یہ وفد بنوعامر جب واپس لوٹ رہا تھا۔ تو عامر بن الطفیل کو ایک مقام پر طاعون ہوا اور قبیلۂ بنوسلول کی ایک عورت کے گھر میں مرگیا۔ اربد اپنے قبیلہ میں واپس پہونچا تو لوگوں نے حالات پوچھے۔ اس شخص نے نہایت حقارت آمیز الفاظ میں آنحضرتؐ کا تذکرہ کیا اور بولا "کچھ نہیں۔ یہ شخص (آنحضرتؐ) کس شئی کی عبادت کی ہم کو دعوت دیتا ہے۔ اگر یہ یہاں میرے پاس ہو تو میں اس کو اپنے تیروں کا نشانہ بنا دوں [2]

قدرت نے اس بدزبانی اور گستاخی کا انتقام اس سے اس طرح لیا کہ اس واقعہ کے ایک یا دو دن بعد وہ اپنا اونٹ لئے اسے فروخت کرنے جا رہا تھا کہ درمیان راہ میں اچانک اس پر اور اس کے اونٹ پر بجلی گری اور دونوں وہیں جل کر بھسم ہو گئے۔ [4]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۹۸ [2] ایضاً [3] طبری ج ۲ ص ۳۹۹ [4] ایضاً

یہ جو کچھ تم نے پڑھا جنوبی عرب کا حال تھا۔ شمال مشرق میں عرب و شام کی سرحد پر غسان قضاعہ وغیرہ جو قبائل آباد تھے ان کی فتنہ انگیزی اور شورش پسندی کی کیفیت تم غزوۂ موتہ کے ذکر میں پڑھ آئے ہو۔ انہیں کی سرزنش اور تادیب کیلئے آنحضرتؐ نے حضرت اسامہ کی زیرِ سرکردگی ایک لشکر روانہ کیا تھا۔ لیکن ابھی یہ مقام جرف سے آگے بھی نہیں بڑھا تھا کہ خود حضور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یعنی آنحضرتؐ کی وفات تک یہ قبائل بھی بحیثیتِ مجموعی اپنی اسی جاہلیت پر قائم رہے۔

سطور بالا میں ہم نے قبائل کی ایک عام کیفیت وحالت پر روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ان قبائل کو من حیث المجموع کیونکر مسلمان کہا جا سکتا ہے اور جب یہ مسلمان ہی نہیں تو پھر یہ کہنا کہ خلافتِ صدیقی میں یہ مرتد ہو گئے تھے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

اب ہم بعض خاص اشخاص کی نسبت گفتگو کریں گے جن کے متعلق اولاً غزواتِ نبوی تک میں شریک ہونا اور پھر باغیوں کی قیادت کرنا ثابت ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی مرتد نہیں تھے؟

عینیہ بن حصن الفزاری حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ شخص فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو گیا تھا اور فتح مکہ کے علاوہ غزوۂ حنین ومحاصرۂ طائف میں شریک ہوا تھا۔ پھر آنحضرتؐ نے اس کو بنو العنبر پر جو بنی تمیم کی ایک شاخ ہے چھاپا مارنے کے لئے بھی بھیجا تھا لیکن ابوبکر کے عہد میں مرتد ہو گیا۔ [1]

حافظ ابن حجر نے اس کو مسلمان ماننے کے بعد مرتد کہا تھا لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے یہ شخص آنحضرتؐ کے زمانہ تک مسلمان ہی نہیں ہوا تھا۔

اصل یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو "مؤلفۃ القلوب" کہلاتے تھے۔ آنحضرتؐ ان لوگوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دلاتے تھے اور اُن کے ساتھ دوسری رعایتیں بھی کرتے تھے اور یہ سب کچھ تالیفِ قلب کی غرض سے ہوتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ شخص یا تو خود سچا اور پکا مسلمان ہو جائے اور یا اگر

---

[1] الاصابہ تذکرہ عینیہ ابن حصن ج ۳ ص ۵۵

وہ اپنے قبیلہ کا کوئی با اثر آدمی ہے تو مسلمان اس کے شر سے محفوظ رہیں مؤلفۃ القلوب کی بس صرف یہی حیثیت تھی۔

اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مؤلفۃ القلوب سچ مچ مسلمان بھی ہو۔ یہ لوگ غزوات تک میں شریک ہوتے تھے لیکن صرف مالی منفعت اور غنیمت میں حصہ دار ہونے کے لئے اسلام یا جذبۂ اقامتِ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے ساتھ رہنے سے بہرحال مسلمان کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے اور پھر مالِ غنیمت میں اپنا حصّہ حلال کرنے کی غرض سے یہ لوگ کچھ نہ کچھ کرتے بھی ہوں گے اس بنا پر آنحضرت صلعم انکو اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے اور کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی اعتبار سے تدبّر و دور اندیشی کا مقتضا بھی یہی تھا۔[1]

عُیینہ بن حصن اپنی قوم کا سردار تھا[1] اور مؤلفۃ القلوب میں سے تھا[2] غزوۂ حنین کے موقعہ پر آنحضرت صلعم نے جن مؤلفۃ القلوب کو بہت کچھ دیا تھا۔ طبری نے اُن کی فہرست دی ہے اور اس فہرست میں عُیینہ کا نام بھی ہے۔

---

[1] طبری کی روایت ہے کہ آنحضرت صلعم۔ ابو سفیان بن حرب۔ اُن کے بیٹے امیر معاویہ اور حکیم بن حزام کو بحیثیت مؤلفۃ القلوب کچھ زیادہ حصّہ دیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مسلمان تھے اور اسلام پر قائم رہے اس سے معلوم ہوا کہ مؤلفۃ القلوب مسلمان بھی ہوتے تھے اور تالیفِ قلب کا فائدہ صرف سیاسی نہیں دینی بھی ہو سکتا تھا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محض غزوات میں شرکت کی بنا پر کسی شخص کے اسلام کا حکم نہیں لگایا جا سکتا تھا اس کیلئے اسکی زندگی کے عام حالات دیکھنے ہوں گے کیونکہ ممکن ہے وہ مؤلفۃ القلوب میں سے ہو اور تالیفِ قلب نے بھی اس کو نہ بدلا ہو یا منافق ہو[1] چنانچہ حافظ نے اس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ یہ خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا اس وقت حضرت عائشہؓ آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں عیینہ نے حضرت عائشہ کیطرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ کون عورت ہے" آپ نے جواب دیا "عائشہؓ" اب عیینہ بولا "آپ میری بیوی ام البنین کو قبول کر لیجئے تا جو عائشہؓ سے زیادہ بہتر ہے" حضرت عائشہؓ کو یہ سُن کر غصہ آگیا تو آنحضرت صلعم نے فرمایا "یہ شخص احمق ہے مگر اپنی قوم کا سردار مطاع ہے"[3]

الاصابہ جلد ۳ ص ۵۵

عبداللہ بن ابی بکر کا بیان ہے کہ یہ سب لوگ اشراف میں سے تھے اور آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کو سو اونٹ فی کس کے حساب سے دئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود عیینہ کا کیا حال تھا اور اگر وہ مسلمان تھا تو اس کا اسلام کس قسم کا تھا اس کا اندازہ واقعاتِ ذیل سے ہوگا۔!

کسی شخص نے آنحضرت صلعم سے کہا "یا رسول اللہ! آپنے عیینہ اور اقرع بن حابس کو سو سو اونٹ دئے ہیں لیکن جعیل بن سراقہ کو چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

اما والذی نفسی بیدہ لجعیل	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم! اس میں
بن سراقۃ الضمری خیر من	شک نہیں کہ جعیل۔ عیینہ اور اقرع جیسے تمام دنیا
طلاع الارض کلھم مثل عیینۃ	بھر کے چھابہاروں سے زیادہ بہتر ہے، لیکن میں
بن حصن والاقرع بن حابس و	ان دونوں (عیینہ اور اقرع) کی دلجوئی کرتا ہوں
لکنی تألفتھما لیسلما وکلت	تاکہ یہ مسلمان ہو جائیں اور رہا جعیل تو اس کو میں نے
جعیل بن سراقۃ الی اسلامہ[1]	اس کے اسلام کے حوالہ کر دیا ہے۔

غور کرو! آنحضرت صلعم کا "لیسلما" فرمانا صاف بتاتا ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں آپ کے نزدیک مسلمان نہیں تھے۔ اس طرح ایک مرتبہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں چند انصاریوں کی نسبت آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس بات کے شاکی ہیں کہ آپ مؤلفۃ القلوب کو تو کافی دے رہے ہیں۔ لیکن انصار کو نظر انداز کر رہے ہیں تو آپ نے فوراً تمام انصار کو جمع کیا اور ایک نہایت مؤثر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

تألفت بھا قوماً لیسلموا	میں ان عطیات کے ذریعہ ایک گروہ کی دلجوئی کرتا ہوں
ووکلتکم الی الاسلام[2]	تاکہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور تمکو اے انصار اسلام کے حوالہ کر دیا ہے۔

لیکن عیینہ کی فطرت احسان ناشناس تھی۔ آنحضرت صلعم کی اس غیر معمولی داد و دہش

---

[1] طبری جلد ۲ ص ۳۵۹

کے باوجود وہ آپ کے صرف انہیں احکام کی تعمیل کرتا تھا جو اُس کے ذاتی مفاد سے نہیں ٹکراتے تھے۔ غزوۂ حنین میں اگرچہ اس کو سو اونٹ مل چکے تھے لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلعم نے فریق مخالف کی ایک بڑھیا کو جو گرفتار ہو کر آئی تھی۔ باندی بنانے سے منع کیا تھا۔ عیینۃ نہ مانا اور زرِ فدیہ کے لالچ میں اسے بھی اپنے قبضہ میں کر لیا اور آنحضرت صلعم کے حکم کے باوجود اسے واپس کر دینے سے انکار کر دیا [۱]

علاوہ بریں اس نے جاہلیت کے عادات و رسوم کو بھی ترک نہیں کیا تھا اور اس بنا پر آنحضرت صلعم کے ساتھ کبھی بڑی بے ادبی اور گستاخی سے پیش آتا تھا طبری نے سنہ ۹ھ کے واقعات میں عبداللہ بن ابی بکر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بنو تمیم کا وفد آیا۔ عیینۃ بن حصن الفزاری اور اقرع بن حابس یہ دونوں بھی ساتھ تھے آنحضرت صلعم زنانخانہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے بڑی بے ادبی سے چیخ کر حضور صلعم کو آواز دی اور باہر آنے کیلئے کہا۔ آپ باہر تشریف لائے تو ان لوگوں نے کہا۔ "ہم آپ سے حسب و نسب میں مفاخرت کرنے کی غرض سے آئے ہیں آنحضرت صلعم نے انکا چیلنج قبول کر لیا اور ان کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس اور ان کے شاعر زبرقان بن بدر کے بالمقابل اپنے شاعر حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ انکے مفواب کا جواب دیں طبری نے اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے اور جانبین کے خطبے اور اشعار نقل کئے ہیں اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعض غزوات میں شریک ہونے کے باوجود عیینۃ اور اس کے دوسرے ساتھی۔ اقرع بن حابس۔ عطارد بن حاجب بدستور عہدِ جاہلیت کے رسوم و افکار پر قائم تھے اور اسلام کی کسی تعلیم کا ان لوگوں کی زندگی پر کوئی اثر نہیں تھا [۲]

اسی کا یہ اثر تھا کہ جب طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو عیینۃ جھٹ اس کا دستِ راست بن گیا اور اب وہ کہا کرتا تھا "خدا کی قسم دو حلیفوں میں سے کسی ایک نبی کا ہم اتباع کریں

---

[۱] طبری ج۳ ص ۲۵۷ [۲] طبری ج۲ ص ۳۷۸ [۳] طبری ج۲ ص ۴۸۷

یہ ہمارے لئے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک قریشی نبی کی پیروی کریں [۱]
عیینۃ کا اقرار کردہ مسلمان نہیں تھا بہرحال اس لحاظ سے ہم کو عیینۃ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے اسلام قبل از ارتداد کے بارے میں ہمکو کسی مغالطہ میں نہیں چھوڑا جب یہ گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا ہے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ اسکی گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ مدینہ کے لڑکے کھجور کی ایک شاخ سے اس کو ٹہکاتے پھرتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ او دشمنِ خدا! تجھ کو آخر یہ کیا سوجھی تھی کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا۔ عیینۃ اسکے جواب میں کہتا تھا "قسم خدا کی میں تو کبھی ایمان لایا ہی نہیں تھا [۲]

اس سلسلہ میں ایک خاص اہم بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کا خون معاف کر دیا اور درگزر فرمایا [۳] اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عیینۃ حضرت ابوبکر کی رائے میں مرتد نہیں بلکہ باغی تھا۔

دوسرے لوگ عیینۃ پر اس قسم کے دوسرے لوگوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے عباس بن مرداس السلمی اور اقرع بن حابس یہ بھی مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اور اس حیثیت سے غزوات تک میں شریک ہوتے تھے لیکن عالم یہ تھا کہ غزوۂ حنین میں عباس بن مرداس کو دوسرے مؤلفۃ القلوب سے حصہ کم ملا تھا تو یہ شخص بگڑ گیا اور چند اشعار پڑھے جن میں یہ دو شعر حافظ ابن حجر نے نقل کئے ہیں۔

اتجعل نھبی ونھب العبید بین عیینۃ والاقرع
وما کان حصن ولا حابس یفوقان مرداس فی مجمع

ترجمہ۔ اے محمد صلعم! کیا آپ میرا اور میرے گھوڑے عبید کا لوٹا ہوا مال عیینۃ اور اقرع کے درمیان تقسیم کرتے ہیں حالانکہ حصن اور حابس یہ دونوں بھی کسی مجمع میں مرداس پر فائق نہیں ہو سکتے [۴]

---

[۱] طبری ج۲ ص ۳۸۹ محاصرۂ طائف کے موقع پر عیینۃ بھی اسلامی لشکر کے ساتھ تھا یہاں کسی شخص نے عیینۃ کو مشرکین کی تعریف کرتے سنا تو اس سے کہا "عیینۃ خدا تجھ کو غارت کرے۔ تو آیا ہے محمد رسول اللہ کی مدد کرنے لیکن تعریف کر رہا ہے مشرکین کی" عیینۃ نے جواب دیا۔ خدا کی قسم میں تو تم مسلمانوں کے ساتھ (باقی آئندہ)

آنحضرت صلعم نے یہ سُنا تو آپ کو بڑا صدمہ ہوا اور حکم دیا کہ "اسکی زبان کاٹ لو" صحابۂ کرام نے اس کی تعمیل اسطرح کی کہ اسکو کچھ اور دیکر اسکی زبان بند کر دی [۱]

اقرع بن حابس کا حال تم ابھی پڑھ ہی چکے ہو کہ سنہ ۹ھ میں بنو تمیم کا جو وفد آنحضرت صلعم کے ساتھ مفاخرت کرنے آیا تھا اُس وفد کا ایک رکن یہ بھی تھا۔ پھر انصار کے شکوہ کرنے پر آنحضرت صلعم نے جن دو مؤلفۃ القلوب کو زیادہ حصّہ دینے کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا تھا: "لیسلما" ان میں سے ایک یہ اقرع بھی تھا۔ اسکے علاوہ عہدِ صدیقی میں ایک مرتبہ عیینہ اور اقرع خلیفۂ رسول کے پاس آئے اور کہا کہ آنحضرت صلعم مؤلفۃ القلوب کی حیثیت سے ہم پر داد و دہش کرتے تھے آپ بھی ایسا کیجئے اور اس کے بعد ایک زمین کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکر جو آنحضرت صلعم کے قدم بقدم چلتے تھے انہوں نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ لیکن جب پروانۂ خلافت کی تصدیق کے لئے یہ دونوں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں پہونچے تو انہوں نے شدید مخالفت کی اور فرمایا "اسلام جب کمزور تھا۔ آنحضرت صلعم تم لوگوں کی تالیف قلب کرتے تھے لیکن اب اسلام مضبوط اور قوی ہوگیا ہے اور ہم کو تم لوگوں کی پرواہ نہیں ہے تم اسلام کو نقصان پہونچانے کے لئے اپنی جیسی جو کوشش بھی کرسکتے ہو کر گزرو۔ [۲]

غور کرو! ارتداد سے تائب ہونے کے بعد بھی ان لوگوں کی حیثیت حضرت عمر کے نزدیک کیا تھی؟ مذکورۂ بالا اقتباس کے آخری فقرہ سے صاف ظاہر ہے۔

قبیلۂ بنو سلیم کا ایاس بن عبداللہ بن عبد یالیل جو الفجاءۃ کے لقب سے مشہور ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ثقیف سے جنگ کرنے آیا ہی نہیں ہوں۔ بلکہ میری غرض تو صرف یہ ہے کہ محمد صلعم نے اگر طائف فتح کر لیا۔ تو مجھ کو ثقیف کی ایک لڑکی ملے گی جس سے میں لطف اندوز ہونگا اور اس سے میری اولاد ہوگی (طبری ج ۲ ص ۱۵۵) [۱] طبری ج ۲ ص ۴۸۹ [۲] الاصابہ ج ۲ ص ۲۶۳ (حاشیہ صفحہ ہذا)

[۱] طبری ج ۲ ص ۲۵۹ [۲] الاصابۃ ج ۳ ص ۵۹۔ اسی واقعہ کو طبری نے بھی لکھا ہے (ج ۲ ص ۵۰۰) لیکن الفاظ کچھ بدلے ہوئے ہیں۔

مرتدین کے ایک گروہ کا عُنصر تھا [۱] لیکن ارتداد سے تائب ہونیکے بعد بھی اس کے اسلام کا کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اس نے حضرت ابوبکر کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں مسلمان ہوں اور جو لوگ مرتد ہوگئے ہیں ان سے جنگ کرنا چاہتا ہوں حضرت ابوبکر نے اُس کو ہتھیار اور ساز و سامان سے لیس کر دیا لیکن یہ بدبخت ان ہتھیاروں سے خود مسلمانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو گرفتاری کے احکام جاری کئے جب گرفتار ہو کر آیا تو حضرت ابوبکر نے شدید غداری اور بے وفائی کی وجہ سے اس کو بڑی سخت سزا دی اور آگ میں ڈلوا کر زندہ جلا دیا [۱]

بہرحال اس بحث سے تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جن لوگوں کو مرتد کہا جاتا ہے ان کے اسلام قبل از ارتداد کی کیا حقیقت تھی؟ حد یہ ہے کہ مسیلمہ اور طلیحہ جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا ان تک کی نسبت مؤرخین لکھتے ہیں کہ انہوں نے شروع میں اسلام قبول کر لیا تھا؟ لیکن اگر اسلام یہی ہے تو کفر کس چیز کا نام ہے؟ اصل بات یہی ہے کہ اوّل تو یہ ارتداد تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو بجائے دینی اور مذہبی ارتداد کے سیاسی ارتداد تھا۔ یعنی ان لوگوں نے مصلحتِ وقت کے پیش نظر آنحضرت صلعم کی طرف سیاسی اطاعت قبول کی تھی۔ اور وہ بھی محض منافقانہ طور پر۔ چنانچہ اس کے بعد بھی ریشہ دوانیوں میں لگے رہے اور جب فضا سازگار ہوتی نظر آئی تو کھلم کھلا علم بغاوت بلند کر دیا۔

وجوہ و اسباب

یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس صورت حال کے اسباب کیا تھے؟ اور وہ کیا وجوہ تھے جن کے باعث یہ لوگ دین حق کو ابتک قبول نہیں کر سکے تھے؟

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۴۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اسکا نام انس لکھا ہے لیکن صحیح ایاس ہے طبری وغیرہ ایاس ہی لکھتے ہیں [۲] طبری ج ۲ ص ۴۹۳

اصل یہ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا، آنحضرتؐ کی نبوت کے تیرہ سال تو مکہ مکرمہ میں بسر ہو گئے تھے یہاں اگرچہ حج کے موقع پر عرب کے مختلف قبائل کے لوگ آتے تھے اور آنحضرتؐ ان کو اپنا پیغام پہونچاتے تھے۔ لیکن اول تو یہ پیغام ظاہر ہے کہ چند آدمیوں تک ہی پہنچا تھا اور پھر جو لوگ اسکو سنتے تھے وہ بھی مختلف طبیعت اور مختلف استعداد کے تھے۔ ان میں کچھ صدق دل سے اسکو سنتے تھے اور پکے مسلمان ہو جاتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑا بہت اثر قبول کرتے تھے لیکن قبیلہ میں پہونچنے کے بعد وہ اثر زائل ہو جاتا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے دل سرے سے پسیجتے ہی نہیں تھے، اس کے علاوہ چونکہ قریش کی سخت ترین عداوت کے باعث خود آنحضرتؐ اور آپکے جاں نثاروں کو سخت ترین مشکلات اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اس لئے تبلیغ اسلام کا ایک ہمہ گیر نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر جب آپ مدینہ ہجرت کر گئے تو مدنی زندگی کے آٹھ سال غزوات و سرایا میں صرف ہو گئے اور اس کا اثر اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ حجاز کی بڑی آبادی مسلمان ہو گئی لیکن یہاں بھی منافقین کا ایک مستقل گروہ موجود تھا۔ پھر یہود و نصاریٰ بھی تھے جو یقیناً اسلام کے اس عروج پر خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ تو خود حجاز کا عالم تھا۔ رہ گئے وہ قبائل جو مدینہ سے دور دراز کے فاصلوں پر آباد تھے۔ تو اگرچہ آنحضرتؐ نے آخر عہد نبوت میں ان میں تبلیغ اسلام کے لئے مبلغینِ اسلام کے وفود روانہ کئے لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ سب قبائل اسقدر جلد اسلام کی دعوت کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکے اور وہ وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) عرب عاربہ اور متعربہ یعنی جنوبی عرب اور شمالی عرب کے قبائل میں دیرینہ عداوتیں تھیں یہاں تک کہ شمالی عرب کے لوگ خدا کو اللہ کہتے تھے تو جنوبی عرب کے قبائل رحمٰن کہتے تھے، مسلمہ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو بعض اس کے ساتھی صاف کہتے تھے کہ ہم جانتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور محمدؐ سچے ہیں لیکن با ایں ہمہ کذاب ربیعۃ احب الینا من صادق مضر، قبیلہ ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے ہم کو زیادہ محبوب ہے۔

(۲) یہود۔ نصاریٰ۔ مجوس اور منافقین۔ یہ لوگ اسلام کے دشمن اور موقع کے منتظر تھے ہی۔ اب انہوں نے قبائلِ عرب میں بے چینی دیکھی تو انہیں شہ دیکر اور آمادہ بہ فساد کر دیا چنانچہ سجاح بنت الحارث جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اس کے ساتھیوں میں ایک بڑی تعداد بنو تغلب کے عیسائیوں کی تھی۔[۱]

اسی طرح بحرین میں حطم کی زیر قیادت مجوسیوں نے بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ (۳) پھر سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں میں مدت سے چپقلش چلی آ رہی تھی اور عرب کے خانہ بدوش قبائل ان دونوں حکومتوں کے علاقوں پر آئے دن چھاپے مارتے تھے اس بنا پر دونوں نے اپنی اپنی سرحدوں پر ان عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی تھیں جنکو آجکل کی اصطلاح میں درمیانی مملکتیں (BAFFER STATER) کہا جاتا ہے۔ ایرانیوں نے حیرہ (حال کوفہ) میں ایک عربی ریاست اور رومیوں نے اسی طرح کی ایک عربی ریاست دمشق میں قائم کی۔ ایرانیوں اور رومیوں میں جب جنگ ہوتی تھی تو حیرہ اور دمشق کے عرب اپنی اپنی حامی مملکتوں کا ساتھ دیتے اور اسطرح خود اپنی ہی برادری کے لوگوں کے خلاف صف آرا ہوتے تھے۔ ایرانی اور رومی حکومتوں کی داد و دہش اور عرب نوازی کا اثر صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی بھی تھا۔ چنانچہ قبیلہ غسان جو سد مآرب کے ٹوٹنے کے باعث شام کی سرحد پر آکر آباد ہو گیا تھا اس نے عیسائی مذہب ہی قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح بحرین میں باغیوں نے جب حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا تو ایران کی ساسانی حکومت نے ان کی پوری پشت پناہی کی اور کمک بھیجکر ان کی مدد کی۔[۲]

ابن عبد ربہ نے "وفود العرب علی کسریٰ" کے زیر عنوان بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ عرب کے وفود کس طرح شاہِ ایران کے دربار میں جاتے تھے اور وہاں سے بڑے عطیات و صلات حاصل کر کے آتے تھے[۳] اسی طرح قیصر روم کی طرف سے ان عربوں کو بڑی بڑی رقمیں سالانہ عطیہ کے طور پر ملتی تھیں۔

ان حکومتوں کا عربوں پر اثر کس قدر عمیق تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے

---

[۱] محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۱ ص ۱۷۸ [۲] فتوح اعثم الکوفی [۳] دیکھو العقد الفرید جلد اول

ہوسکتا ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ حج کے موقع پر آنحضرت صلعم حضرت ابوبکر کے ساتھ قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس تشریف لیگئے اور قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِہٖ (الآیۃ) چند آیتیں پڑھ کر ان کو اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ کے سردار مفروق مثنی اور ہانی بن ربیعہ ان آیتوں سے بڑے کر متاثر ہوئے لیکن ساتھ ہی بولے کہ اوّل تو مدتوں کا خاندانی دین اچانک ترک کر دینا زود اعتقادی ہے اور پھر ہم لوگ کسرای کے زیر اثر ہیں اور ہم دونوں میں باہمی معاہدہ ہوچکا ہے کہ کسی اور کے اثر میں نہ جائیں گے [1]

اسلام کا جب غلغلہ بلند ہوا اور پیہم فتوحات کے باعث اس کے قدم حجاز میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور مدینہ میں ایک نہایت با اقتدار اسلام کی پہلی ریاست قائم ہوگئی تو اب ایران اور روم دونوں کی مملکتوں کو اپنی فکر ہوئی اور انہوں نے ان عرب قبائل کو جو ان کے احسانمند اور دست نگر تھے۔ اسلام کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور آخر کار انہیں بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ آنحضرت صلعم نے غزوۂ موتہ کا اہتمام انہیں لوگوں کی سرکوبی کے لئے کیا تھا۔ لیکن ابھی اس مہم کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوا تھا کہ آنحضرت صلعم کی ہی وفات ہوگئی۔ اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا بغاوت کے کوہِ آتش فشاں کی شکل میں اچانک پھٹ پڑا۔

مدّعیانِ نبوّت

ظاہر ہے اتنی بڑی اور وسیع تحریک بغاوت کسی لیڈر کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ یمن میں الاسود العنسی اس تحریک کا قائد تھا اور یمامہ میں بنو حنیفہ میں مسلمہ۔ قبیلہ اسد اور غطفان میں طلیحہ اور قبیلہ بنو تمیم میں سجاح اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ دراصل یہ تحریک ایک خالص سیاسی قسم کی تھی اور مذہب سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ

[1] روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت [2] کامل ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۵ مطبوعہ لیدن۔

جانتے تھے کہ اس تحریک کو مذہبی رنگ دیئے بغیر کامیاب نہیں بنایا جاسکتا اور پھر آنحضرت صلعم کی مثال ان کے سامنے تھی اس بنا پر ان لوگوں نے مذہب کا نام دیکر یہ تحریک شروع کی اور خود اپنے لئے نبوت کا دعویٰ کیا۔

اب ہم ان مدعیان نبوت کا حال الگ الگ لکھتے ہیں۔

الاسود العنسی مورخین لکھتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلا شخص جو مرتد ہوا وہ اسود العنسی ہے [1]۔ اس کا نام عبہلہ بن کعب تھا۔ قبیلہ مذحج کی شاخ عنس سے تعلق رکھتا تھا۔ کہانت اور شعبدہ بازی میں اسکو بڑی دسترس تھی۔ اُسکا ایک گدھا تھا جس کو اس نے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ گدھے سے کہتا کہ کیا تو اپنے رب کے سامنے سجدہ نہیں کریگا اور اسکے بعد وہ گدھے سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہتا اور گدھا فوراً اس کی تعمیل کرتا تھا اس کی وجہ سے اس کا لقب ذوالحمار پڑ گیا تھا۔ یہ بلاذری کا بیان ہے [2] لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ ذوالحمار نہیں بلکہ ذوالخمار ہے۔ خمار دوپٹہ یا اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ہر وقت عمامہ باندھے رہتا اور چادر اوڑھے رہتا تھا۔ اسلئے اس کو ذوالخمار کہتے تھے۔ [3]

العنسی کے ارتداد کے وقت یمن کی حالت یمن سیاسی اعتبار سے شاہِ ایران کے ماتحت تھا۔ اور جب آنحضرت صلعم نے اور سلاطین و امرا کیساتھ شاہ ایران کو بھی دعوتِ اسلام کا خط لکھا ہے تو اس وقت باذان یا بلبھان علی اختلاف الروایۃ حکومتِ ایران کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ کسرای (شاہِ ایران) نامۂ نبوی صلعم دیکھ کر چراغ پا ہوا اور اس نے باذان کو لکھا کہ حجاز کے اس شخص (آنحضرت صلعم) کا سر اسکے پاس بھیجدے لیکن باذان کا قلب اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوچکا تھا اس لئے کسرای کے حکم کی تعمیل کرنیکی بجائے اس نے کیا یہ کہ جب اسے آنحضرت صلعم کی طرف سے اسلام کی دعوت پہونچی تو اس نے فوراً اس کو لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا اس سے پہلے اسلام کی دعوت یمن میں پھیل ہی چکی تھی اور بہت سے لوگ یہاں مسلمان ہوچکے تھے۔ اب آنحضرت صلعم نے باذان

[1] کامل ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۵ مطبوعہ لیدن [2] فتوح البلدان ص ۱۱۳ [3] تاریخ الکامل ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۴

کو اپنی طرف سے پورے یمن کا گورنر مقرر فرمایا لیکن کچھ دنوں بعد جب باذان کا انتقال ہو گیا تو آپ نے یمن کی عملداری کو مختلف عمال میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ عمرو بن حزم کو نجران کا۔ خالد بن سعید بن العاص کو نجران و زبید کے درمیانی علاقہ کا۔ عامر بن شہر کو ہمدان کا۔ شہر بن باذان کو صنعاء کا۔ عک اور اشعریین کا طاہر بن ابی ہالہ کو۔ مارب کا ابو موسیٰ اور جند پر یعلیٰ بن امیہ کو عامل مقرر فرما دیا۔ ان عمال کے علاوہ اپنے چند معلمین بھی بھیجے تھے جو مختلف قبیلوں میں رہکر ان کو اسلامی احکام و مسائل کی تعلیم دیتے تھے۔ معاذ بن جبلؓ ان کے صدر تھے جن کیلئے کوئی علاقہ مخصوص نہیں تھا اور وہ قبیلہ قبیلہ تعلیم و تبلیغ کا کام انجام دیتے تھے۔ ان کے علاوہ حضر موت کے علاقوں پر زیاد بن لبید، سکاسک اور سکون پر عکاشہ بن ثور اور بنو معاویۃ بن کندہ پر عبداللہ یا مہاجر عامل مقرر کئے گئے تھے۔ لیکن مہاجر آنحضرت ؐ کی علالت کے باعث روانہ نہ ہو سکے تھے۔ آخر جب آپ کا وصال ہو گیا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کو روانہ کیا۔

اسود عنسی کا دعویٰ نبوت اور خروج

حجۃ الوداع سے تشریف لانے کے بعد آنحضرت ؐ کا مزاج گرامی کچھ ناساز ہو گیا تھا اسود عنسی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے خود نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ جیسا کہ گزر چکا ہے یہ شعبدہ باز تو تھا ہی قبیلہ مدحج اس کا ہم نوا ہو گیا۔ اسود نے سب سے پہلے نجران پر حملہ کیا اور آنحضرت ؐ کی طرف سے اس جگہ جو عامل اور مبلغ مقرر تھے۔ یعنی عمرو بن حزم اور خالد بن سعید ان کو یہاں سے نکال دیا اب وہ صنعاء کی طرف بڑھا۔ ادھر سے باذان کا بیٹا شہر مقابلہ کیلئے نکلا۔ لیکن شہر بن باذان نے جام شہادت نوش کیا۔ (یہ واقعہ اسود عنسی کے خروج سے پچیس دن کے بعد پیش آیا) شہر صنعاء کی حیثیت چونکہ مرکزی تھی اس لیئے اسکے سقوط کے ساتھ ہی مسلمان عمال میں اضطراب پیدا ہو گیا اور وہ فضا کو ناسازگار پاکر منتشر ہو گئے۔ بقول مؤرخ ابن اثیر کے اسود عنسی کی شہرت آگ کی طرح پھیل گئی اور چند روز میں ہی یہ یمن کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ شہر بن باذان کی شہادت کے بعد اس نے اسکی بیوہ سے نکاح بھی کر لیا تھا جس کا نام آزاد تھا، قدرت نے اسی بیوہ کے

ہاتھوں اسکی ہلاکت مقدر کی تھی۔

اسود عنسی کا خاتمہ

اس کا واقعہ یہ ہوا کہ جب آنحضرت ؐ کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے یہاں جو لوگ اپنے اسلام پر ثابت قدم تھے ان کو پیغام بھیجا کہ وہ صاف طور پر کھلم کھلا یا چالاکی کیساتھ جس طرح بھی ممکن ہو اسود عنسی کا مقابلہ کریں [1] ادھر ایران کے شاہی خاندان کے افراد اور اعیان و امراء جو یمن میں آباد تھے اسود عنسی نے ان کیساتھ انتہائی تحقیر و تذلیل کا معاملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے یہ لوگ یوں بھی اس شخص سے نالاں اور پریشان تھے۔ اب آنحضرت ؐ کا یہ حکم پہنچا جس کو وبر بن یحنس الازدی لیکر گئے تھے اور ادھر آپ نے قیس بن ھبیرۃ بن مکشوح کو بھی تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ اسود سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کر دیا تھا تو ان لوگوں نے ایرانی امراء فیروز اور داذویہ اور شہر بن باذان کی بیوہ آزاد جو اب اسود کی بیوی تھی ان سب کے ساتھ ملکر اسود کو دھوکہ سے قتل کر دینے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا چنانچہ آزاد کی رہنمائی میں ایک شب یہ سب لوگ اسود عنسی کے مکان میں ایک پوشیدہ راستہ سے داخل ہو کر چھپ کر بیٹھ گئے اور آخر صبح کے وقت جبکہ اسود نشہ کی حالت میں پڑا سو رہا تھا فیروز نے آگے بڑھ کر اس تمدہ کا وار کیا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا اور مذبوح بیل کی طرح ڈہاڑیں مارنے لگا۔ اسود کے مکان کے پہرہ دار جو ادھر ادھر تھے یہ چیخ سن کر دوڑ پڑے اور پوچھا کہ یہ کیا ہوا تو آزاد نے مذاق میں کہا کہ تمہارے پیغمبر پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ اتنے میں داذویہ اور قیس اور چند اور مسلمان جو چھپے بیٹھے تھے آ گئے اور قیس نے اسود کی گردن اسکے تن سے جدا کر دی۔ اسکے بعد شہر کی چہار دیواری پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ محمد ؐ رسول اللہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اسود عنسی جھوٹا اور کاذب تھا۔ اسود کے قتل ہوتے ہی اس کے ساتھیوں کے پاؤں اکھڑ گئے جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے جنہوں نے کچھ مقاومت کی ان کا کام تمام کر دیا گیا [2]

یہ واقعہ اگرچہ آنحضرت ؐ کی وفات سے پانچ روز پہلے پیش آیا تھا اور آپ نے اپنی

[1] یہاں تک کی تفصیلات کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵۵ - ۲۵۶ سے ماخوذ ہیں [2] ابن اثیر و فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۲-۱۱۳

زبانِ وحی ترجمان سے اسکا اظہار بھی فرما دیا تھا لیکن اسکی اطلاع مدینہ میں آپکی وفات کے دس دن بعد پہونچی[1] چونکہ خلافتِ صدیقی کے عہد کی یہ پہلی خوشخبری تھی اسلئے حضرت ابوبکر کو قدرتی طور پر اسکی بڑی مسرت ہوئی[2]

اسود عنسی کے قتل کے بارہ میں مورخین میں بڑا اختلاف ہے کہ وفاتِ نبوی سے قبل ہوا ہے یا بعد میں لیکن سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے دونوں کے بیانات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

طلیحۃ الاسدی طلیحہ کے باپ کا نام خویلد تھا اور قبیلہ بنی اسد کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے اسدی کہلاتا تھا، اس نے بھی نبوت کا دعویٰ آنحضرت صلعم کے عہد میں کیا تھا۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو آپنے ضرار بن الازور کو بنواسد کا عامل بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ طلیحہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جو لوگ مرتد ہو گئے ہیں انکی سرزنش کیجائے ضرار مسلمانوں کے ساتھ مقام واردات میں مقیم تھے اور یہاں مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی ان کے برخلاف طلیحہ اپنے آدمیوں کیساتھ سمیرا میں فروکش تھا لیکن اسکے ساتھیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آخر ضرار کے کسی ساتھی نے طلیحہ کو پکڑ کر اس پر تلوار ماری لیکن اتفاق سے یہ بچکر بھاگ نکلا۔ اب اسکو پروپیگنڈہ کا اچھا موقع مل گیا کہ تلوار اس پر اثر ہی نہیں کرتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کا ایک وسیع حلقہ اسکے گرد جمع ہو گیا۔ اتنے میں آنحضرت صلعم کی وفات ہو گئی، طلیحہ دعویٰ کرتا تھا کہ اسکے پاس جبریل آتے ہیں اور مسجع عبارتیں گھڑ گھڑ کر بطور وحی سناتا تھا۔ اور کہتا ہے کہ نماز میں رکوع و سجود کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ تمہاری کمر جھکے اور تمہاری پیشانیاں گرد آلود ہوں۔ آنحضرت صلعم کی وفات کو بھی پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا[3] چنانچہ عیینہ بن حصن الفزاری جو طلیحہ کا دستِ راست تھا۔ جہاں عصبیت کے نام پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔ یہ بھی کہتا تھا کہ دیکھو محمد صلعم کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ہمارا پیغمبر زندہ ہے[4] بہرحال اسد غطفان اور طے کے قبائل میں اس کو بڑا نفوذ و اثر حاصل ہو گیا۔ طلیحہ نے ان سب لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مقام ابرق میں ٹھہرا دیا اور دوسرے فریق کو مقام ذوالقصہ کیطرف بھیجا جو مدینہ طیبہ سے نجد کے راستہ پر قریب ہی واقع ہے۔

---

[1] بلاذری ص ۱۱۳ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵۸۔ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۱ [4] طبری ج ۴ ص ۴۸۷

سجاح بنت الحارث اس وقت نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کی ہوا کچھ ایسی چل رہی تھی کہ مرد تو مرد عورتیں بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کیلئے اتر پڑیں۔ چنانچہ سجاح نے جو بنو تغلب سے تعلق رکھتی تھی۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔ بنو تغلب اور بنو تمیم میں کچھ لوگ اسکے پیرو ہو گئے۔ انکے علاوہ قبیلہ ہذیل جو عیسائی تھا وہ بھی اس کا حامی ہو گیا اور مسیحیت کو ترک کر دیا۔ مالک بن نویرہ جو مرتد ہو گیا تھا اس کا دستِ راست تھا لیکن سجاح اور مسیلمہ جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔ دونوں میں ازدواجی تعلق ہو گیا[1] اور اسطرح اسکی نبوت مسیلمہ کی نبوت میں مدغم ہو گئی۔

مسیلمۃ الکذاب مسیلمہ کے باپ کا نام حبیب تھا اور کنیت ابوثمامہ یا ابوثمالہ تھی[2] بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بنو حنیفہ کا جو وفد آنحضرت صلعم کی خدمت میں ۹ھ میں آیا تھا۔ اسکا ایک رکن یہ بھی تھا اور اس نے آنحضرت صلعم سے کہا تھا کہ اگر اپنے بعد مجھ کو اپنا قائم مقام بنانے کا آپ وعدہ کریں تو میں آپ سے بیعت کر لوں گا۔ لیکن آپ نے کھجور کی ایک شاخ جو آپ کے پاس تھی اس کی طرف اشارہ کر کے صاف جواب دیدیا کہ اگر تو مجھ سے کھجور کی یہ شاخ بھی مانگے گا تو میں نہیں دونگا۔[3] اسی قبیلہ کے ایک اور شخص ھوذۃ بن علی نے بھی آنحضرت صلعم کو اسی طرح کی بات لکھی تھی۔ لیکن آپ نے اس کو بھی یہی جواب دیا اور ساتھ ہی دعا فرمائی کہ اے اللہ! تو مجھ کو اسکے شر سے بچا۔ چنانچہ چند روز کے بعد ہی یہ مر گیا۔ (بلاذری ص ۹۷)

مسیلمہ وفد بنو حنیفہ کے ساتھ اپنے قبیلہ میں واپس پہنچا تو نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اسکے ساتھیوں نے یہ خبر اڑا دی کہ محمد رسول اللہ صلعم نے مسیلمہ کو اپنا شریکِ کار تسلیم کر لیا ہے۔ بنو حنیفہ اور جو لوگ ان کے حلیف تھے وہ سب مسیلمہ کے ساتھی ہو گئے۔ اب مسیلمہ کو جرأت یہاں تک ہو گئی کہ اس نے آنحضرت صلعم کو ایک خط لکھا جس کا سرنامہ یہ عبارت تھی۔

---

[1] اس تعلق کی ابتدا کیسے ہوئی اور یہ کس نوعیت کا تعلق تھا۔ ابن جریر نے اس کی تفصیل جو کہ نہایت فحش ہے۔ ج ۲ ص ۲۷۹ پر لکھی ہے [2] فتوح البلدان ص ۹۰ بلاذری نے حلیہ یہ لکھا ہے کہ پست قامت زرد رو اور چپٹی ناک والا تھا۔ بلاذری بیان کے مطابق حبیب مسیلمہ کے باپ کا نہیں دادا کا نام تھا۔ اور باپ کا نام کبیر تھا لیکن طبری وغیرہ مسیلمہ بن حبیب لکھتے ہیں [3] صحیح بخاری، ج ...

"من مسیلمة رسول اللہ الی محمد رسول اللہ" اور اس کے بعد لکھا تھا۔ آدھی زمین میری ہے اور آدھی زمین قریش کے لیے ہے لیکن قریش انصاف نہیں کریں گے۔"

یہ خط عمرو بن الجارود الحنفی نے مسیلمہ کی طرف سے لکھا تھا۔ اس کا جواب نبی صادق مصدوق نے ابی بن کعب سے جو لکھوایا اسکے شروع میں یہ الفاظ تھے "محمد النبی الی مسیلمة الکذاب" اور پھر لکھا تھا کہ زمین اللہ کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

مسیلمہ کے ساتھیوں میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جو مسیلمہ کو جھوٹا سمجھتے تھے اور اسکی بداخلاقی و بدعملی کے باعث اسکو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن صرف قبائلی عصبیت کے باعث اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے چنانچہ خود مسیلمہ کا مؤذن جس کا نام حجیر تھا وہ جب اذان دیتا تھا تو برملا کہتا تھا۔ اشھد ان مسیلمة یزعم انه رسول اللہ" یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور لطف یہ ہے کہ مسیلمہ بھی یہ سن کر کہتا تھا افصح حجیر [1]"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسیلمہ خود بھی اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن صرف اپنا کام نکالنے کیلئے چہرہ پر نبوت کا نقاب ڈال لیا تھا۔

یوں تو مدعیان نبوت کے سلسلہ میں اور بھی دو تین نام ملتے ہیں لیکن انکو فروغ نہیں ہوا اور وہ جلد ہی گمنامی کی موت مر گئے۔ ارتداد و بغاوت کا عرب میں یک بیک جو طوفان اٹھا تھا اسکی رہبری اور قیادت بھی مذکورہ بالا چار شخص تین مرد اور ایک عورت کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ عیینہ بن حصن الفزاری اور مالک بن نویرہ وغیرہ ہم اقسم کے لوگ انہیں میں سے کسی نہ کسی کے اعوان و انصار تھے۔ ان چار میں سے ایک شخص یعنی اسود عنسی تو آنحضرت صلعم کی ہی حیات میں یا آپ کی وفات کے فوراً بعد (علی اختلاف الروایات) مارا گیا تھا اور اس کے ساتھیوں میں سے جو چند آدمی زندہ و سلامت بچ رہے تھے انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی [2] اب فتنہ کے سرخیل در غنہ طلیحہ سجاح اور مسیلمہ باقی رہ گئے تھے

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۹۷ [2] خود فیروز دیلمی جنہوں نے اسود عنسی کو قتل کیا تھا اور جن پر آنحضرت صلعم نے انکے متعلق یہ الفاظ فرمائے تھے قتله رجل مبارك من اهل بيت مباركين (ایران و عرب کی طرف اشارہ ہے) انکا بیان ہے کہ اسود کی قتل کے بعد صنعا میں ہمارا وہی اقتدار قائم ہو گیا جو پہلے تھا اور معاذ بن جبل ہمکو نماز پڑھاتے تھے (البدایة والنہایة ج ۶ ص ۳۱۰)

حضرت ابوبکر صدیق رضی نے ان کا خاتمہ کس طرح کیا اور اس طوفان پر کیونکر قابو پایا آئندہ باب میں اس کی تفصیل پڑھو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی کے جنگی اقدامات

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی نے جب حضرت اسامہ رضی کی سرکردگی میں لشکر حدود شام کی طرف روانہ کرنے کا ارادہ کیا ہے تو انصار اور کبار مہاجرین کی رائے عرب کی عام بغاوت و فتنہ انگیزی کے باعث اس کیخلاف تھی۔ ان حضرات کو اندیشہ تھا کہ مدینہ کو اسلامی فوج سے خالی دیکھ کر باغی مدینہ پر حملہ کر دیں گے اور پھر ان سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائیگا۔ لیکن خلیفہ رسول نے اس مشورہ کو محض اسلئے قبول نہیں کیا تھا کہ آپ کے نزدیک سب سے مقدم اور ضروری آنحضرت صلعم کے ادھورے چھوڑے کام کو پورا کر دینا تھا چنانچہ آپنے ایسا ہی کیا۔

مانعین زکوٰۃ اعراب کا وفد | قبائل عبس و ذبیان۔ بنو کنانہ، غطفان اور بنو فزارہ جو حوالی مدینہ میں آباد تھے یہ لوگ وہ تھے جو اس کا اقرار کرتے تھے کہ ہم نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ تھے بعض تو وہ تھے جو بربنائے بخل سرے سے ادائے زکوٰۃ کے ہی منکر تھے اور بعض کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ نکالیں گے لیکن اسکو مدینہ نہیں بھیجیں گے' ان لوگوں کا استدلال یہ تھا کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلعم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔

خذ من اموالھم صدقة تطھرھم	اے پیغمبر آپ لوگوں سے صدقہ لیجیے جو ان کو
وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلاتك	پاک و صاف کر دے اور ان کیلئے سلام و رحمت طلب
سکن لھم ۔	کیجیے آپکی صلوٰۃ اُنکے لیے تسکین کا باعث ہے

یہ کہتے تھے کہ اب حضور صلعم کی وفات کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جسکی صلوٰۃ ہمارے لیے سکن ہو۔ اس لیئے اب ہم کسی کو زکوٰۃ نہیں دیں گے اس کے علاوہ ان کا ایک استدلال یہ بھی تھا کہ آنحضرت صلعم کا زکوٰۃ کے بارہ میں ارشاد ہے۔

تؤخذ من اغنیائھم و ترد الی	زکوٰۃ ہر جگہ کے مال داروں سے لیجائے اور

فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِہِمْ ۔ انہیں لوگوں کے فقیروں پر تقسیم کر دی جائے ۔

اس بنا پر یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ نکالیں گے تو اس کو مدینہ نہیں بھیجیں گے بلکہ خود اپنے قبیلہ کے فقرا پر ہی تقسیم کر دیں گے۔ اب ان لوگوں نے سلسلہ جنبانی اس طرح کی کہ پہلے اپنے وفد گفتگو کے لئے مدینہ بھیجنے شروع کئے۔

ان وفود نے پہلے مدینہ کے دوسرے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے ان کی سفارش کر دیں۔

صحابۂ کرام اور حضرت ابوبکر میں گفتگو

اس وقت عرب کی جو عام حالت تھی کچھ اس کا احساس اور پھر ان وفود کا استدلال بھی کچھ دل لگتا سا تھا۔ صحابۂ کرام ان لوگوں کی گفتگو سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا کہ ان اعراب کو جو زکوٰۃ ادا کرنا نہیں چاہتے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے اور ان سے مزید کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ صحابۂ کرام کا خیال تھا کہ ان اعراب کا ایمان ابھی نیا نیا ہے۔ مکمل طور پر جب دل نشین اور راسخ ہو جائے گا تو پھر یہ لوگ خود زکوٰۃ دیں گے[1] لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ اونٹ کی ایک رسی سے بھی جس کو وہ آنحضرتؐ کے عہد میں ادا کرتے تھے انکار کریں گے تو میں اس پر اُن سے جنگ کروں گا۔ اسکے بعد فرمایا "زکوٰۃ مال کا حق (یعنی عبادت) ہے۔ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کریں گے ان سے قتال کروں گا۔

حضرت عمرؓ جو اپنی رائے کے اظہار میں زیادہ جری اور بیباک تھے انہوں نے کہا "آپ ان لوگوں سے قتال کس بنیاد پر کریں گے؟ آنحضرتؐ نے تو فرمایا ہے" مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جبتک کہ وہ "لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ"

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۱ علامہ ابن حزم نے اسی بنا پر ان لوگوں کی نسبت لکھا ہے وطائفۃ بقیت علی الاسلام ایضا الا انہم قالوا "نقیم الصلوٰۃ" وشرائع الاسلام" الا انا لا نؤدی الزکوٰۃ الی ابی بکر رضی اللہ عنہ ولا نعطی طاعۃ لاحد بعد رسول اللہؐ (الملل والنحل ج ۲ ص ۶۱) [2] بعض روایتوں میں عقال کا لفظ ہے جس کے معنی رسی کے ہیں اور بعض میں عناق کا لفظ ہے اسکے معنی ایک برس سے کم عمر کی بھیڑ ہیں۔

نہ کہیں۔ لیکن جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں گے مگر ہاں جب ان پر کسی کا کوئی حق ہو لیکن حضرت ابوبکرؓ کا استدلال یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ میں باعتبار فرضیت کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ دونوں کا ذکر ایک ساتھ ہی ہے اس کے علاوہ قرآن میں ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَہُمْ ۔ — پس اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تم ان سے کچھ نہ کہو۔

پھر یہ معلوم ہے کہ بنو ثقیف کا ایک وفد جو آنحضرتؐ کی خدمت میں طائف سے حاضر ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ہم اسلام قبول کرنے کیلئے تیار ہیں لیکن نماز سے ہم کو مستثنیٰ کر دیجئے تو آپ نے بڑی سختی کے ساتھ انکی یہ درخواست رد کر دی تھی اور فرمایا تھا "بھلا وہ دین ہی کیا ہے جس میں نماز نہ ہو" انہ لا خیر فی دین لا صلوٰۃ فیہ" پس جس طرح دین نماز کے بغیر کچھ نہیں ہے زکوٰۃ کے بغیر بھی وہ دین باقی نہیں رہ سکتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ چونکہ بالکل حق تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی ایک فیصلہ نے دین کی اصل عظمت اور اس کی اصلیت کو قائم رکھ لیا۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ بھی قائل ہو گئے خود فرماتے ہیں۔

فما ھو الا ان رأیت اللہ قد شرح صدر ابی بکر ۔ — تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی میں نے دیکھ لیا کہ اللہ نے ابو بکر کا سینہ کھول دیا تھا۔

وفود کی ناکام واپسی اور مدینہ کی حفاظت کے انتظامات

بارگاہِ خلافت سے مایوس ہو کر یہ ارکانِ وفد اپنے اپنے قبیلوں کیطرف واپس ہوئے یہاں مدینہ میں دیکھ ہی گئے تھے کہ صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد حضرت اسامہ کے ساتھ جا چکی تھی اور یہاں تھوڑے سے صحابۂ کرام رہ گئے تھے، ان لوگوں نے اپنے قبیلوں کو آمادہ کیا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر حملہ کر دیا جائے ادھر یہ لوگ یہ منصوبے باندھ رہے تھے اور اُدھر حضرت ابوبکرؓ نے وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے مدینہ کی حفاظت نگرانی کا بندوبست شروع کر دیا۔ آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ کبار صحابہ یعنی حضرت علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، زبیر بن عوامؓ

عبداللہ بن مسعود اور طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کی سرکردگی میں مدینہ کے مختلف راستوں پر حفاظتی دستے متعین کر دیئے اور جو اہل مدینہ تھے ان پر مسجد میں حاضر ہونا لازمی کر دیا تاکہ اگر کوئی ہنگامی صورت اچانک پیدا ہو جائے تو ان کو فوراً اطلاع ہو سکے اور سب کو خبردار کر دیا کہ "اے مسلمانو! یہ وفد تمہاری قلت تعداد کو دیکھ کر گیا ہے۔ اس لئے تم نہیں جانتے کہ یہ صبح کو حملہ کر دینگے یا شب میں، یہ لوگ مسافت کے اعتبار سے تو آخر تم سے قریب ہیں ہی یہ لوگ ہم سے معاملہ طے کرنے اور بہت کچھ توقعات لیکر آئے تھے لیکن ہم نے ان کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا ہے اس لئے تم تیار ہو جاؤ اور ہوشیار رہو[1]

مدینہ پر شب خون | حضرت ابوبکر کا جو اندیشہ تھا وہ آخر صحیح ثابت ہوا۔ وفد کو ناکام گئے ابھی تین دن ہی ہوئے تھے کہ ان قبیلوں نے جو طلیحہ اسدی کے زیر اثر تھے اپنے آپکے دو حصوں میں برابر تقسیم کیا۔ ایک حصہ مقام ذوحسی میں چھوڑا جو مدینہ کے قریب نجد کے راستہ پر واقع ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کمک کا کام دے۔ رہا دوسرا حصہ تو اس نے مدینہ پر غارت گری کے ارادہ سے چڑھائی کر دی۔ مدینہ کی حفاظت پر جو دستہ متعین تھا اس نے حضرت ابوبکر کو اطلاع پہونچائی۔ آپ نے حکم دیا کہ تم اپنی جگہوں پر رہو اور ادھر سے آپ خود مسلمانوں کو اونٹنیوں پر لیکر روانہ ہوئے باغی مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ پڑے، مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ باغی مقام ذوحسی پہونچے تو جو لوگ یہاں پہلے سے موجود تھے وہ بھی اب ان کے ساتھ مل گئے مسلمان اونٹوں پر انکا تعاقب کرتے ہوئے آ ہی رہے تھے کہ ذوحسی والوں نے کیا حرکت کی؟ چمڑہ کے تھیلے جو ان کے ساتھ تھے ان میں پھونک بھری، غبارہ کی شکل بنا کر ان میں رسیاں باندھیں اور انکو اونٹوں کی طرف پھینک مارا مسلمانوں کے یہ اونٹ جنگ کی فریب کاریوں کے عادی نہ تھے۔ اسلیئے بھاگ پڑے اور سیدھے مدینہ میں آکر ٹھہرے

مدینہ پر حملہ کی تیاریاں | قبیلۂ عبس وذبیان، بنو مرۃ اور بنو کنانہ وغیرہم جو انکے حلیف تھے سمجھے کہ مسلمان پسپا ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ اس لیئے اب انکا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۱-۳۱۲ [2] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۱ وطبری ج ۲ ص ۴۷۷ والبدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۲ [illegible]

مدینہ پر باقاعدہ حملہ کے ارادہ سے ذوالقصہ (یہ مقام بھی مدینہ سے قریب نجد کے راستہ پر ہے) والوں کو بھی پیغام بھیجا کہ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ طلیحہ کا بھائی (حافظ عماد الدین ابن کثیر نے بیٹا لکھا ہے) حبال ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اُدھر یہ لوگ مدینہ پر حملہ کا خواب دیکھ رہے تھے اور ادھر حضرت ابوبکر نے مدینہ واپس پہونچکر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا آتے ہی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ باقاعدہ فوج کی تربیت کی۔ فوج کے دائیں بازو پر نعمان بن مقرن کو، بائیں بازو پر عبداللہ بن مقرن کو مقرر کیا اور پچھلا حصہ ان کے بھائی سوید کے سپرد کیا۔ ابھی ایک پہر شب باقی تھی کہ روانہ ہو گئے۔ صبح کی پو پھٹی بھی نہیں تھی کہ دشمن پر جا پہونچے یہ لوگ بے خبر آرام سے سو رہے تھے مسلمانوں نے تلوار چلانی شروع کر دی یہ لوگ بدحواس ہو کر بھاگے تو ذوالقصہ میں دم لیا خلیفہ رسول نے ذوالقصہ تک ان کا تعاقب کیا لیکن اب ان لوگوں میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اسلیئے حضرت نعمان بن مقرن کو ان کے دستہ کے ساتھ ذوالقصہ میں چھوڑ کر خود مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ یہاں مسلمانوں کی اس کامیابی سے جو آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ حاصل ہوئی تھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ مختلف قبائل کے جو سردار مسلمان تھے وہ اپنی اپنی زکوٰۃ لے کر مدینہ پہونچ گئے اس سے جہاں مالی اعتبار سے تقویت ہوئی اور مسلمانوں کو امداد پہنچی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ باغیوں اور مرتدوں کی کثرت کے باوجود متعدد بیرونی قبائل کے رؤسا پکے اور سچے مسلمان تھے اس احساس نے خوشی دوچند کر دی،

جو حضرات مدینہ کا پہرہ دے رہے تھے ان میں سے ایک ایک صاحب زکوٰۃ رئیس کو لیکر مدینہ میں آتا تھا تو مسلمان ان کو دیکھ کر کہتے "ہذا نذیر"[1] حضرت ابوبکر فوراً فرماتے کہ نہیں بلکہ وہ بشیر ہیں۔ اور اسلام کے حامی ہیں سست نہیں ہیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں"

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۷ چونکہ یہ حضرات مدینہ کے پہرہ دار تھے اس لئے ان کا آنا بظاہر اس بات کی علامت تھی کہ مدینہ کو کوئی خطرہ پیش آگیا ہے اور یہ اسکی اطلاع لیکر آئے ہیں مسلمان فرط مسرت سے مذاق میں ان کو ھذا نذیر اسی مناسبت سے کہتے تھے جو حضرت صدقات لیکر آئے تھے تاریخوں میں ان سب کے نام بھی محفوظ ہیں

"بل ھو بشیر۔ وھو حام ولیس بوان" لوگ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ سے کہتے "طالما بشرت بالخیر" آپ تو ہمیشہ ہی خیر کی بشارت دیتے رہے ہیں۔

عبس و ذبیان کی غداری حضرت ابوبکرؓ کی ذوالقصہ سے واپسی کے بعد قبیلہ عبس و ذبیان کا اور کوئی بس نہ چلا تو یہاں تھوڑے بہت جو مسلمان تھے ان کو دھوکہ سے قتل کر ڈالا۔ صدیق اکبرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو قسم کھائی کہ جب تک وہ ان قبیلوں سے مسلمانوں کے خونِ ناحق کا بدلہ نہیں لے لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اسی اثنا میں حضرت اسامہؓ اپنی مہم سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آگئے تھے اب حضرت ابوبکرؓ کو اور زیادہ اطمینان ہوا، آپ نے حضرت اسامہؓ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور فرمایا اریحو واستریحو! تم لوگ اب آرام کرو۔

ذوالقصہ کو روانگی اس انتظام سے فارغ ہو کر آپ نے بنفس نفیس ایک فوج لیکر ذوالقصہ کی روانگی کا ارادہ کیا تاکہ غدار قبیلوں کو انکی غداری کی سزا دیکر مسلمانوں کا انتقام لیں صحابۂ کرام نے ہر چند منت وسماجت کی اور کہا اے خلیفۂ رسول! ہم آپکو قسم دیتے ہیں آپ نہ جائیے اگر خدانخواستہ آپ کو چشم زخم پہونچا تو ہم لوگوں کا کوئی نظام باقی نہیں رہے گا۔ اور آپ کا یہاں رہنا دشمن کیلئے سخت مرعوب کن ہوگا آپ اپنے بجائے کسی دوسرے کو بھیجدیجئے گا وہ اگر کام آگئے تو آپ انکی جگہ کسی دوسرے کو مقرر کر سکتے ہیں[1] لیکن حضرت ابوبکرؓ نہ مانے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب میرے باپ سواری پر بیٹھے اور تلوار میان سے باہر نکالے ذوالقصہ کیلئے روانہ ہونے لگے تو حضرت علی ابن ابی طالبؓ ان کی سواری کی باگ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے "اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! آپ کہاں جارہے ہیں؟ میں آپ سے وہی کہوں گا جو آنحضرت ﷺ نے غزوۂ احد کے موقع پر آپ سے کہا تھا یعنی یہ کہ آپ اپنی تلوار میان میں کیجئے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دردمند نہ کیجئے"۔[2]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۷۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۵ لیکن اسکے بعد حافظ صاحب فرماتے (بقیہ صفحہ آئندہ)

مانعین زکوٰۃ کی مکمل سرکوبی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان سب کے جواب میں فرمایا "اللہ کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا۔ اور میں اپنے نفس کے ساتھ تمہاری غمخواری قبول نہیں کرسکتا"، چنانچہ آپ اپنا لشکر لیکر ذی حسی اور ذوالقصہ کیطرف روانہ ہو گئے۔ مقام ابرق میں اہل ربذہ پر حملہ کیا۔ حارث اور عوف یہاں کے لیڈر تھے، ان کو شکست دی بنوعبس اور بنوبکر خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ حضرت ابوبکرؓ ابرق میں چند روز قیام فرمانے کے بعد آگے بڑھے اور بنوذبیان کو مغلوب کیا اور ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اور آخر اس طرح عبس و ذبیان نے جن مسلمانوں کو شہید کیا تھا ان کا انتقام لیکر فتح وکامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے مدینہ واپس آگئے۔[1]

بنوذبیان۔ عبس۔ غطفان۔ بنوبکر اور ان کے علاوہ دوسرے قبیلے جو مدینہ کے قرب وجوار میں آباد تھے اور جو اعرابِ مدینہ کہلاتے تھے حضرت ابوبکرؓ کی ان کے ساتھ یہ آخری کامیاب جنگ تھی" ان کو چاہئے تھا کہ اب وہ حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت قبول کر لیتے اور زکوٰۃ کی فرضیت کے بھی قائل ہو کر مسلمان اور پکے مومن بن جاتے۔ لیکن ان پیہم شکستوں نے ان کو بوکھلا دیا تھا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک اسلام کی جو مصنوعی نقاب انہوں نے اپنے چہرہ پر ڈال رکھی تھی اسے بھی نوچ کر پھینک دیا اور جو کھلم کھلا باغی اور کافر تھے ان کی صفوں میں جا کر مل گئے۔ اس لئے حروب ارتداد کا اب ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۷۹۔ (بقیہ صفحہ گذشتہ) ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؓ کی درخواست قبول کر لی اور وہ خود واپس ہو گئے اور لشکر روانہ کر دیا حالانکہ طبری وغیرہ میں ہے کہ آپ نے یہ مشورہ منظور نہیں فرمایا اور بہ نفس نفیس تشریف لے گئے۔

مدعیانِ نبوّت اور مرتدین سے عام جنگ

اِس وقت تک حضرت اُسامہ اور انکے رفقا، کچھ دنوں آرام کرنیکے بعد تازہ دم ہوچکے تھے اس لئے اب موقع تھا کہ مدعیانِ نبوّت کے برخلاف نہایت شدید اور ہمہ گیر مہم کا آغاز کیا جائے اور اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ بنو عبس و ذبیان اور بنو بکر وغیرہم ربذہ میں شکستِ فاش کھانے کے باوجود راہِ راست پر آنیکے بجائے طلیحہ کے زیرِ دامن پناہ گیر ہو گئے تھے وہاں سطے۔ غطفان اور سُلیم دوسرے قبیلے پہلے سے تھے ہی اسلیئے اب طلیحہ کی طاقت دوچند ہوگئی تھی اور وہ اس وقت اسلام کے لیئے بڑا خطرہ بنا ہوا تھا یہ حال تو مدینہ کے مشرق اور شمال مشرق کا تھا۔ اس کے علاوہ جنوب میں جو آگ لگی ہوئی تھی اس کا مختصراً ذکر آہی چکا ہے۔

اسلامی فوج کے گیارہ دستے

ان سب امور کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر ذوالقصہ میں دوبارہ تشریف لائے اور یہاں پوری اسلامی فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ کا الگ الگ ایک سردار جو صاحبِ علم ہوتا تھا مقرر فرمایا۔ اسکی تفصیل حسب ذیل نقشہ سے معلوم ہوگی۔

(نقشہ صفحہ آئندہ پہ ملاحظہ فرمائیے)

	سردارِ فوج کا نام	مقامِ جنگ	ان قبیلوں یا اشخاص کے نام جن سے جنگ کرنے کیلئے ان سردارانِ فوج کا تقرر ہوا تھا۔
۱	حضرت خالد بن الولید سیف اللہ	بزاختہ اور بطاح	طلیحہ اور مالک بن نویرہ
۲	" عکرمۃ ابن ابی جہل	یمامہ	مسیلمہ کذاب اور بنو حنیفہ
۳	" مہاجر ابن ابی امیہ	یمن و حضرت موت	پیروانِ اسود عنسی اور قیس بن العاص
۴	" عمرو بن العاص	عرب و شام کی سرحد	قضاعۃ۔ ودیعۃ اور حارث
۵	" خالد بن سعید بن العاص	الحمقتان (حدود شام میں)	یہاں جو قبائل آباد تھے بڑے سرکش تھے
۶	" علاء بن الحضرمی	بحرین	الحطم بن ضبیعۃ
۷	" سوید بن المقرن	یمن کا نشیبی علاقہ	
۸	" عرفجۃ بن ہرثمہ	مہرہ	
۹	" حذیفۃ بن محصن	عمان	لقیط بن مالک الازدی
۱۰	" طریفۃ بن حاجز السلمی[۱]	عرب کا شمالی حصہ	بنو سلیم و ہوازن۔
۱۱	" شرحبیل بن حسنہ	یمامہ (حضرت عکرمہ کیساتھ)	مسیلمہ و بنو حنیفہ [۲]

وقت اور سیاست کا تقاضہ تھا کہ حضرت ابوبکر خود مدینہ میں قیام فرمائیں چنانچہ آپ فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے دارالخلافہ میں مقیم رہے اور یہیں سے فوج کی نقل و حرکت کی نگرانی اور اس کیلئے احکام و ہدایات جاری کرتے رہے۔

اتمامِ حجت کے لئے حضرت ابوبکر نے فوج کو روانہ کرتے وقت ایک اعلانِ عام لکھ کر ہر دستۂ فوج کو الگ الگ دیا تاکہ جنگ سے پہلے باغیوں اور دشمنوں کو سنا دیا جائے۔ اسکو سنکر اگر یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں اور اسلام کی اطاعت قبول کرلیں تو ان سے درگزر کیا جائے ورنہ پھر جنگ فیصلہ کریگی۔ چونکہ حضرت ابوبکر کی یہ تحریر نہایت

[۱] طبری نے (ج ۳ ص ۸۰ ۴) ان کا نام طریفہ لکھا ہے لیکن ابن اثیر اور دوسری تاریخوں میں معن بن حاجز ہے دیکھو کامل ابن اثیر ج ۲ ص ص ۲۹۳ [۲] طبری و ابن اثیر

اہم ہے جس سے آپ کی سیاسی بصیرت عزم و ہمت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ساتھ ہی مختصراً اسلام کی اصل روح اس میں سمو دیگئی ہے اسلیئے ہم ذیل میں طوالت کے باوجود اس کا پورا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

خلیفۂ رسول کا اعلانِ عام

ابوبکر خلیفۂ رسول اللہؐ کیطرف سے اُن تمام عام و خاص لوگوں کے نام جن کے پاس میری یہ تحریر پہونچے اور جو اسلام پر قائم ہوں یا اس سے روگرداں ہو گئے ہوں۔ سلام اُن پر جنھوں نے ہدایت کی پیروی کی اور ایک مرتبہ اسکو قبول کرنیکے بعد اس سے گمراہی اور اندھے پن کی طرف نہیں لوٹے ہیں تم سب لوگوں کے سامنے اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کے بندہ اور رسول ہیں ہم اُن تمام چیزوں کا اقرار کرتے ہیں جو آپ لیکر آئے اور جو شخص اس کا منکر ہے ہم اس کی تکفیر کرتے ہیں اور ہم اس سے جہاد کرینگے

اما بعد! اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو اپنی طرف سے حق کیساتھ اپنی مخلوق کیطرف بشیر و نذیر اور حق کا داعی بناکر اور چراغ فروزاں بناکر بھیجا۔ تاکہ جو لوگ زندہ ہیں آپؐ انکو ڈرائیں اور کافروں پر اللہ کی حجت تمام کر دیں۔ اللہ نے جس کو توفیق دی اس نے یہ امرِ حق بخوشی قبول کر لیا۔ اور جس نے اس سے پشت پھیری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اس پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی طوعاً یا کرہاً اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے رسولؐ کو اس دنیا سے اٹھا لیا۔ آپؐ اللہ کے امر کو نافذ کر چکے تھے اور آپ پر جو کچھ فرض تھا اس کو پورا کر چکے تھے اللہ اس بات[1] (وفات نبویؐ) کو اپنی کتاب کے ذریعہ محمد رسول اللہؐ

[1] حضرت ابوبکر نے اس موقع پر آنحضرتؐ کی وفات کا ذکر زیادہ قوت کیساتھ اس لیئے کیا کہ عیینہ بن حصن وغیرہ جیسے مفسد قبائل میں یہی کہہ کہہ کے پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ محمدؐ کی وفات ہو گئی اور طلیحہ ابتک زندہ ہے اور زندہ رہیگا اس سے معلوم ہوا کہ اصل پیغمبر طلیحہ ہی ہے۔ غور کرو حضرت ابوبکر کے یہ ارشادات منصب نبوت اور مقام رسالت سے متعلق اسلام کے اصل نقطہ نظر کی کتنی اعلیٰ قسم کی توضیح ہے جسکے باعث اسلام دوسرے مذاہب سے بالکل متمیز ہو جاتا ہے

اور تمام اہل اسلام کو صاف طور بیان کر چکا تھا چنانچہ اُس نے کہا۔

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ۝	بے شک آپ بھی مرنے والے ہیں اور دوسرے بھی مرنے والے ہیں

اور اس نے کہا۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَھُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝	اور آپ سے پہلے ہم نے کسی انسان کو بھی دوامی زندگی نہیں بخشی تو کیا جب آپ مر جائیں گے تو یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں تو خطاب خاص آنحضرتؐ سے تھا۔ ان کے علاوہ عام مومنوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر اللہ شیئاً وسیجزی اللہ الشاکرین ۝	اور محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک رسول، ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں تو اگر یہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم روگردانی اختیار کر لو گے اور جو روگردانی اختیار کریگا۔ تو وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا ہے اور اللہ شکر کرنیوالوں کو جزا دے گا۔

پس جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ مر گئے۔ لیکن ہاں جو شخص صرف اللہ کو پوجتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو اللہ اسکی نگرانی کرنیوالا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے وہ قیوم ہے اور اس کو کبھی موت نہیں آئیگی، اس کو نہ غنودگی آتی ہے اور نہ نیند۔ وہ اپنے امر کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اپنے دشمن سے بدلہ لینے والا ہے اور وہ اس کو اس دشمنی کی سزا دیگا اور میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو۔ اس سے اور جو چیز تمہارے نبیؐ لائے ہیں اس سے اپنا حصہ لو۔ آنحضرتؐ کے اسوہ کا اتباع کرو۔ اللہ کے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہیں دیتا وہ گمراہ ہے اور جس کو اللہ معاف نہیں کرتا وہ مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس شخص کی مدد اللہ نہیں کرتا وہ رسوا ہوتا ہے۔ جس کو اللہ نے ہدایت دی وہ راہِ راست پر آیا۔ اور جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا وہ گم کردہ

راہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۔ اور پھر اس کا دنیا میں کوئی عمل قبول نہیں کیا جاتا۔ جو اسکو اللہ سے قریب کر دے۔ اور آخرت میں نہ کوئی فدیہ قبول کیا جاتا ہے اور نہ اس کے برابر کی کوئی چیز۔

تم میں سے جو لوگ اسلام کا اقرار کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بعد اپنے دین سے پھر گئے ہیں مجھ کو ان کی اطلاع پہونچی ہے۔ ان لوگوں نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ وہ اللہ کے متعلق غلط فہمی میں ہیں۔ اس کے امر سے جاہل ہیں اور انہوں نے شیطان کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

اب میں انصار و مہاجرین اور تابعین باحسان کے لشکر کا فلاں فلاں کو سردار بنا کر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو حکم کیا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی سے نہ قتال کریں اور نہ قتل کریں جب تک کہ اللہ کیطرف اسکو دعوت نہ دیں۔ اس دعوت کو جو شخص لبیک کہے گا۔ اقرار کریگا۔ اپنی شرارت اور فتنہ انگیزی سے باز آجائیگا۔ اور نیک عمل کریگا۔ یہ میرا نمائندہ اسکو قبول کر لیگا۔ اور اسکی مدد کریگا۔ لیکن اس کے برخلاف جو شخص انکار کریگا تو میں نے حکم دیا ہے کہ اس سے قتال کیا جائے۔ پھر جب یہ دشمن ہاتھ لگ جائے تو ان کو آگ میں جلائے۔ ان کو قتال کر کر کے ختم کر دے اور ان کی عورتوں اور اولاد کو گرفتار کر لے۔ اور اب سوائے اسلام کے ان سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائیگی۔ پس جو لوگ ان میرے نمائندوں کا اتباع کریں گے تو وہ ان کیلئے بہتر ہوگا۔ اور جو ان کی پرواہ نہیں کرے گا وہ اللہ کو ذرا عاجز نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنے نامہ بردوں کو حکم دیا ہے کہ میری یہ تحریر تم لوگوں کے ہر مجمع میں پڑھ کر سنائی جائے۔" [1]

عہد نامہ | لشکر روانہ ہوئے تو ان کے آگے آگے یہ نامہ بر چل رہے تھے جو اس تحریر کو لیئے

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۱ - ۴۸۲

ہوئے تھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان تو مرتدین کے نام تھا جن سے قتال کرنیکے لئے یہ لشکر روانہ ہو رہے تھے اس کے علاوہ خاص امراء فوج کے نام آپنے ایک عہد نامہ الگ تحریر فرمایا تھا جس میں ان کے فرائض و واجبات بتائے گئے تھے۔ اور جنگ کے سلسلہ میں انکو خاص خاص ہدایات اور احکام دئے گئے تھے اس میں بھی یہ بات بالکل صاف صاف کہدی گئی تھی کہ ان مرتدین سے اسلام کے سوا کوئی اور دوسری چیز مقبول نہیں ہوگی اور خود مسلمانوں کے ساتھ نرمی و ملاطفت کا برتاؤ کرنے کی تاکید کی تھی۔ [1]

جنگِ بُزاخہ

عبس اور ذبیان کی شکست کے وقت طلیحہ سمیرا۔ ایک مقام میں مقیم تھا اب وہ بزاخہ میں آگیا تھا۔ اور ادھر ادھر کے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک بڑی جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ حضرت خالد بن الولید اسی کے مقابلہ پر مامور کئے گئے تھے۔

حضرت خالد کو ہدایات | حضرت خالد جب اپنی مہم پر روانہ ہونے لگے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو چند ہدایات دیں جن سے خلیفۂ رسول کی فوجی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے آپنے فرمایا۔

"تم پیش قدمی اس طرح کرنا کہ قبیلۂ بنو طے سے آغاز کر دو [2] پھر بزاخہ کا رُخ کرنا اور جب یہاں سے فارغ ہو جاؤ تو پھر بطاح کیطرف پیش قدمی کرنا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ جب تم ایک مہم سے فارغ جاؤ تو بس اسی جگہ اس وقت تک رہنا جب تک کہ میرا حکم نہ پہنچ جائے ساتھ ہی حضرت ابو بکر نے بطور ایک تدبیر کے

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۲ [2] صدیق اکبر کو معلوم تھا کہ اگرچہ اس وقت بنو طے بھی طلیحہ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں لیکن وہ ایسے زیادہ سرکش نہیں ہیں معمولی گفتگو اور کسی قدر تخویف و تہدید سے رام ہو جائیں گے۔ اسی بنا پر آپ نے بنو طے کے متعلق یہ مشورہ دیا۔

دشمن کو مرعوب کرنے کی غرض سے خود اپنے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ میں ایک فوج لے کر خیبر جا رہا ہوں اور وہاں خالد کی فوج کے ساتھ ملکر اسکی مدد کر دوں گا۔

بنو طے مسلمان ہوتے ہیں قبیلہ بنو طے کا مقام اجا تھا۔ خلیفۂ رسول کی ہدایت کے مطابق حضرت خالد نے پہلے اس کا رُخ کیا۔ حضرت عدی بن حاتم جو اس قبیلہ کے معزز شخص تھے اور اپنے اسلام پر قائم تھے حضرت ابوبکر کے حکم سے بنو طے کے پاس آئے اور کہا کہ دیکھو خالد ایک لشکرِ جرار لیکر تم لوگوں کیطرف روانہ ہو چکے ہیں۔ اور ادھر خود ابوبکر بھی ایک لشکر کیساتھ خیبر جا رہے تھے۔ اس لئے تم لوگوں کیلئے بہتر یہی ہے کہ اسلام قبول کر دو اور طلیحہ کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ اسلامی فوج تمکو تباہ و برباد کر دیگی۔ ان لوگوں نے پہلے تو حضرت عدی کی بات کا مذاق اڑایا اور حضرت ابوبکر کیلئے بطورِ استخفاف و تمسخر ابوالفصیل کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن جب حضرت عدی نے پھر دوبارہ قوت کے ساتھ کہا کہ تم کس خواب خرگوش میں ہو۔ جو فوج تمہاری طرف بڑھ کر آ رہی ہے اس کا قائد کسی بچھڑے کا باپ (ابوالفصیل) نہیں بلکہ فحل اکبر (ایک بڑا سانڈ) ہے اب تم جانو اور تمہارا کام۔ اب یہ لوگ نرم ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اچھا! آپ جا کر ذرا اس لشکر کو ہم سے دور رکھئے ہماری وہ بھائی بند جو طلیحہ کے پاس بزاخہ چلے گئے ہیں ہم انکو حسن تدبیر سے واپس بلالیں ورنہ طلیحہ ان سب کو قتل کر دیگا۔ عدی نے یہ بات مان لی حضرت خالد اس وقت مقام سنخ میں فروکش تھے عدی یہاں آئے اور کہا "آپ ذرا تین دن کا توقف کیجئے اس درمیان میں پانچ سو بڑے بڑے جنگجو سپاہی آپ سے آکر مل جائیں گے جن سے آپ کو بڑی تقویت ہوگی۔ حضرت خالد نے یہ درخواست منظور کر لی۔ آخر حضرت عدی نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ بزاخہ سے قبیلہ بنو طے کے لوگ جو وہاں چلے گئے تھے جب واپس آگئے تو حضرت عدی سب کو لیکر حضرت خالد کی خدمت میں آئے اور انہوں نے اسلام کی اطاعت قبول کی لہ۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسطرح حضرت خالد کی فوج میں ایک ہزار شہسوار من کا اضافہ ہو گیا

لہ تین دن کی مہلت کا ذکر طبری نے کیا ہے۔ ج ۲ ص ۸۳ ۴ لیکن کامل ابن اثیر (ج ۲ ص ۲۶۲) میں دنوں کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ اور غالباً صحیح بھی یہی ہے۔ کیونکہ بظاہر تین دن میں ان تمام معاملات کا انصرام مشکل تھا۔

بنو جدیلہ مسلمان ہوتے ہیں اب حضرت خالد مقام انسر کیطرف بڑھے جو جدیلہ کی قیام گاہ تھا۔ حضرت عدی نے پھر مداخلت کی اور فرمایا کہ قبیلہ طے ایک پرندہ کی طرح ہے اور جدیلہ اس پرندہ کا ایک پر ہے۔ اس پرندہ کا ایک پر یعنی طے تو درست ہو گیا۔ اب مجھ کو ذرا موقع دیجئے کہ میں دوسرے پر (جدیلہ) کو بھی درست کر دوں۔ حضرت خالد نے یہ درخواست بھی منظور کر لی۔ عدی ان لوگوں کے پاس آئے اور ان سے بھی وہی بات کہی جو طے سے کہی تھی اس کے بعد ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے دعوت فوراً قبول کر لی اور حضرت عدی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اب بنو جدیلہ کے مسلمان ہو جانے سے حضرت خالد کی فوج میں مزید ایک ہزار سواروں کا اضافہ ہو گیا لہ

حضرت عدی بن حاتم کا یہ کارنامہ اتنا شاندار اور مبارک ہے کہ مورخین لکھتے ہیں "عدی بہترین شخص تھے ان سب لوگوں میں جو طے میں پیدا ہوئے تھے،،

ایسی حالت میں جبکہ تمام عرب میں اسلام کی مخالفت کی آگ لگی ہوئی تھی اچانک بلا کسی جنگ و جدال کے محض ایک شخص کی تبلیغ و فہمائش پر دو قبیلوں کا مسلمان ہو جانا اور ان کے دو ہزار سپاہیوں کا اسلامی فوج میں آشریک ہونا جہاں اسلام کا ایک معجزہ ہے حضرت ابوبکر صدیق کے حسنِ تدبیر و سیاست کا بھی بڑا ثبوت ہے۔

اب حضرت خالد اپنی اصل منزل مقصود یعنی بزاخہ کیطرف روانہ ہوئے۔ مقدمۃ الجیش کے طور پر حضرت عکاشہ بن محصن اور ثابت بن اقرم انصاری کو پہلے سے روانہ کر دیا تھا راستہ میں کہیں ان دونوں کو طلیحہ کا بھائی حبال مل گیا۔ انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ طلیحہ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ اپنے بھائی سلمہ کو لیکر نکلا اور طلیحہ نے حضرت عکاشہ کو اور حضرت ثابت کو سلمہ نے قتل کر دیا اور اسکے بعد یہ دونوں واپس لوٹ آئے۔ اب حضرت خالد اپنے لشکر کے ساتھ اس مقام پر پہونچے تو حضرت عکاشہ اور حضرت ثابت کو مقتول دیکھ کر آپکو اور مسلمانوں کو سخت رنج ہوا۔ بہرحال اب بزاخہ کا میدانِ جنگ سامنے تھا۔ طلیحہ کیساتھ اسوقت عیینہ بن حصن الفزاری اپنے قبیلہ کے سات سو بہادروں کیساتھ تھا۔ انکے علاوہ قبیلہ قیس اور بنو آ

لہ طبری ج ۲ ص ۸۳ ۴ و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۲

بھی اسکے جانثاروں میں تھے چونکہ بنو اسد اور بنو طے دونوں آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے اسلئے طے کے جو سپاہی حضرت خالد کی فوج میں شامل تھے انہوں نے کہا کہ ہم قبیلۂ قیس ہی سے جنگ کریں گے حضرت عدی بن حاتم اس پر کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ فوراً بولے! خدا کی قسم میرے خاندان کا زیادہ سے زیادہ عزیز و قریب بھی اس دین کو ترک کریگا تو میں اس سے بھی قتال کرونگا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ چونکہ بنو اسد اور بنو طے آپس میں ایک دوسرے کے حلیف ہیں اسلئے بنو طے بنو اسد سے جنگ نہیں کریں گے! حضرت خالد نے فرمایا "یہ قیس بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر بنو طے انہیں سے لڑنا چاہتے ہیں تو انکو ایسا کرنے دو اور انکی مخالفت نہ کرو۔"

طلیحہ سے جنگ اب مسلمان فوج اسطرح پر تھی کہ بہادران طے قیس کے بالمقابل صف آرا تھے اور باقی مجاہدین دوسرے قبیلوں کے سامنے صفیں جمائے کھڑے تھے جنگ شروع ہوئی تو نہایت گھمسان کا رن پڑا عیینہ کو اپنے بہادروں پر بڑا ناز تھا لیکن اسلامی فوج نے اس کو بدحواس کردیا طلیحہ ایک چادر میں لپٹا ہوا بالوں کے ایک خیمہ میں مقیم تھا عیینہ کو اپنی فوج کے پاؤں اکھڑتے نظر آئے تو گھبرا گھبرا کر طلیحہ کے خیمہ میں پہنچکر پوچھتا تھا کہ کوئی وحی آئی لیکن طلیحہ ہر مرتبہ جواب نفی میں دیتا ہے آخر جب تیسری بار عیینہ آیا اور یہی سوال کیا تو طلیحہ نے کہا ہاں وحی آئی ہے اور یہ ہے ان لك رحا کرحاہ وحدیثا لا تنساہ" عیینہ غصہ کے مارے بے قابو ہوگیا اور بولا "اللہ جانتا ہے کہ تجھ کو ایسا واقعہ پیش آیگا کہ تو اسکو نہیں بھولیگا طلیحہ سے یہ کہہ کر اس نے بنو فزارہ سے کہا کہ لوگو! یہ شخص جھوٹا ہے اس لئے اب تم جنگ سے ہٹ جاؤ۔ طلیحہ کی سب سے بڑی طاقت یہی بنو فزارہ تھے اس لئے میدان جنگ سے ان کا الگ ہونا تھا کہ طلیحہ کی فوج کو شکست ہوگئی طلیحہ نے اپنے لئے ایک گھوڑا اور اپنی بیوی نوار کیلئے ایک سواری کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا میاں بیوی دونوں اپنی اپنی سواری پہ بیٹھ میدان جنگ سے بھاگ نکلے طلیحہ نے بھاگتے بھاگتے کہا کہ اے بنو فزارہ تم میں سے جو شخص بھی اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ بھاگ سکتا ہو اسے چاہیئے کہ اپنی جان لے کر بھاگ جائے۔

طلیحہ کی شکست اور اس کا مسلمان ہونا طلیحہ یہاں سے فرار ہو کر سیدھا شام پہونچا۔ کچھ دنوں بعد جب اسکو معلوم ہوا کہ قبیلۂ اسد و غطفان دونوں مسلمان ہوگئے ہیں تو بنو کلب میں آکر خود بھی مسلمان ہوگیا۔ ایک مرتبہ عمرہ کے ارادے سے مکہ جاتے ہوئے مدینہ کے قرب و جوار سے گذر رہا تھا کہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر کو اطلاع دی آپ نے فرمایا "اب میں کیا کروں وہ مسلمان ہو گیا ہے

حضرت ابوبکر کی وفات تک وہ بنو کلب ہی میں رہا۔ جب حضرت عمر فاروق سے بیعت خلافت کرنیکی غرض سے وہ خلیفۂ دوم کے سامنے آیا تو حضرت عمر نے پوچھا "کیا تو وہی ہے جس نے عکاشہ اور ثابت کو قتل کیا تھا؟ واللہ میں تجھ کو کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ طلیحہ نے جواب دیا امیر المؤمنین! اسلام تو پرانی چیزوں کو ہدم کردیتا ہے۔ اب ان باتوں کا کیا ذکر۔ اس کے علاوہ آپکو ایسے دو شخصوں کی کیا فکر ہے جن کو اللہ نے میرے ذریعہ عزت بخشی (یعنی شہادت پائی) اور ان دونوں کے ہاتھوں نے مجھ کو ذلیل نہیں کیا۔ یہ سنکر حضرت عمر نے طلیحہ کو بیعت کرلیا [1]

جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق کے جو مرتد قبائل تھے حضرت خالد کی ان کے ساتھ یہ آخری جنگ تھی۔ یہ شکست خوردہ قبائل بنو اسد اور قیس اور بنو فزارہ اپنے متعلقین کو میدان جنگ میں نہیں لائے تھے اور خود انہوں نے شکست کے بعد فوراً اسلام قبول کرلیا اسلئے ان میں سے کسی کو غلام باندی نہیں بنایا گیا اور حضرت خالد نے ان کو امن دیدیا [2]

بنو عامر کا اسلام بنو عامر نہ ادھر تھے اور نہ ادھر۔ متردد تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اب حضرت خالد کو فتح ہوئی اور بنو طے جدیلہ۔ اسد۔ قیس اور غطفان یہ سب قبائل مسلمان ہوگئے تو اب اُن میں سرکشی اور بغاوت کی جرأت نہیں رہی۔ حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اقرار کیا کہ ہم اسلام قبول کرتے ہیں اور اب نماز بھی پڑھیں گے اور زکوٰۃ بھی ادا کریں گے حضرت خالد نے ان سے بیعت لی اور انکو امن دیا

ظالموں کو سخت سزائیں مذکورۂ بالا جو قبائل مسلمان ہوگئے تھے انکے خاص خاص خبیث الفطرت سرداروں اور امیروں نے ان مسلمانوں پر اپنے ارتداد کے زمانہ میں بہت شدید مظالم کئے تھے جو ان میں گھر کر رہ گئے تھے اس لئے ان مسلمانوں کا انتقام لینا ضروری تھا چنانچہ حضرت خالد نے ان تمام قبائل مجبور کو کیا کہ وہ اپنے اس قسم کے لوگوں کو پیش کریں۔ یہ لوگ آئے تو ان میں سے چند ایک کو تو آپ نے گرفتار کر کے مدینہ بھیجدیا۔ انہیں میں عیینۃ بن حصن الفزاری قرۃ بن ہبیرۃ۔ الفجاءۃ السلمی اور علقمۃ بن علاثہ تھے ان کے علاوہ باقی تمام کو خود بہت سخت اور عبرتناک سزائیں دیں بعد میں حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو آپنے بھی حضرت خالد کو

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴ و طبری ج ۲ ص ۴۸۹ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۵

تقویٰ اور پرہیزگاری اور لوگوں کیساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی تاکید فرمائی اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا اُن سے انتقام لینے کی بھی توثیق فرمائی [1]

ام زمل کی فتنہ انگیزی اور اس کا استیصال اس مہم سے فارغ ہونیکے بعد بھی حضرت خالد بزاخہ میں ایک مہینہ مقیم رہے۔ کیونکہ اب بھی کچھ ایسے شریر اور سرکش لوگ باقی تھے جو شکست کھا جانے اور قبائل کے مسلمان ہو جانیکے باوجود فتنہ انگیزی پر تلے ہوئے تھے چنانچہ اسی قماش کے کچھ لوگ ام زمل نامی ایک عورت کے پاس جمع ہو گئے۔ ام زمل، ام قرفہ کی بیٹی تھی۔ بنو فزارہ کی طرف آنحضرت صلعم نے حضرت زید بن حارثہ کی سرکردگی میں جو سریہ بھیجا تھا اس کے ہاتھوں ام قرفہ گرفتار ہوئی تھی اور چونکہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی عداوت اور دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے قتل کر دی گئی تھی، ام زمل کے دل میں وہی غبار بھرا ہوا تھا حالانکہ خود اس کے ساتھ معاملہ یہ کیا گیا تھا کہ جب یہ گرفتار ہو کر آئی تو حضرت عائشہ کے حصہ میں پڑی لیکن حضرت عائشہ نے چند روز کے بعد اسکو آزاد کر دیا اور یہ اپنے قبیلہ میں واپس چلی گئی۔ حضرت عائشہ کے اس احسان کے باوجود یہ اپنی ماں کے خون کو فراموش نہیں کر سکی تھی اب غطفان۔ طے۔ سلیم اور ہوازن کے بچے کھچے باغی اور سرکش لوگ جو ابتک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ام زمل کے اردگرد جمع ہوئے تو عورت کی بات اس نے ان سب لوگوں کو پھر لڑنے پر آمادہ کر دیا اور باغیوں کے اس گروہ کے ساتھ خود ایک اونٹ پر بیٹھ کر جو اسکی ماں کا تھا بڑے کرّوفر اور شان و شوکت کیساتھ نکلی حضرت خالد کو ان واقعات کا علم ہوا تو خود اسکے مقابلہ کو بڑھے۔ مسلمان مجاہدین نے ام زمل کے اونٹ کا محاصرہ کر لیا پہلے اونٹ کی کونچیں قطع کیں اور پھر ام زمل کو قتل کر دیا۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس اونٹ کے اردگرد ایک سو باغی شہسوار کام آئے اور اس فتح کا مژدہ فوراً حضرت ابوبکر کو پہنچا دیا گیا [2]

حضرت خالد نے اسکے علاوہ بھی دو تین شورشوں کا جو بزاخہ کے قریب و جوار میں برپا ہو رہی تھیں خاتمہ کیا اور آخر یہاں کے ایک ماہ قیام کی مدت میں شمال مشرق کے محاذ کا مطلع بالکل صاف ہو گیا۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۱ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۳۶۶

قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اس جنگ میں جو بڑے بڑے سردار پکڑے گئے تھے حضرت خالد نے ان کو مدینہ بھیجدیا تھا حضرت ابوبکر نے ان کیساتھ جس ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کیا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ یہ سب آگ طلیحہ کی ہی لگائی ہوئی تھی لیکن اسکے باوجود جب اس نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا تو حضرت ابوبکر نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پھر طلیحہ کی جو کچھ بھی طاقت تھی عیینہ کے دم سے تھی۔ لیکن اس نے جب اسلام کے قبول کر لینے کا اعلان کیا تو اسکی بھی جان بخشی کر دی گئی اور قید سے رہا کر دیا گیا۔ قرۃ بن ھبیرۃ جو بنو عامر کا سردار تھا مدینہ میں قیدی بنا کر لایا گیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں کبھی بھی مرتد نہیں ہوا۔ البتہ میری قوم زکوٰۃ کو تاوان سمجھتی تھی اس لئے اس سے اپنا اشتنا چاہتی تھی حضرت ابوبکر نے پوچھا تیرے اس ایمان کا کوئی گواہ ہے؟ قرہ نے حضرت عمرو بن العاص کو گواہی میں پیش کیا۔ جو عمان میں جیفر کے پاس سے مدینہ جاتے ہوئے بنو عامر کے قبیلہ میں ایک شب کیلئے قرۃ بن ھبیرۃ کے مہمان رہے تھے اور اس وقت قرۃ میں اور حضرت عمرو بن العاص میں زکوٰۃ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی تھی۔ اب اس وقت عمرو بن العاص نے گواہی میں وہی گفتگو نقل کر دی اور اس سے ثابت ہو گیا کہ قرۃ واقعی مرتد نہیں ہوا تھا تو حضرت ابوبکر نے اسکو بھی رہا کر دیا البتہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے صرف ایک الفجاءۃ السلمی ہے جس کو اس کی حد درجہ غداری اور سفاکی کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے بڑی سختی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کرایا ہے۔

سجاح اور مالک بن نُوَیْرَہ

بنو تمیم کی اہمیت قبیلہ بنو تمیم کے مکانات جنوب کی جانب بنو عامر سے ذرا فاصلہ پر اور مدینہ کے مشرق میں واقع تھے جو خلیج فارس تک چلے گئے۔ شمال مشرق کی جانب میں دریائے فرات کے دہانہ سے ملے ہوئے تھے۔ عہد جاہلیت میں اور اس کے بعد آنحضرت صلعم کے عہد میں بھی یہ قبیلہ بڑا معزز سمجھا جاتا تھا اور شجاعت و سخاوت کے اوصاف میں ممتاز تھا اس قبیلہ میں نامور شعراء بہادر اور فیاض طبع لوگ پیدا ہوئے اس قبیلہ کی شاخیں بنو حنظلہ

دارم۔ بنو مالک۔ بنو یربوع وہ ہیں جن کے کارناموں سے عربی ادب و تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

چونکہ یہ قبائل خلیج فارس اور فرات کے دہانہ سے قریب تھے اس بناپر ارضِ عراق اور جزیرہ نمائے عرب دونوں کیساتھ ان کے تعلقات تھے اور ادھر ایران میں بھی ان کی آمد و رفت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر لوگ نصرانیت کے زیرِ اثر آ گئے۔ یہ سب اسباب تھے جن کے باعث عرب میں جب بغاوت و ارتداد کا طوفان اٹھا تو بنو تمیم نے بھی اسمیں نمایاں حصہ لیا۔

مالک بن نویرہ کی بغاوت آنحضرت صلعم کی جب وفات ہوئی تو اس وقت آپ کے چند عمال بنو تمیم میں موجود تھے جو زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے[1] انہیں میں مالک بن نویرہ تھا جو قبیلۂ بنو یربوع کا سردار تھا۔ آنحضرت صلعم کی خبرِ وفات ملنے پر ان عاملوں میں اختلاف ہوا کہ جو زکوٰۃ اور صدقات ان لوگوں نے جمع کر لئے تھے ان کا کیا کریں؟ ان کو حضرت ابوبکر کے پاس بھیجیں یا وہیں لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ مالک بن نویرہ اس گروہ میں شامل تھا جو زکوٰۃ کو مدینہ بھیجنے کا مخالف تھا اس طرح اب وہ اسلام سے منحرف ہو کر اس کے مخالفوں کی صف میں شریک ہو گیا اور مسلمانوں کا کھلم کھلا دشمن بن گیا۔

سجاح کی آمد یہ عمال آپس میں اختلاف کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں سجاح بنت الحارث الجزیرہ سے جو عراق میں ہے اس شان سے یہاں پہونچ گئی کہ اس کے قبیلۂ بنو تغلب کے لوگ اس کو گھیرے ہوئے تھے اور وہ ایک عظیم لشکر کی قیادت کر رہی تھی جس میں قبیلہ ربیعہ۔ نمر۔ ایاد اور شیبان کے آزمودہ کار لوگ شریک تھے۔ سجاح بنو تمیم کی شاخ بنو یربوع سے تعلق رکھتی تھی اور عراق کے بنو تغلب سے جنہوں نے مسیحیت کو اختیار کر لیا تھا اسکے ننھالی تعلقات تھے اس بناپر ابتداءً یہ خود بھی مسیحی تھی اور اسلام کے ساتھ جو دشمنی یہود اور

[1] طبری نے ان تمام عمال کے نام اور جن جن قبیلوں پر یہ مقرر کئے گئے تھے ان کے نام ذکر کئے ہیں یہ عمال آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد تین حصوں میں بٹ گئے تھے، ایک وہ جو اسلام کے سچے اور پکے حامی تھے اور انہوں نے اپنی جمع کردہ زکوٰۃ مدینہ بھیجی جیسے صفوان بن صفوان۔ دوسرے وہ جو متردد تھے جیسے زبرقان بن بدر تیسرے وہ جو کھلم کھلا مخالف ہو گئے۔ مثلاً مالک بن نویرہ (ج ۲ ص ۴۹۵)

نصاریٰ کو تھی سجاح بھی اسلام کیساتھ وہی عداوت رکھتی تھی یہ کاہنہ تھی اور اسکی قابلیت۔ ذہانت اور ہوشیاری کی دلیل بھی کیا کم ہے کہ اس زمانہ میں عورت ہو کر عرب کے نامور قبیلوں کی قیادت کر رہی تھی۔

اسلام کیساتھ دشمنی کے باعث یہ موقع کی تلاش میں تو تھی ہی۔ آنحضرت صلعم کی خبرِ وفات سنتے ہی ایک لشکر لے مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے چل پڑی۔ بعض مورخین کا خیال ہے اور غالباً صحیح ہے کہ سجاح کا یہ اقدام حکومتِ ایران اور عراق میں اس کے جو عمال تھے ان کے بھڑکانے اور جوش دلانے کا نتیجہ تھا۔ ورنہ خود اس کو اپنے بل بوتہ پر مدینہ پر حملہ کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

سجاح کی قبائل سے جنگ سجاح شمالِ عراق سے اتر کر جب جزیرہ نمائے عرب میں داخل ہوئی تو طبعی طور پر اس کو سب سے پہلے خود اپنے قبیلۂ بنو تمیم کے پاس آنا چاہئے تھا۔ یہاں پہونچی تو دیکھا کہ آنحضرت صلعم کے عمالِ صدقات میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، اب اسے موقع اچھا مل گیا۔ اس نے مالک بن نویرہ کو جلد ہی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ لیکن مالک بن نویرہ نے سجاح کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی مدینہ پر حملہ کا ارادہ نہ کرے بلکہ بنو تمیم کے جو بعض قبیلے اب تک اسکی (سجاح کی) پیغمبری کا اقرار نہیں کر سکے ہیں اور اس کے مخالف ہیں۔ پہلے ان سے جنگ کی جائے۔ سجاح نے اس مشورہ کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کے اصل قوتِ بازو دو ہی شخص تھے۔ ایک مالک بن نویرہ اور دوسرا وکیع جو تمیم کی ایک شاخ بنو حنظلہ کا سردار تھا۔ ان دونوں کے مشورے سے اب سجاح نے بنو تمیم کی مختلف شاخوں پر حملہ شروع کر دئیے جن میں قتل و قتال ہوا۔ دونوں طرف کے آدمی گرفتار ہوئے اور غلام بنائے گئے لیکن آخر میں صلح ہو گئی اور قیدیوں کا تبادلہ کر لیا گیا۔

یمامہ پر حملہ کا ارادہ یہاں سے فارغ ہو کر سجاح کے دل میں پھر مدینہ پر حملہ کرنے کا ولولہ اٹھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مالک بن نویرہ اور وکیع دونوں اپنے قبیلوں کو زبان دے چکے تھے کہ سجاح مدینہ جانے کے لئے ان قبیلوں سے نہیں گزرے گی[1] اس لئے جب اہلِ جزیرہ کے سردارانِ فوج نے اس سے آکر کہا کہ اب ہم کیا کریں۔ مالک اور وکیع تو

[1] ان قبیلوں کو دراصل مدینہ یا حضرت ابوبکر کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی بلکہ اصل یہ ہے کہ (باقی آئندہ صفحہ پر)

ہماری کوئی مدد نہیں کریں گے اور ہم ان کے علاقوں میں گزر بھی نہیں سکتے ہیں تو اس نے پیغمبرانہ شان میں جواب دیا کہ "یمامہ کا رخ کرو۔ ان لوگوں نے کہا "یمامہ کا معاملہ تو بڑا مشکل ہے وہاں مسیلمہ کی طاقت بڑی مضبوط ہے۔ لیکن سجاح بولی "کوئی پرواہ کی بات نہیں ہے یمامہ پر حملہ لازمی طور پر کرنا ہے۔ [1]

مسیلمہ اور سجاح کا نکاح اب ادھر مسیلمہ کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا۔ اسکو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر وہ سجاح سے جنگ کرنے میں مشغول ہو گیا تو مسلمانوں کا لشکر جو ثمامہ بن آثال یا شرجبیل بن حسنہ کی سرکردگی میں چلا آرہا تھا اس کو غلبہ حاصل ہو جائیگا یا جو قبائل اسکے اطراف واکناف میں آباد تھے ان کو سر اٹھانیکا موقع مل جائیگا۔ اس بنا پر اس نے یہ چال چلی کہ اس نے سجاح کے پاس ایک ہدیہ بھیجا اور اپنی جان کی امان طلب کر کے اس سے ملنے کی درخواست کی۔ سجاح نے درخواست منظور کر لی تو مسیلمہ بنو حنیفہ کے چالیس آدمیوں کو ہمراہ لیکر سجاح کے جائے قیام پر پہونچا۔ یہاں دونوں میں خلوت میں گفتگو ہوئی۔ دونوں ہی کاہن تھے اور پیغمبری کا دعویٰ کرتے تھے دونوں پر وحی نازل ہوتی تھی لیکن مسیلمہ بہرحال مرد تھا آخر وہ اس فتنہ کی پری کو شیشے میں اتار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔ [2]

نکاح کے بعد مسیلمہ سجاح کو اپنی جائے قیام پر لے آیا۔ سجاح تین دن یہاں رہی پھر اپنی قوم میں واپس چلی گئی۔ مسیلمہ اور سجاح کے درمیان جو معاملات طے ہوئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یمامہ کی پیداوار سے جو کچھ آمدنی ہوگی اس کا نصف حصہ سجاح کو ملا کر دیا جائیگا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) چونکہ سجاح کے ساتھ الجزیرہ اور عراق کے لوگ تھے اسلئے ان قبیلوں کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر سجاح ان لوگوں کو لے کر ان قبائل میں سے گزرے گی تو اس سے ان کی آزادی اور خود مختاری خطرہ میں پڑ جائیگی [1] سجاح نے اس وقت پیغمبرانہ انداز میں گویا کہ ابھی اس پر وحی نازل ہوئی ہے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے علیکم بالیمامة و دفوا دفیف الحمامة۔ فانها غزوة صرامة لا یلحقکم بعدها ملامة

[2] طبری نے اس موقعہ کے جو واردات اور مسیلمہ و سجاح کی جو باہمی گفتگو لکھی ہے اگرچہ عربی ادب و تاریخ کے ایک محقق کو اس کا اعتبار کرنا بہت مشکل ہے نہایت فحش اور گندی ہے۔

سجاح ان معاملات کے انصرام و تعمیل کی غرض سے اپنے کارکن ہذیل عقہ اور زیاد کو یہاں چھوڑ کر الجزیرہ واپس لوٹ گئی۔ جہاں تک خلافت صدیقی کا تعلق ہے سجاح کے ڈرامہ کا یہ آخری سین ہے۔ کیونکہ پھر وہ عراق سے باہر نہیں نکلی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ امیر معاویہ کے عہد حکومت میں مسلمان ہو گئی تھی [1]

بطاح میں حضرت خالد کا نزول

سجاح کے جزیرہ لوٹ جانے کے بعد بنو تمیم کے بعض امراء مثلاً وکیع اور سماعہ اپنی حرکت پر نادم ہوئے اور جب حضرت خالد حضرت ابوبکر کے حکم کے مطابق بزاخہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بطاح پہونچے تو وکیع بن مالک سماعہ اور زبرقان اپنی اپنی زکوٰۃ لے کر حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا ان کے برخلاف مالک بن نویرہ اب تک متردد تھا۔ لیکن چونکہ اس کو حضرت خالد کے مقابلہ کی جرأت نہیں تھی اس بنا پر اس نے اپنے تمام ساتھیوں اور قبیلہ والوں کو منتشر کر کے ان کے گھروں کو واپس کر دیا۔ حضرت خالد یہاں پہونچے تو مطلع صاف تھا۔ آپ نے مسلمانوں کی چند ٹولیاں (سریات) ادھر ادھر روانہ کیں اور تاکید کی کہ تم اسلام پیش کرو اور اذان دو جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں اور اذان دیں نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی عہد کریں ان سے کچھ نہ کہو لیکن جو ایسا نہ کریں ان کو سزا دی جائے۔

مالک بن نویرہ کا قتل ایک ٹولی واپس ہوئی تو اپنے ساتھ مالک بن نویرہ اور چند اور لوگوں کو گرفتار کر تی لائی۔ یہ لوگ جو گرفتار کر کے لائے گئے تھے ان میں ابو قتادہ بھی تھے انہوں نے شہادت دی کہ قیدیوں نے اذان دی تھی اور نماز پڑھی تھی۔ لیکن بعض اور ارکان سریہ نے اس کی مخالفت کی حضرت خالد نے اس اختلاف کے باعث قیدیوں کے متعلق اس وقت فیصلہ کرنا ملتوی کر دیا اور ان کو کسی جگہ محبوس کرنے کا حکم دیا لیکن رات ہی رات میں مالک بن نویرہ اور اسکے ساتھی قتل کر دیئے گئے اور حضرت خالد بن ولید نے

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۰

مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم سے نکاح کر لیا۔ ابو قتادہ انصاری کو اس پر سخت برہمی ہوئی اور وہیں حضرت خالد سے تیز کلامی کی لیکن انہوں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ مدینہ پہونچکر انہوں نے اور مالک بن نویرہ کے بھائی متمم بن نویرہ نے ادھر حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر سے خالد بن الولید کی شکایت کی اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت ابوبکر کو سن کر صدمہ تو ہوا لیکن مصلحتِ وقت کے پیش نظر چپ ہو گئے۔ فاروق اعظم کو شدید غصہ تھا انکی رائے ہوئی کہ خالد کو فوراً معزول کر دیا جائے۔ اور چونکہ ایک مسلمان کو عمداً قتل کر کے اس کی بیوی سے عدت وفات کے انقضا سے قبل انہوں نے شادی کی ہے۔ اس لئے انہیں رجم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کا اس پر جب اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت ابوبکر نے آخر حضرت خالد کو مدینہ طلب کیا اور ان سے گفتگو کے بعد آپ کو جب یقین ہو گیا کہ اگر مالک نویرہ کا قتل بحالت اسلام ہوا بھی ہے تو بہر حال وہ قتل عمد نہیں۔ قتل خطا ہے تو آپ نے حضرت خالد کی طرف سے مالک کا خون بہا ادا کیا اور چونکہ مقام جنگ (بطاح) سے حضرت خالد کی غیر حاضری کے باعث حالات زیادہ بگڑ گئے تھے اس بنا پر فوراً ان کو واپس روانہ کر دیا۔

مالک بن نویرہ کے واقعۂ قتل پہ ایک نظر

ارتداد سے تائب ہونیکے باوجود مالک بن نویرہ کا قتل اور پھر اس کے بعد ہی فوراً اسکی بیوی سے نکاح ان دونوں چیزوں نے جہاں خالد کی سیرت سے متعلق ایک پیچیدہ بحث پیدا کر دی ہے اس سے بظاہر حضرت ابوبکر پر بھی مداہنت اور جرم سے چشم پوشی کا اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

واقعہ کی مختلف صورتیں | سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟

(۱) اس سلسلہ میں ایک روایت جو طبری نے نقل کی ہے یہ ہے کہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے اسلام سے متعلق جب ارکانِ سریہ میں اختلاف ہو گیا تو حضرت خالد بن الولید نے خیال کیا کہ دوسرے دن فیصلہ کریں گے اور قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو بند کر کے رکھا جائے۔ اتفاق سے اس رات سردی بہت زیادہ تھی۔

اسی لئے حضرت خالد کو قیدیوں کا خیال آیا تو آپ نے محافظین کو حکم دیا "ادفئوا اسراکم" عام لغت کے مطابق اس فقرہ سے حضرت خالد کی مراد یہ تھی کہ اپنے قیدیوں کو کچھ اڑھا دو تاکہ سردی سے ان کی حفاظت ہو جائے لیکن جو لوگ پہرہ دے رہے تھے وہ ادفاء کے اس معنی سے بے خبر تھے اس لئے انہوں نے بنو کنانہ کے لغت کے مطابق ادفاء کے معنی قتل کے سمجھے اور اس بنا پر سب قیدیوں کو قتل کر دیا۔ اب چیخ و پکار کا شور بلند ہوا تو حضرت خالد نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" اور جب معلوم ہوا کہ قیدی قتل کر دئے گئے ہیں تو انہیں افسوس تو ہوا لیکن فرمایا "جو چیز مقدر ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے"[۱]

(۲) طبری کی ہی ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت خالد نے یہ معلوم کرنیکی غرض سے کہ کونسی شہادت سچی ہے۔ مالک بن نویرہ کے اسلام کی یا اسکے اصرار علی الارتداد کی خود مالک بن نویرہ کو بلایا اور گفتگو شروع کر دی۔ اثنائے گفتگو میں ایک مرتبہ مالک نے کہا "میرا خیال تو یہ ہی ہے کہ تمہارے ساتھی (صاحبکم) یہ کہا کرتے تھے" "تمہارے ساتھی" کے لفظ سے آنحضرت صلعم کیطرف اشارہ تھا۔ حضرت خالد نے کہا "کیا تو ان کو (آنحضرت صلعم کو) اپنا صاحب نہیں سمجھتا" یہ کہا اور اس کی اور ان کے ساتھیوں کی گردنیں اڑا دیں[۲]

(۳) تیسری روایت ابن خلکان کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد اور مالک بن نویرہؓ میں خوب گفتگو ہوئی اس کے سلسلہ میں مالک نے کہا "میں نماز پڑھتا ہوں۔ لیکن زکوٰۃ نہیں دیتا" حضرت خالد نے کہا "کیا تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں ہی فرض ہیں اور ایک بغیر دوسرے کے مقبول نہیں ہے[۳] اس پر مالک بن نویرہ نے آنحضرت صلعم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "قد کان صاحبك يقول ذالك" "آپ کے صاحب تو چنیں وچناں کہتے تھے۔ حضرت خالد کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص ابھی تک مسلمان نہیں

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۰۲ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۰۳ [۳] کسی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ مراد یہ ہے کہ نماز ہو یا زکوٰۃ دونوں ہی فرض ہیں اور جب تک کوئی شخص ان دونوں کی فرضیت کا قائل نہ ہو اس کی کوئی ایک عبادت خواہ وہ فقط نماز ہو یا فقط زکوٰۃ مقبول نہیں ہوگی۔

ہوا ہے چنانچہ انہوں نے کہا "اوما تراہ لك صاحبًا" کیا تو ان کو (آنحضرت ﷺ کو) اپنا صاحب نہیں سمجھا۔ اس کے بعد فرمایا "میں تیری گردن اڑا دوں گا۔ اس پر دونوں میں مزید سخت کلامی ہوئی۔ مالک بن نویرہ "صاحبُك" کا لفظ بار بار دہرائے جاتا تھا۔ آخر حضرت خالد نے حکم دیا۔ اور مالک بن نویرہ قتل کر دیا گیا[1]

(۴) چوتھی روایت یعقوبی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو لکھا کہ مالک بن نویرہ کا رُخ کریں چنانچہ وہ وہاں پہونچے۔ مالک بن نویرہ حضرت خالد کے بلانے پر آیا تو اس کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ خالد پر اس کی بیوی کا کچھ اثر ہوا اور انہوں نے کہا۔

واللّٰہ لانلت ما فی مثابتك	جو تیرا ٹھکانہ ہے تو اس وقت تک نہیں پائیگا۔
حتیٰ اقتلك	جب تک میں تجھ کو قتل نہیں کر دوں گا۔

اس کے بعد مالک بن نویرہ سے مناظرہ کیا[2] اور اس کی گردن اڑادی اور پھر اس کی بیوی سے نکاح کیا[3]

(۵) پانچویں روایت یاقوت حموی کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد کا دستہ جو ضرار بن الازور کی سرکردگی میں تھا اس کا مقابلہ مالک بن نویرہ کے دستہ سے ہوا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور ضرار نے مالک کو قتل کر دیا[4]

اگرچہ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی اور بعض دوسری ادبی کتابوں میں یہ واقعہ ایک افسانۂ حسن و عشق بنا کر لکھا گیا ہے اور اس میں کافی رنگ آمیزی کی گئی ہے لیکن وہ سرتاسر بیہودہ اور لغو ہے تاریخی حیثیت سے واقعہ کی جو صورت بھی ہو مذکورۂ بالا چار صورتوں میں محدود ہے۔

واقعہ کی اصل صورت | اب ہمیں یہ بتانا چاہیئے کہ قرائن اور قیاس کی روشنی میں واقعہ کی اصل صورت کیا ہونی چاہیئے

[1] ابن خلکان ج ۵ ص ۶۶ مطبوعہ مصر جدید اڈیشن [2] اصل کتاب میں تنتظر مانگا چھپا ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ تصحیف ہے اصل لفظ تناظر ہوگا۔ اس کی تائید طبری وغیرہ کی روایات سے بھی ہوتی ہے
[3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۸ [4] معجم البلدان ج ۱ ص ۶۶۱ مطبوعہ لیپزگ۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ کچھ زیادہ قابل اعتبار نظر نہیں آتی وجہ یہ ہے کہ ادفاء کے عام معنی ڈھانکنے چھپانے اور گرمی پہونچانا ہی ہیں، قرآن و حدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے قتل کرنے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال یا قتل سے اس کا کنایہ ہونا دور کا احتمال ہے۔ اس بنا پر جب قیدیوں کے محافظین کو اس لفظ کی حقیقی مراد میں شبہ ہوا تھا تو انکو حضرت خالد سے پوچھنا چاہیئے تھا محض ایک دور کے احتمال و ایہام پر قتل کر دینا اور وہ بھی کسی معمولی شخص کو نہیں بلکہ مالک بن نویرہ ایسے اہم شخص کو اور پھر وہ بھی ایک جماعت کیساتھ کسی طرح قیاس میں نہیں آتا۔ اور اچھا اگر ان لوگوں سے یہ حرکت عجلت میں ہو بھی گئی تھی تو حضرت خالد کو ان سے بازپرس کرنی چاہیئے تھی صرف یہ کہدینا کہ "جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے" کافی نہیں ہے۔ اگر واقعہ کی دراصل صورت یہ ہی تھی تو حضرت خالد صاف طور پر معذور تھے پھر حضرت عمر کا اس قدر غضب ناک ہونا اور حضرت ابوبکر کا اس کے جواب میں "فَاَوَّلَ فَاَخْطَأَ" "خالد نے تاویل کی اور ان سے خطا ہو گئی" فرمانا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ اور اگر ان سب باتوں کی بھی کوئی توجیہ کر لی جائے تو حضرت خالد نے مالک کی بیوی سے جو فوراً نکاح کیا ہے درانحالیکہ وہ مسلمان تھا اس کی کیا توجیہ ہوگی۔

باقی رہیں اب تین صورتیں تو وہ تقریباً ایک ہی متن کی مختلف شرحیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ۲ اور ۴ اتنی واضح اور صاف نہیں ہیں جتنی کہ ۳ یعنی ابن خلکان کی روایت ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک اسی کو اصل سمجھنا چاہیئے۔

مالک بن نویرہ کا مختصر حال | واقعہ کی اس صورت کے متعین ہو جانے کے بعد اب یہ سنو کہ مالک بن نویرہ کے حالات کیا ہیں؟

مالک بن نویرہ بنو تمیم کی شاخ بنو یربوع کا سردار تھا کنیت ابو حنظلہ تھی عرب کے مشہور شعرا اور شہسواروں میں اس کا شمار ہوتا ہے، یہ مسلمان کب ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ کا متعین کرنا مشکل ہے۔ غالباً ۸ھ یا ۹ھ ہجری میں ہوا ہوگا۔ جب کہ بنو تمیم کا ایک وفد خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ بہرحال اتنا معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسکو اپنی قوم کے صدقات کے جمع کرنے پر عامل مقرر فرمایا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر پہونچی تو

اس نے زکوٰۃ روک لی اور اس کو مدینہ بھیجنے کے بجائے اپنی قوم میں تقسیم کر دیا اور اس نے یہ شعر پڑھے۔

فقلت خذوا اموالکم غیر خائفٍ ولا ناظرٍ فیما یجیئُ من الغدِ

فان قام بالدین المخوّف قائمٌ اطعنا وقلنا الدین دین محمّدٍ [1]

اب اس وقت سے لیکر قتل ہونے تک مالک بن نویرہ نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں جیسا کہ طبری کے حوالہ سے ہم پہلے لکھ چکے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) مالک بن نویرہ نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ اس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہو بلکہ جب سجاح عراق سے چل کر مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے یہاں پہونچی تو مالک بن نویرہ نے اس سے سازباز کر لی اور اس جھوٹی مدعیۂ نبوت کا وہ دستِ راست بن گیا۔

(۲) سجاح کو آمادہ کیا کہ بنو تمیم کی بعض شاخیں جو اب تک اپنے اسلام پر قائم تھیں ان پر وہ حملہ کرے۔ چنانچہ سجاح نے ایسا کیا اور مالک بن نویرہ نے اس معاملہ میں اسکی ہر قسم کی مدد کی۔

(۳) سجاح کے عراق چلے جانے کے بعد زبرقان، وکیع بن مالک اور سماعۃ جو آنحضرتؐ کی خبر وفات سنکر متردد یا مخالف ہو گئے تھے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ حضرت خالد بزاخہ سے مقام بطاح میں پہونچے تو ان لوگوں نے حضرت خالد کا استقبال کیا اور اپنے جمع کئے ہوئے صدقات ان کے حوالہ کر دیئے لیکن مالک بن نویرہ کو اب بھی ہوش نہیں آیا اور وہ اپنے لوگوں کو لیکر اپنے قبیلہ میں چلا گیا [2]

(۴) حضرت خالد نے جو جماعت (سریہ) ان لوگوں کے تعاقب میں روانہ کی تھی اس سے تاکیداً کہا تھا کہ اگر یہ لوگ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے بھی حامی

---

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۶ اصل کتاب میں المحوق چھپا ہوا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

[2] ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ وعرف وکیع وسماعۃ قبح ما اتیا فراجعا رجوعاً حسناً ولم یتجبرا واخرجا الصّدقات فاستقبلا بہا خالداً وسار خالدٌ یرید البطاح وبہا مالک بن نویرۃ قد تردد علیہ امرہٗ۔ التاریخ الکامل ج ۲ ص ۲۷۲۔

بھر لیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے [1]

حضرت خالد کے اس صاف و صریح حکم کے باوجود اس سریہ کا مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے لانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مالک بن نویرہ نے اس جماعت کے سامنے ادائے زکوٰۃ کی حامی نہیں بھری تھی۔

(۵) مالک بن نویرہ کے واقعۂ قتل سے متعلق طبری اور ابن خلکان کے حوالہ سے جو دو روایتیں اوپر گزر چکی ہیں اُن میں صاف تصریح ہے کہ حضرت خالد اور مالک بن نویرہ میں جو گفتگو ہوئی ہے اس میں مالک بن نویرہ نے ادائے زکوٰۃ کا اقرار نہیں کیا اور وہ اپنے انکار پر برابر مصر رہا۔ اس کے علاوہ اس نے آنحضرتؐ کیلئے صاحبکم کی ترکیب استعمال کی۔

اب غور کرو مالک بن نویرہ کے اس تجزیۂ حالات سے کیا کسی درجہ میں بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے تائب ہو کر پھر مسلمان ہو گیا تھا؟

مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت

یہ حالات تو خود مالک بن نویرہ کے تھے۔ اب ہم کو اُس شہادت پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے جو اس کے اسلام سے متعلق تاریخ سے فراہم ہوتی ہے تو یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے لانیوالی جماعت میں دو چار نہیں بلکہ کافی تعداد میں مسلمان ہونگے لیکن اس کے باوجود مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت صرف دو شخصوں سے ہی منقول ہے۔ ایک متمم بن نویرہ جو خود مالک بن نویرہ کے حقیقی بھائی تھے اور ان کو اپنے اس بھائی سے کس درجہ محبت تھی وہ ان کے اُن مراثی سے ظاہر ہے جو خنسا کے مراثی کی طرح عرب کی تاریخ مرثیہ گوئی میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے شخص ابو قتادہ انصاری ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ موخر الذکر ایک جلیل القدر صحابی اور انصاری ہیں اس بنا پر ہم انکی طرف جھوٹ اور دروغ گوئی کی نسبت نہیں کر سکتے لیکن اس سلسلہ میں بہرحال مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۲

(۱) حضرت ابو قتادہ نے جو شہادت مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے اسلام کی دی ہے اس میں ادائے زکوٰۃ کے اقرار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف اسقدر ہے کہ انّھُمْ اقاموا الصلوٰۃ۔ ان لوگوں نے نماز پڑھی تھی [۱]

(۲) حافظ ابن حجر نے اقامتِ صلوٰۃ کے علاوہ اذان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن زکوٰۃ کا وہاں بھی نام نہیں [۱]

حضرت خالد جب بزاخر کی مہم سے فارغ ہو کر بطاح کے قصد سے روانہ ہونے لگے ہیں تو انصار نے ساتھ جانے سے انکار کیا اور کہا کہ اس بارہ میں خلیفہ کا ہمارے پاس کوئی حکم نہیں ہے۔ ہر چند حضرت خالد نے سمجھایا کہ میرے پاس حکم موجود ہے اور میں امیر بھی ہوں۔ لیکن نہ مانے۔ آخر جب خالد ان کو پیچھے چھوڑ کر کافی دور نکل گئے تو ان کو خیال ہوا کہ اگر اسلامی لشکر کو کامیابی ہوئی تو ہم اس میں حصہ دار بننے سے محروم رہیں گے اور اگر ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کو نقصان پہونچا تو لوگ ہمیں کو برا بھلا کہیں گے اب اُن کو ندامت محسوس ہوئی اور وہ حضرت خالد کے لشکر میں جاکر شریک ہوئے۔ [۳]

اگرچہ اس واقعہ کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ چونکہ حضرت ابو قتادہ بھی انصاری تھے اس بنا پر ان کو پہلے سے ہی حضرت خالد کے ساتھ اختلاف تھا اور وہ یہاں (مقامِ بطاح) میں آنے کیلئے تیار نہیں تھے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے جزئی واقعات کو قانون شہادت کی رو سے کسی واقعہ کی اصل نوعیت کے متعین کرنے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ واقعہ زیر بحث میں اگرچہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کا عذر قبول فرمالیا اور پھر دوبارہ مسیلمہ سے جنگ کرنے کی غرض سے ان کو اس عہدہ پر بحال کر دیا لیکن حضرت ابو قتادہ کے دل میں حضرت خالد کیطرف سے جو تکدر پیدا ہو گیا تھا وہ پھر بھی نہ نکلا اور انہوں نے قسم کھائی کہ اب وہ آئندہ کبھی خالد کے جھنڈے کے نیچے نہیں چلیں گے یعنی ان کی سرداری میں کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے [۴]

اب نفسیات کے کسی طالب علم سے دریافت کرو حضرت ابو قتادہ کا یہ رویہ کس چیز

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲ [۲] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷

[۳] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲ [۴] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۸

کی غمازی کر رہا ہے۔

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اگر واقعی مالک بن نویرہ قتل سے پہلے ارتداد سے تائب ہو کر سچا اور پکا مسلمان بن بھی گیا تھا تو بے شبہ آخرت میں اس کا اس کو اجر ملے گا۔ اور یہ معاملہ خود اس کے اور خدا کے درمیان ہے لیکن جہانتک واقعات کی ترتیب اور انکی تحقیق و تنقید کا تعلق ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ حضرت خالد پر ایک مسلمان کے قتل عمد کا کوئی الزام عائد نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ حضرت خالد کی رائے اور یقین میں اپنے ارتداد پر بدستور قائم تھا اور مسلمان نہیں ہوا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر سے حضرت خالد نے کہا تھا کہ مالک جب اثنائے گفتگو میں رسول اللہؐ کا ذکر کرتا تھا تو آپ کیلئے "صاحبکم" کی ترکیب استعمال کرتا تھا [۱] حضرت ابوبکر نے خالد کے اس عذر کو قبول فرمالیا تو اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ حضرت ابوبکر نے بھی مالک بن نویرہ کے عدمِ اسلام و قیام علی الارتداد کو تسلیم کر لیا تھا۔ ورنہ جیسا کہ حضرت ابوبکر کے الفاظ تاوّل فاخطأ سے متبادر ہوتا ہے۔ اگر واقعہ یہ ہی ہے کہ حضرت خالد کو غلط فہمی ہوئی تھی اور اس بنا پر انہوں نے ایک مسلمان کو قائم علی الارتداد سمجھ لیا تھا تو اگرچہ حضرت خالد ایک مسلمان کے قتلِ عمد سے بری ہو جاتے ہیں بہر حال ان کا مالک کی بیوی سے اس کی عدتِ وفات کے انقضا سے قبل نکاح کر لینا تو کسی طرح بھی جائز اور درست نہیں ہو سکتا۔ اور اس بنا پر ضروری تھا کہ اول تو حضرت خالد اس عورت سے خود قطع تعلق کر لیتے اور اگر خود نہ کرتے تو کم از کم حضرت ابوبکر کو حکم کرنا چاہئے تھا کہ وہ تعلق منقطع کر دیں کیونکہ سرے سے نکاح ہی فاسد تھا۔

حافظ ابن حجر نے زبیر بن بکار کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے خالد بن الولید کو حکم کیا تھا کہ وہ مالک کی بیوی سے مفارقت اختیار کر لیں [۲] ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو اور حضرت ابوبکر نے واقعی حضرت خالد سے ایسا کہا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت خالد نے ام تمیم سے تعلق منقطع نہیں کیا، چنانچہ خالد کی بنو حنیفہ کے ساتھ جو جنگ ہوئی ہے اس موقع پر ام تمیم حضرت خالد کے ساتھ موجود تھی اور حضرت خالد نے ایک خیمہ میں اسکی

---

[۱] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷ [۲] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷

کی حفاظت پر مقرر کر رکھا تھا [1] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً حضرت خالد کا نکاح ام تمیم کیسا کچھ درست تھا۔ اسی بنا پر نہ حضرت خالد نے اس سے از خود مفارقت اختیار کی اور نہ انہوں نے اس بارہ میں حضرت ابوبکر کے حکم یا مشورہ کی پرواہ کی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی حضرت ابوبکر نے اس بارہ میں حکم دیا تھا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب اس موقع پر بعض مورخین کو اشکال یہ پیش آیا ہے کہ اچھا ہم نے مانا کہ مالک بن نویرہ نے ارتداد سے توبہ نہیں کی تھی لیکن وجہ کیا ہے کہ جنگ بزاخہ کے موقع پر اپنے اپنے قبیلہ کے بڑے بڑے سردار قرۃ بن ہبیرہ، الفجاءۃ السلمی ابو شجرہ اور عیینۃ بن حصن الفزاری جیسے لوگ گرفتار ہوئے تو حضرت خالد نے ان کو سیدھا مدینہ بھیج دیا تھا اور خود ان کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پھر مالک بن نویرہ کے بارے میں بھی ایسا کیوں نہیں کیا جب کہ وہ مرتبہ اور حیثیت میں ان لوگوں سے کسی طرح کم اور جرم کے اعتبار سے کسی طرح بڑھا ہوا نہیں تھا [2]

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ دراصل حضرت ابوبکر اس قسم کے معاملات میں اپنے اعیان لشکر اور امرائے فوج پر پورا اعتماد کرتے اور انہیں کو وسیع اختیارات دیتے تھے چنانچہ قعقاع بن عمرو کو ایک جماعت کے ساتھ علقمہ بن علاثہ کو اسکے ارتداد و بغاوت کی سزا دینے کیلئے روانہ کیا تو آپ نے فرمایا "علقمہ تمہارے ہاتھ پڑ جائے تو تمہیں اختیار ہے اس کو میرے پاس بھیجو یا تم خود قتل کر دو" اسکے بعد آپ نے یہ نہایت ہی حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا۔

واعلموا ان شفاء النفس الحنوض	اور یاد رکھو کہ نفس کی شفا کسی کام کو خوب
فاصنع ما عندک [3]	اچھی طرح کرنے میں ہے۔ اس لئے جو تمکو مناسب معلوم ہو کرنا

اس عام پالیسی کے ماتحت اسی طرح کے اختیارات حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن الولید کو بھی دئے تھے کہ جس مجرم کے حق میں وہ جو چاہیں اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کریں

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ اس جنگ کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔
[2] الصدیق ابوبکر از محمد حسین ہیکل مصر ص ۱۵۶ [3] طبری ج ۲ ص ۴۹۰

حضرت خالد کے نام ایک مکتوب گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں:

لیزدک مما انعم اللّٰہ بہ علیک	اللہ نے تم کو جو نعمتیں خیر کی دے رکھی ہیں ان
خیرًا واتق اللّٰہ فی امرک فان اللّٰہ	میں اور اضافہ ہو تم اپنے معاملات میں اللہ سے
مع الذین اتقوا والذین ھم	برابر ڈرتے رہو۔ کیونکہ اللہ ان لوگوں کے
محسنون جد فی امر اللّٰہ ولا	ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور جو نیک
تنین ولا تظفرن باحد قتل	ہوتے ہیں تم اللہ کے معاملات میں پوری سعی
المسلمین الا قتلتہ و	کرو سستی نہ کھاؤ اور جن لوگوں نے مسلمانوں
نکلت بہ غیرہ ومن	کو قتل کیا ہے ان میں سے اگر کوئی تمہارے ہاتھ
احببت ممن حاد اللّٰہ او	لگ جائے تو اسکو قتل کر دو اور اس طرح دوسروں کو
ضادہ ممن تری ان فی ذالک	سبق دو۔ اور انکے علاوہ جن لوگوں نے اللہ سے
صلاحًا فاقتلہ [1]	انحراف یا بغاوت کی ہے اگر تمہاری رائے میں انکو
	قتل کر دینا مناسب ہو تو قتل کر دو۔

بلکہ جہاں تک مالک بن نویرہ کا تعلق ہے ایک روایت یہ بھی ہے کہ خود حضرت ابوبکر نے حضرت خالد سے قسم کی تھی کہ اگر مالک بن نویرہ ہاتھ پڑ جائے تو اسکو بلا تامل قتل کر دیں، اصل الفاظ یہ ہیں: وعزم علیہ لیقتلن مالکًا ان اخذہٗ [2]

مذکورۂ بالا تقریر سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مالک بن نویرہ قتل کے وقت مرتد تھا اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت خالد نے اسی وجہ سے ان اختیارات کے ماتحت جو حضرت ابوبکر نے ان کو دئے تھے مالک کو قتل کیا اور وہ اس میں حق بجانب تھے، مالک کے بھائی متمم بن نویرہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت عمر کے

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۱ [2] ابوریاش احمد بن ابی ہاشم القیسی نے خاص حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ شیخ عبدالقادر بن عمر البغدادی نے اپنی مشہور کتاب خزانۃ الادب علی شواہد شرح الکافیہ میں اس رسالہ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ یہ جملہ اسی اقتباس میں ہے دیکھو خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۳۷ مطبوعہ میریہ بولاق۔

پاس آیا اور اس نے بھائی کا جو مرثیہ لکھا تھا سنایا تو فاروق اعظم پر اس کا بڑا اثر ہوا اور فرمایا کہ اگر میں بھی شاعر ہوتا تو اپنے بھائی زید کا مرثیہ کہتا۔ متمم بن نویرہ بولا اے امیر المؤمنین دونوں برابر نہیں ہیں۔ اگر میرا بھائی بھی اسی طرح قتل ہوتا جیسا کہ آپ کا بھائی ہوا ہے تو میں کبھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہتا ہی نہیں حضرت عمرؓ نے یہ سنکر فرمایا۔ جیسی تعزیت آج متمم بن نویرہ نے میری کی ہے ایسی آجتک کسی نے کی ہی نہیں۔

علامہ ابن شاکر المتوفی ۷۶۴ھ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ مالک بن نویرہ خود اس کے بھائی متمم کے نزدیک بھی مرتد قتل ہوا تھا اور حضرت عمرؓ سے اس نے جو کچھ کہا اسکا مطلب یہ تھا کہ میں تو اپنے بھائی کو اس لئے روتا ہوں کہ وہ اسلام پر نہیں مارا گیا اس کا انجام خراب ہوا۔ لیکن آپ کے بھائی زید تو اسلام کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے ہیں حق کی راہ میں مارے گئے ہیں انکے مراتب اور مدارج تو اللہ کے ہاں بہت بلند ہیں۔ تو پھر اُن کے ماتم کی کیا ضرورت ہے [1]

ام تمیم سے نکاح | اِس واقعہ میں حضرت خالدؓ نے صرف ایک مالک بن نویرہ کو ہی تو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اس کے جتنے ساتھی تھے وہ بھی قتل کر دئے گئے تھے لیکن اسکے باوجود حضرت خالدؓ کے خلاف جو شورش ہوئی اس کی بنیاد مالک بن نویرہ ہی کا قتل تھا۔ اس سلسلہ میں کسی اور مقتول کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس کی وجہ درحقیقت ایک تو یہ ہے کہ حضرت خالدؓ نے مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم بنت منہال سے اسی روز نکاح کر لیا اور اسکی وجہ سے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اس نکاح کو قتل مالک کا سبب قرار دیں [2] اور دوسری وجہ خود متمم بن نویرہ تھا چنانچہ حضرت عائشہؓ نے بھی اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابی بکر کی شہادت پر وہی شعر بطور مرثیہ پڑھے ہیں اور صحیح بخاری میں درج ملیں۔

---

[1] فوات الوفیات ج ۲ ص ۲۹۶ مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ [2] چنانچہ اغانی وغیرہ میں لکھ ہی دیا کہ حضرت خالد تو اس عورت سے زمانہ جاہلیت سے محبت کرتے تھے حالانکہ جو شخص عربوں کے اخلاق سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ محض بیوی حاصل کرنے کے لئے اسکے شوہر کو قتل کرنا انکے ہاں حد درجہ بزدلانہ اور غیر شریفانہ فعل سمجھا جاتا تھا تو پھر عرب بھی خالد بن ولید ایسا بہادر شخص اس بزدلی کا کیونکر مرتکب ہوسکتا تھا۔

جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے یہ شعر کی کرشمہ سازیاں ہیں جن سے تاریخ ادب کے صفحات بھرے ہوئے ہیں حضرت خالد پر اسکی ذمہ داری کیونکر عائد ہوسکتی ہے رہی پہلی وجہ تو ہمارے خیال میں اصل صورت یہ پیش آئی ہے کہ حضرت خالدؓ نے پہلے ام تمیم کو باندی بنایا ہوگا۔ اور یہ ثابت ہی ہے کہ گرفتار شدہ لوگ "سبایا" بنائے گئے تھے جنکو بعد میں متمم بن نویرہ کی درخواست پر حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ لیکن ام تمیم نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا ہوگا تو اب حضرت خالدؓ نے اس سے نکاح کر لیا معترضین کہتے ہیں کہ حضرت خالد اس کو دیکھ کر عاشق ہوگئے تھے اس لئے نکاح کیا۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن جب نکاح شرعاً درست تھا اور مالک بر بنائے ارتداد قتل ہوا تھا تو اس میں شرع یا اخلاق کسی اعتبار سے کیا قباحت ہے یہ تو اس وقت ہے جب کہ معترضین کی بات کو صحیح مان لیا جائے۔ ورنہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ام تمیم چونکہ ایک عالی مرتبت اور معزز شخص کی بیوی تھی اور اب وہ بیوہ ہوگئی اسلئے حضرت خالدؓ نے اس کی تسلی اور دلدہی کیلئے اس سے نکاح کیا تھا۔ رہا قتل کے بعد فوراً نکاح کرنا! تو ہمارے خیال میں راوی کو اس میں شبہ ہوا ہے۔ کیونکہ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

وتزوج خالدؓ ام تمیم ابنة المنهال	خالد نے ام تمیم سے نکاح کیا اور پھر اسکو چھوڑ دیا
وترکها لینقضی طهرها (ج ۲ ص ۵۰۲)	تاکہ اسکی مدت طہر پوری ہو جائے۔

غالباً مالک کے قتل کے بعد حضرت خالدؓ ام تمیم کو بطور سبی اپنے خیمہ میں لے گئے ہونگے اور پھر اسکے مسلمان ہو جانے پر کچھ دنوں کے بعد اس سے نکاح کیا ہوگا۔ اسکو راوی نے اسطرح بیان کر دیا یاد رکھنا چاہئے کہ یہ صرف ہمارا قیاس نہیں ہے بلکہ اسکی ایک اصل بھی موجود ہے ابو زید وثیمہ بن الوشاء المتوفی ۲۳۷ھ تیسری صدی کے ایک بلند پایہ مورخ ہیں انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں فتنہ ارتداد کا جو طوفان اٹھا تھا خاص اسی موضوع پر ایک مستقل کتاب "کتاب الردہ" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن یہ کس پایہ کی کتاب تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں جگہ جگہ اسکے حوالے دئے ہیں اور اسکے اقتباسات نقل کئے ہیں چنانچہ اصابہ کے انہیں

اقتباسات کو ایک جرمن فاضل نے یک جا مرتب کر کے کتاب الردہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ ابوزید وثیمہ کا تذکرہ وفیات الاعیان اور فوات الوفیات دونوں میں ہے اسکے علاوہ محمد بن عمر الواقدی نے بھی اسی موضوع پر اور اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ایک نسخہ ابتدائی اور انکے مطابق اصلاح کرنی ضروری ہے۔ پٹنہ میں موجود ہے ابن شاکر نے متمم بن نویرہ کے تذکرہ میں وثیمہ اور واقدی ان دونوں کی مذکورہ بالا کتابوں کے حوالے سے حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کا جو واقعہ نقل کیا ہے اس میں حضرت خالد اور ام تمیم کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قیل انہ اشتراھا من الفیٔ	کہا جاتا ہے کہ خالد نے ام تمیم کو مالِ غنیمت
وتزوج بھا وقیل انھا	میں سے خریدا تھا اور پھر اس کے ساتھ نکاح
اعتدت بثلاث حیض ثم	کر لیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ام تمیم نے تین
خطبھا الی نفسہ	حیض کی عدت گزاری تھی اور اس کے بعد خالد
فاجابتہٗ [1]	نے اس کو اپنا پیغام نکاح دیا اور ام تمیم نے اس کو قبول کر لیا

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اچھا جب بات یہی تھی تو پھر حضرت عمرؓ نے حضرت خالد کے رجم کر دینے کا مطالبہ کیوں کیا، تو اسکے جواب میں ہم ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جائیگا۔ حافظ ابن حجر نے ضرار بن الازور الاسدی کے تذکرہ میں الاصابہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق کے عہدِ خلافت میں حضرت خالد نے ضرار بن الازور کے ماتحت بنو اسد کیطرف ایک دستہ (سریہ) روانہ کیا۔ اس دستہ نے بنو اسد پر چھاپہ مارا اور ایک عورت گرفتار کر لی۔ ضرار جو دستہ کے امیر تھے وہ مسلمانوں سے اجازت لیکر عورت کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ لیکن بعد میں ان کو ندامت ہوئی اور انہوں نے حضرت خالد سے درخواست کی کہ وہ اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمر کو کر دیں اور اس کے لئے بارگاہِ خلافت سے باقاعدہ منظوری لے لیں حضرت خالد کے نزدیک چونکہ اسکی ضرورت نہیں تھی اس لئے انہوں نے ضرار سے کہا کہ اسکی ضرورت

[1] دیکھو فوات الوفیات ج ۲ صفحہ از ۶۲۵ تا صفحہ ۶۲۸

نہیں ہے لیکن وہ نہ مانے۔ آخر حضرت خالد نے فاروق اعظم کو اس کی اطلاع دی تو آپ کو سخت غصہ آیا اور فوراً حضرت خالد کو حکم بھیجا کہ ضرار کو سنگسار کر دیا جائے۔ اتفاق یہ ہوا کہ حکم پہنچنے سے پہلے ہی ضرار کا انتقال ہو گیا۔ اب حضرت خالد کو یہ حکم ملا تو انہوں نے فرمایا "اللہ ضرار کو رسوا کرنا نہیں چاہتا تھا"

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر اذن خلیفہ کے بغیر مال غنیمت میں تصرف کو ناجائز اور حرام سمجھتے تھے اور اسی بنا پر انہوں نے ام تمیم کیساتھ تسری کو حرام سمجھ کر حضرت خالد کو مستحق رجم قرار دیا لیکن اس کے برخلاف حضرت خالد مسلمانوں کی باہمی رضامندی کے بعد مالِ غنیمت میں تصرف کو جائز قرار دیتے تھے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خالد نے درپردہ حضرت ابوبکر سے اس طرح کے تصرفات کیلئے اجازت لے رکھی ہو اور اسی بنا پر حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کے خلاف اس معاملہ میں کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔

چند ضمنی مباحث | تم پڑھ آئے ہو کہ جب ابو قتادہ انصاری نے مدینہ آکر حضرت خالد کی شکایت صدیق اکبر سے کی تو آپ سنکر غضب ناک ہو گئے اور انکی شکایت پر کوئی اعتنا نہیں کیا۔ آخر ابو قتادہ حضرت عمر کے پاس آئے اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عمر فاروق سخت برہم ہوئے اور اسی وقت حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "خالد کی تلوار میں فساد ہے آپ ان کو فوراً معزول کر دیجئے اور میدان جنگ سے واپس بلا لیجئے۔ اسکے علاوہ حضرت خالد کی شان میں کچھ اور سخت الفاظ بھی استعمال کئے۔ حضرت ابوبکر نے انکو ٹوکا اور فرمایا جس تلوار کو اللہ نے اپنے دشمنوں پر بے نیام کر دیا ہے میں اس کو نیام کے اندر واپس نہیں کر سکتا (اشارہ تھا حضرت خالد کے سیف اللہ ہونے کی طرف) لیکن حضرت عمر کا اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت خالد کو مدینہ طلب کیا۔ خالد مدینہ پہونچکر مسجد نبوی میں سے گزر رہے تھے کہ وہاں فاروق اعظم نے انکو دیکھ کر سخت سست کہا لیکن انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ وہ سیدھے صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر نے متمم بن نویرہ کو اس کے بھائی کا خون بہا بیت المال سے ادا کیا اور خالد بن ولید کو بطاح واپس کر دیا۔ یہ پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں

(۱) اگر حضرت خالد خلیفۂ رسول کی رائے میں بے گناہ تھے تو انہوں نے خون بہا کیوں ادا کیا؟

(۲) حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ میں اسقدر شدید اختلاف کی وجہ کیا ہے۔

اب ہم ہر ایک سوال کا جواب الگ الگ بالترتیب لکھتے ہیں۔

حضرت ابوبکر کا دیت ادا کرنا — اگرچہ حضرت خالد سے گفتگو کے بعد اور دوسرے ذرائع سے بھی واقعہ کی اصل نوعیت حضرت ابوبکر پر روشن ہوگئی تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت خالد نے عجلت پسندی اور بے احتیاطی سے کام لیا تھا اگر وہ مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کی بجائے مدینہ بھیجدیتے تو جب وہ دیکھتا کہ سب ہی نامور ان وزعمائے قبائل مسلمان ہونے جارہے ہیں تو ممکن ہے وہ بھی مسلمان ہوجاتا اسکے علاوہ ام تمیم سے نکاح کیسا ہی جائز سہی۔ بے احتیاطی کا عمل ضرور تھا۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے اول تو خود حضرت ابوبکر کو ناگوار ہی تھی ہی[1] پھر متمم بن نویرہ کی تالیفِ قلب اور حضرت عمر فاروق کی تسکین خاطر بھی ضروری تھی، ان مصالح کے پیش نظر آپنے متمم کو بیت المال سے ادا کی، آپ کا یہ عمل محض بربنائے مصلحت وسیاست تھا۔ اسلیئے نہیں تھا کہ آپکی رائے میں بھی حضرت خالد ایک مسلمان کے قتل خطا کے مرتکب ہوئے تھے۔ چنانچہ جیسا آگے آئیگا عراق کی فتوحات کے سلسلہ میں مصیخ نامی ایک مقام پر حضرت خالد نے عبد العزیٰ جسکا نام بعد میں عبداللہ ہوگیا تھا اور لبید بن جریر ان دونوں کو جو دشمن کے کیمپ میں تھے قتل کردیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ دونوں مسلمان تھے اور اس بارہ میں انکے پاس حضرت ابوبکر کی ایک تحریر بھی تھی حضرت ابوبکر کو اسکی اطلاع ہوئی تو آپنے انکی دیت ادا کی لیکن ساتھ ہی حضرت خالد کیطرف سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ یوں ادا کرنے کو تو میں ادا کردیتا ہوں لیکن درحقیقت یہ دیت مجھ پر واجب نہیں تھی کیونکہ یہ دونوں مقتول اہل حرب کے ہاں مقیم اور انکے مہمان تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اور معاملات کی طرح اس ایک معاملہ میں بھی خلیفۂ رسول نے بعینہٖ وہی

[1] حافظ ابن حجر نے زبیر بن بکار کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب خالد کے پاس اموال غنیمت آتے تھے تو وہ انکو اربابِ غنائم میں تقسیم کردیتے تھے اور ان کا حساب حضرت ابوبکر تک نہیں پہنچاتے تھے وہ بعض اوقات ایسے اقدامات بھی کرجاتے تھے جن کو حضرت ابوبکر اچھا نہیں سمجھتے تھے چنانچہ مالک نویرہ کا قتل اور اسکی بیوہ کے ساتھ نکاح حضرت ابوبکر نے ان دونوں باتوں کو مکروہ سمجھا۔ الاصابہ ج ا ص ۴۱۴ تذکرہ خالد بن ولید[2] (طبری ج ۴ ص ۵۸۱)

کیا جو اسی قسم کے ایک واقعہ میں (جبکہ حضرت خالد کے ہاتھوں بنو جذیمہ کے لوگوں کا قتل عمل میں آیا) رسول اللہ صلعم نے کیا تھا۔ آپ نے اس واقعہ کو سنکر ایک طرف تو دونوں ہاتھ اٹھاکر دو مرتبہ فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَبرءُ اِلَیكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ[1] — اے اللہ جو کچھ خالد نے کیا ہے میں تیری جناب میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

اور دوسری جانب حضرت علیؓ کو مقتولین بنی جذیمہ میں سے ہر ایک کی نصف دیت (خونبہا) ادا کی۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یہ خون بہا محض مصالحت کی غرض سے ادا کیا گیا تھا کیونکہ مقتولین کے ورثہ نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن رحمتِ عالم نے پسند نہیں کیا کہ ان کا خون رائگاں جائے[2] لیکن بااین ہمہ آں حضرت صلعم نے حضرت خالد کو معزول نہیں کیا۔ اور اس واقعہ کے بعد بھی آنحضرت صلعم کی زندگی میں وہ برابر فوجی امارت کے عہدہ پر سرفراز رہے۔

شیخین کا اختلاف — اب صرف ایک بات باقی رہتی ہے اور وہ یہ کہ آخر حضرت ابوبکر حضرت عمر میں اس درجہ شدید اختلاف کی وجہ کیا تھی؟

ایک وہ شخص جس کی نظر عہدِ نبوت اور اس کے بعد کی تاریخ پر ہے جانتا ہے کہ خلیفہ اول و دوم کا یہ اختلاف پہلی مرتبہ نہیں تھا، عہدِ نبوت میں بھی دونوں میں متعدد بار مختلف معاملات ومسائل میں اختلاف ہوا۔ اور اس کے بعد جیش اسامہ کی روانگی کے وقت اور مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنے کے بارے میں بھی اختلاف ہوا تھا۔ لیکن جب کبھی اختلاف ہوا فاروقِ اعظم کو آخر میں اقرار کرنا پڑا کہ حضرت ابوبکر کی جو رائے تھی وہ صواب تھی چنانچہ اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر نے بعد میں فرمایا۔

رحم اللّٰہ ابابکرٍ ہو کان اعلم منی بالرجال — اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحم فرمائے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس واقع ہوئے تھے۔

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۲ باب بعث النبی صلعم خالد بن ولید الی بنی جذیمۃ
[2] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۴ ص ۱۱۷

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ متمم بن نویرہ نے حاضر ہو کر حضرت خالدؓ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا۔

لا اردشیئاً صنعہ ابو بکر [1] ابوبکرؓ جو کر گئے ہیں میں اس کو رد نہیں کروں گا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جن کی شان میں فرمایا گیا تھا "اشدھم فی امر اللہ عمرؓ" انہوں نے ابو قتادہ انصاری سے مالک بن نویرہ کا واقعہ سنا تو چونکہ بنو جذیمہ کیساتھ بھی اس قسم کا واقعہ پیش آچکا تھا اس بنا پر ان کو سخت غصہ آیا۔ کیونکہ بحکم حسنات الابرار سیات المقربین وہ ایک صحابی سے اس طرح کے فعل کا صدور اور وہ بھی مکرر بہت مستبعد جانتے تھے، انکے برخلاف حضرت ابوبکرؓ کا معاملہ یہ تھا کہ ہر بات میں اسوۂ رسول صلعم کا اتباع انکی فطرت اور طبیعت بن گئی تھی۔ وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور دوسری طرف سیاست اور فوجی تدابیر کا جو مقتضا تھا اس سے بھی پورے طور پر آگاہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے میں اگر حضرت خالدؓ سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا بھی تھا تو بہرحال وہ اتنی بڑی غلطی ہرگز نہیں تھی جس کی پاداش میں حضرت خالدؓ ایسے مدبر سپہ سالار اور بہادر جرنیل کی قیادت سے لشکر کو محروم کر کے اسلامی محاذِ جنگ کو خطرہ میں ڈالتے۔ بارگاہِ خلافت کی طلب پر حضرت خالدؓ کا مدینہ چلا آنا اور خلیفۂ رسول صلعم کے روبرو معذرت خواہ ہونا بھی حضرت خالدؓ کے جرم فروگذاشت کی تلافی کیلئے کافی تھا آج کی مہذب دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ کسی ذمہ دار شخصیت سے بڑے سے بڑا جرم سرزد ہو جاتا ہے لیکن صرف ایک لفظ "افسوس" (REGRET) کہدینا ہی اسکی مکافات کر دیتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے مزاج میں اوّلاً تو شدت تھی ہی۔ پھر اس وقت تک حکومت کی براہ راست ذمہ داری کا بوجھ بھی ان کے کاندھوں پر نہیں پڑا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے وفات کے وقت اپنی جانشینی کیلئے فاروق اعظمؓ کے نام کی سفارش کرتے ہوئے پیشگوئی کی تھی۔ جب خود حضرت عمرؓ کو حکومت و خلافت کے بارِ گراں کا متحمل ہونا پڑا تو ان کے تشدد میں خود بخود اعتدال کا رنگ پیدا ہو گیا۔

[1] خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۳۸

مسیلمہ اور اہلِ یمامہ سے جنگ

یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے باغی اور مرتد قبائل سے جنگ کرنے کی غرض سے جو گیارہ لشکر مختلف اطراف میں روانہ کئے تھے ان میں سے ایک لشکر جو مسیلمہ کیطرف روانہ کیا گیا تھا عکرمہ بن ابی جہل کی سرکردگی میں تھا لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ یہ لشکر ناکافی ہوگا تو آپ نے شرجیل بن حسنہ کے ماتحت ایک لشکر اور بھیجا۔ حضرت عکرمہ نے یمامہ پہونچتے ہی شرجیل کا انتظار کئے بغیر حملہ کر دیا۔ لیکن ان کو پسپا ہونا پڑا۔ ادھر شرجیل کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہیں راستہ میں ٹھہر گئے۔ عکرمہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اصل واقعہ کی خبر کی تو آپکو بڑا ملال ہوا اور عکرمہ کو لکھا کہ اب آئندہ تم میری شکل نہ دیکھنا اور میں تمہاری شکل نہ دیکھوں گا۔ ساتھ ہی حکم بھیجا کہ وہ حذیفہ اور عرفجہ کے پاس پہونچکر عمان اور مہرہ کے لوگوں کے ساتھ جنگ کریں اور یہاں سے فارغ ہو کر یمن اور حضرموت کا رُخ کریں۔ اب رہے شرجیل تو ان کو حکم بھیجا کہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں یہاں تک کہ خالدؓ پہنچ جائیں۔

حضرت خالدؓ کی نامزدگی غالباً حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مسیلمہ کی طاقت کا شروع میں صحیح اندازہ نہیں تھا اور اسی وجہ سے حضرت خالدؓ کو ابتداءً اس محاذ پر نہیں بھیجا گیا تھا۔ لیکن جب عکرمہ کو شکست ہوئی اور ساتھ ہی معلوم ہوا کہ مسیلمہ کے ساتھ چالیس ہزار عرب منتخب نبرد آزما ہیں تو اب آپکو موقع کی نزاکت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اب ظاہر ہے اتنے بڑے معرکہ کو سر کرنے کے لیئے سیف اللہؓ کے سوا اور کس کے نام قرعہ فال نکل سکتا تھا چنانچہ حضرت خالدؓ دربارِ خلافت کی طلبی پر بطاح سے مدینہ آئے اور یہاں مالک بن نویرہ کے واقعہ کی جو صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی جب حضرت خالدؓ کا بیان سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو اس کے متعلق اطمینان ہو گیا تو اب

حضرت ابوبکرؓ نے معرکۂ یمامہ کو سر کرنے کی پوری ذمہ حضرت خالد کے سپرد کی۔

نامور مہاجرین و انصار کی شرکت غزوۂ بدر کے بعد یمامہ کا معرکہ سب سے بڑا معرکہ تھا جبکہ اسلام کی زندگی اور موت کا قطعی فیصلہ ہونیوالا تھا۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے صرف حضرت خالد کے بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ نامورانِ مہاجرین وانصار جو بدر وحنین کے معرکہ سر کر چکے تھے اور جن میں بڑے بڑے حفاظ وقرا تھے ان کو بھی اس جنگ کیلئے نامزد کیا گیا مہاجرین کے دستہ کے سردار حضرت ابوحذیفہ اور حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطاب تھے اور انصار کا دستہ ثابت بن قیس بن شماس کی ماتحتی ونگرانی میں تھا۔

غرضیکہ اس شان وشوکت اور اہتمام کیساتھ حضرت خالد مسیلمہ سے جنگ کرنیکے لئے یمامہ روانہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس خیال سے کہ کوئی پیچھے سے حملہ نہ کر دے حضرت خالد کے عقب میں سلیط کی سرکردگی میں ایک اور دستہ روانہ کیا۔

مجاعہ کی گرفتاری حضرت خالد یمامہ سے ابھی ایک شب کی مسافت پر تھے کہ ان کو ایک دستہ ملا جس کا سردار مجاعۃ بن مرارہ تھا جو بنوحنیفہ کے معزز ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ دستہ بنوتمیم اور بنوعامر پر شب خون مار کر آ رہا تھا حضرت خالد کے حکم سے اس دستہ کے سب آدمی قتل کر دیئے گئے اور مجاعہ گرفتار کر لیا گیا۔ اب لشکر آگے بڑھا اور یمامہ کے ایک مقام عقربا پہونچا۔ جہاں مسیلمہ اپنا لشکر کثیر لئے پڑا تھا جس کی تعداد عام مورخین کے بیان کے مطابق چالیس ہزار اور بعض روایات میں ساٹھ ہزار بیان کی جاتی ہے۔[2]

لشکر کی ترتیب دوسرے دن صبح کو حضرت خالد نے اپنے لشکر کو اسطرح ترتیب دی کہ دائیں بازو (میمنہ) کے کمانڈر حضرت زید بن خطاب تھے اور بائیں بازو (میسرہ) کی قیادت حضرت اسامہ بن زید کے سپرد تھی۔ اور خود ایک دستہ لئے ہوئے وسط لشکر

---

[1] صحابۂ بدریین کو حضرت ابوبکر اسقدر عزیز رکھتے اور ان کو اس درجہ بابرکت سمجھتے تھے کہ آپ انکو کبھی جنگ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ (طبری ج ۲ ص ۵۰۵) یمامہ کے معرکہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر کو اپنے ذاتی رجحان کے برخلاف اس موقع پر بدری صحابہ کو بھی بھیجنا پڑا۔[2] طبری ج ۲ ص ۵۰۵

میں تھے ادھر مسیلمہ نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور دونوں لشکر ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو گئے۔

جنگ کا آغاز اب مسیلمہ کی طرف سے شرجبیل بن مسیلمہ نے بنوحنیفہ کو للکار کر کہا "اے لوگو! آج کا دن غیرت کا دن ہے۔ اگر تم لوگ شکست کھا گئے تو تمہاری عورتوں کو لونڈی باندیاں بنا لیا جائے گا۔ اور بغیر نکاح کے ان کے ساتھ تمتع کیا جائیگا۔ اس لئے تم اپنے حسب وشرف کی طرف سے مدافعت کرو اور اپنی عورتوں کو بچاؤ۔ ادھر مجاہدین اسلام کے ولولہ وجوش کا یہ عالم تھا کہ "جوہر شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا"۔

مجاہدین کا جوش وخروش مہاجرین کا علم حضرت سالم مولی حذیفہ کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے کہا کہ اگر آپ قتل ہو گئے تو ایک حاملِ قرآن جاتا رہے گا۔ انہوں نے کہا "اگر میں اس بات کا اندیشہ کروں تو مجھ سے برا حاملِ قرآن کون ہو گا۔ نہار رجال ایک شخص تھا جس نے مشہور کر دیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی نبوت میں سے نصف کا شریک مسیلمہ کو کر لیا ہے اور اسطرح مسیلمہ کا دستِ راست تھا۔ اس نے صف سے باہر نکل کر پکارا کہ ہل من مبارز کیا مجھ سے کوئی مقابلہ کرنے والا ہے۔ اسکے جواب میں اسلامی لشکر کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطاب آگے بڑھے اور انہوں نے اس زور کا وار کیا کہ نہار رجال ڈھیر تھا۔ اب دونوں لشکر گتھ ہو گئے اور بڑے زور کا رن پڑا مسیلمہ کا ایک ایک آدمی اس پر پروانہ وار اپنی جان قربان کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اگر اس جنگ میں شکست ہو گئی تو حجاز کی سیادت جنوبی عرب پر ہمیشہ کیلئے قائم ہو جائیگی اور شدید قبائلی عصبیت کے باعث یہ چیز انکی موت کے مرادف تھی۔ مسلمانوں کو ایسی ہولناک اور سخت جنگ لڑنے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس لئے اول اول مسلمان پسپا ہو گئے یہ رنگ دیکھ کر مسیلمہ کی فوج کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ اس نے حضرت خالد کے خیمہ پر حملہ کر دیا۔ یہاں حضرت خالد کی نئی بیوی ام تمیم تھیں حملہ آوروں نے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں لیکن مجاعہ جسکو حضرت خالد ام تمیم کی نگرانی میں رکھ گئے تھے اس نے روکا اور کہا کہ میں اس عورت کا پڑوسی ہوں۔ ان لوگوں نے اب ام تمیم سے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن خیمہ کی دھجیاں اڑا دیں۔

مسلمانوں کا دوسرا حملہ اب مسلمانوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک دوسرے کو پکار پکار کر ثابت قدمی اور استقلال کی دعوت دینے لگا ثابت بن قیس نے کہا "آہ! اے مسلمانو! آخر تم کیا کروگے اے اللہ! ان مسلمانوں نے جو پسپائی دکھائی ہے میں اس سے بری ہوں زید بن خطاب بولے "خدا کی قسم! اب میں اس وقت تک زبان نہیں کھولوں گا جب تک کہ ہم لوگ دشمنوں کو شکست نہیں دیدیں گے یا میں خود قتل نہیں کردیا جاؤنگا۔ ابو حذیفہ نے للکار کر کہا "اے اہل قرآن! تم اپنے افعال سے قرآن کو زینت دو۔ یہ مجاہدین اسلام اپنی اپنی جگہ پر شیر کی طرح ہنکار ہی رہے تھے کہ اتنے میں حضرت خالد نے پلٹ کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے لیکن کچھ فاصلہ پر پہونچکر جوابی حملہ کیا۔ اور جنگ تیز ہوگئی۔ مہاجرین انصار اہل قریٰ اور اہل بادیہ ان سب کے دستے ایک دوسرے کیساتھ ملے ہوئے داد شجاعت دے رہے تھے حضرت خالد نے حکم دیا کہ ہر دستۂ فوج الگ الگ ہوجائے۔ اب حضرت خالد نے جائزہ لیا۔ تو معلوم ہوا کہ مہاجرین انصار اور اہل قریٰ کو بہ نسبت اہل بادیہ کے زیادہ نقصان پہونچا تھا۔ اور مشہور صحابہ حضرت زید بن خطاب حضرت سالم اور ان کے آقا حضرت ابو حذیفہ اس معرکہ میں کام آچکے تھے حضرت خالد نے دشمن کی جمعیت پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ مسیلمہ اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا ہے اور اسکے حمائیتوں نے چاروں طرف سے اسکو اپنے حلقہ میں لے رکھا ہے اب حضرت خالد نے محسوس کیا کہ جب تک مسیلمہ کی دستۂ خاص پر حملہ کر کے اسے شکست نہیں دیجائیگی دشمن کی جمعیت منتشر نہ ہوگی چنانچہ انہوں نے بیک "یا محمداہ" نعرہ لگایا اور مسیلمہ کے دستہ پر حملہ کردیا اب عالم یہ تھا کہ دشمن کی فوج کا ایک ایک بہادر سربکف ہوکر آگے بڑھتا تھا اور اسکی لاش خاک و خون میں تڑپ کر رہ جاتی تھی مسیلمہ نے یہ دیکھ کر چاہا کہ خود مقابلہ کے لئے آگے بڑھے لیکن شدتِ خوف و اضطراب سے ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور اسے پھر پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ اتنے میں حضرت خالد نے اپنے دستہ کے مجاہدوں کے ساتھ اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ اب مسیلمہ کیلئے راہِ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا مسیلمہ کے جانثاروں نے ہرچند اس سے کہا کہ "تو ہم سے جس فتح و ظفر کا وعدہ کرتا تھا وہ کہاں ہے"

لیکن اب اس کیلئے ٹھہرنا ناممکن تھا۔ خود بھاگتا جاتا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ "اپنے حسب و نسب کی طرف سے مدافعت کرو۔ لیکن ظاہر ہے اسکی اب ان باتوں کا اثر ہی کیا ہوسکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھی میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ پڑی۔ ذرا فاصلہ پر ایک باغ تھا جس کی چہار دیواری محفوظ تھی حکم بن الطفیل نے چیخ کر کہا۔ اے بنو حنیفہ باغ! باغ! یعنی اس میں چل کر پناہ لو۔ یہ باغ درحقیقت مسیلمہ کا قلعہ تھا اور چونکہ مسیلمہ اپنے آپ کو رحمٰن الیمامۃ کہتا تھا اس لئے باغ کا نام حدیقۃ الرحمٰن تھا یہ سب لوگ اس میں پہونچکر قلعہ بند ہوگئے۔

مسیلمہ کا قتل اسلامی لشکر نے اس قلعہ کا محاصرہ کرلیا اندر جانیکا راستہ نہیں تھا اسلئے حضرت براء بن مالک نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ ان کو اوپر اٹھا کر باغ (قلعہ) کے اندر ڈالدیں۔ مجاہدین نے کہا "ہم ایسا نہیں کریں گے۔ لیکن براء بن مالک نے اصرار کیا تو مسلمانوں نے مجبوراً ان کو باغ کی دیوار پر پہونچادیا اور اندر کی طرف کود کر تن تنہا لڑتے بھڑتے گھسے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دروازہ کھول دیا۔ بس اب کیا تھا؟ مسلمان باغ کے اندر گھس آئے اور پھر شدید جنگ شروع ہوگئی۔ دونوں طرف سے کشتوں کے پشتے لگ گئے لیکن بنو حنیفہ کے مقتولین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس معرکہ میں مسیلمہ بھی جبیر بن مطعم کے غلام وحشی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب ابو حنیفہ کیلئے جمنا ناممکن تھا پسپا ہوکر بھاگ پڑے۔ حضرت خالد کو یہ خوشخبری پہونچی تو مجاعہ کو لیکر بنو حنیفہ کے مقتولین کو دیکھنا شروع کیا ایک طرف محکم کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ شخص خوبصورت اور وجیہ تھا حضرت خالد نے پوچھا "کیا تمہارا سردار مسیلمہ یہی ہے؟" مجاعہ نے جواب دیا "نہیں! بخدا یہ اس سے زیادہ بہتر اور شریف ہے۔ یہ محکم الیمامہ ہے۔ محکم کو حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے ایک تیر مار کر اس وقت ہلاک کیا تھا جبکہ ابھی وہ باغ کے احاطہ سے باہر پیچھے سے اپنے ساتھیوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ اب حضرت خالد قلعہ کے اندر داخل ہوئے یہاں ایک لاش کی طرف اشارہ کر کے مجاعہ نے بتایا کہ یہ مسیلمہ ہے اس دن سے اس باغ کا نام "حدیقۃ الموت" یعنی موت کا باغ پڑ گیا اور وہ اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہے طبری کا بیان ہے کہ باغ سے باہر اور اندر دس ہزار آدمی مسیلمہ کے اور بارہ سو مسلمان مجاہدین قتل ہوئے[1]

[1] یہ پوری تفصیل طبری ج ۳ از صفحہ ۵۰۴ تا صفحہ ۵۱۹ و ابن اثیر ج ۲ از صفحہ ۲۷۳ تا صفحہ ۲۸۰ سے ماخوذ ہے۔

باقی قلعوں پر قبضہ اس مہم سے فارغ ہونیکے بعد عبد اللہ بن عمرؓ اور عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ نے حضرت خالد کو مشورہ دیا کہ باقی دوسرے قلعوں پر بھی جہاں مسیلمہ کے ساتھی ابھی تک محفوظ ہیں حملہ کیا جائے۔

ادھر مجاعہ نے جس پر حضرت خالد اعتماد کرنے لگے تھے آکر کہا کہ مسیلمہ کیساتھ جو لوگ آئے تھے جلد باز قسم کے تھے ورنہ ایک بہت بڑی تعداد تو ابھی تک قلعوں میں بند ہے مجاعہ کا مقصد اس کہنے سے صرف یہ تھا کہ حضرت خالد بنو حنیفہ کے بچے کھچے لوگوں کیساتھ مصالحت کرلیں اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات برتیں چنانچہ مجاعہ نے ایک طرف تو حضرت خالد سے یہ کہا اور دوسری جانب اپنی قوم کی عورتوں سے کہا "تم سب ہتھیار پہن لو اور قلعوں کی منڈیروں پر کھڑی ہو جاؤ" عورتوں نے فوراً اس پر عمل کیا اب حضرت خالد نے یہاں پہونچکر نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ قلعوں پر زرہ پوش اور ہتھیار بند سپاہیوں کی صفیں کھڑی ہیں ادھر چونکہ مسیلمہ کے ساتھ مسلمان مجاہدین کو بڑی شدید جنگ لڑنی پڑی تھی اس لئے وہ تھکے ماندے اور گھر واپس جانے کیلئے بے قرار تھے ان وجوہ کی بنا پر مجاعہ نے جو ترکیب چلی تھی وہ کامیاب ہوئی اور حضرت خالد نے معمولی سی شرطوں پر صلح کرلی۔ بعد میں مجاعہ کی فریب کا بھید کھلا تو حضرت خالد کو بڑا غصہ آیا لیکن مجاعہ نے صاف کہا "یہ لوگ (بنو حنیفہ) میرے ہم قوم ہیں۔ اس لئے میرے لئے ناممکن تھا کہ میں انکی مدد نہ کرتا"

صلح ہو جانے کے بعد حضرت خالد نے ان سب بقیۃ السیف پر اسلام پیش کیا جس کو انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ اور حضرت خالد نے از روئے صلح جو کچھ ان سے وصول کیا تھا وہ سب انکو واپس کر دیا[1]

جنگِ یمامہ کی تاریخ یہ جنگ یمامہ کب ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۱ھ بتاتا ہے۔ اور کوئی ۱۲ھ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے دونوں میں تطبیق اس طرح دی کہ اس کا آغاز تو ہوا ۱۱ھ میں لیکن ختم ہوئی ۱۲ھ میں واللہ اعلم[2]

حدیقۃ الموت کا جائے وقوع عام طور پر محدثین اور مورخین کے ہاں مشہور ہے اور جیسا کہ ہم نے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۵ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۶

بھی لکھا ہے۔ کہ مسیلمہ کیساتھ یہ جنگ یمامہ میں لڑی گئی تھی اور حدیقۃ الموت جسمیں مسیلمہ قتل ہوا تھا اسکی نسبت یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ یمامہ کی حدود میں یا اس کے قریب ہی تھا لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر[1] جس نے ابو اسماعیل الازدی کی کتاب "فتوح الشام" کو ۱۸۵۴ء میں اڈیٹ کیا تھا اس نے ایک اور مستشرق کیپٹن لیس (LEES) کو ۷ فروری ۱۸۶۵ء کو ایک خط لکھا تھا۔ جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی کاروائیوں (PROceedings) کی رپورٹ بابت ۱۸۶۵ء میں از صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۷ چھپا ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسیلمہ کا باغ یمامہ میں نہیں۔ بلکہ مقام بحرین میں ہے۔

جنگ کا اثر مرتد اور باغی قبائل سے جتنی لڑائیاں لڑی گئی ہیں ان میں یمامہ کی جنگ سب سے بڑی اور سخت ترین تھی۔ مسیلمہ کیساتھ جو لشکر تھا اس کی تعداد اکثر نے چالیس ہزار اور بعض نے ساٹھ ہزار لکھی ہے اور یہ سب کے سب مسیلمہ پر پروانہ وار فدا تھے جس کے متعدد اسباب و وجوہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

موقع کی اس نزاکت کے باعث وہ اکابر مہاجرین و انصار جن کو حضرت ابوبکر مدینہ سے باہر بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انکو بھی محاذ جنگ پر بھیجا گیا اور اگرچہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچا۔ اکابر صحابہ اور بڑے بڑے حفاظ و قراء[2] جام شہادت نوش کر گئے لیکن چونکہ اسلام کے سب سے بڑے حریف پر یہ آخری اور فیصلہ کن فتح تھی جس نے جزیرۃ العرب میں ہمیشہ کیلئے اسلام کے قدم جما دئے اور اس کو کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا۔ اسلئے اسلامی فوج فتح و ظفر کا پرچم اڑاتی ہوئی جب مدینہ میں داخل ہوئی ہے تو مدینہ کا گوشہ گوشہ مرحبا اور آفریں کے نعروں اور حمد و صلوٰۃ کے نغموں سے گونج اٹھا جو صحابہ کرام اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے انکا غم ہونا ایک طبعی بات تھی، لیکن نصرتِ خداوندی پر ترانہ ہائے حمد کی آوازوں میں نوحہ و ماتم کی یہ صدائیں دب دب کر رہ گئیں۔

---

[1] ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم لنسان لیس یہ دونوں کلکتہ مدرسہ کے جو مسلمانوں میں عام طور پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نام سے مشہور ہے۔ پرنسپل تھے اول الذکر ۱۸۵۰ء میں اور مؤخر الذکر ۱۸۵۷ء میں)

[2] ابن اثیر اور بلاذری نے اجلہ صحابہ کے نام کی فہرست دی ہے۔

اس فتح و کامرانی پر حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ خوش ہونیکا حق اور کسے ہو سکتا تھا لیکن ایکو بارہ سو صحابہؓ کے شہید ہو جانے کا رنج و ملال بھی کم نہیں تھا چنانچہ آپ کو اطلاع ملی کہ حضرت خالدؓ نے جنگ کے بعد مجاعہ کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے تو انتہائی حلیم و بردبار ہونیکے باوجود حضرت خالدؓ کو ایک سخت غضب آلود خط لکھا کہ "اے ام خالد کے بیٹے! معلوم ہوتا ہے تمہارے دل میں درد نہیں ہے۔ تم اس وقت عورتوں سے نکاح کرتے ہو جبکہ تمہارے گھر کے صحن میں بارہ سو مسلمانوں کا خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے"۔[1]

بحرین

حضرت خالدؓ جس وقت یمامہ کی جنگ میں مصروف تھے دوسرے مسلمان قائدین فوج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے احکام کے مطابق عرب کے مختلف حصوں میں باغیوں کے ساتھ مصروف پیکار تھے۔ انہیں میں سے ایک ریگستانی صوبہ بحرین کا تھا جو مدینہ سے بہت دور شمال مشرق میں خلیج فارس کے کنارہ پر واقع تھا۔ یہ علاقہ حکومت ایران کے ماتحت تھا اور اس میں متعدد عرب قبائل بنو عبد القیس، بکر بن وائل اور تمیم آباد تھے جن کا سردار ایران کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کے عہد میں یہ سردار منذر بن ساویٰ تھا جس کے نام آنحضرتؐ کے لکھے ہوئے خطوط ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی قابل قدر کتاب "الوثائق السیاسیہ" میں نقل کئے ہیں۔ آنحضرتؐ کی دعوت پر منذر اور بحرین کا صدر مقام ہجر کا گورنر (مرزبان) یہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ جتنے عرب قبائل یہاں آباد تھے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، یہ واقعہ ۸ھ کا ہے[2] بعض مؤرخین اسکو نو ہجری کے واقعات میں شمار کرتے ہیں لیکن اصح اول ہی ہے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے چند روز بعد ہی منذر بن ساویٰ کا بھی انتقال ہو گیا تو الحطم ایک سردار کیساتھ بنو عبد القیس اور بنو بکر مرتد ہو گئے۔ لیکن جارود بن بشر بن عمرو العبیدی جنہوں نے آنحضرتؐ کا فیض صحبت حاصل کیا تھا انکی کوششوں سے بنو عبد القیس تو

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۱۹
[2] فتوح البلدان بلاذری ص ۸۵۔

جلد ہی اسلام کی طرف لوٹ آئے[1] لیکن بنو بکر کو اپنے ارتداد پر اصرار رہا اور ان لوگوں نے نعمان بن منذر بن ماء السماء (صاحب الخورنق والسدیر) کے بیٹے کو جس کا نام بھی منذر تھا اپنا سردار منتخب کر لیا۔ الحطم بن ضبیعہ بنو بکر اور دوسرے عجمی لوگ جو بحرین میں آباد تھے اور جو سرے سے مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے ان کو ساتھ ملا کر مقام جواثا میں حضرت جارودؓ کے خلاف معرکہ آرا ہوا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کا محاصرہ کر کے سامان رسد تک سے انکو محروم کر دیا لیکن مسلمان فقر و فاقہ اور ان تمام سختیوں کے باوجود اسلام کے دامن کو پکڑے رہے۔

یہی حالات گذر رہے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے علاء بن الحضرمی کو بحرین کے محاذ پر روانہ کیا علاء بحرین اس وقت پہونچے ہیں جبکہ حضرت خالدؓ مسیلمہ کی جنگ سے فارغ ہو چکے ہیں اس بنا پر بنو حنیفہ کے بچے کھچے لوگ جو اب مسلمان ہو گئے تھے وہ بھی حضرت علاءؓ کے ہم رکاب ہو گئے۔ ان کے علاوہ ثمامہ بن آثال اور قیس بن عاصم المنقری بھی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ اس لشکر میں شریک ہو گئے۔ حضرت علاءؓ اپنے لشکر کو لئے ہوئے صحرائے دھنا میں سے گذر رہے تھے کہ شام ہو گئی تو انہوں نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا تاکہ رات کے وقت جنگل میں کہیں راستہ نہ بھول جائیں۔ جب یہ لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اتفاق ایسا ہوا کہ اونٹ جن پر سامان خورد و نوش لدا ہوا تھا بدک کر بھاگ پڑے اور یہاں کھانے پینے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی مسلمان سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ اور ایک دوسرے کو وصیت کرنے لگا۔ حضرت علاء بن الحضرمی نے انکی ہمت بندھائی اور کہا کہ اے لوگو! کیا تم سب مسلمان نہیں ہو۔ کیا تم اللہ کے انصار اور اسکی راہ میں جہاد کرنے والے نہیں ہو؟ تم یقین رکھو کہ اللہ تم جیسے لوگوں کو رسوا اور ذلیل نہیں کریگا۔ چنانچہ اسلامی فوج جب نماز فجر سے فارغ ہوئی تو ان کو دور سے سراب چمکتا ہوا نظر آیا۔ فوج کے پیش رو دستہ نے پاس جا کر دیکھا تو وہ پانی تھا بہت خوش ہوئے سب نے پانی پیا۔ غسل کیا اور اپنے اپنے مشکیزوں میں بھر لیا۔ اس کے بعد آفتاب ذرا بلند ہوا تو کرا چانک اونٹ بھی ادھر ادھر بھاگتے ہوئے واپس آگئے۔ مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی اب یہ لشکر تازہ دم ہو کر روانہ ہوا

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۱۹

اور بحرین پہونچا۔ یہاں جارود مقامی مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ حطم بن ضبیعہ کے بالمقابل صف آرا تھے۔ حضرت علاء بن الحضرمی نے جارود کو پیغام بھیجا کہ تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہو لیکن حطم کا لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا اور ساز و سامان بھی اس کے پاس بافراط تھا اس لئے حضرت علاء، اور حطم دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خندقیں کھود کر پڑ گئے، دن کے وقت یہ دونوں فوجیں خندقوں سے باہر آکر جنگ کرتی تھیں اور پھر خندقوں میں واپس چلی جاتی تھیں، ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ فتح و شکست کسی فریق کو نہیں ہوئی تھی۔ آخر ایک رات دشمن کے لشکر میں اچانک شور و غل اور مار دھاڑ کی آواز بلند ہوئی حضرت علاء نے عبداللہ بن حذف کو خبر لانے کیلئے بھیجا۔ انہوں نے آکر بتایا کہ فریق مخالف کے سپاہی شراب میں بدمست ہیں اور خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔ حضرت علاء یہ سنتے ہی اپنی فوج لے کر ان لوگوں پر جا پڑے اور تلوار چلانی شروع کر دی۔ یہ لوگ سخت بدحواس ہو کر رہ گئے۔ ان میں کچھ قتل ہو گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے کچھ اِدھر اُدھر جہاں جگہ نظر آئی چھپ گئے اور باقی جو تھے وہ بھاگ پڑے۔ اسی ہنگامہ میں حطم مارا گیا۔

جو لوگ اس دار و گیر سے بچ نکلے تھے وہ کشتیوں میں سوار ہو کر جزیرہ دارین[1] پہونچے۔ حضرت علاء نے ان لوگوں کا تعاقب کرنا چاہا لیکن مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس کشتیاں نہیں تھیں کہ سمندر پار کر سکیں۔ آخر حضرت علاء نے مسلمانوں کو جمع کرکے کہا کہ کچھ خوف نہ کرو۔ جس خدا نے تمہاری مدد خشکی (صحرائے دھنا) میں کی ہے وہ بحرین میں تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد سب مسلمانوں نے مل کر جناب باری تعالیٰ میں عجز و الحاح کیساتھ دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ گھوڑا۔ اونٹ۔ گدھا اور خچر غرض کہ جس کے پاس جو سواری تھی اس نے بے جھجک سمندر میں ڈالدی۔ بقول اقبال ؎

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اِس شان سے مسلمانوں نے سمندر پار کیا اور جزیرہ دارین کے ساحل پہ پہونچے یہاں چونکہ مفرورین کے لئے اب کہیں بھاگ نکلنے کی گنجایش نہیں تھی اس لیئے وہ

---

[1] دارین خلیج فارس کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ کے سامنے ہی تھا یہاں کی آبادی زیادہ تر عیسائی تھی۔

بڑی بے جگری سے لڑے۔ لیکن فتح مسلمانوں کو ہی ہوئی۔ اور یہ سب لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ طبری کی روایت ہے کہ اس جنگ میں مال غنیمت اس کثرت سے ہاتھ آیا کہ ایک ایک سوار کو چھ چھ ہزار اور پیادہ کو دو دو ہزار ملے۔ حضرت علاء اسی دن بحرین کیلئے واپس روانہ ہو گئے اور بحرین پہنچکر حضرت ابوبکر کو مژدۂ فتح کا خط لکھا اور جو حالات گذرے تھے سب از اوّل تا آخر لکھے۔ اب یہاں مرتدین اور باغیوں کی طاقت مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی، جو بچ رہے ہیں سب مسلمان ہو گئے۔ کسی نے خبر اڑادی کہ بنو شیبان حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں لیکن یہ محض افواہ تھی۔ حضرت علاء نے تحقیق کی تو اس کی کوئی اصلیت نہ تھی[1]

جنگِ بحرین کی اہمیت اگرچہ اس جنگ کا نمبر جنگِ یمامہ کے بعد ہے۔ لیکن بعض خاص اعتبارات سے یہ جنگ یمامہ سے بھی زیادہ اہم تھی۔ یمامہ میں صرف ایک قوم اور ایک گروہ سے واسطہ تھا لیکن بحرین چونکہ خلیج فارس پر واقع تھا۔ ایران کی حکومت کے ماتحت تھا اور یہاں ہندوستان اور ایران کے تاجر آباد تھے جنہوں نے فرات کے دہانہ سے عدن تک اپنی آبادیاں قائم کر رکھی تھیں، اس بنا پر اسلام کی یہ جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں تھی۔ بلکہ بین الاقوامی تھی۔ اور پھر چونکہ ان لوگوں میں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی آتش پرست بھی تھے۔ اور بت پرستی بھی اس لئے اس جنگ کو بین المذاہبی جنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو جو شاندار فتح ہوئی اور اثرات و نتائج کے علاوہ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں ایرانی حکومت نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اس کا تار و پود بکھر گیا اور مسلمانوں کے لئے عراق کی فتح کا راستہ کھل گیا۔ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

---

[1] یہ پوری تفصیل ملخصاً طبری ج ۲ از صفحہ ۵۱۹ تا صفحہ ۵۲۸ سے ماخوذ ہے۔

عمان ومہرہ

عمان بحرین سے قریب ہی بحر ہند کے ساحل پر واقع ہے۔ یہاں زیادہ آبادی قبیلۂ ازد کی تھی۔ لیکن دوسری قومیں بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ۸ھ میں آنحضرت صلعم نے حضرت ابوزید انصاری کو جو قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے تبلیغ اسلام کیلئے بھیجا جیفر اور علبید جو یہاں کے امیر تھے ان کے نام عمرو بن العاص کے ذریعہ ایک مکتوب والا ارسال فرمایا جیفر اور علبید دونوں نے اسلام کی دعوت کو لبیک کہا اور پھر ان کی دعوت پر باقی عرب بھی مسلمان ہو گئے [1]

لیکن جب آنحضرت صلعم کی وفات ہوئی تو ازد سب مرتد ہو گئے۔ لقیط بن مالک ذوالتاج جس نے اس زمانہ کی عام ہوا کے مطابق نبوت کا دعوای کیا تھا۔ اور ان مرتدین کا قائد تھا اس نے عمان پر قبضہ کر لیا۔ اور جیفر اور عبید[2] کو مجبوراً پہاڑوں پر پناہ لینی پڑی۔ حضرت ابوبکر کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے حذیفہ بن محصن اور عرفجۃ بن ہرثمہ کو عمان کے محاذ پر روانہ کیا اور ان کے عقب میں عکرمۃ بن ابی جہل کو بھیجا جو یمامہ کی جنگ میں شکست کھا چکے تھے۔ حذیفہ اور عرفجہ ابھی عمان پہونچے بھی نہیں تھے کہ عکرمہ ان سے آملے۔ عمان کے قریب پہونچکر ان حضرات نے جیفر اور عبید کو اپنی آمد کی خبر کی اور یہ بھی اسلامی فوج سے آکر مل گئے۔ اب اسلامی فوج نے عمان کے دارالسلطنت مقام صحار میں پڑاؤ ڈالا اور ادھر لقیط بن مالک اپنی فوج لئے مقام دبا میں پڑا تھا۔ آخر مسلمانوں نے پیش قدمی کر کے لقیط پر حملہ کیا۔ بڑا سخت قسم کا معرکہ ہوا۔ جنگ کے پہلے دور میں دشمن کا پلہ بھاری نظر آتا تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اضطراب و تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ اسی اثناء میں خریت بن راشد بنو ناجیہ کا لشکر اور سیحان بن صوحان بنو عبدالقیس کی ایک بڑی جمعیت لئے ہوئے پہونچ گئے۔ اچانک اس غیبی امداد کو دیکھ کر مسلمانوں کے دل بڑھے مضبوط ہو گئے اور انہوں نے پینترا بدل کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۸۳ [2] ابن اثیر نے عبید کا نام عیاذ لکھا ہے۔ ج ۲ ص ۲۸۵

ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں دشمن کی فوج کے دس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اور بہت بڑی تعداد میں مال غنیمت ہاتھ آیا اس کا پانچواں حصہ حضرت عرفجہ کے ہاتھ مدینہ روانہ کر دیا گیا اور حضرت حذیفہ یہاں کے انتظام اور در و بست کی غرض سے عمان ہی میں قیام پذیر رہے [1]

اب رہے عکرمۃ بن ابی جہل تو وہ ایک لشکر کثیر کے ساتھ مہرہ چلے گئے یہاں مہرہ میں دو گروہ تھے جو آپس میں ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔ ایک گروہ کا سردار ایک شخص سخریت نامی تھا۔ اور دوسرے گروہ کا امیر مصبح نام کا ایک شخص تھا جو بنو محارب سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دونوں میں مصبح کا گروہ نسبۃً زیادہ طاقتور اور با اقتدار تھا۔ اب حضرت عکرمہ نے سیاسی چال یہ چلی کہ جو گروہ کمزور تھا اس کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی چنانچہ اس مقصد کیلئے سخریت سے گفت و شنید کی سخریت نے بڑی خوشی سے عکرمہ کی دعوت پر لبیک کہا اور مسلمان ہو گیا۔ اب عکرمہ نے مصبح کو دعوتِ اسلام دی۔ لیکن وہ اپنی طاقت پر نازاں تھا اس لئے یہ دعوت قبول نہیں کی عکرمہ نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ شدید قتال کے بعد مصبح شکست کھا گیا اور قتل کر دیا گیا جو لوگ اسلام کی شمشیر خارا شگاف سے بچ رہے تھے مسلمان ہو گئے [2]

یمن

پہلے گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلعم کی حیات ہی میں اسود عنسی نے یمن میں نبوت کا دعوی کر کے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی تھی اور چند روز کے بعد ہی اس کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ اسود عنسی کے قتل ہو جانے کے بعد یمن میں سخت قسم کی طوائف الملوکی اور لاقانونیت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ مسلمانوں کو اپنی جان اور عزت کا محفوظ رکھنا دشوار ہو گیا۔ اسود عنسی کے فوج کے سردار تھے کہ صنعا اور عدن کے درمیان گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے۔ اسود عنسی کے ساتھیوں کے علاوہ عرب کا مشہور بہادر اور شہسوار عمرو بن معد یکرب اور قیس بن عبد یغوث یہ دونوں بھی آنحضرت صلعم کی خبر وفات سنتے ہی مرتد

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۵ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۶

ہو گئے تھے اس بنا پر پورے یمن میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور مدینہ اور یمن کا درمیانی راستہ تک خطرناک ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلعم کی طرف سے جو عمال اور امراء مقرر تھے انہوں نے حضرت ابوبکر کو اصل صورت حال سے مطلع کیا۔ فیروز دیلمی جس نے اسود عنسی کو قتل کیا تھا ابناء سے تعلق رکھتا تھا جو اگرچہ ایرانی النسل تھے لیکن مدت سے یمن میں آباد ہو گئے تھے اور یہاں اچھا خاصا اقتدار رکھتے تھے اس بنا پر یہ تمام باغی اور فتنہ پرداز ابناء کے خاص طور پر دشمن تھے اور انکو یمن سے جلا وطن کرنیکا ارادہ کئے ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکر کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے فیروز دیلمی کو یمن میں اپنا نائب مقرر فرمایا اور عمر ذی مران، سعید ذی زود، ذوالکلاع الحمیری اور حوشب ذی ظلیم وغیرہم جو یمن کے با اقتدار لوگ تھے اور اسلام پر قائم تھے ان سب کو حکم بھیجا کہ وہ فیروز کی اطاعت کریں اور ان کیساتھ پورا تعاون کریں۔ فیروز دیلمی نے بنو عقیل بن ربیعہ اور بنو عک وغیرہما قبائل جو اسلام پر قائم تھے انکو اپنے ساتھ لیکر صنعاء سے باہر قیس بن عبد یغوث بن مکشوح کا سخت مقابلہ کیا اور ابناء جن کو وہ جلا وطن کرنے پر تلا ہوا تھا انہیں قیس کے پنجۂ ظلم سے نجات دی۔ یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت ابوبکر کی ہدایت اور حکم کے مطابق ایک طرف ادھر شمال سے مہاجر بن ابی امیہ اور ان کے بعد ہی عکرمہ بن ابی جہل عمان و مہرہ کی مہم سے فارغ ہو کر یہاں پہونچ گئے۔ اب مسلمانوں کی طاقت اس قدر زیادہ اور مضبوط تھی کہ انکا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ معمولی سی جھڑپوں کے بعد ہی قیس شکست کھا گیا اور گرفتار ہو گیا۔ اور عمرو بن معدیکرب کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے خود اپنے آپکو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ مہاجر بن ابی امیہ نے ان دونوں کو مدینہ روانہ کیا جہاں حضرت ابوبکر کیساتھ معمولی سی گفتگو اور ان کی فہمائش کے بعد دونوں پھر مسلمان ہو گئے اور عراق و شام کی مہمات میں شریک ہوئے۔ اب مہاجر صنعاء میں آکر مقیم ہو گئے اور عکرمہ نے جنوبی یمن قیام کیا اور اسطرح پورا یمن فتنہ و فساد سے پاک و صاف ہو کر پھر گہوارۂ امن بن گیا [1]

مہم یمن کی اہمیت اس مہم کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فیروز الدیلمی۔ داذویہ اور دوسرے ابناء یہ سب اگرچہ یمن میں آبسے تھے لیکن ایرانی النسل تھے اس بنا پر اگرچہ

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۷ و ۲۸۸

قیس بن مکشوح مسلمان تھا اور اسود عنسی کے قتل کے مشورہ میں بھی شریک تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق نے جب فیروز کو اپنا نائب مقرر کیا تو اس کی عربی عصبیت کی رگ غیرت و حمیت بھڑک اٹھی اور یہ مرتد ہو گیا اسکے بعد اس نے ایک جمعیت اپنے اردگرد فراہم کر کے ان ایرانی النسل متوطنین یمن سے یمن کو پاک و صاف کر دینے کا ایک منصوبہ باندھا۔ لیکن حضرت ابوبکر نے اس کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ اس طرح گویا تاریخ اسلام میں یہ سب سے پہلا واقعہ ہے جب کہ عربی عصبیت کے سر پر عملاً ایک ضرب کاری لگا کر اسلامی اخوت و مساوات کی مثال قائم کی گئی اس کا اثر جہاں عربوں پر یہ ہوا کہ انکی آنکھ کھل گئی غیر عربی قوموں پر یہ ہوا کہ ان کیلئے اسلام میں زیادہ کشش پیدا ہو گئی۔ قیس بن مکشوح کو حضرت ابوبکر صدیق نے ایک ایرانی النسل مسلمان داذویہ کے قصاص میں چاہا کہ اسے قتل کر دیں لیکن چونکہ قیس نے یہ قتل خفیہ طور پر کیا تھا اور اس کے ثبوت کے لئے کوئی شہادت نہیں مل سکی اس لئے یہ قتل نہیں کیا جا سکا پھر ارتداد سے توبہ کر لینے پر معاف کر دیا گیا [1]۔

کندہ و حضرموت

کندہ اور حضرموت بھی یمن سے قریب ہیں آنحضرت صلعم کی طرف سے ان دونوں جگہوں کے گورنر (عامل) زیاد بن لبید الانصاری تھے جن کا کام صدقات کے جمع کرنیکے علاوہ اسلامی احکام و مسائل کی تعلیم و تبلیغ بھی تھا۔ جب آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد عرب کے دوسرے قبائل مرتد ہوئے تو اہل کندہ و حضرموت بھی اس گمراہی سے محفوظ نہیں رہے۔ اشعث بن قیس کندہ کا نہایت معزز اور نامور شخص تھا۔ سنہ ۱۰ھ میں کندہ کے اسی آدمیوں [2] کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شان سے حاضر ہوا تھا کہ یہ اور اس کے سب ریشمین لباس پہنے ہوئے تھے اشعث نے اسلام قبول کیا لیکن اب کندہ اور حضرموت میں جو ارتداد پیدا ہوا اسکی قیادت بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ زیاد بن لبید الانصاری نے مقابلہ کیا لیکن جم نہ سکے اتنے میں مہاجر بن امیہ اور عکرمہ دونوں یمن سے یہاں پہونچ ہی گئے۔ حضرت مہاجر نے عکرمہ رضؓ کو تو وہیں چھوڑا اور خود ایک لشکر لیکر زیاد بن لبید سے ملے اور پھر دونوں نے پیش قدمی کر کے

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۸ [2] حافظ ابن حجر نے بروایت ابن سعد تعداد ستر بتائی ہے، الاصابہ ج ۱ ص ۶۶

مجزالذیرقان نامی ایک مقام پر اشعث بن قیس کو چیلنج کیا۔ دونوں فوجوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی اشعث جم نہیں سکا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کیساتھ بھاگ کر قلعہ النجیر میں پناہ لی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا اسلامی فوج قلعہ کا محاصرہ کرکے پڑ گئی۔ جب محاصرہ طویل ہوا اور سامانِ رسد وغیرہ کا پہنچنا بھی مسدود ہو گیا تو آخر جان کی بازی لگاکر یہ سب باہر نکل آئے اور بڑی بہادری کے ساتھ لڑے لیکن اس درمیان میں حضرت عکرمہ بھی اپنی فوج لیکر آ گئے تھے اس لئے اشعث بن قیس نے انکو درمیان میں ڈالکر حضرت مہاجر سے پناہ طلب کی، یہ پناہ نو آدمیوں کے لئے طلب کی گئی تھی لیکن اشعث کچھ ایسا بدحواس تھا کہ جب اُس نے ان آدمیوں کے ناموں کی فہرست پیش کی تو اس میں خود اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ اس بنا پر قلعہ کے اُن نو آدمیوں کو جن کے نام درج فہرست تھے امن دیدیا گیا۔ اور اشعث گرفتار کرکے مدینہ بھیجدیا گیا یہاں حضرت ابوبکر اور اشعث میں طویل گفتگو ہوئی جس میں اشعث نے دوبارہ مسلمان ہونے اور اسلام پر ثابت قدم رہنے کا اقرار واعتراف کیا اور حضرت ابوبکر صدیق نے معاف کردیا۔ اشعث بن قیس جب آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تو انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق کی بہن ام فروہ سے نکاح کرنے کی درخواست کی تھی لیکن اس وقت نکاح نہیں ہو سکا تھا۔ اب ارتداد سے تائب ہونے کے بعد انہوں پھر اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا تو حضرت ابوبکر نے یہ درخواست منظور فرمالی۔ اور بہن کا نکاح ان سے کردیا۔ اس کے بعد ان کا قیام مع متعلقین کے مدینہ میں ہی رہا اور عراق و شام کی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے [1] کندہ وحضرموت کی یہ جنگ حروبِ ارتداد و بغاوت کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس پر ان کا خاتمہ ہو گیا اور پورا عرب اسلام کے علم کے نیچے آ گیا۔

ان جنگوں میں بہت سے لوگ باندی غلام بھی بنائے گئے تھے لیکن حضرت عمر فاروق رضؓ نے فدیے کر ان سب کو آزاد کردیا اور فرمایا "یہ بات عرب کیلئے بہت بری ہے کہ ان میں سے کوئی کسی کا مملوک ہو" عہدِ اسلام میں جو لوگ باندی غلام بنائے گئے تھے حضرت عمرؓ نے صرف انہیں کے ساتھ نہیں بلکہ عہدِ جاہلیت کے باندی غلاموں کو بھی آزاد کردیا [2]

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۶۶ - [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲

حروبِ ارتداد و بغاوت پر ایک نظر

حضرت ابوبکر صدیق کے مسند آرائے خلافت ہوتے ہی پورے عرب میں ارتداد و بغاوت کا طوفان جب زور شور سے اٹھا تھا تو تمہیں یاد ہوگا۔ اس وقت مدینہ کی حالت کیا تھی؟ حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبانی تم سن آئے ہو کہ مدینہ میں جو مسلمان تھے انکی حالت اس بکری کی مانند تھی جو سخت سرد رات میں بارش میں بھیگی کھڑی ہو۔

اسلام دشمنی اور دینِ محمدی کی مخالفت کی ایک ہمہ گیر آگ تھی جس کے شعلے شمال میں حدودِ شام اور الجزیرۃ تک جنوب میں بحرِ ہند کے کناروں تک، مشرق میں عراق عرب اور خلیج فارس تک اور مغرب میں بحرِ احمر کے سواحل اور تنگنائے باب المندب تک پھیلے ہوئے تھے لیکن دنیا نے دیکھا کہ ایک سال سے بھی کم مدت میں مجاہدین اسلام نے کس طرح تعداد، سازو سامان اور اسلحہ ہر اعتبار سے اقلیت میں ہونے کے باوجود شر و فساد کی ان تمام طاقتوں کو فنا کرکے دینِ قیم کی فتح وظفر کا پرچم لہرایا اور پورے جزیرۃ العرب کو اسلام کے جھنڈے کے نیچے لاکر کھڑا کردیا۔ یہ واقعہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے کہ اسی سے انسانی تہذیب ومعاشرت، کلچر اور فکر ونظر میں وہ عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا جس کا داعی اسلام تھا۔ ورنہ اگر خدانخواستہ اسلام خود اپنے وطن میں گھٹ کر رہ جاتا تو باہر کی دنیا پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اس انقلاب کا ہیرو اور لیڈر کون ہے؟ وہی ابوبکر صدیق جن کی رقتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ حضورِ پر نور کی جگہ نماز کی امامت کو کھڑے ہوئے تو آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی لیکن آج یہی وہ رقیق القلب انسان ہے جو خون کی روشنائی سے اسلام کی عظمت وحقانیت کی دستاویز مرتب کر رہا ہے، اشدت ورقت۔ قہر ومہر اور رحم وتشدد کا یہ لطیف امتزاج ایک انسانِ کامل جس کی سیاست سرتاپا سیاستِ محمدی ہو اس کے سوا اور کس میں ہو سکتا تھا رضی اللہ عنہ۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲

اِس فتنہ کا استیصال جس تیزی اور قوت کیساتھ ہوا ہے اس پر مستشرقین کو سخت حیرت ہے۔ چنانچہ کیتانی کا خیال ہے کہ ان تمام جنگوں سے فراغت ایک سال میں نہیں بلکہ دو سال میں ہوئی ہوگی [1] لیکن درحقیقت یہ صرف خیال ہی خیال ہے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۲ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکر نے شام و عراق کی مہم شروع کر دی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اندرونِ عرب استحکام و استقلال حاصل کئے بغیر وہ کسی اور طرف توجہ کرتے۔

اصل یہ ہے کہ حروبِ ارتداد کا ایک طویل سلسلہ وسیع و عریض محاذِ جنگ اور عرب قبائل کا تمردوسرکشی ان سب چیزوں کی وجہ سے کیتانی اور اس کے ہم خیال مستشرقین کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس محاذِ جنگ کا قطعی فیصلہ ایک برس کی قلیل مدت میں کیونکر ہوگیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فتوحات عراق و شام کا سلسلہ بھی تو جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کافی دراز و وسیع ہے اور پھر یہاں تو مقابلہ رومی اور ایرانی اس وقت کی دو عظیم الشان سلطنتوں سے تھا۔ پس اگر حروبِ ارتداد کی انجام دہی میں دو برس لگے تو اس حساب سے عراق و شام کی فتوحات میں بھی کم از کم دو ہی برس لگنے چاہئیں۔

حالانکہ حضرت ابوبکر کی مدتِ خلافت ہی کل سوا دو برس ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بالکل بعید از قیاس بات ہے کہ حروبِ ارتداد کے ساتھ ساتھ فتوحاتِ عراق و شام کی مہم بھی جاری ہو۔

اِس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پروفیسر فلپ ہٹی کی رائے میں ان تمام اندرونی لڑائیوں کا خاتمہ صرف چھ مہینہ کی قلیل مدت میں ہی ہوگیا تھا [3]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۱۱۰ جدید ایڈیشن [2] ایک مشہور اطالوی مستشرق جس کی کتاب ANNALS OF ISLAN اطالوی زبان میں ہے۔ [3] دیکھو ہسٹری آف دی ارابس ایڈیشن ۱۹۴۹ء ص ۱۴۱

فتوحات

تیسری صدی عیسوی میں عرب کے شمال میں بازنطینی سلطنت قائم تھی جو شام پر قابض تھی اور اس کے مشرقی سرحد پر جو عراق سے ملتی تھی ایرانی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ صحرائے شام ان دونوں کے درمیان حدفاصل تھا۔ دونوں حکومتیں آپس میں ایک دوسرے کی رقیب تھیں اور ان میں آئے دن جنگ رہتی تھی۔ عراق اور شام ان دونوں ملکوں کی سرحدیں چونکہ عرب سے ملتی تھیں اس لئے عرب کے خانہ بدوش اور بدو قبائل ان ملکوں میں گھس کر لوٹ مار مچاتے رہتے تھے جس کے باعث دونوں سلطنتوں کا ناک میں دم تھا اس بنا پر ان دونوں نے تحقق مندی یہ کی بفر اسٹیٹ (BUFFER STATE) کے طور پر عربوں کو اپنے اپنے ملک کی سرحدوں پر آباد کر کے ان کی اپنی باقاعدہ ریاستیں قائم کر دیں تاکہ اسطرح وہ عربوں کی لوٹ مار سے محفوظ رہیں اور ساتھ ہی جب ایرانی اور بازنطینی حکومتوں میں جنگ ہو تو ہر ایک کی دست پروردہ عرب حکومت اس کی مدد کر سکے ساسانی حکومت کے ماتحت جو عرب حکومت قائم ہوئی۔ وہ حکومت حیرہ یا لخمی حکومت کہلاتی ہے اور شام کی سرحد پر قیصر روم کے زیر سایہ جو عرب حکومت بنی اس کا نام غسانہ ہے۔

حکومت حیرہ کا پہلا بادشاہ مالک بن فہم ازدی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا جذیمۃ الابرش تخت نشین ہوا۔ یہ جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ عربی تاریخ و ادب میں اس سے متعلق بہت سی کہاوتیں اور روایتیں مشہور ہیں۔ جذیمہ زبا نامی ایک عورت کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجہ عمرو بن عدی اس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے زبا سے اپنے ماموں کا انتقام لیا اور حیرہ کو جو کوفہ سے متصل ہے۔ اپنا دارالسلطنت بنایا اور

عراق کا بادشاہ کہلایا۔ لیکن اسی زمانہ میں ایران میں اردشیر بن بابک نے ایک وسیع سلطنت قائم کی اور عمرو بن معدی کو اپنا باج گزار بنالیا۔ یہ صورتِ حال اس خاندان کے آخری بادشاہ منذر کے زمانہ تک قائم رہی جس کا خاتمہ ۶۳۲ء میں ہوا۔

شاہ پور بن اردشیر نے حجاز اور یمن کو بھی باج گزار بنالیا۔ اور امراء القیس کندی کو ان صوبوں کا گورنر مقرر کیا۔

لیکن چونکہ اوّل تو محکوم رہنا عرب کی فطرت کے خلاف تھا۔ اور پھر ساسانی حکومت کا ان عربوں کیساتھ معاملہ بھی تحقیر و تذلیل کا تھا۔ اس لئے عربوں کو جب کبھی موقع ملتا تھا ساسانی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ چنانچہ سابور ذی الاکتاف جب ایران کے تخت پر بیٹھا تو تمام عرب میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور عراق کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ سابور اسوقت کم سن تھا۔ بڑے ہوکر اس نے عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ مقام ہجر میں پہنچکر سخت خوں ریزی کی اور جو عرب گرفتار ہوکر آتے تھے ان کے شانے اکھڑوا دیتا تھا۔ اِسی سے اس کا لقب ذوالاکتاف ہوگیا [1]

ایران میں مزدک کے زیر اثر بے حیائی اور بے شرمی عام ہوگئی تھی۔ انہیں مزدکی اثرات کا نتیجہ تھا کہ خسرو پرویز نے حیرہ کے بادشاہ نعمان سوم ابوقابوس سے اس کی خاندان کی حسین عورتوں کا مطالبہ کیا اور جب نعمان نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا تو اس کو مدائن بلاکر قید میں ڈلوادیا۔ جہاں طاعون سے اس کا انتقال ہوگیا۔ نعمان نے اپنے بیش قیمت اسلحہ بنوبکر کے ایک شخص ہانی بن مسعود کے پاس بطور امانت رکھدیئے تھے۔ نعمان کی گرفتاری کے بعد خسرو پرویز نے حیرہ کا فرماں روا بنو طے کے ایک شخص ایاس بن قبیصہ کو بنادیا۔ خسرو پرویز کے حکم سے ایاس نے ہانی نعمان کی اس امانت کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ہانی نے امانت میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا تو کسرای کو سخت غصہ آیا اور اس نے ذی قار نامی ایک مقام پر بنو بکر کا خاتمہ کر دینے کی غرض سے ایک لشکر جرار بھیجا بنوبکر اپنی ضد پر قائم تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے زور کا معرکہ ہوا اور ایرانیوں کو شکستِ فاش ہوئی

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸ [2] اس واقعہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

آنحضرت صلعم ان دِنوں مدینہ میں تشریف رکھتے تھے آپ کو ایرانیوں کی شکست کا علم ہوا تو فرمایا۔

الیوم انتصف العرب من العجم [1] — آج عرب نے عجم سے اپنا بدلہ لے لیا۔

تاریخ عرب میں "یوم ذی قار" کی بڑی اہمیت ہے۔ شعراء نے بڑے فخر اور جوش کے ساتھ قصیدے لکھے ہیں۔

سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلعم نے جہاں اوروں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تھے ایک خط شاہِ ایران کے نام بھی بھیجا تھا۔ لیکن شاہ ایران نے اس نامۂ مبارک کے ساتھ بڑی بے ادبی اور گستاخی کا معاملہ کیا اسے پڑھے بغیر ہی چاک کر دیا اور نامہ بر کو دربار سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ وہ آنحضرت صلعم کو گرفتار کر کے ایران کے پایۂ تخت مدائن روانہ کر دے۔ آنحضرت صلعم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔

هلك كسرای ولا كسرای بعدهٗ — کسرٰی ہلاک ہوگیا۔ اور اس کے بعد کوئی کسرٰی نہیں ہوگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شیرویہ نے اپنے باپ خسرو پرویز کو قتل کر دیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر باذان خود مسلمان ہوگیا۔ [2]

اس کے علاوہ تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے فوراً بعد ہی ایرانی حکومت کے اشارہ پر سجاح مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے ایک لشکر جرار کیساتھ آئی تھی۔

ان سب واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور ایران کے تعلقات بہت پرانے تھے اور ایرانی ہمیشہ عربوں کو دبا کر رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اور دنیا کی عام شہنشاہیتوں کی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے خود عربوں کے ہی ایک قبیلہ مثلاً بنو عبدالقیس کو دوسرے قبیلہ مثلاً بنو بکر کے خلاف استعمال کرتے تھے جس کا اثر یہ تھا کہ عربوں میں قومی وحدت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸ [2] اس واقعہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

ایرانی حکومت کو اسلام سے جو خاص پرخاش تھی اس کی وجہ بھی یہی تھی یہ لوگ سمجھتے تھے کہ اسلام سے وابستہ ہو کر عرب ایک منظم اور مضبوط طاقت بن رہے ہیں اور یہ طاقت انکی شہنشاہیت کیلئے ایک کھلا چیلنج ہے۔ اس بنا پر جزیرہ نمائے عرب کی مشرقی سرحد اس وقت تک محفوظ ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک کہ عراق کے عربوں کو ایران کی شہنشاہیت کے جوئے سے آزاد نہ کرا لیا جاتا اور ظاہر ہے یہ مقصد ایران کے ساتھ جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

"سرحد پر جو مسلمان رہتے تھے۔ عراق اور شام کے لوگ جب ان سے متصادم ہوئے تو قیصر روم اور کسرای ایران دونوں نے اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں کی مدد کی اس بنا پر جنگ کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور اسلام کو مشرق اور مغرب کی "طاقتور حکومتوں سے مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا" [1]

ایک طرف ایران کے ساتھ عرب کے یہ تعلقات تھے۔ اور دوسری جانب شام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ شروع میں بنو قضاعہ کے چند قبیلے وہاں جا بسے تھے وہاں رومیوں کی حکومت تھی۔ انہوں نے انہیں لوگوں میں سے ایک سردار کو ان کا حاکم مقرر کر دیا اور غرض وہی تھی کہ ایک طرف وہ خانہ بدوش عرب قبائل کی لوٹ مار سے محفوظ رہیں اور دوسری جانب ایران اور روم کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ کا کام دیں اور ان سرداروں کو ملوک کہا جاتا تھا سدِ مآرب کے ٹوٹنے سے قبل غسانی قبیلہ یمن سے ہجرت کر کے یہاں پہونچا اور آباد ہو گیا۔ غسانیوں [2] نے کچھ دنوں بعد اس درجہ طاقت و قوت حاصل کر لی کہ یہ بنو قضاعہ پر غالب آگئے اور اب رومیوں نے ان کو ہی ملوک تسلیم کر لیا۔ ان کی مدتِ حکومت کے بارہ میں اختلاف ہے۔ زیادہ صحیح وہ ہے کہ

---

[1] The Khilafat, Its Rise, Decline And Fall Page 46.

[2] یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بنو غسان عمرو بن عامر المزیقیہ کی اولاد میں تھے۔ عمرو بن عامر کے ایک بیٹے کا نام جفنہ تھا۔ اس کی نسبت سے یہ لوگ آل جفنہ کہلاتے تھے۔ غسان دراصل ایک چشمہ کا نام تھا جس پر یہ لوگ ایک عرصہ تک مقیم رہے تھے۔ اس تقریب سے ان کا نام آل غسان یا بنو غسان پڑ گیا۔

جو ابو الفدا نے لکھا ہے یعنی چار سو برس۔ کیونکہ غسانی دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں شام پہونچے ہیں۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ جبلہ بن الایہم تھا۔ جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پہلے مسلمان ہوا۔ اور پھر مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ جرجی زیدان کے ناول فتاۃ غسان" میں اسی جبلہ کا تذکرہ ہے۔

عراق میں ملوک حیرہ کا جو حال تھا۔ وہ ہی ان غسانہ کا تھا، کہنے کو خود مختار اور صاحبِ حکومت تھے لیکن درحقیقت رومیوں کی باج گزاری کا حلقہ ان کے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ اور رومی حکومت ان کے ساتھ سخت تحقیر و تذلیل کا معاملہ کرتی تھی جس کا اعتراف سر ولیم میور جیسے مصنف تک نے کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"شام کے لوگ بازنطینی حکومت کے ماتحت طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے تھے اختلافِ مذہب کی بنا پر ان کو سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ بھاری بھاری ٹیکس ان سے وصول کئے جاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر جب مسلمان عربوں نے شام پر حملہ کیا تو یہ شامی عرب صرف تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے کیونکہ ان کو عرب حملہ آوروں سے جو زیادہ نرم برتاؤ کرتے تھے اور جن میں زیادہ رواداری اور رحمدلی تھی۔ بہت کچھ توقعات تھیں [1]

مشہور جرمن مصنف وان کریمر (Von Kramen) نے اسی حقیقت کو اور زیادہ صاف لفظوں میں کہا ہے۔

"جو عرب عرصۂ دراز سے شام اور عراق میں آباد تھے چونکہ یہ عرب مسلمانوں کے ہم نسل ہم قوم اور ہم زبان تھے۔ اس لئے انہوں نے حملہ آور عربوں کی مدد صرف چھپے چوری نہیں بلکہ علی الاعلان کی۔ ان عراقی اور شامی عربوں نے صرف جاسوسی کی خدمات انجام نہیں دیں بلکہ بسا اوقات میدانِ جنگ میں بھی ان کا ساتھ دیا۔" [2]

---

[1] The. caliphate its Rise, Decline And fall. P.65

[2] The orient Under The Caliphs: Translatoon By Prof Khuda Bahsh P: 92,

جب اسلام کا غلغلہ بلند ہوا اور اس کے ذریعہ عربوں میں قومی تنظیم پیدا ہوئی اور انھوں نے عظیم سیاسی طاقت حاصل کر لی تو حکومت ایران کی طرح بیزنطینی حکومت کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوا اور اس خطرہ سے محفوظ رہنے کیلئے اس نے انہیں عربوں کو استعمال کیا جو حدود شام میں آباد تھے چنانچہ ۶ھ میں جب آنحضرت ؐ نے دعوتِ اسلام کا خط قیصرِ روم ہرقل کے پاس حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بھیجا اور وہ واپس آتے ہوئے مقام جذام میں پہونچے تو انہیں شامی عربوں نے حضرت دحیہ کلبی پر حملہ کر دیا اور ان کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ اسی طرح جب آنحضرت ؐ نے بصریٰ کے حاکم کو ایک خط لکھا اور حارث بن عمیر اس کو لیکر گئے تو شرحبیل بن عمرو جو شام کے سرحدی علاقہ کا ایک رئیس حکمران اور قیصر کے ماتحت تھا اس نے حضرت حارث ؓ کو قتل کر دیا اس کا انتقام لینے کیلئے آنحضرت ؐ نے تین ہزار فوج شام روانہ کی اور غزوۂ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت زید بن حارثہ ؓ جعفر طیار ؓ اور عبداللہ بن رواحہ ؓ جو اکابر صحابہ میں سے تھے اسی غزوہ میں شہید ہوئے تھے۔ اس سے رومیوں کا حوصلہ بڑھا اور وہ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے آں حضرت ؐ کو جب یہ خبریں پہونچیں تو آپ بہ نفس نفیس ایک لشکر جرار لیکر مقام تبوک کیطرف بڑھے اور اگرچہ اس وقت جنگ نہیں ہوئی لیکن مسلمانوں کی روز افزوں طاقت رومیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور وہ برابر کوئی نہ کوئی شورش چھوڑتے ہی رہتے تھے۔ تم پڑھ آئے ہو کہ وفات سے چند روز پہلے آنحضرت ؐ نے حضرت اسامہ ؓ کے ماتحت جو لشکر بھیجا تھا وہ اسی حفظ ماتقدم کیلئے بھیجا تھا اس لشکر کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی ہزار مشکلوں کے باوجود پہلا کام یہی کیا کہ اس لشکر کو حدود شام کی طرف روانہ کیا، ولیم میور کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ کا یہ عمل انتہائی سیاسی دانشمندی پر مبنی تھا کیونکہ اس نے اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے دل پر اسلام کی سیاسی طاقت و قوت کی دھاک بٹھا دی [1]

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے واضح ہوا ہوگا کہ مسلمان درحقیقت اس وقت ایران اور

[1] The caliPhate P: 42

روم دو طاقتور دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو اسلام کیلئے مستقل خطرہ ہونے کے علاوہ خود عربی قومیت کے اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے اس بنا پر جب تک ان دونوں حکومتوں کی سرکوبی نہ کی جاتی نہ اسلام کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع مل سکتا تھا نہ عربی قومیت مستحکم اور مضبوط ہو سکتی تھی اور نہ عراق اور شام کے عرب قبائل کو ان دونوں حکومتوں کی غلامی اور اُن کے حقارت آمیز برتاؤ سے نجات مل سکتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے دو محمد ؐ نے جس پیمانہ پر لشکر شام کی طرف روانہ کیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ عرب قبائل میں امن اپنی سرحدوں کو وسیع کیئے بغیر قائم ہی نہیں کیا جا سکتا تھا [1]

ان بیانات سے ان یورپین مصنفین کی بھی تردید ہوتی ہے جو عراق و شام پر اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ عرب طبعاً جنگ جو تھے اور حروبِ ارتداد سے فارغ ہونے کے بعد اندیشہ تھا کہ پھر کہیں اور کسی طرف سے بغاوت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے اس لئے حضرت ابوبکر نے ان کو مشغول رکھنے کیلئے ان کا رخ ان ملکوں کی طرف پھیر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ اقدام صرف اسی غرض سے تھا تو اس میں کوئی جان نہ تھی اور اس صورت میں مسلمان ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں سے بیک وقت ٹکرا سکتے۔ انصاف پسند یورپین مصنفین نے خود اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ فتوحات کسی دنیوی لالچ اور طمع کا نتیجہ نہیں بلکہ اس اسپرٹ، بے خوفی اور بے جگری اور اس ڈسپلن کا نتیجہ تھیں جو اسلام نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا وان کریمر لکھتا ہے۔

ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ مدینہ سے جو معمولی سی فوجیں روانہ کی جاتی تھیں انہوں نے کس طرح بازنطینی اور ایرانی ہمسایہ شہنشاہیتوں کے مقابلہ میں عجیب و غریب کامیابیاں حاصل کیں، لیکن ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اسلام نے پہلے زمانہ کے غیر منظم لوگوں میں ایک غیر مشروط اور مطلق اطاعت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا صرف یہی جذبہ تھا جس نے عرب مسلمانوں کو یونانی اور ایرانی خود غرضیوں کے مقابلہ

[2] جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

میں سوگنا زیادہ برتر بنا دیا تھا [1]

امریکہ کا مشہور فاضل پروفیسر فلپ ہٹی لکھتا ہے۔

درحقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات گویا مشرق قریب کی اپنے دیرینہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اسلام کے جذبہ اور جوش کے ماتحت مشرق بیدار ہوگیا تھا اور اب وہ صدیوں کے مغربی تسلط و استیلا کے بعد پھر بھی انفرادیت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا [2]

غرضیکہ یہ اسباب تھے جن کے باعث ارتداد و بغاوت کا سرزمین حجاز و یمن سے خاتمہ کرنے کے بعد ہی فوراً حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے عراق و شام کی طرف توجہ کی۔

عراق پر لشکر کشی

مسلمان مورخین عراق کو دو حصّوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ عراق عرب اور عراق عجم۔ عراق عرب اس علاقہ کا نام ہے جو عرب سے متصل ہے۔ قرون وسطیٰ میں اس کا دارالسلطنت مدائن تھا بعد میں بغداد ہوا۔ کوفہ بصرہ اور واسط اس علاقہ کے مشہور شہر ہیں اس کے حدود اربعہ یہ ہیں۔ شمال میں صوبۂ جزیرہ۔ جنوب میں خلیج فارس۔ جنوب مشرق میں خوزستان۔ مشرق میں عراق عجم اور مغرب میں صحرائے شام۔

اس وقت ایران میں جو حکومت قائم تھی وہ ساسانی خاندان کی تھی جس کا بانی اردشیر ابن بابک تھا۔ جس نے ملک میں طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے اسے ایک وحدت (UNIT) بنا دیا تھا۔ یہ واقعہ ۲۲۶ء کا ہے ساتھ ہی اس نے عراق اور اس کے ہمسایہ عرب شہروں پر قبضہ کر لیا اس کا لقب شہنشاہ تھا۔ اردشیر کے بعد حکومت ایران دست بدست اس کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی۔ نوشیرواں جو اپنے عدل و انصاف کیلئے ضرب المثل ہے اور جس کے عہد میں آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اسی خاندان کا بادشاہ اس کے بعد ہرمز اس کا

[1] The orient under The caliphs P. 92

[2] "History of Th Arabs" 1949 Edition, P 143

جانشین ہوا۔ اور ہرمز کے بعد خسرو پرویز تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی شہنشاہ ایران ہے جس کے نام آنحضرتؐ نے خط بھیجا تھا اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس نے مکتوب گرامی کیساتھ گستاخی کی تھی اس کا ادبار اس پر ایسا پڑا کہ اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ شیرویہ ڈیڑھ برس کے قریب بادشاہ رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اردشیر تاج و تخت کا مالک ہوا۔ لیکن چونکہ یہ کمسن تھا اس لیے ایک سردار فوج نے اس کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن چالیس روز کے بعد یہ بھی قتل کر دیا گیا۔ اور اب شیرویہ کی بہن بوران تخت و تاج ایران کی مالک ہوئی اس کے بعد ملک میں اختلال پیدا ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کا آخری فرماں روا یزدگرد تخت نشین ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عراق پر پیش قدمی اسی یزدگرد کے عہد حکومت میں کی ہے۔

فوج کشی کی ابتداء عراق کی مہم کا آغاز اس طرح ہوا کہ مثنیٰ بن حارثۃ الشیبانیؓ ایک صحابی تھے جو قبیلہ بنو بکر کے ایک سردار تھے۔ یہ قبیلہ بحرین میں رہتا تھا اور جب عام ارتداد کی ہوا چل رہی تھی تو یہ بھی مرتد ہوگیا تھا لیکن حضرت مثنیٰ چند ساتھیوں کیساتھ اسلام پر ثابت قدم تھا چنانچہ علاء بن الحضرمی جو معرکہ بحرین کے ہیرو ہیں انہوں نے مرتدین بحرین کے مقابلہ میں جہاں دوسرے مقامی مسلمانوں سے مدد لی۔ مثنیٰ کو بھی لکھا کہ وہ راستوں کی نگرانی کریں [1] مثنیٰ نے اس فرض کو بڑی خوبی کیساتھ انجام دیا اور آٹھ ہزار مسلمانوں کی ایک جمعیت کو اپنے اردگرد جمع کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بحرین کا معرکہ ختم ہوجانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ ان کو ان کی قوم کا سردار بنا دیا جائے تاکہ وہ اہل فارس سے اور اُن کے اطراف واکناف میں جو دشمن ہیں ان کے ساتھ جنگ کر سکیں [2] حضرت ابوبکرؓ نے پہلے ہی ان کے کارناموں کی جب شہرت سنی تھی تو دریافت کیا تھا کہ "یہ مثنیٰ کون ہیں"؟ اس کے جواب میں قیس بن عاصم بن سنان المنقری نے کہا تھا کہ مثنیٰ مشہور معروف النسب اور بہت مضبوط شخص ہیں [3]" اس بنا پر اب مثنیٰ نے خود بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی تو حضرت ابوبکرؓ کو کوئی تامل نہیں ہوا فوراً ان کو پروانۂ امارت لکھ کر عطا فرما دیا [4]۔

[1] طبری ج ۲ ص ۵۲۶ [2] الاصابہ ج ۳ ص ۳۴۱ [3] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۰ [4] بلاذری ص ۲۵۰

حضرت خالدؓ کی نامزدگی

لیکن حضرت مثنیٰؓ کے چلے جانیکے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خیال ہوا کہ عراق کی مہم بہت اہم ہے اکیلے مثنیٰؓ سے سر نہ ہوگی اس لئے حضرت خالدؓ کو جو جنگ یمامہ سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ میں مقیم تھا[1] حکم دیا کہ دس ہزار کا لشکر لیکر عراق کا رخ کریں یہ واقعہ ۱۲ھ کا ہے[2] اور ادھر مثنیٰؓ بن حارثہ اور مذعور بن عدی العجلی کو جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے ان کی قوم ہی ان کی درخواست کے مطابق امیر بنادیا تھا، ہدایات بھیجیں کہ وہ حضرت خالدؓ کے ساتھ ساتھ کوچ اور قیام کریں اور پورے طور پر ان کے مطیع اور فرمانبردار ہوکر رہیں، ان کے علاوہ حضرت عیاضؓ بن غنم جو اس وقت بناج اور حجاز کے درمیان کسی مقام پر تھے ان کو بھی لکھا کہ حضرت خالدؓ کے پاس پہونچیں اور ان کی قیادت میں کام کریں۔

حضرت خالدؓ کو ہدایات

اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو جو ہدایات دی ہیں وہ خلیفۂ رسولؐ کی فوجی مہارت، تدبّر اور غیر معمولی بیدار مغزی کی روشن دلیل ہیں آپ نے فرمایا

(۱) عراق کا کوچ اس کی بلند زمینوں کے ذریعہ کریں۔ مورخین کو اس میں دھوکہ ہوگیا ہے چنانچہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت خالدؓ عراق کی نشیبی زمینوں کے ذریعہ کوچ کرنے کا حکم ہوا تھا اور حضرت عیاضؓ کو بلند زمینوں کے ذریعے، بہر حال ان سب کو جمع ہونا تھا اُبلہ کے مقام پر اور مقصد یہ تھا کہ مختلف فوجیں مختلف راستوں سے جائیں تو ہر طرف کی آبادی پر اثر پڑے۔

(۲) عراق کی سرزمین میں پہونچکر لوگوں کی دلجوئی کریں۔ اللہ کی طرف ان کو دعوت دیں اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو خیر ! ورنہ ان سے جزیہ طلب کریں اگر وہ اس سے بھی انکار کریں تو پھر ان سے جنگ کی جائے۔

(۳) جو شخص ان کے (حضرت خالدؓ) ساتھ جانے کیلئے تیار نہ ہو اس پر جبر نہ کریں۔

(۴) جو لوگ مرتد ہوگئے تھے۔ مگر اب پھر مسلمان ہوگئے ہیں ان سے کسی قسم کی کوئی مدد طلب

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خالدؓ یمامہ ہی میں تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یہ حکم وہیں بھیجا تھا لیکن عراق کی مہم کی اہمیت کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ کی سیاست اور تدبر سے بعید تھا کہ وہ حضرت خالدؓ کو بالا بالا بھیجدیتے اس لیے ہم نے مدینہ والی روایت کو اختیار کیا ہے [2] ص ۲۵۰

نہ کریں۔

(۵) ان کے علاوہ جو مسلمان اُن کے پاس سے گزرے اس کو ہمراہ لے لیں[1]

اُبلہ کی اہمیت

ساتھ ہی حکم دیا تھا کہ اپنی جنگی کاروائیوں کا آغاز اُبلہ[2] سے کریں۔ اس[3] میں مصلحت یہ تھی کہ اُبلہ میں شاہ ایران کا تمام میگزین جمع تھا اور اس بنا پر اس کی حیثیت فوجی چھاؤنی کی تھی اس کے علاوہ آب و ہوا اور کاروبار تجارت کے اعتبار سے نہایت عمدہ جگہ سمجھی جاتی تھی۔ مشہور امام لغت اصمعی کا قول ہے "دنیا میں جنتیں تین ہیں۔ غوطۂ دمشق نہر بلخ اور اُبلہ"[4] اس کے علاوہ یہی وہ بندرگاہ تھی جس کے ذریعہ سے عرب اور ہند و سندھ میں تجارتی تعلقات قائم تھے اور ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں آتا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے اس کو "فرج الہند" کہا تھا۔

عراق میں حضرت خالدؓ نے جو لڑائیاں لڑیں ان کی ترتیب کیا ہے ؟ اس میں روایات اس قدر مختلف ہیں کہ کسی ایک نتیجہ تک پہنچنا بہت دشوار ہے اب ہم جس ترتیب سے واقعات لکھیں گے وہ زیادہ تر طبری اور ابن اثیر کے بیانات پر مبنی ہے اور جزئی ترمیم و تنسیخ کیساتھ ترتیب تقریباً وہی ہے جو ان دونوں بزرگوں کے ہاں ہے۔

جنگِ ذات السلاسل

عام مورخین کا رجحان یہ ہے کہ عراق میں جو پہلی جنگ لڑی گئی ہے وہ غزوۂ حفیر یا ذات السلاسل کے نام سے مشہور ہے۔

حفیر خلیج فارس کے قریب اور کاظمہ کی سرحد پر واقع ہے۔ مدینہ سے بصرہ تک اگر خط مستقیم کھینچا جائے تو حفیر اسی خط پر بصرہ سے پہلے واقع ہوگا۔ اس مقام کا حاکم ہرمز تھا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۴۲ [2] یہ مقام دجلۂ بصرہ کے کنارہ پر خلیج فارس کے کونہ میں جو شہر بصرہ تک آتا ہے واقع ہے اور بصرہ چونکہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں آباد ہوا ہے اس لیے اس سے مقدم ہے۔ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۱ [4] معجم البلدان یاقوت حموی ج ۱ ص ۹۷ مطبوعہ لیبزگ۔

جو حکومت ایران کے ماتحت تھا۔ ایرانیوں میں یہ دستور تھا کہ جو شخص جس مرتبہ اور درجہ کا ہوتا تھا اس کے مطابق اس کی ٹوپی قیمتی ہوتی تھی۔ اسی بنا پر ہرمز چونکہ یہاں کے امراء اور اشرف میں سب سے بڑا تھا اس لیے اس کی ٹوپی ایک لاکھ کی تھی۔ حفیر کے اطراف و جوانب میں سرحدوں پر جو عرب قبائل آباد تھے ہرمز کا معاملہ ان کے ساتھ نہایت برا تھا چنانچہ عرب خباثتِ نفس اور درشت خوئی کی ضرب المثل کے طور پر کہا کرتے تھے۔ وہ شخص ہرمز سے بھی زیادہ خبیث یا اس سے بھی بڑا کافر ہے۔ اس باہمی عناد و منافرت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان عرب قبائل کے بنی اعمام جو جزیرہ نمائے عرب میں مقیم تھے وہ جب کبھی موقع ملتا تھا ہرمز کے علاقوں میں گھس کر غارت گری کرتے تھے اور ہرمز ان کے ساتھ خشکی میں اور اہل ہند کے ساتھ بحر میں جنگ و پیکار کرتا رہتا تھا اس بنا پر حکومتِ ایران ہرمز کو اپنے ملک کے ناکوں کا محافظ و پاسبان سمجھتی تھی۔

حضرت خالدؓ مدینہ سے دس ہزار کی فوج اپنے ساتھ لیکر روانہ ہوئے تھے حدودِ عراق میں داخل ہوئے تو یہاں مثنیٰؓ بن حارثہؓ آٹھ ہزار کی جمعیت کیساتھ ان کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ حضرت خالدؓ نے اب پوری فوج کو تین حصوں میں تقسیم کردیا اور حکم دیا کہ وہ مختلف راستوں سے چل کر حفیر میں جمع ہو جائیں۔ ان تین حصوں میں سے ایک حصہ کے سردار مثنیٰؓ بن حارثہؓ تھے۔ دوسرا حصہ عدی بن حاتم الطائیؓ کی سرکردگی میں تھا۔ اور تیسرا حصہ خود حضرت خالدؓ کے ماتحت تھا۔ یہ تینوں لشکر دو دو اور تین تین دن کے فاصلہ سے روانہ ہوئے۔ سب کے آخر میں حضرت خالدؓ کی روانگی ہوئی۔ لیکن روانگی سے قبل حضرت خالدؓ نے ہرمز کے نام ایک خط روانہ کردیا تھا جس کا مضمون یہ تھا

فاسلم تسلم او اعتقد لنفسك	تو اسلام لے آ تو محفوظ رہے گا ورنہ اپنے اور اپنی
وقومك الذمة واقرار بالجزية	قوم کیلئے ذمی ہونے کا یقین رکھ اور جزیہ کا اقرار کر
والا فلا تلومن الا نفسك فقد	ورنہ پھر تو اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کو ملامت نہیں
جئتك بقوم يحبون الموت كما	کریگا کیونکہ میں تیرے پاس ان لوگوں کو لیکر آیا ہوں جو موت
تحبون الحياة ۔[1]	کو ایسا محبوب رکھتے ہیں جیسا کہ تم زندگی کو محبوب رکھتے ہو

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۵

ادھر ہرمز کو یہ خط ملا اور ادھر اسے مسلمان افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو اس نے شہنشاہِ ایران اردشیر (یزدگرد) کو یہ تمام حالات لکھ کر بھیجے اور حضرت خالدؓ کا مقابلہ کرنے کی غرض سے مقام کواظم میں فوجیں اتار دیں لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اسلامی فوجیں حفیر کی طرف بڑھ رہی ہیں تو بڑی تیزی کیساتھ اپنا لشکر لیکر حفیر پہنچا اور یہاں ایک گھاٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اب حضرت خالدؓ نے کاظمہ کیطرف ہٹ کر اپنے لشکر کو خیمہ فگن ہونے کا حکم دیا تو لوگوں نے کہا کہ دشمن نے پانی پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے پاس پانی کہیں نہیں ہے لیکن خدا کی شان تھوڑی دیر بعد بارش ہوئی اور جل تھل بھر گئے۔

اب ہرمز نے صف بندی اس طرح کی کہ اس کے لشکر کا میمنہ اور میسرہ شاہی خاندان کے دو جوانمرد قباذ اور انوشجان کی سرکردگی میں تھا اور جتنے مردانِ کارزار تھے سب نے اپنے آپکو ایک دوسرے کیساتھ زنجیروں میں جکڑ لیا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ اسی وجہ سے یہ غزوہ ذات السلاسل کہلاتا ہے۔ یہ سب انتظامات ہو چکے تو جنگ شروع ہوئی۔ ہرمز نے آگے بڑھ کر حضرت خالدؓ کو دعوتِ مبارزت دی۔ حضرت خالدؓ فوراً آگے بڑھے اور لڑائی ہونے لگی۔ ہرمز نے قواعدِ جنگ کے بالکل خلاف ازراہ غدر و فریب پہلے سے اپنے شہسواروں کی ایک جماعت کو اس پر آمادہ کر رکھا تھا کہ جب خالدؓ تن تنہا ہرمز کیساتھ مصروفِ جنگ ہوں تو یہ لوگ اچانک کمین گاہ سے نکل کر حضرت خالدؓ پر حملہ کردیں چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ ہرمز کے شہسواروں نے حضرت خالدؓ پر حملہ کرنا چاہا۔ حضرت قعقاع بن عمروؓ نے[1] اچانک اسلامی فوج سے نکل کر اس زور کے ساتھ حملہ کیا کہ شہسواروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اتنے میں حضرت خالدؓ نے پہلو بچا کر ہرمز کی پیشانی پر ضربِ کاری لگائی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ میدانِ جنگ کا یہ رنگ دیکھ کر مسلمانوں نے حملہ کردیا۔ ایرانی شکست کھا کر بھاگے تو مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ فرات کا بڑا پل جہاں بعد میں بصرہ آباد ہوا وہاں پہنچکر دم لیا۔ قباذ اور انوشجان بچا کر نکلے لیکن ایرانیوں کی بڑی تعداد قتل ہوگئی۔

[1] ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ مدینہ سے حضرت خالدؓ کی روانگی کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خیال آیا تو حضرت قعقاعؓ کو بھی پیچھے سے مدد کی غرض سے روانہ کیا۔ کسی نے پوچھا ایک آدمی سے کیا ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا جس فوج کے لشکر میں قعقاع ہوں گے اس کو کبھی شکست نہیں ہوگی

حضرت خالدؓ نے مال غنیمت جس میں ایک ہاتھی اور ہرمز کی بیش قیمت ٹوپی بھی شامل تھی مدینہ بھیجا تو ہاتھی کو مدینہ کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمایا گیا عربوں کیلئے یہ ایک بالکل نیا جانور تھا اس لیے مدینہ کی بڑی بوڑھی عورتیں اور بچے اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور تعجب کرتے تھے لیکن چونکہ یہ جانور شاہی تزک و احتشام کی علامت تھا اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے اس کو مدینہ میں رکھنا پسند نہیں کیا اور زر بن کلیب جو اسے لائے تھے انہی کے ہاتھ اسے واپس کر دیا[1] فرات کے بڑے پل پر پہنچ کر حضرت خالد نے مثنیٰ بن حارثہ کو تو ایرانیوں کے تعاقب میں روانہ کر دیا اور معقل بن مقران المزنی کو اُبلہ روانہ کیا کہ اس کی فتح کی تکمیل و انصرام کا انتظام کریں

اُبلہ سے متعلق ایک بحث اُبلہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس سے متعلق مورخین میں اختلاف یہ ہے کہ یہ خلافت صدیقی میں فتح ہوا ہے یا حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں۔ ابن اثیر کی رائے یہ ہے کہ حضرت عتبہ بن غزوان کے ہاتھوں حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہوا۔ چنانچہ معقل ابن والی مذکورہ بالا روایت نقل کرکے انہوں نے اس کی تردید کی ہے اور اس کو اہل نقل کے علم کے خلاف کہا ہے[2] لیکن بلاذری[3] اور ابو اسماعیل محمد بن عبداللہ الازدیؒ[4] نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت خالدؓ بصرہ پہونچے تو سوید بن قطبۃ الذہلی نے ان سے مل کر کہا کہ اُبلہ کے لوگ تمہارا مقابلہ کرنے کیلئے جمع ہو رہے تھے اور میری رائے میں وہ اس وقت تک باز نہیں آئیں گے جب تک کہ آپ میری مدد نہ کریں اس پر حضرت خالدؓ نے ترکیب یہ چلی کہ سوید سے کہا دن میں کے وقت بصرہ سے چلا جاؤں گا۔ لیکن شب میں واپس ہو کر تمہارے لشکر میں آملوں گا۔ اب اگر صبح کے وقت اہل اُبلہ نے حملہ کیا تو ہم ان سے جنگ کریں گے اس قرارداد کے مطابق حضرت خالدؓ اپنے لشکر کو لیکر بصرہ سے نکل گئے جیسا کہ توقع تھی اہل اُبلہ کو اس سے اطمینان ہوا اور انہوں نے سوید بن قطبہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی لیکن دوسرے دن صبح کے وقت انہوں نے حملہ کیا تو چونکہ حضرت خالدؓ شب میں واپس آکر سوید کے لشکر میں شامل

---

[1] طبری جلد ۲ ص ۵۵۶ و ابن اثیر ج ص ۲۶۲ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳ [3] فتوح البلدان ص ۲۵۰
[4] فتوح الشام ص ۴۹ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ [5] ابن خلکان کے بیان کے مطابق ابلہ بصرہ سے چار فرسنگ یعنی ایک دن کی مسافت پر تھا۔

ہو گئے تھے۔ اس لیے اب اہل اُبلہ نے مسلمانوں کی خلاف توقع اتنی بڑی تعداد دیکھی تو اوسان خطا ہو گئے اور ان پر رعب کی کیفیت طاری ہو گئی حضرت خالدؓ نے اسکو محسوس کر کے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوراً تعمیل کی گئی اور اہل اُبلہ شکست کھا گئے ان میں سے جو بھاگ نہیں سکے وہ یا قتل ہو گئے یا دریا میں غرق ہو کر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ حضرت خالدؓ نے سوید سے فرمایا کہ ہم نے تمہارے نواح کے ایرانیوں کو اتنا پامال کر دیا ہے کہ وہ اب سر نہیں اٹھا سکیں گے۔

بلاذری اور ازدی کی اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابلہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی فتح ہو گیا تھا اور قرین قیاس بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو روانہ کرتے وقت یہی حکم دیا تھا کہ وہ اپنی کارروائیوں کا آغاز اسی مقام سے کریں۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ سب کچھ فتوحات ہو جاتیں لیکن ایک اُبلہ ہی فتح نہ ہوتا درانحالیکہ فوجی اعتبار سے یہ ایک نہایت اہم مقام تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ابلہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو فتح ہوا ہے تو اس کے کیا معنی ہوں گے اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں نے ایک مرتبہ فتح ہو جانے کے بعد پھر بغاوت برپا کر دی ہو اور اس لیے حضرت عمرؓ کے عہد میں وہ دوبارہ فتح کیا گیا ہو[1]۔

مذار کی جنگ

حضرت خالدؓ کے حکم کے مطابق مثنیٰ بن حارثہ ایرانیوں کا تعاقب کر رہے تھے اور مدائن

---

[1] یہاں ایک شبہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بلاذری اور ازدی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُبلہ سوید کے ہاتھوں فتح ہوا لیکن طبری اور ابن اثیر کے ہاں معقل بن مقرن کا نام ملتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل ابلہ کی دراصل جنگ تو ہوئی تھی سوید بن قطبہ ہی کے ساتھ اور انہوں نے ہی اس کو فتح کیا تھا رہے معقل تو غزوہ حفیر کے بعد حضرت خالد نے ابلہ مال غنیمت وغیرہ اکٹھا کرنے اور اس کا انتظام کرنے کیلئے بھیجا تھا اس لیے التباس ہو گیا ہے چنانچہ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔ وارسل معقل بن مقران المزني الى الابلة ليجمع له مالها والسبي فخرج معقل حتى نزل الابلة فجمع الاموال والسبايا۔ ج ۲ ص ۵۵۶۔

تک پہونچنے کا ارادہ رکھتے تھے ۔ لیکن جنگ حفیر کے موقع پر ہرمز نے شہنشاہ ایران کے پاس جو سفارت بھیجی تھی کچھ اس کا اثر کچھ حفیر میں ایرانیوں کی شکست فاش کی خبر ان دونوں وجوہ کی بنا پر حکومت ایران نے حضرت خالدؓ سے جنگ کرنے کیلئے ایک لشکر جرار روانہ کر دیا تھا جس کے مختلف دستوں کی قیادت ایران کے نامور اشراف و امراء کر رہے تھے ۔ حضرت مثنیٰ کو اثنائے راہ میں یہ اطلاع ملی تو ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ۔

ایرانی لشکر نے جس کے ساتھ غزوۂ حفیر کے شکست خوردہ بھی مل گئے تھے ۔ مذار نامی ایک مقام پر جو دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع ہے پڑاؤ ڈالا ۔ حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی تو پیش قدمی کر کے وہاں پہونچے جنگ شروع ہوئی ایرانی فوج کی طرف سے ایران کا نامور بہادر قارن نکلا ۔ ادھر سے معقل بن الاعشیٰ آگے بڑھے ۔ آخر قارن قتل ہو گیا ۔ اسی طرح نوشجان ، عاصم کے ہاتھ سے اور قباذ حضرت عدی بن حاتم کے ہاتھوں قتل ہو گیا ۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ قارن ۔ نوشجان اور قباذ ایران کے اتنے بڑے لوگ تھے کہ پھر آئندہ کسی جنگ میں ایران کا ان جیسا نامور بلند مرتبہ شخص مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں مارا گیا [1] طبری اور ابن اثیر کی روایت ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی مارے گئے ۔ جو بچ گئے تھے وہ کشتیوں میں بیٹھ کر بھاگ گئے اگر دریا درمیان میں حائل نہ ہوتا تو دشمن کی فوج کا ایک سپاہی بھی جان سلامت نہیں لے جا سکتا تھا ۔ اس جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوئے انہیں میں ایک ابوالحسن بصری بھی تھے جو بعد میں مسلمان ہو کر مشہور صاحب معرفت و طریقت ہوئے یہ واقعہ ماہ صفر ۱۲ھ میں پیش آیا [2]

جنگ ولجہ

حضرت خالدؓ اب حیرہ جو خلیج فارس اور مدائن کے وسط میں ہے اس سے قریب تھے اردشیر کو مدار میں ایرانیوں کی شکستِ فاش کی خبر ملی تو اس نے ایک اور لشکر ایران کے مشہور شہسوار اندرزغر کی سرکردگی میں روانہ کیا اور اس لشکر کے پیچھے پیچھے ایک اور لشکر ایران کے نامور شہسوار جادویہ (جس کو عرب مؤرخین جاذویہ لکھتے ہیں) کی قیادت میں بھیجا ۔ اس مرتبہ ایرانیوں نے ایک چال یہ

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳ [2] طبری ج ۲ ص ۵۵۷ ۔

بھی چلی کہ وہ عرب قبائل جو دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقوں میں بادیہ شام تک آباد تھے اور جن میں سے اکثر عیسائیت اختیار کر چکے تھے [1] ان کو بھی حریت اور آزادی کے نام پر اپنے ساتھ ملا لیا اب ان سب نے مقام ولجہ میں جو مقام دجلہ و فرات کے سنگم کے قریب تھا پڑاؤ ڈالا ۔

حضرت خالدؓ کو مذار میں اطلاع ہوئی تو پورے ساز و سامان کیساتھ روانہ ہوئے لیکن مقابلہ آسان نہیں تھا ۔ ایرانیوں اور عرب قبائل دونوں کے لشکر الگ الگ تھے اور ہر ایک لشکر کا سردار اسی قوم سے تھے ۔ لیکن ان سب کا کمانڈر انچیف ایرانی تھا ، جنگ شروع ہوئی ، فریقین نے داد شجاعت و جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ کسی فریق کے متعلق بھی فتح و ظفر کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی ۔ ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں ۔

حتی ظن الفریقان ان الصبر	دونوں فریق نے گمان کیا کہ صبر کا
قد فرغ ۔	پیمانہ لبریز ہو گیا ہے ۔

لیکن حضرت خالدؓ نے مذار سے روانہ ہو کر اثنائے راہ میں ایک تدبیر یہ کی تھی کہ اپنے لشکر کے سرداروں کو اپنے سے الگ کر کے حکم دیا تھا کہ وہ دونوں مختلف راستوں سے میدان جنگ میں ایرانی لشکر کے عقب کی طرف سے پہونچیں ، یہ تدبیر بہت کارگر ہوئی چنانچہ ٹھیک اس وقت جبکہ معرکہ کارزار گرم تھا اور حضرت خالدؓ دشمن پر دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ، ایرانی لشکر کے پیچھے مذکورہ بالا امیر اپنا اپنا دستہ لیکر پہونچ گئے ، اب دشمن کو تاب مقاومت نہیں رہی ، ایرانی بہت بری طرح شکست کھا کر بھاگ پڑے ۔ ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی اندرزغر جان بچا کر نکل بھاگا تھا ۔ لیکن تشنگی کی وجہ سے وہ بھی ہلاک ہو گیا ۔ یہاں بھی حضرت خالدؓ نے کسانوں کیساتھ نرمی اور ملاطفت کا معاملہ کیا ۔ ان سب کو امن دے دیا ۔ اور یہ لوگ ذمی ہو گئے [2] ۔

[1] ان عربوں میں اکثریت بنو بکر بن وائل کی مختلف شاخوں کی تھی [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴ ۔

جنگِ اُلّیس

اس تیسری شکست نے ایرانیوں کو تو بدحواس کیا ہی تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اثر عراق کے عرب قبائل پر ہوا جن کو جزیرہ نمائے عرب کے اپنے بنو اعمام کے ہاتھوں اس قدر شدید شکست اُٹھانی پڑی تھی۔ ان کے غیظ و غضب کی حد نہ رہی اور ہم مذہبی کے رشتہ سے انہیں عرب قبائل میں جو اور عیسائی تھے وہ بھی مشتعل ہو گئے اور اب ان سب نے ایرانیوں سے خط و کتابت کر کے بہت بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ حیرہ اور اُبلہ کے عین وسط میں دریائے فرات کے کنارہ پر ایک مقام اُلّیس ہے یہ سب وہاں جمع ہوئے۔ اردشیر نے بھمن جادویہ کو جو اس وقت ایک مقام قسینا نامی مقیم تھا حکم بھیجا کہ عرب عیسائیوں کی الیس پہونچکر مدد کرے۔ لیکن بھمن خود اردشیر سے بعض معاملات طے کرنے کی غرض سے مدائن چلا گیا اور اپنی طرف سے جابان نامی سردار کو یہ کہہ کر بھیجدیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں تم جنگ میں پیش قدمی نہ کرنا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بھمن مدائن پہونچا تو اس وقت اردشیر بیمار تھا۔ اس لیے بھمن کو وہاں قیام کرنا پڑا۔ ادھر یہ ہوا کہ جابان الیس پہونچکر بھمن کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت خالدؓ پہنچ گئے اور دشمن کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع دیئے بغیر جنگ شروع کر دی۔ مالک بن قیس جو بڑا بہادر تھا آگے بڑھا لیکن حضرت خالدؓ کی تلوار نے اسکو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دشمن کی صفوں پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہاں ایک دل دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا پکا پکایا کھانا چھوڑ کر بھاگے تھے۔ مسلمانوں نے جب کھانے پر قبضہ کیا تو ان کو میدہ کی سفید روٹیاں بھی ملیں جن کو عربی میں "الرقاق البیض" کہتے ہیں۔ مسلمان عرب اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس لئے کسی شخص نے پوچھا "یہ کیا ہے" تو دوسرے نے جواب دیا تم نے "رقیق الجیش" تو سنا ہی ہوگا اسی مناسبت سے ان کو "رقاق البیض" کہتے ہیں۔ الیس سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے امغیشا نامی ایک شہر کا رُخ کیا جو الیس سے

لے ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴-۲۶۵-

قریب تھا اور فرات اور نہر بادقلی کے سنگم پر واقع تھا۔ لیکن یہاں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ اہل شہر نے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو ان پیہم فتوحات کا علم ہوا تو خوش ہو کر فرمایا "عورتیں خالدؓ جیسا کوئی پیدا کرنے سے عاجز ہیں"۔ لے

ابن جریر طبری۔ ابن اثیر اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ جنگ الیس میں فریق ثانی کے ستر ہزار افراد قتل ہوئے تھے۔ سر ولیم میور اسکو مبالغہ کہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اعداد و شمار کا نظم و ضبط اس زمانہ میں ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے اس لیے ممکن ہے کہ پورے ستر ہزار نہ ہوں اور چونکہ ستر کا عدد کثرت کو ظاہر کرنے کیلئے عربی زبان میں عام طور پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں "اِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً" میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے اس بنا پر ستر ہزار سے کثرت ہی مراد ہو۔

حیرہ کی فتح

ان پیہم شکستوں نے اگرچہ ایرانیوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ لیکن الیس کی جنگ میں عراق کے عرب قبائل پیش پیش رہے تھے اور اس وقت ایرانیوں کا بڑا سہارا یہی عرب تھے۔ اس بنا پر فوجی نقطہ نظر سے ضروری تھا کہ حیرہ پر جو عراق عرب کا پایہ تخت تھا قبضہ کیا جائے تاکہ ان عرب قبائل کو قابو میں رکھا جا سکے۔ چنانچہ امغیشا سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ نے حیرہ کا رخ کر دیا۔ حکومت ایران کی طرف سے حیرہ کا گورنر اس وقت آزادیا (آزادبہ) نامی ایک ایرانی تھا۔ اس کو اسلامی فوج کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو لشکر لیکر آگے بڑھا اور ساتھ ہی چونکہ حضرت خالدؓ دریائی راستہ سے آرہے تھے اس بنا پر اس نے اپنے بیٹے کو بھیج کر دریا کا پانی منقطع کرا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشتیاں زمین سے لگ گئیں۔ حضرت خالدؓ اپنا ایک دستہ لیکر کشتیوں سے اترے دریائے فرات کے کنارہ پر آزادیا کے لڑکے سے جنگ کی۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا اور پھر روانہ ہو گئے۔ آزادیا کیلئے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ ایک طرف اردشیر شہنشاہ ایران کے مرنے کی

لے ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴-۲۶۵-

خبر ملی اور دوسری جانب خود اس کا بیٹا اور اس کے ساتھی قتل ہو گئے تھے۔ اس لیے بجز فرار کے اس کیلئے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اہل حیرہ نے یہ رنگ دیکھا تو قلعہ بند ہو بیٹھ گئے۔ حیرہ مختلف اعلیٰ قسم کے محلات کیلئے مشہور تھا جن میں سے خورنق اور سدیر بہت مشہور ہیں اور عربی اشعار میں ان کا ذکر آتا ہے۔ مسلمانوں نے ان سب کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ کو جب ایک دن اور ایک رات گذر گئے تو مسلمان کسی طرح محلات کے اندر گھس گئے۔ اب ان لوگوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ صلح کرلیں۔ چنانچہ ایک بڈھے اور تجربہ کار شخص عبدالمسیح (طبری نے نام عمرو بن عبدالمسیح لکھا ہے) اور ایاس بن قبیصہ کی معرفت صلح کی گفت وشنید ہوئی آخر کار ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح ہوگئی اور یہ شرط طے پائی کہ اہل حیرہ مسلمانوں کیلئے ایرانیوں کے برخلاف جاسوسی کی خدمات انجام دیں گے اور مسلمان ان کا کوئی گرجا ہدم کریں گے اور نہ کوئی محل۔ [1]

حضرت خالدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو جب فتح حیرہ کی خبر بھیجی تو ساتھ ہی کچھ ہدایا بھی بھیجے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان ہدایا کو اہل حیرہ کے جزیہ میں محسوب کرلیا اور حضرت خالدؓ کو لکھا کہ جزیہ کی باقی رقم کی وصولیابی بھی کرلیں اور اس کو بھی اہل حیرہ کیطرف سے ہدایا ہی سمجھ لیں۔ [2]

یہ فتح ربیع الاول ۱۲ھ میں ہوئی۔ [3]

بنت بقیلہ کا افسانہ اس موقع پر طبری، بلاذری، ابن اثیر اور ابن کثیر جیسے مؤرخین تک نے ایک روایت نقل کی ہے جو دراصل ایک غلط افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم اصل روایت نقل کرتے ہیں اور پھر اس پر جرح ونقد کریں گے۔

روایت یہ ہے کہ خریم بن اوس الطائی نے ایک آنحضرت ﷺ سے عرض کیا تھا کہ اگر اللہ آپ کے ہاتھوں حیرہ فتح کرادے تو آپ بنت بقیلہ (حیرہ کے ایک نامور خاندان کی لڑکی) مجھ کو عطا فرمائیے گا۔ چنانچہ اب جب حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے صلح کرنی چاہی تو خریم نے ان سے کہا کہ بنت بقیلہ کو آپ صلح میں داخل نہ کریں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مجھے دے چکے ہیں۔ خریم کے اس دعوی کی تصدیق بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ نے بھی

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۲ - ۲۵۳ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷۔

کردی۔ تو حضرت خالدؓ نے اس عورت کو صلح میں شامل نہیں کیا اور وہ خریم کے حوالہ کردی لیکن چونکہ یہ عورت اس وقت اسی برس کی بڑھیا تھی اس لیے خریم نے اس عورت کے اہل خاندان سے ایک ہزار درہم لیکر وہاں کو واپس کردی۔ جب لوگوں نے خریم سے کہا آپ نے کیا کیا کہ بنت بقیلہ کو اتنے سستے داموں فروخت کردیا تو خریم نے جواب دیا کہ مجھ کو علم ہی نہیں تھا کہ ایک ہزار سے اوپر بھی کوئی عدد اور ہے،، [1]

یہ روایت اصول روایت کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور درایۃً بھی اور اس کے دلائل یہ ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ واقعہ کس شخص کا ہے اس میں ہی اختلاف ہے۔ بلاذری نے اس کو خریم بن اوس جو قبیلہ بنو طے سے تعلق رکھتے تھے ان کا واقعہ بتایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص سے کیا تھا [2] حافظ عمادالدین ابن کثیر نے اس شخص کا نام شویل لکھا ہے اور طبری اور ابن اثیر نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ [3]

(۲) طبری نے اس عورت کا نام کرامت نقل کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر نے اس کا نام لیشماء لکھا ہے۔ [4]

(۳) طبری میں آنحضرت ﷺ نے بنت بقیلہ دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ حیرہ بزور شمشیر (عنوۃً) فتح ہو۔ ھی لک اذا فتحت عنوۃً۔ [5] اور ظاہر ہے کہ یہاں حیرہ جبراً نہیں بلکہ صلحاً فتح ہوا تھا اس لئے نہ خریم یا شویل کو اس کے طلب کرنیکا حق تھا اور نہ حضرت خالدؓ اس مطالبہ کو منظور کرسکتے تھے۔

(۴) روایت میں ہے کہ جب حضرت خالدؓ نے بنت بقیلہ کو شرائط صلح سے مستثنیٰ رکھنے اور اس کو مدعی کے حوالہ کردینے کا فیصلہ کرلیا تو بنت بقیلہ کے رشتہ داروں کو اس پر اعتراض

[1] فتوح البلدان ص ۲۵۳ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۳۴۷ [3] طبری ج ۲ ص ۵۶۹ وابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷ [4] الاصابۃ ج ۳ ص ۳۵۱ ترجمہ محمد بن بشیر وجلد اول ص ۴۲۳ ترجمہ خریم [5] طبری ج ۲ ص ۵۶۹۔

ہوا لیکن بنتِ بقیلہ نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ مجھ کو روکیں نہیں، جانے دیں، اصل بات یہ ہے کہ اس شخص نے مجھ کو جوانی میں دیکھا تھا اور یہ شاید یہ سمجھتا ہے کہ جوانی ہمیشہ رہتی ہے اب مجھ کو دیکھے گا کہ میں اسّی برس کی بڑھیا ہو گئی ہوں تو یہ خود مجھ کو واپس کر دے گا اب سوال یہ ہے کہ اگر اس شخص نے بنتِ بقیلہ کو اس کے عہدِ شباب میں دیکھا تھا اور وہ اس کو دل دے بیٹھا تھا تو یقینی بات ہے کہ یہ خود بھی اس وقت جوان ہوگا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عرصہ میں بنتِ بقیلہ تو شباب اور کہولت کی منزلیں طے کر کے ہشتاد سالہ عجوزہ بن گئی لیکن یہ شخص جوان کا جوان ہی رہا جو اس جذبہ کیساتھ بنتِ بقیلہ کو حضرت خالدؓ سے طلب کرتا ہے اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس شخص کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ اس مدت میں بنتِ بقیلہ بڑھیا بھی ہو چکی ہوگی۔ بنتِ بقیلہ اس کے متعلق یہ کہتی ضرور ہے کہ وہ شباب کو پائیدار اور دوامی سمجھتا ہے۔ لیکن درحقیقت دنیا میں ایسا کوئی احمق ہے بھی!

(۵) اس شخص کو جب لوگوں نے سستے داموں بیچ دینے پر برا بھلا کہا تو اس نے کہا کہ میں ایک ہزار کے بعد بھی کوئی عدد ہے یہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس بات کو بھی آخر کون باور کر سکتا ہے حضرت خالدؓ کی فوج میں کتنے مسلمان تھے؟ مالِ غنیمت کس کثیر مقدار اور تعداد میں مسلمانوں کے ہاتھ پڑ رہا تھا؟ کیا یہ سب چیزیں اس شخص کو معلوم نہیں تھیں اور اگر تھیں تو وہ ان کا شمار کس طرح کرتا تھا۔

حیرہ میں حضرت خالدؓ کا طویل قیام

حضرت خالدؓ کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ مدائن کے فتح کرنیکا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ نے احکام بھیج دیئے تھے کہ جبتک حضرت عیاض ان سے آکر نہ ملجائیں اور میری اجازت نہ ہو اس وقت تک مدائن کی طرف پیش قدمی نہ کیجائے اس لیے حضرت خالدؓ نے حیرہ کو ہیڈ کوارٹر بنالیا اور کم و بیش سال بھر یہاں مقیم رہے اس قیام سے یہ فائدہ ہوا کہ اطراف و جوانب کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں (دہاقین) نے جب یہ دیکھا کہ اسلامی فوج کے قائدِ اعلیٰ کا معاملہ اہلِ حیرہ کے ساتھ بہت ہی روادارانہ اور منصفانہ ہے تو اب ان لوگوں نے بھی خدمت میں حاضر ہو کر صلح کی پیش کش کی اور یہ سب جزیہ ادا کرنیکا

عہد و پیمان کر کے حضرت خالدؓ کے سایۂ عاطفت میں آگئے [۱]۔

اب جنوب میں خلیج فارس شمال میں حیرہ۔ مغرب میں بلادِ عرب اور مشرق میں دجلہ تک کے وسیع علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ حضرت خالدؓ نے ضرار بن الازور۔ ضرار بن الخطاب قعقاع ابن عمرو اور مثنیٰ بن حارثہ وغیرہم نامور بہادروں کی سرکردگی میں ایک ایک دستہ فوج دیکر ان کو ان تمام علاقوں میں منتشر کر دیا۔ تاکہ نظم و ضبط قائم رہے اور کسی کو بغاوت و سرکشی کی جرأت نہ ہو۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے اہلِ ایران عوام و خواص (مرازبہ) کے نام الگ الگ خطوط روانہ کیے جن میں اُن کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ ایرانیوں کا اس وقت حال یہ تھا کہ شاہِ ایران اردشیر کے مرجانے سے طوائف الملوکی کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اسلامی فتوحات نے ان کو ایک مرکز پر لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اس بنا پر انہوں نے انبار اور عین التمر میں جو حیرہ سے قریب ہی تھے فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔

واقعۂ انبار [۲]

حضرت خالدؓ کو علم ہوا تو قعقاع کو حیرہ میں اپنا قائم مقام کر کے دریائے فرات کے کنارے انبار کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ اقرع بن حابس مقدمۃ الجیش کا کام کر رہے تھے۔ ایرانیوں کو اسلامی لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ہوئی تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے قلعہ کے چاروں طرف خندق تھی اس لیے مسلمان قلعوں تک پہنچ نہیں سکتے تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ ایرانی قلعوں کی فصیل سے تیروں کی بارش کر رہے تھے حضرت خالدؓ نے یہ رنگ دیکھا تو اپنے قدر اندازوں کو حکم دیدیا کہ وہ دشمن کی آنکھ کو نشانہ بنا کر تیر چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خدنگ افگنوں نے ایک ہزار آنکھوں کو ٹھکانے لگایا اسی وجہ سے اس جنگ کا نام ذات العیون بھی ہے [۳]۔

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۷۰ - ۵۷۳ [۲] اس کو انبار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں غلہ اور اناج کے انبار لگے رہتے تھے۔ نعمان بن منذر کے خاص گودام ہو اس کے دستکاروں کو غلہ فراہم کیا جاتا تھا، بلاذری ص ۲۵۵۔ انبار میں بڑی آبادی عربوں کی تھی جن کے آباؤ اجداد بخت نصر کے عہد میں یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ عربی لکھنا بھی جانتے تھے۔ طبری ج ۲ ص ۵۷۱ [۳] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۹۔

ایرانی فوج کا قائد شیرزاد اپنے زمانہ کا مشہور عقلمند اور مدبر تھا۔ اس نے تنگ آکر صلح کی پیش کش کی لیکن شرائط صلح ایسے تھے کہ حضرت خالدؓ منظور نہیں کر سکتے تھے اس لیئے اس پیش کش کو رد کر دیا گیا۔ اور اب حکم ہوا کہ مجاہدین کے جتنے کمزور اونٹ ہیں ان کو ذبح کر کے خندق میں پھینک دیا جائے۔ ایسا کرنے سے خندق پر ہو گئی اور مسلمانوں نے اسے عبور کرنا شروع کر دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر شیرزاد پر ایسا خوف طاری ہوا کہ حضرت خالدؓ کی جو شرائط صلح تھیں ان کو بے چون و چرا مان لیا۔ شیرزاد یہاں سے جان سلامت لیکر بہمن جادویہ کے پاس چلا گیا۔ اور انبار پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا[1] شعبی سے روایت ہے کہ۔

لاهل الانبار عهد و عقد[2] اہل انبار کیساتھ عہد و پیمان ہوا تھا۔

فتح عین التمر

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے زبرقان بن بدر کو انبار میں چھوڑا اور خود ایک لشکر لیکر عین التمر کیلئے روانہ ہوئے۔ عین التمر عراق اور بادیۂ شام کے درمیان صحرا کے کنارہ پر واقع ہے تین دن کے سفر کے بعد یہاں پہنچ گئے۔ بہرام چوبین کا بیٹا مہران حکومت ایران کی طرف سے اس جگہ کا حاکم تھا، اس کے پاس ایرانیوں کی ایک بڑی فوج کے علاوہ بنو تمر، تغلب اور بنو ایاد بادیۂ شام کے عرب قبائل کا بھی ایک عظیم لشکر تھا، عرب قبائل کا سردار عقہ ابن ابی عقہ تھا۔ حضرت خالدؓ کے پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو عقہ نے مہران سے کہا کہ ''لوہا لوہے کو کاٹتا ہے'' ہم بھی عرب ہیں اور خالد اور اُن کے ساتھی بھی عرب ہیں اس لئے بس ہم دونوں کو لڑنے دو۔ مہران نے اس تجویز کو بخوشی منظور کر لیا۔ جب اس کے لوگوں نے اس پر ملامت کی تو بولا، میں نے یہ ایک بڑی چال چلی ہے۔ جو تم لوگوں کیلئے بہت مفید ہوگی۔ اگر عقہ۔ خالدؓ کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا تو ہو المراد، ورنہ مسلمان عقہ اور اس کی فوج سے لڑتے لڑتے کمزور ہو جائیں گے۔ اتنے میں ہم تازہ دم ہوں گے ہی مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے اور اس طرح فتح ہماری ہی ہوگی، چنانچہ عقہ اپنی فوج لیکر حضرت خالدؓ کی طرف بڑھا۔ اس میمنہ پر بجیر بن فلان تھا اور میسرہ پر ہذیل۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۹ [2] فتوح البلدان ص ۲۵۵

بن عمران عقہ اور مہران کے درمیان چند میلوں کی مسافت تھی۔ عقہ نے ایک مقام پر پہنچ کر صف بندی شروع کی۔ حضرت خالدؓ بھی اس کے مقابلہ میں اپنی فوج کو ترتیب دینے لگے۔ جب دونوں طرف صفیں آراستہ ہو گئیں تو عقہ نے پیش قدمی کر کے حضرت خالد پر حملہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کرتے رہے۔ آخر حضرت خالدؓ نے پہلو بچا کر عقہ پر اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ عقہ کو اپنے بازؤں میں تھام لیا اور اسے گرفتار کر لیا۔ عقہ کی گرفتاری نے اس کی فوج کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ بدحواس ہو کر بھاگے۔ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ گرفتار ہو گئے۔

مہران کو عقہ کی اس شکست کی خبر ملی تو اپنے لشکر کو لیکر قلعہ سے نکل بھاگا۔ اب حضرت خالدؓ کیلئے میدان صاف تھا۔ چنانچہ جب قلعہ عین التمر میں پہونچے تو جو لوگ یہاں رہ گئے تھے ان سب کو گرفتار کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا عقہ اور اس کے ساتھی جو سخت قسم کے فتنہ پرداز تھے اُن کو قتل کر دیا۔

یہاں یہ ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالدؓ نے ایک گرجا دیکھا جس کا دروازہ اندر سے بند تھا حضرت خالدؓ کے حکم سے جب دروازہ توڑا گیا تو اندر سے چالیس لڑکے ملے جو انجیل پڑھ رہے تھے۔ حضرت خالدؓ نے پوچھا ''تم کون لوگ ہو؟'' انہوں نے کہا ہم یہاں گروی ہیں ''حضرت نے ان کو وہاں سے نکال کر مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ ابو موسیٰ بن نصیر جو اندلس کے مشہور فاتح ہیں اور ابو محمد بن سیرین جو بصرہ کے نامور فقیہ ہیں وہ بھی انہیں لڑکوں میں تھے[1]

معرکۂ دومۃ الجندل

دومۃ الجندل عین التمر سے جنوب مغرب میں تین سو میل کی مسافت پر اس راستہ پر واقع ہے جو حیرہ اور عراق کی طرف جاتا ہے بادیہ اور صحرائے نفود دونوں کے درمیان میں حائل ہے۔ ربیع الاول ۵ھ میں آنحضرت ﷺ کو اطلاع ملی کہ دومۃ الجندل میں دشمنوں کی ایک بڑی فوج مجتمع ہو رہی ہے۔ تو ایک ہزار کی جمعیت لیکر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ان لوگوں کو خبر ہوئی تو بھاگ نکلے اس لیئے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اکیدر بن عبد الملک الکندی ایک عربی سردار تھا۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۷۷۔

جو قیصر کے زیرِ اثر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے مقابلہ کیلئے حضرت خالدؓ کو ماہ شوال ۹ھ میں بھیجا۔ حضرت خالدؓ اس کو گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ یہاں اکیدر مسلمان ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے اور اہلِ دومۃ کیلئے پروانہ امن عطا فرمادیا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد اس نے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور عہد شکنی کر کے مرتد ہو گیا[1]۔

ان وجوہ کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت خالدؓ کو عراق کی طرف روانہ کیا تو عیاض بن غنم کو دومۃ الجندل بھیجا۔ آپ کو توقع تھی کہ دومۃ کی مہم جلد سر ہو جائیگی لیکن کم و بیش ایک سال گزر گیا۔ اور یہ مورچہ فتح نہیں ہوا۔ بنو کلب۔ بہراء اور غسان کے قبائل جو عراق میں حضرت خالدؓ کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگے تھے۔ انہوں نے بھی دومۃ الجندل میں آکر پناہ لے لی تھی۔ تاکہ حضرت خالدؓ کا بدلہ حضرت عیاض سے لیکر اپنے دل کو تسکین دے سکیں۔ اس بنا پر دشمنوں کی جمعیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کی وجہ سے حضرت عیاض کو بڑی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

عین التمر کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ نے مالِ غنیمت کیساتھ مژدۂ فتح ولید بن عقبہ کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ولید بن عقبہ کو مع ساز و سامان کے بطور کمک حضرت عیاض کے پاس بھیج دیا۔ ولید نے صورتِ حال کی نزاکت محسوس کر کے عیاض سے کہا کہ آپ حضرت خالدؓ کی مدد طلب کیجیے۔ ورنہ اس کے بغیر یہ مورچہ فتح نہیں ہوگا۔ عیاض نے فوراً اس مشورہ پر عمل کیا۔ حضرت خالدؓ کو عیاض کا خط ملا تو فوراً ان کو لکھا کہ میں تو خود ہی تمہارے پاس آنے والا تھا اور اس کے بعد یہ رجزیہ اشعار لکھے۔

لَبِّثْ قلیلاً تأتِكَ الحلائبُ یحملن آساداً علیها القاشب
کتائبٌ یتبعها کتائب

کچھ اور انتظار کرو۔ تمہارے پاس اونٹنیاں آ رہی ہیں جن پر شیر سوار ہیں اور ان پر تلواریں ہیں لشکر پر لشکر آگے پیچھے آ رہے ہیں۔

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۶۸ - ۶۹ -

چنانچہ حضرت خالدؓ شام و نفود کے بادیہ و صحرا میں گھوڑا اڑاتے ہوئے دس روز سے بھی کم کی مدت میں تین سو میل کی مسافت طے کر کے دومۃ الجندل کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں بہراء کلب۔ غسان۔ تنوخ اور ضجاعم یہ سب عرب قبائل ان کے مقابلہ میں صف آرا تھے دومۃ الجندل کی ریاست دو شخصوں میں تقسیم تھی۔ ایک اکیدر اور دوسرا جودی بن ربیعہ۔ اکیدر چونکہ حضرت خالدؓ کے پنجۂ شیر افگن سے واقف تھا اس لئے اس کی رائے ہوئی کہ جنگ نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن عرب قبائل اور ان کا سردار جودی اس پر رضامند نہیں ہوئے اس لئے اکیدر نے ان سے جدا ہو کر اپنی راہ لی۔ حضرت خالدؓ کو اس کی خبر ہوئی تو عاصم بن عمرو کو تعاقب میں روانہ کیا۔ عاصم نے اکیدر کو گرفتار کر کے پیش کیا۔ چونکہ باغی اور مرتد تھا اس لئے خالدؓ کے حکم سے قتل کر دیا گیا[1]

اب حضرت خالدؓ نے صف بندی کی۔ جودی عربوں کا ایک دستہ لیکر مقابلہ کیلئے بڑھا۔ اور ایک دستہ عیاض کی طرف بھیجا۔ حضرت خالدؓ اور عیاض نے دومۃ الجندل کو درمیان میں لے لیا تھا۔ جودی حضرت خالدؓ کے مقابلہ میں شکست کھا گیا اور گرفتار ہو گیا۔ اس کے لشکر کے لوگ بدحواس ہو کر قلعہ کیطرف بھاگے۔ لیکن قلعہ سب کو سما نہیں سکتا تھا۔ اس لیے جتنے آدمی اندر آسکتے تھے انہوں نے گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ ایک بڑی تعداد جو قلعہ سے باہر رہ گئی تھی لقمۂ اجل بن گئی۔ کلب کے قیدیوں کو بنو تمیم ان کے حلیف ہونے کی وجہ سے امن دے چکے تھے۔ اس لئے حضرت خالدؓ نے ان کی جان بخشی کر دی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے قلعہ پر حملہ کیا۔ اور اس کو بزورِ شمشیر فتح کیا جودی جو عرب قبائل کا سردار تھا۔ قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی بیٹی سے جو حسن و جمال میں مشہور تھی۔ گرفتار ہو کر آئی تو حضرت خالدؓ نے پہلے اس کو خریدا اور پھر آزاد کر کے نکاح کر لیا[2]

عراق میں بغاوت

حضرت خالدؓ، دومۃ الجندل میں مقیم تھے کہ ایرانیوں اور عراق کے عرب قبائل نے ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ بنو تغلب جن کا سردار عقہ مارا گیا تھا وہ اس میں

[1] الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۰ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۶۹

پیش پیش تھے۔ قعقاع جن کو حضرت خالدؓ حیرہ میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر آئے تھے۔ ان باغیوں سے عہدہ برآمد ہونا تنہا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے حضرت خالدؓ بغاوت کی خبر پاتے ہی دومہ سے روانہ ہو گئے۔ اقرع بن حابس مقدمۃ الجیش پر تھے۔ ان باغی ایرانیوں اور عربوں نے اپنی جمعیت کو کئی محاذوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ ایرانی سردار روزمہر اور روزبہ نے انبار کا رخ کیا تھا اور دوسرے فوجی دستے حصید، خنافس وغیرہ مقامات جو انبار کے قرب و جوار میں تھے۔ ان میں بغاوت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ حضرت خالدؓ نے حیرہ پہونچکر قعقاع کو حصید کے موقع پر متعین کیا۔ جہاں اس وقت روزمہر اور روزبہ فرد کش تھے اور ابولیلیٰ کو خنافس کے محاذ پر روانہ کیا حصید میں جنگ بڑی شدید قسم کی ہوئی۔ لیکن آخر قعقاع غالب آگئے اور روزمہر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا [1] اب رہا روزبہ اس کو عصمۃ بن عبد اللہ الضبی نے ٹھکانہ لگا دیا۔ اور ایرانی شکست کھا گئے۔

یہاں سے بھاگ کر ان لوگوں نے خنافس کے مورچہ پر پاؤں جمائے۔ ایرانی فوج مہبوذان کے ماتحت تھی۔ لیکن مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔ مہبوذان ابولیلیٰ کی خبر آمد سنتے ہی بھاگا اور مُصَیَّخ نامی ایک مقام پر پہونچکر ھذیل بن عمران کے دامن میں پناہ لی۔ حضرت خالدؓ کو ان واقعات کا علم ہوا تو قعقاع۔ ابولیلیٰ۔ اعبد اور عروہ جو مختلف محاذوں پر متعین تھے اُن کو لکھا کہ فلاں شب میں فلاں وقت سب لوگ مصیّخ میں جمع ہو جائیں، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ہذیل پر شبخون مارنے کا حکم ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ کشتیوں کے پشتے بندھ گئے لیکن ہذیل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

دو مسلمانوں کا سہواً قتل مصیّخ کے شبخون میں جو لوگ مارے گئے اُن میں عبدالعزیٰ اور لبید بن حریر بھی تھے یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے۔ اور ان کے پاس حضرت ابوبکرؓ کا تصدیق نامہ بھی تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کیا۔

---

[1] اس موقع پر قعقاع نے جو شعر کہے تھے یاقوت نے معجم البلدان میں ان نقل کیا ہے وہ شعر یہ ہیں۔

الا ابلغا اسماء ان خلیلها — قضی وطرا من روزمهر الاعاجم
غداة صبحنا فی حصید جموعهم — بهندیة تفری فراخ الجماجم

اور حکم دیا کہ اُن کی اولاد کیساتھ حسنِ سلوک برتا جائے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو جس طرح مالک بن نویرہ کے قتل کا مجرم قرار دیا تھا وہ ان دونوں شخصوں کے قتل ناحق کا الزام بھی ان پر لگاتے تھے۔ [1] لیکن حق یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کیلئے سب سے بڑا معقول عذر یہ تھا کہ یہ دونوں شخص مسلمان ہونے کے باوجود دشمن کے کیمپ میں موجود اور ہذیل کے ساتھیوں میں تھے چنانچہ جب اس معاملہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو کی تو حضرت خالدؓ کے خلاف اپنی ناراضگی اور برہمی کا اظہار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے صاف جواب دیا۔

کذالك یلقی من نازل اهل الشرك [2] جو کوئی اہل شرک کیساتھ قیام کرتا ہے اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔

لیکن طبری میں یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان شخصوں کا جب خون بہا ادا کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا۔

اما ان ذالك لیس علیّ (میں خون بہا ادا کرتا ہوں لیکن یہ میرے ذمہ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مقتول اذ نازلا اهل الحرب [3] اہل حرب کے ہاں مقیم اور ان کے مہمان تھے۔

چونکہ بغاوت کا یہ سارا فتنہ پیدا کیا ہوا بنو تغلب کا تھا اور ایرانی جو کچھ کر رہے تھے انہی کے بل بوتے پر کر رہے تھے اور ان کی اسلام دشمنی بہت پرانی اور نہایت شدید تھی اس بنا پر حضرت خالدؓ نے قسم کھائی تھی کہ وہ بنو تغلب کو تہس نہس کئے بغیر دم نہیں لیں گے۔ چنانچہ اب وہ مُصَیَّخ سے فارغ ہو گئے تو قعقاع اور ابولیلیٰ ان دونوں کو دو مختلف راستوں سے روانہ کیا اور ایک رات مقرر کر دی کہ اس میں بنو تغلب پر حملہ کیا جائے۔ ان دونوں کی روانگی کے بعد خود بھی روانہ ہوئے پہلے مقام ثنی میں اور اس کے بعد مقام زمیل میں (جو بنو تغلب کے خاص مرکز تھے) پہونچکر تین طرف سے اس قدر زور کا حملہ کیا کہ بنو تغلب کا کوئی شخص دوسرے دن تک ان کی خبر پہنچانے والا بھی نہیں بچا۔ اس حملہ میں جو عورتیں گرفتار ہوئی تھیں انہیں میں ربیعہ بن بجیر التغلبی کی بیٹی بھی تھی [4]

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲

[2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲

[3] طبری ج ۲ ص ۵۸۱

[4] ان کا نام صہبا اور کنیت اُم حبیب تھی۔

یہ سب مال غنیمت اور گرفتار شدہ عورتیں مدینہ پہونچیں تو حضرت علیؓ نے بنت ربیعہ کو جس کا نام الصہباء اور کنیت ام حبیب تھی خرید لیا اور ان کے بطن سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئے[1]

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے رضاب کا رُخ کیا۔ اس جگہ عقبہ کے بیٹے ہلال نے بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ لیکن ہلال کے ساتھی حضرت خالدؓ کے پہنچنے کی خبر سنتے ہی اس کو چھوڑ کر بھاگ پڑے۔ اسی لیے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

جنگ فراض

فراض۔ عراق اور شام کی سرحد پر دریائے فرات کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ حضرت خالدؓ عراق کی بغاوت کا سر قلم کر دینے کے بعد فراض پہونچے اور دریائے فرات کے کنارے پر خیمہ فگن ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ آیا، وہ بھی یہیں گذار دیا۔ رومیوں نے اسلامی لشکر کو اس حالت میں دیکھا تو ان کے غصہ کی حد نہ رہی۔ اہل ایران کی جو فوجی چھاؤنیاں قرب و جوار میں تھیں اور ان کے علاوہ جو عرب قبائل قیصر کے باج گذار ان سب سے رومیوں نے مدد طلب کی اور اس طرح مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک نہایت عظیم فوج تیار ہو گئی۔ ۱۵ ذی قعدہ ۱۲ھ تک دونوں فوجیں اسی طرح آمنے سامنے پڑی رہیں کہ صرف ایک دریا ان کے درمیان حائل تھا۔ آخر رومیوں نے پہل کی اور دریا پار کر لیا۔ حضرت خالدؓ نے صفیں آراستہ کیں اور جنگ شروع ہو گئی۔ نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن حضرت خالدؓ نے حکم دیا تھا کہ دشمن کی فوج کو منتشر نہ ہونے دیں اور اسے چاروں طرف سے گھیر کر لڑیں، مسلمانوں نے اس پر عمل کیا اور رومیوں۔ ایرانیوں اور عرب قبائل کا بادل دم کے دم میں صاف ہو گیا۔ مورخین کا عام بیان ہے کہ اس معرکہ میں دشمن کی فوج کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے ہماری رائے میں یہاں بھی مراد صرف کثرتِ مقتولین کا بیان مقصود

---

[1] طبری و ابن اثیر و البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۵۲۔ بلاذری نے اس واقعہ کا ذکر فتوح الشام کے زیر عنوان کیا ہے۔ اور بجائے بنتِ ربیعہ کے بنتِ حبیب بن بجیر لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون ربیعۃ بن بجیر کی بیٹی نہیں بلکہ بھتیجی تھیں۔ فتوح البلدان ص ۱۱۷۔

ہے۔ ورنہ ظاہر ہے اس زمانہ میں کسی فریق کیلئے اتنی بڑی فوج کا میدانِ جنگ میں انتظام کرنا ممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور تھا۔

حضرت خالدؓ کا حج

فراض کی جنگ سے ۲۵ ذی القعدہ ۱۲ھ کو فراغت ہوئی تھی اب حج میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ حضرت خالد نے حج کا ارادہ کر لیا دشوار گزار طویل مسافت کو ان چند دنوں میں طے کر کے اس رازداری کے ساتھ مکہ معظمہ آئے اور گئے کہ فراض کی جنگ سے فارغ ہو کر پھر اسی فوج سے آملے، حیرہ میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے اور ان لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ حضرت خالدؓ حج کر آئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق اس سال امیر حج خود حضرت ابوبکرؓ تھے۔ اور دوسری روایت کے مطابق حضرت عمرؓ تھے بہرحال امیر الحج کو بھی ذرا خبر نہ ہوئی کہ ان کے قافلۂ حجاج میں خود خالد بن الولیدؓ بھی ہیں جو شام کی سرحد پر مصروف جنگ تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت خالدؓ کا یہ فعل ان کے کمالِ عزم و ہمت شجاعت و شہامت اور جوانمردی و قوت کی دلیل ہے۔ لیکن چونکہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر محاذ جنگ سے اس طرح چلا جانا ڈسپلن کے خلاف تھا اس لیے حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت خالدؓ کو ایک عتاب نامہ لکھا کہ تم کو اپنی فتوحات پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور سخت تاکید کی کہ آئندہ اس طرح کی کوئی حرکت سرزد نہ ہو[1]

عراق میں حضرت خالدؓ کا قیام محرم ۱۲ھ سے صفر ۱۳ھ تک کم و بیش ایک برس اور دو مہینہ رہا۔ لیکن اس قلیل مدت میں انہوں نے جو فتوحات حاصل کیں وہ جنگ و حرب کی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ ان جنگوں کا دائرہ خلیج فارس سے شام کی سرحد فراض تک وسیع ہے اور پھر جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں بلکہ ایرانی رومی اور عرب قبائل ان تینوں کے متحدہ لشکروں سے جو تعداد میں ساز و سامان اور اسلحہ میں مجاہدین اسلام سے ہر طرح برتر تھے۔ ان تمام معرکوں میں ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے جہاں

---

[1] طبری ج ۱ ص ۲۰۸۴۔

مسلمانوں کو شکست ہوئی ہو۔

اس کے علاوہ اس پر بھی غور کرو کہ اس زمانہ کے عام قاعدہ کے برخلاف حضرت خالدؓ جس شہر یا قصبہ کو فتح کرتے تھے اس کے نظم و ضبط کا باقاعدہ بندوبست بھی کرتے تھے ایک امیر پورے علاقہ کا نگران اور حاکم ہوتا تھا اور اس کے ماتحت ٹیکس وصول کرنے والے دوسرے لوگ ہوتے تھے۔ کسانوں کے ساتھ ہمیشہ غیر معمولی رعایت اور ملاطفت کا معاملہ کیا جاتا تھا اور زمین دار و اور جاگیرداروں کے ظلم سے ان کو نجات دلائی جاتی تھی اس بنا پر حضرت خالدؓ کی حیثیت ایک فاتحِ اعظم کی تھی۔ نہ کہ محض ایک حملہ آور کی۔ ان کی فتح کا مقصد تعمیر تھا نہ کہ تخریب۔

فتوحاتِ شام

شام کی فتوحات سے متعلق مؤرخین کے بیانات بڑے مختلف اور پیچیدہ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلا لشکر کب بھیجا؟ اور وہ لشکر کونسا تھا؟ ان لشکروں کے امراء کون کون تھے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب ایک نہیں ہے۔ طبری میں متعدد روایات ہیں جن سے متعدد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بلاذری کے بیانات بہت بے ترتیب اور اُلجھے ہوئے ہیں جن سے ایک شخص کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ ان میں سے بعض بیانات طبری کی روایتوں کیساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور بعض ان کی بالکل ضد ہیں۔ ابو اسماعیل الازدی اور واقدی کے بیانات کا حال یہی ہے۔ ابن اثیر، ابن خلدون اور عماد الدین ابن کثیر نے زیادہ تر طبری کی روایات کا ہی تتبع کیا ہے۔ لیکن ہم نے ان سب مآخذ کو سامنے رکھ کر واقعات شام کو ایک خاص طرز پر مرتب کیا ہے جس سے واقعات میں تاریخی تسلسل بھی باقی رہتا ہے۔ اور منطقی ترتیب بھی قائم رہتی ہے۔ صفحاتِ آئندہ سے قارئین کو خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

شام کی سرحد پر لشکر کا تعین | مؤرخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ[1] اہلِ ارتداد کے معاملہ سے فارغ ہو گئے تو آپ نے شام کی طرف توجہ کی۔ لیکن ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ تبوک اور موتہ کے واقعات نے ہرقل (قیصر روم) کو ہوشیار کر ہی دیا تھا کہ اس کے بعد ہی حضرت اُسامہ کو مشارف شام میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس صورت حال نے قیصر روم کو جو ایرانیوں پر اپنی فتوحات کے نشہ میں غرق تھا بوکھلا دیا اور اس نے اپنی سرحدوں پر فوجی دستے متعین کرنے شروع کر دیئے چنانچہ ابن عساکر لکھتے ہیں

[1] بلاذری ص ۱۱۲ و تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص ۸۳ –

فبلغ ذالك هرقل وهو بحمص فدعى بطارقته فقال هذا الذی حذرتكم فابيتم ان تقبلوه منی قد صارت العرب تاتی من مسيرة شهر فتغير عليكم ثم تخرج من ساعتها ولم تكلم - قال اخوه نياف فابعث رابطة تكون بالبلقاء فبعث رابطة واستعمل عليهم رجلا من اصحابه فلم يزل مقيما حتی تقدمت البعوث الی الشام فی خلافة ابی بكر و عمر[5]

ہرقل حمص میں تھا جب اس کو (جیش اسامہ کی کامیابی کی) خبر پہنچی تو اس نے اپنے پادریوں کو بلایا اور کہا یہی وہ بات ہے جس سے میں تم کو ڈرایا کرتا تھا۔ لیکن تم اس کو ماننے سے انکار کرتے تھے، دیکھو یہ عرب ایک مہینہ کی مسافت پر آتے ہیں تم پر لوٹ مار مچاتے ہیں اور فوراً ہی زخم کھائے بغیر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہرقل کے بھائی نیاق نے کہا تو آپ بلقا میں ایک دستۂ فوج متعین کر دیجئے۔ چنانچہ ہرقل نے ایسا ہی کیا۔ ایک دستہ متعین کر دیا اور اپنا ایک معتمد ان کا چارج آفیسر بنا دیا۔ یہ دستہ اسوقت تک برابر رہا جبکہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں شام کی طرف لشکر آنے شروع ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے اد ھر جب قیصر روم یہ سب کچھ سرحدی انتظامات کر رہا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس طرف حضرت ابوبکرؓ کو اس کی خبر نہ ہوتی اور آپ اس کے جواب میں اپنی سرحدوں پر کوئی فوجی دستہ حفظِ ماتقدم کے طور پر متعین نہ فرماتے اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے بھی تھی کہ مسلمان جس زمانہ میں باغیوں کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے ان کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے قیصر روم اندرونِ عرب گھس کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا خیال کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے عین اس زمانہ میں جبکہ حروب ارتداد جاری تھیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن سعیدؓ کو جو السابقون الاولون میں سے تھے شام کی سرحد پر ایک دستۂ فوج کا امیر بنا کر بھیجا ۔ چونکہ مؤرخین نے جیسا کہ ہم نے شروع

---

[5] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۴

میں کہا ہے ۔ شام کے واقعات کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا ہے اس لیے وہ عام طور پر خالد بن سعیدؓ کے تقرر کو حروبِ ارتداد کے بعد کا واقعہ لکھتے ہیں جبکہ شام کی طرف باقاعدہ فوجیں روانہ ہونی شروع ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارا قیاس یہی ہے کہ خالدؓ بن سعیدؓ کا تقررِ عام فوجوں کی روانگی سے بہت پہلے دراصل سرحد کی حفاظت کی غرض سے ہوا تھا ۔ چنانچہ ابن حجر ایک روایت نقل کرتے ہیں ۔

ان ابابكر امّرهٔ علی مشارف الشام فی الردة[1]

ابوبکرؓ نے ان کو ارتداد کے دنوں میں شام کی چوکیوں کا امیر مقرر کیا تھا ۔

اسکی تائید طبری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب خالد بن سعیدؓ کو تیماء کیطرف روانہ کیا جو شام کی سرحد پر واقع ہے تو ساتھ ہی ہدایت کی کہ وہاں قرب و جوار کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ مرتد نہیں ہوئے تھے صرف ان کی خدمات قبول کریں اور نیز یہ کہ جب تک خود حضرت ابوبکرؓ کا حکم نہ پہونچے اور وہ لوگ خود جنگ میں پہل نہ کریں اس وقت تک وہ جنگ نہ کریں[2]

اس کے علاوہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو خالد بن سعیدؓ کیطرف سے کچھ تکدر تھا ۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت سے ایک یا دو مہینہ کے بعد جب یہ یمن سے جہاں وہ آنحضرتؐ کیطرف سے متعین تھے ۔ مدینہ واپس آئے تو انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ لیکن جب حضرت علیؓ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ ابوبکرؓ کی خلافت صحیح خلافت ہے نہ کہ تغلب تو وہ چپ ہو گئے ۔ اس تکدر کی وجہ سے حضرت خالد بن سعیدؓ کو مشارف شام کا امیر مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کیا اور خالد بن سعیدؓ کو امارت سے معزول کر دینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے اس مشورہ کو اس صورت میں قبول فرمایا کہ خالدؓ کو امارت سے تو معزول کر دیا لیکن مسلمانوں کے مددگار کی حیثیت سے ان کو شام بھیجدیا ۔

---

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۴۰۶ تذکرۂ خالد بن سعید [2] طبری ج ۲ ص ۵۸۷ ۔

اصل الفاظ یہ ہیں ۔

"وجعلہ ردأ للمسلمین بتیماء"[1] اور ان کو تیما میں مسلمانوں کا مددگار بنادیا ۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟ بہرحال ردأ جس کا انگریزی ٹھیٹ ترجمہ AUXILTARY FORCE ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خالد بن سعیدؓ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف سرحد کی حفاظت اور اس کی نگہداشت کیلئے بھیجے گئے تھے تاکہ اگر قیصر کی طرف سے کوئی حملہ ہو تو اس کی روک تھام کی جاسکے ۔

جب تک عرب میں ارتداد و بغاوت اور اس کے ساتھ جنگ کا ہنگامہ برپا رہا ۔ غالباً قیصر اس خیال میں رہا کہ اسلام اس سے عہدہ برآنہ ہوسکے گا اور وہ خانہ جنگیوں کی اسی آگ میں جل بھن کر بھسم ہوجائیگا ۔ اس کے علاوہ اس کو یہ خیال بھی ہوگا اگر ان حالات میں اس نے خود حملہ کردیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ متحدہ قومیت عرب کی رگِ حمیت میں جوش پیدا ہو اور اس کی وجہ سے پورا عرب باہمی جنگ کو بالائے طاق رکھ کر خود اس کے مقابلہ پر آجائے ۔ بہرحال یہ یا اسی طرح کے کچھ اور اسباب تھے کہ قیصر نے اپنی سرحدوں پر جو دستے متعین کیئے تھے وہ اسی طرح وہاں پڑے رہے اور انہوں نے کوئی حملہ یا جنگی اقدام نہیں کیا ۔

قیصر روم کی جنگی تیاری | لیکن یمن ۔ حضر موت اور عمان کے علاقوں میں مسلمانوں کو پے در پے جو فتوحات حاصل ہورہی تھیں ۔ انہوں نے قیصر کو بدحواس کردیا ۔ اور اب اس نے بہراء، تنوخ، سلیح، غسان، کلب ۔ لخم ۔ اور جذام وغیرہ عرب قبائل جو حدود شام میں آباد اور قیصر کے باج گذار تھے ان سب کو اپنے ساتھ ملاکر اسلام کیخلاف ایک نہایت عظیم الشان فوج جمع کرلی اور بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں شروع کردیں ۔ ادھر مسلمانوں کو حروب ارتداد میں خاطر خواہ کامیابی ہوچکی تھی ۔ یمن اور اس کے آس پاس کے علاقے ان کے قبضہ میں آگئے تھے اور دوسری جانب حیرہ فتح ہوگیا تھا ۔ دومۃ الجندل نے مجاہدین اسلام کیلئے اپنے دروازے کھول دیئے تھے اور اس کی وجہ سے وادی سرحان کے راستے شام میں داخل ہونا آسان ہوگیا تھا ۔ اس لیے اب حضرت ابوبکرؓ کو قیصر روم کی عظیم الشان جنگی تیاریوں کی اطلاع ہوئی ۔ تو آپنے بھی شام

[1] فتوح الشام للواقدی ۔ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۔ ص ۲ ۔

پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا ۔

مشاورت | چونکہ یہ ایک نہایت اہم اقدام اور غیر معمولی مہم تھی اس لئے صحابہ سے مشورہ لینا اور ان کی رائے معلوم کرنا ضروری تھا ۔ چنانچہ ماہ صفر ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجلس مشاورت طلب کی جس میں حضرت عمرؓ ۔ عثمانؓ ۔ علیؓ ۔ طلحہؓ ۔ زبیرؓ ۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ سعد بن ابی وقاصؓ ۔ ابوعبیدۃ بن الجراحؓ اور معاذ بن جبلؓ وغیرہم تمام اکابر اور نامور صحابہ اور مہاجرین و انصار شریک تھے ۔ اس مجلس میں پہلے حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کی اور فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے شام کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی تھی لیکن اسی درمیان میں اللہ نے آپ کو اپنے پاس بلالیا ۔ عرب ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد ہیں ۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو شام روانہ کردوں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا اور اے خلیفۂ رسولؐ! آپ کی اطاعت ہم پر واجب ہے ۔ آپ جہاں کہیں جانے کا ہم کو حکم کریں گے اس کا بجالانا ہمارا فرض ہوگا[1]

ابواسماعیل الازدی نے اس موقع پر نقل کیا ہے ۔ کہ اس مجلس مشاورت میں خالد بن سعید الاموی بھی شریک تھے اور انہوں نے ہی سب سے پہلے شام جانے کیلئے اپنا نام پیش کیا تھا ۔ لیکن طبری ۔ ابن اثیر اور ابن خلدون کے بیانات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ اس لیے صحیح وہ ہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے یعنی یہ کہ خالد بن سعید اس وقت تیما میں تھے اور یہ مجلس درحقیقت ہوئی ہی تھی اس وقت جبکہ حضرت ابوبکر کو خالد بن سعید کے خط سے ہرقل کی جنگی تیاریوں کا علم ہوا تھا ۔

دعوت نامے | جب سب صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا اور اس پر مہر تصدیق ثبت کردی تو چونکہ قیصر روم کی طاقت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور اسی وجہ سے مجلس مشاورت میں حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا تھا "انہا الروم وبنو الاصفر حد حدید ورکن شدید" ۔ یہ اہل روم بہت تیز دھار اور مضبوط ستون ہیں ۔ اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے حجاز اور یمن کے تمام امرائے قبائل کے نام شرکتِ جہاد کے دعوت نامے بھیجے

[1] فتوح الشام للازدی ص ۴ [2] فتوح الشام للواقدی ص ۳-۴ و فتوح الشام للازدی ص ۷ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۹

قبائل کا جوش و خروش اور ان کی مدینہ میں آمد

قبائل نے بڑی خوش دلی اور جوش و خروش کے ساتھ اس دعوت کو لبیک کہا اور جوق در جوق مدینہ میں آنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ذوالکلاع الحمیری نے حضرت ابوبکرؓ کے خط کا مضمون سنا ہی تھا کہ فوراً ہتھیار سج، گھوڑے پر بیٹھ اپنی قوم اور یمن کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لے روانہ ہو گئے اسی طرح قیس بن ہبیرہ المرادی مذحج کو جندب بن عمرو الدوسی قبیلۂ ازد کو۔ اور حابس بن سعد الطائی قبیلۂ طے کے مجاہدین کو ساتھ لیکر چل پڑے۔ انس ابن مالک جو آنحضرتؐ کے خادم خاص تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے یہ تمام خطوط لیکر گئے تھے۔ انہوں نے واپس آکر حضرت ابوبکرؓ کو مژدہ سنایا کہ آپ کی دعوت جہاد کا یہ اثر ہوا ہے کہ قبائل یمن جس حالت میں تھے اُسی میں وہ اپنی عورتوں، بال بچوں اور جمع پونجی کو لیکر روانہ ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر آپ کو بیحد مسرت ہوئی۔ دوسرے دن اہل مدینہ کو ساتھ لیکر ان مجاہدین اسلام کے استقبال کیلئے مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ قبائل یمن میں سب سے پہلے قبیلۂ حمیر پہونچا جو ہتھیار بند تھا ذوالکلاع ایک عمامہ باندھے اس قبیلہ کی پیشوائی کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ابھی ان کا استقبال کر ہی رہے تھے کہ قبیلوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ مدینے کے قریب مقام جرف میں ان سب قبائل کیلئے خیمے لگا دیئے گئے تھے وہیں ان کو ٹھہرایا گیا [1]

قیصر روم کے نام ابوبکرؓ کی سفارت

اسی درمیان میں اتمام حجت کرنے کی غرض سے حضرت ابوبکرؓ نے قیصر روم کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی جس کے ذریعے اس کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ حافظ ذہبی نے اس سفارت کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے [2]

ڈاکٹر حمید اللہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"ارمنی مورخ سابیوس (SABEOS) نے بھی ذکر کیا ہے کہ اس زمانہ میں قیصر کے پاس ایک اسلامی سفارت آئی تھی اس کے بیان کا ترجمہ ہیولشں مان نے اپنی کتاب میں کیا ہے

---

[1] فتوح الشام للواقدی ص ۳-۴ و فتوح الشام للازدی ص ۷ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۹

[2] تاریخ کبیر حالات ابوبکرؓ مخطوطۂ بزم ادب حیدر آباد دکن۔

اور وہ یہ ہے

"انہوں (مسلمانوں) نے تب ایک سفارت بیزنطینی شہنشاہ کے پاس بھیجی اور کہا خدا نے یہ علاقہ ہمارے جد (حضرت ابراہیمؑ) اور ان کی ذریت کو عطا کیا تھا تو اسپر بہت دنوں سے قابض ہے وہ ہمیں صلح اور آشتی کیساتھ واپس کر دے پھر ہم تیرے ملک میں نہیں آئیں گے۔ قیصر نے انکار کیا اور وہ جواب نہیں دیا جس کی سفیر کو توقع تھی۔ قیصر نے کہا یہ ملک میرا ہے اور تیرا حصہ تو صحرا ہے جا وہاں امن سے رہ [1]

قبائل کی بے قراری

اس اتمام حجت کے بعد حضرت ابوبکرؓ فوجوں کی ترتیب اور ان کیلئے ساز و سامان کی فراہمی میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ مہم نہایت اہم درپیش تھی اس لیے حضرت ابوبکرؓ جو قدم اٹھاتے تھے کامل غور و فکر اور پورے حزم و احتیاط سے اٹھاتے تھے۔ اس بنا پر فوجوں کی روانگی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ یمن اور حجاز کے جو قبائل جرف میں خیمہ فگن تھے ان کی بیقراری کا یہ عالم تھا کہ جب کچھ زیادہ دن ہو گئے تو قیس بن ہبیرہ المرادی اور چند لوگوں کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے یا تو ہمیں شام روانہ کیجیے ورنہ اجازت دیجیے کہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اطمینان دلایا کہ تم ہی لوگوں کے انتظامات کی تکمیل کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے [2]

اسلامی فوج کے عناصر ترکیبی

شام کیلئے جو فوج روانہ ہونیوالی تھی اس کی یہ خصوصیت خاص طور پر لحاظ میں رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں یمن اور حجاز کے ممتاز بہادر اور جنگجو قبائل کے علاوہ اکابر صحابہ جو بدر و اُحد کے معرکوں میں شریک رہ چکے تھے اور اجلّۂ مہاجرین و انصار جو اسلام کی عمارت کے ستونِ اعظم تھے یہ بھی شامل تھے ایسے صحابہ کی تعداد تین سو بیان کیجاتی ہے ان کے علاوہ عکرمہ بن ابی جہل جو حروب ارتداد کے سلسلہ میں کندہ حضرموت اور عمان وغیرہ کی مہم سر کر کے مدینہ پہونچ چکے تھے۔ ان کو بھی ایک تازہ دم فوج

---

[1] منقول از "آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی"، ص ۲۸۰

[2] فتوح الشام واقدی ص ۶

دیگر شام کے محاذ پر روانہ کیا گیا۔ عمرو بن العاص مرتدین کے استیصال کے بعد سے قضاعہ میں مقیم تھے، اُن سے پوچھا گیا وہ کیا چاہتے ہیں،، انہوں نے جواب دیا اے امیر المؤمنین! میں اللہ کا تیر ہوں جسطرح آپ چاہیں اس کو استعمال کر سکتے ہیں، اس جواب کے بعد ان کو بھی مدینہ طلب کر لیا گیا [1]۔

افواج کی روانگی

اب فوجوں کی روانگی کا وقت آگیا تھا حضرت ابوبکر نے ایک ٹیلہ پر چڑھ کر مجاہدین اسلام کے اجتماع عظیم کا جائزہ لیا اور ان کے جوش و خروش اور جذبہ کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ پھر مجاہدین کو چار لشکروں میں تقسیم کیا۔ واقدی نے ان لشکروں کو ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل بتایا ہے اور لشکروں کی تعداد تین لکھی ہے [2]۔ لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لشکروں کی تعداد چار بتائی ہے اور ہر ایک لشکر کو تین تین ہزار مجاہدین پر مشتمل لکھا ہے [3] اور ہمارے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں روایات کے اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لشکر آگے پیچھے روانہ ہوئے ہیں اور بعض چھوٹے لشکروں کو کسی ایک بڑے کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ اس بنا پر امراء کی تعداد میں بھی اختلاف ہے اور خود لشکر کی تعداد میں بھی۔ ان چار لشکروں میں سب سے بڑا لشکر یزید بن ابی سفیان کا تھا جس میں اہل مکہ اور اہل یمن دونوں قسم کے حضرات شامل تھے ان کے علاوہ ایک لشکر ابو عبیدۃ بن الجراح۔ دوسرا عمرو بن العاص اور تیسرا شرجیل بن حسنہ کی سرکردگی میں تھا۔ مورخین نے لشکروں کی تعداد جو تین یا چار لکھی ہے ہماری رائے میں اس سے مراد بڑے اور کسی نہ کسی حیثیت سے اہم لشکر ہیں ورنہ در حقیقت لشکروں کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔ چنانچہ عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں جو لشکر تھا اس کا ذکر اوپر آہی چکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ ان لشکروں کو الگ الگ روانہ کرتے اور ان کو الوداع کہنے کیلئے مدینہ کے باہر تک پاپیادہ تشریف لاتے تھے رخصت کرنے سے قبل ہر ایک لشکر کو خاص خاص ہدایات اور نصائح تلقین فرماتے جس کا ذکر آگے اپنی جگہ پر آئے گا۔ اور پھر ان کے حق میں بارگاہِ ایزدی میں کمال خضوع و خشوع کیساتھ دعا کرنے کے بعد۔ خدا حافظ کہتے تھے

[1] واقدی ص ۶ [2] فتوح الشام ص ۶ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۔

ان لشکروں کو آپ نے جو ہدایات دیں ان میں ایک یہ ہدایت بڑی اہم تھی کہ وہ سب ایک ہی راستے سے نہ جائیں بلکہ مختلف راستے اختیار کریں۔ چنانچہ یزید بن ابی سفیان جن کو دمشق کے محاذ پر بھیجا گیا تھا۔ ان کو حکم ہوا کہ تبوک کے راستہ سے جائیں۔ عمرو بن العاص جو فلسطین کے محاذ کیلئے مقرر کیے تھے۔ وہ ایلہ کی راہ گئے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ ان لشکروں کی روانگی جمعرات کیدن یکم صفر ۱۳ھ کو ہوئی تھی [1]۔

ظاہر ہے شام کے محاذ کیلئے بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی کہ قیصر نے بہت بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں کی ہیں تو آپ نے بعد میں اور لشکر بھی آگے پیچھے روانہ کیے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ شدہ شدہ ہر امیر کے ماتحت ساڑھے سات ہزار مجاہدین کا لشکر ہو گیا تھا۔ اور اس طرح کل تعداد چوبیس ہزار تھی [2] لیکن ظاہر ہے یہاں پھر مورخین کو التباس ہو گیا ہے۔ کیونکہ لشکر تین مانے جائیں یا چار، بہر حال اگر ہر لشکر میں ساڑھے سات ہزار کی مساوی تعداد تسلیم کر لی جائے تو اس حساب سے مجموعی تعداد چوبیس ہزار نہیں ہوتی۔

رومیوں سے پہلا مقابلہ

یاد ہوگا کہ خالد بن سعید پہلے سے تیماء میں متعین تھے ہی۔ ان کو حضرت ابوبکرؓ نے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر اقدام جنگ نہ کریں۔ چنانچہ جب انہوں نے قیصر کی فوجوں کا اجتماع عظیم دیکھا تو حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع کی آپ نے حکم بھیجا کہ ہاں اچھا اب آگے بڑھو لیکن ساتھ ہی تاکید کی کہ اندرون ملک گھسے مت چلے جانا ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن تمکو پیچھے سے آدبائے [2]۔ لیکن خالد بن سعید نے جوش میں اس نصیحت کی کچھ پروا نہیں کی انہوں نے اقدام کیا اور رومی اس سے پسپا ہوئے تو یہ اپنی فوج لیکر اندرون ملک گھسے چلے گئے۔ رومی فوج کا افسر اعلیٰ باہان تھا جو اپنے عہد کا نامور ماہر جنگ تھا۔ باہان نے دمشق کا رخ کیا۔ خالد بھی اسی طرف اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ واقوصہ اور دمشق کے درمیان مرج الصُّفَّر کے نام سے جو مقام ہے وہاں پہونچکر دم لیں گے۔ اور اس کو اپنی فوجی قیام گاہ بنائیں گے۔ لیکن در حقیقت باہان کی یہ پسپائی نہیں تھی

[1] بلاذری ص ۱۱۴ [2] فتوح البلدان ص ۱۱۵ [3] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۳۱ و طبری و ابن اثیر۔

بلکہ ایک زبردست جنگی چال تھی۔ چنانچہ ابھی خالد بحیرۂ طبریہ کے شرق کیجانب مرج الصفر کے قریب ہی تھے کہ باہان اچانک راستہ بدل کر اسلامی فوج کے عقب میں آگیا اور اس طرح اس کو گھیر لیا کہ اب لوٹنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ خالد بن سعید کا بیٹا مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ کہیں الگ تھلگ رہ گیا تھا۔ باہان کا قابو چل گیا۔ اور ان سب کو قتل کر دیا۔

خالدؓ کو بیٹے کے اس طرح مارے جانے کا صدمہ اس قدر شدید ہوا کہ پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ پڑے۔ مدینہ کے قریب ایک مقام ذوالمروہ ہے وہاں پہونچکر دم لیا حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت ملال ہوا۔ اور خالدؓ کو لکھا جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن اب اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ بلکہ یہاں تک فرمایا "اگر میں خالدؓ کے متعلق عمرؓ اور عبیدہ کی رائے (یہ دونوں خالد کو امیر مقرر کرنیکے خلاف تھے) مان لیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا"[1]

اسلامی لشکر کے مختلف محاذ | یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ سے جو لشکر روانہ کیے تھے انہوں نے خلیفۂ رسول ؐ کے حکم کے مطابق مختلف محاذوں پر پہنچکر پڑاؤ ڈالدیا تھا۔ چنانچہ ابوعبیدۃ دمشق کے راستہ میں شرجیل بن[2] حسنہ طبریہ اور نہر اردن کے بالائی حصہ میں یزید بن ابی سفیان بلقاء میں جہاں سے وہ بصریٰ پر آسانی سے حملہ کر سکتے تھے اور عمرو بن العاص عربہ میں جو ردن کیلئے خطرہ کی گھنٹی بنے پڑے تھے۔ یہ لشکر الگ الگ اور دوسرے سے علیحدہ تھے لیکن ان کے امراء میں باہمی مراسلت و مشاورت کا سلسلہ برابر جاری تھا ان تمام اسلامی لشکروں کی مجموعی تعداد عام روایات کے مطابق تیس ہزار تھی۔

قیصر روم کے لشکروں کی ترتیب | قیصر روم کو ان اسلامی لشکروں کا علم ہوا تو اس نے بہت بڑے پیمانہ پر اپنے لشکر مرتب کیے[3] اس کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ اسلامی لشکروں کو کسی ایک محاذ پر جمع ہونے نہ دے تاکہ وہ سب اجتماعی قوت کیساتھ دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۸۹۔ [2] شرجیل بن حسنہ دراصل حضرت خالد بن الولید کی طرف سے عراق کا مژدۂ فتح لیکر آئے تھے۔ لیکن یہاں شام کی مہم درپیش تھی اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ایک لشکر دے کر سیدھا شام بھیجدیا[3] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ہرقل (HIERACLINS) نے شروع میں رومی سرداروں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کیساتھ صلح کرلیں لیکن ان لوگوں نے جب اس کی ایک نہیں سنی تو پھر مجبور ہو کر اس کو جنگ کی تیاری کرنی پڑی ج ۲ ص ۲۷۸

اور چونکہ اس کے پاس فوج بے شمار تھی اس لیے اس کو یقین تھا کہ مسلمان محاذوں پر بٹ کر اس کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ قیصر پہلے خود حمص آیا جہاں شام کی ایک عظیم الشان فوجی چھاؤنی تھی اور یہاں لشکروں کی ترتیب۔ اُن کیلئے سازوسامان اور اسلحہ وغیرہ کی فراہمی کا کام شروع کر دیا۔ جب سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس نے چار لشکر اسطرح روانہ کیے۔

(۱) ایک لشکر جو سب سے بڑا اور نوے ہزار بہادروں پر مشتمل تھا۔ عمرو بن العاص کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ اس لشکر کی قیادت ہرقل کا حقیقی بھائی تھیوڈرس (THEODOROIES) کر رہا تھا۔ اس نوے ہزار کے مقابلہ میں عمرو بن العاص کے پاس جو لشکر تھا وہ سات آٹھ ہزار سے زیادہ نفوس پر مشتمل نہیں تھا۔

(۲) دوسرا لشکر جو ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا ابوعبیدۃ کے مقابلہ پر بھیجا گیا تھا اس لشکر کا قائد پیٹر (PETER) تھا جس کو عرب مؤرخین فیقار بن نسطوس لکھتے ہیں۔ حضرت ابوعبیدۃ کی فوج بھی سات آٹھ ہزار کے درمیان تھی۔

(۳) تیسرا لشکر جس کا قائد سرجیس (SERGIUS) تھا عرب مؤرخین اس کو جرجۃ بن توذرا لکھتے ہیں یزید بن ابی سفیان کے مقابلہ میں روانہ ہوا۔

(۴) چوتھا لشکر دراقص کے ماتحت تھا جو شرجیل بن حسنہ کیساتھ جنگ کرنے کیلئے بھیجا تھا مسلمانوں کو ان لشکروں کے اجتماع عظیم اور ان کی تیاریوں کا علم ہوا تو اپنی قلت تعداد کی وجہ سے کچھ اندیشہ ہوا۔ اور عمرو بن العاص کو لکھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ادھر ان لوگوں نے (ازدی نے لکھا کہ خود عمرو بن العاص نے) حضرت ابوبکرؓ کو دشمن کی کثرت تعداد کی اطلاع دی تو بارگاہِ خلافت سے جواب آیا کہ "تم سب ایک جگہ ہو جاؤ اور ایک لشکر بنالو اس کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ اپنی قلت تعداد کا غم نہ کرو۔ تم اللہ کے دین کے اعوان و مددگار ہو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا پھر حکم دیا کہ تم سب لوگ یرموک میں جمع ہو جاؤ۔"

اجتماع یرموک | یرموک دراصل ایک دریا کا نام ہے جو حوران کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مختلف پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اردن کے دریا اور بحر منجمد (DEADSEA) میں جاملتا ہے۔ یرموک کا یہ دریا اردن کے دریا سے جہاں ملتا ہے اس سے تیس یا چالیس میل کے فاصلہ

پر ایک مقام ہے جس کا نام واقوصہ ہے۔ یہ مقام ایک وسیع نشیبی علاقہ میں ہے اور تین طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ چونکہ یہ بہت وسیع مقام تھا اس لیے قیصر کی فوجوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کیلئے اسی کو منتخب کیا۔

رومی یہاں پہنچکر لشکر انداز ہو گئے۔ مسلمان دریائے یرموک کے دائیں بازو کو عبور کر کے رومیوں کے بالمقابل فروکش ہو گئے۔ اب تین طرف سے رومی پہاڑوں سے گھرے ہوئے تھے اور ان کے روبرو جو راستہ تھا اس پر اسلامی فوج قابض تھی۔ اس طرح وہ محصور ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے اس قدرتی صورتِ حال پر اظہار مسرت کیا۔ اور مسلمانوں کو مبارکباد دی۔ اس وقت قیصر روم کی فوج تذارق (تھیوڈرس) کے ماتحت تھی مقدمۃ الجیش پر سرجیس دونوں بازوؤں پر باہان اور درواقص میدانِ جنگ کا انچارج تھا۔ پیٹر تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی نامزدگی | مسلمان اور رومی دونوں ایک دوسرے کے مقابل اسی حالت میں دو ماہ تک پڑے رہے۔ اس مدت میں معمولی جھڑپوں کے علاوہ کھل کر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو فکرمند ہوئے اور آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو حکم بھیجا کہ عراق میں مثنیٰ کو اپنا قائم مقام بنا کر فوراً شام کیلئے روانہ ہو جائیں۔

اگرچہ حضرت خالدؓ یہاں حیرہ میں مدائن پر حملہ کرنے کا خیال کر رہے تھے۔ لیکن اول تو خلیفۂ رسولؐ کا حکم اور پھر اس وقت شام کے محاذ کی اہمیت بہت زیادہ تھی اس لئے شام کیلئے روانہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا[1]

اس موقع پر بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ حضرت خالدؓ صرف لشکر شام کی مدد کیلئے بھیجے گئے تھے اور ان کو وہاں کی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

---

[1] مورخین کا اس میں بھی بڑا اختلاف ہے کہ شام کیلئے روانگی کے وقت حضرت خالدؓ کے ساتھ فوج کتنی تھی۔ کسی نے نو ہزار کسی نے چھ ہزار۔ کسی نے آٹھ سو۔ چھ سو۔ پانچ سو تعداد بتائی ہے۔ (ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۹) لیکن بلاذری نے آٹھ سو سے پانچ سو تک کی تعداد لکھی ہے (ص ۱۱۶) اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ کیونکہ شام کے محاذ پر صرف حضرت خالدؓ جیسا سپہ سالار درکار تھا۔ فوج تو یوں بھی کافی تھی اور مدینہ سے دستے برابر آرہے تھے اس کے علاوہ اب جبکہ حضرت خالدؓ عراق سے جا رہے تھے ضروری تھا کہ وہاں فوج کافی تعداد میں رہے۔

کیونکہ شام کے محاذ پر کیا کچھ نہیں تھا۔ کسر تھی تو خالد ایسے سپہ سالار کی تھی اور اسی کسر کو پورا کرنے کیلئے ان کو عراق سے ہٹا کر شام جانے کا حکم ہوا تھا چنانچہ طبری میں ہے کہ اس حکم نامہ میں حضرت ابوبکرؓ کے الفاظ یہ تھے

سرحتی تاتی الجموع من المسلمین	تم روانہ ہو یہاں تک کہ یرموک میں جو مسلمان مجتمع
بالیرموک فانھم قد شجوا واشجوا۔	ہیں ان سے ملو۔ کیونکہ وہ غمزدہ ہیں۔

اس کے علاوہ ابو اسماعیل الازدی نے حضرت خالدؓ کے نام حضرت ابوبکرؓ کا جو خط نقل کیا ہے اس میں اس کی تصریح ہے کہ وہ جب تم وہاں پہنچ جاؤ اور لوگوں سے ملو تو پھر امیر جماعت تم ہی ہو گے[1] اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ واقدی کی فتوح الشام (ص ۴۰) میں ہے، اسمیں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو تمام لشکر شام اور خود حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح پر امیر بنا کر بھیجا تھا اور طبری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس امرائے شام کا خط پہنچا جس میں مدد بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی تو اسے پڑھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "خالد لھا" یہ معرکہ تو خالدؓ سے ہی سر ہو گا[2]

حضرت خالدؓ کی روانگی | اب حضرت خالدؓ عراق سے ہو کر تو پہلے تدمر آئے۔ جو صحرائے شام کے کنارے وادیٔ فرات سے متصل ہے اور دمشق سے ڈیڑھ سو میل دور اس کے شمال مشرق میں واقع ہے راستہ میں پانی کی قلت کے باعث بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اس اثناء میں بعض قبائل سے مڈبھیڑ بھی ہوئی حضرت خالدؓ ان سب کو پسپا کرتے بڑھتے چلے گئے۔ تدمر سے ثنیۃ العقاب[3] اور وہاں سے مرج راہط پہنچے جو غوطہ دمشق کے مشرق میں ہے، یہاں سے جنوبی سمت میں روانہ ہو کر بصری پہونچے۔

مرج راہط جو دمشق سے پندرہ میل کی مسافت پر ہے غسانیوں کا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں حضرت خالدؓ نے جنگ کے بعد ان لوگوں کو مغلوب کیا۔ اس کے بعد بصری پہونچے تو یہاں حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے مطابق شرحبیل بن حسنہ اور یزید بن ابی سفیان اس شہر کا محاصرہ کیئے پڑے تھے مگر وہ فتح نہیں ہوا تھا۔ لیکن حضرت خالدؓ نے آتے ہی اس زور کا حملہ کیا کہ رومیوں کا سپہ سالار رومانس (ROMANUS) پسپا ہو کر بصری شہر کے اندرونی حصہ میں

---

[1] فتوح الشام ص ۲۵۱ [2] طبری ج ۲ ص ۵۹۱ [3] عقاب حضرت خالدؓ نے عَلَم کا نام تھا۔ آپ نے اس جگہ پہونچکر یہ عَلَم نصب کیا تھا اس لیے اس جگہ کا نام ثنیۃ العقاب ہو گیا۔

گھس کر پناہ گزین ہو گیا اور شہر فتح ہو گیا ۔

واقدی نے رومانس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شخص کتب قدیمہ کا عالم تھا اور اس بنا پر اس کو معلوم تھا کہ رومیوں کا زوال ایک پیغمبر عرب کے ہاتھوں یقینی تھا اس لیے وہ مسلمان ہونا چاہتا تھا لیکن اس کی قوم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کو قتل کر دینے کے درپے ہو گئے ۔ اور وہ جان کے ڈر سے مجبوراً رومیوں کے ساتھ حضرت خالدؓ کے مقابلہ میں آنکلا لیکن بعد میں مسلمان ہو گیا اور اسلام کی حمایت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔

ابو اسمٰعیل الازدی نے بصریٰ میں رومی فوج کے سپہ سالار کا نام دربخار لکھا ہے ۔ اور رومیوں کی تعداد پانچ ہزار اور مسلمانوں کی ایک ہزار بتائی ہے ۔ اس کے علاوہ بصریٰ کی فتح سے قبل جو جنگ ہوئی اس کی تفصیل بھی لکھی ہے [1]

معرکۂ اجنادین

بصریٰ کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ کا ارادہ تھا کہ دمشق کی طرف پیش قدمی کریں ۔ لیکن اچانک اطلاع ملی کہ قیصر روم نے ایک لاکھ کا لشکر جرار اجنادین میں جمع کر دیا ہے اور اس کے علاوہ چونکہ عیسائی مذہب کے پیشواؤں ۔ پادریوں اور لشبیوں نے تمام ملک کا دورہ کر کے مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دی ہے اس لیے اطراف اکناف سے بھی چھوٹے چھوٹے لشکر برابر آرہے ہیں ، یہ خبر سن کر خالدؓ نے پہلی تدبیر یہ کی اسلامی لشکر جو مختلف حصوں میں بٹے ہوئے اور مختلف محاذوں پر تھے ان سب کے امیروں کو خط لکھا کہ اجنادین کے محاذ پر آ کر جمع ہو جائیں اس حکم کی تعمیل میں حضرت ابو عبیدہؓ اپنے چند ساتھیوں کیساتھ روانہ ہوئے تو اہل دمشق نے بڑا سی کی تعداد میں عقب سے آ کر حملہ کر دیا ۔ حضرت خالدؓ کو اس کا علم ہوا تو فوراً ایک لشکر لیکر موقع پر پہنچے اور رومیوں کو پسپا کر کے دمشق کی طرف جانے پر مجبور کر دیا ۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ جس وقت اجنادین کے مقام پر پہونچے ہیں ٹھیک اسی وقت وردان جو ایک نامور رومی سپہ سالار تھا ایک لشکر جرار لیے ہوئے اجنادین پہنچ گیا لیکن دوسری طرف اس وقت تک حضرت عمرو بن العاص ۔ یزید بن ابی سفیان اور شرجیل بن حسنہ

[1] فتوح الشام ص ۱۷ - ۴۷ ۔

بھی حضرت خالدؓ کی دعوت پر اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ پہونچ چکے تھے ۔ حضرت خالدؓ نے اب پوری اسلامی فوج کا جائزہ لیا ۔ اُن کی صف بندی کی اور ایک ایک دستہ کے پاس پہونچ کر اُن کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت یاد دلائی ۔ خواتین اسلام بھی اس جنگ میں شامل تھیں ۔ ان کو مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگتا ہوا تمہارے پاس سے گزرے تو اس کو غیرت دلانا اور شرمندہ کرنا ۔

آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ عموماً جنگ ظہر کی نماز کے بعد شروع کرتے تھے ۔ حضرت خالدؓ نے اس اسوۂ نبیؐ پر عمل کرنے کے خیال سے نماز ظہر کے وقت تک کیلئے جنگ کو ٹالنا چاہا ۔ لیکن رومیوں نے پیش قدمی کر کے حملہ کر دیا ۔ اسلامی فوج کے میمنہ پر معاذ بن جبل اور میسرہ پر حضرت عمرؓ کے بھتیجے سعید بن زیدؓ تھے ۔ رومیوں نے اسلامی لشکر کے ان دونوں بازوؤں پر اس زور کی تیر باری کی کہ مجاہدین کے گھوڑے بدکنے لگے اور خود مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا ۔ حضرت خالدؓ نے یہ رنگ دیکھا تو شہسواروں کو حکم دیا کہ حملہ کریں اور خود اس میں پیش قدمی کی ۔ حضرت خالدؓ کا حملہ کرنا تھا کہ پوری اسلامی فوج ایک سیل رواں کی طرح آگے بڑھی اور دشمنوں پر چھا گئی ۔ اب دشمن کیلئے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ۔ حمص اور دمشق میں جا کر پناہ لی ۔ تھیوڈرس جو رومی افواج کا سپہ سالار اعظم تھا اس نے بھاگ کر حمص میں جہاں قیصر پہلے سے موجود تھا ۔ پناہ لی ۔ قیصر نے بڑی ذلت و خواری کیساتھ اس کو معزول کر دیا اور آخر اسی حالت میں وہ مر گیا ۔ ابو اسمٰعیل الازدی کے بیان کیمطابق تین ہزار رومی مارے گئے اور مسلمانوں کا بھی نقصان کافی ہوا [1] بلاذری کا بیان ہے کہ یہ جنگ ۱۸ جمادی الاولیٰ یا ۲ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو ہوئی ہے [2] لیکن ابو اسمٰعیل الازدی نے لکھا ہے کہ اجنادین کی جنگ جو شام میں سب سے پہلی بڑی جنگ تھی ہفتہ کیدن ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ کو دوپہر کیوقت ہوئی

حضرت خالدؓ کا خط حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نام	فتح کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے عبدالرحمٰن بن حنبل الجمعی کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کے نام ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ہم میں اور مشرکوں میں

[3] جنگ ہوئی ۔ ان لوگوں نے ہمارے مقابلہ میں بڑے بڑے لشکر مقام اجنادین میں جمع کر

[1] فتوح الشام از صفحہ ۷۴ تا ۷۹ ، [2] فتوح البلدان ص ۱۲۰ [3] اہل روم درحقیقت عیسائی تھے لیکن حضرت خالدؓ نے ان کو مشرک اس لیے کہا ہے کہ یہ لوگ اصل عیسائیت سے گمراہ ہو کر حضرت عیسٰیؑ (باقی برصفحہ ۲۸۸)

رکھے تھے یہ لوگ اپنی صلیبیں اور کتابیں اٹھائے ہوئے تھے اور اس بات کی قسم کھائی تھی کہ میدان جنگ سے فرار اختیار نہیں کریں گے اور ہم کو اپنے ملک سے باہر نکال کر ہی دم لیں گے۔ ہم اللہ پر بھروسہ کر کے ان کے مقابلہ کو آگے بڑھے۔ پھر ہم نے تیروں سے کام لیا۔ اس کے بعد تلواروں کی نوبت آئی اور شمشیر کی جنگ ہوئی۔ آخر اللہ نے ہم پر اپنی مدد نازل کی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔

یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات سے چوبیس دن پہلے کا ہے۔ آپ کو حضرت خالدؓ کا مکتوب ملا تو پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے اور فرمایا "جمیع حمد ثابت ہے اس اللہ کے لئے جس نے مسلمانوں کی مدد اور میری آنکھیں اس مژدۂ فتح سے ٹھنڈی کیں۔"[1]

جنگ اجنادین کے بعد کیا ہوا؟ اس باب میں بھی روایات مختلف ہیں۔ ابو اسمٰعیل الازدی کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ نے دمشق کا رُخ کیا۔ اور فوج نے جا کر شہر کا محاصرہ کر لیا ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہو گئی۔ لیکن بلاذری کی روایت یہ ہے کہ اجنادین کے بعد رومیوں کا اجتماع واقوصہ (بلاذری میں یاقوصہ لکھا ہوا ہے) میں ہوا۔ حضرت خالدؓ کو اطلاع ہوئی تو واقوصہ پہونچ کر جنگ کی رومی شکست کھا کر بھاگے اور شام کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئے۔ بلاذری لکھتے ہیں کہ مسلمان ابھی واقوصہ میں ہی تھے کہ خلیفۂ رسولؐ کی وفات کی اطلاع ملی[2]۔

ایک بحث: جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ خلافت صدیقیؓ کے عہد میں شام میں جو فتوحات ہوئی ہیں اُن سے متعلق بڑے بڑے شدید اختلاف ہیں یہاں تک کہ خود اس میں بھی اختلاف ہے کہ یرموک کا واقعہ عہد صدیقی میں پیش آیا یا خلافت فاروقی میں۔ طبری اور ابن اثیر یرموک کے اس واقعہ کو اجنادین سے پہلے ملاتے ہیں۔ لیکن ازدی، واقدی اور بلاذری کے ہاں سب سے بڑا معرکہ جو شام میں خلافت صدیقی میں ہوا ہے وہ اجنادین ہے۔ اور یرموک کا واقعہ ۱۵ھ میں پیش آیا ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ابن اللہ کہتے تھے اور بجائے توحید کے تثلیث کے قائل ہو گئے تھے اس لیے وہ مشرک ہو گئے تھے۔

[1] فتوح الشام الازدی ص ۸۱ [2] فتوح البلدان ص ۱۲۱

ہمارے نزدیک غالباً شکل یہ پیش آئی ہے کہ حضرت خالدؓ کی عراق سے روانگی سے قبل قیصر روم نے اپنی فوجیں مقام واقوصہ میں جو یرموک سے متصل تھا جمع کر دی تھیں تاکہ یہاں ایک فیصلہ کن جنگ شام کی قسمت کا آخری فیصلہ کر دے۔ اسلامی اور رومی دونوں فوجیں آمنے سامنے تقریباً دو ماہ تک پڑی رہیں۔ لیکن معمولی چھڑپوں کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ صورت حال کے اس جمود سے جس کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں خطرناک ہو سکتا تھا اکتا گئے تو حضرت خالدؓ کو حکم بھیجا کہ عراق کا محاذ مثنیٰؓ کے سپرد کر کے شام کیلئے روانہ ہو جائیں وہاں تعمیل حکم میں کیا دیر ہو سکتی تھی۔ راستہ میں متعدد مقامات پر حرب و ضرب کی نوبت آئی اور حضرت خالدؓ کامیابی کیساتھ ان سب سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے جنوب مشرق کی سمت سے حدود شام میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ جنگی نقطۂ نظر سے واقوصہ (یا یرموک) کو میدانِ جنگ بنانا مناسب نہیں ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ مقام تین طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اسی کو دیکھ کر حضرت عمروؓ بن العاص نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا کہ دشمن محصور ہو گیا ہے۔ یہ حضرت عمرو بن العاص کی ذاتی رائے تھی لیکن حضرت خالدؓ جانتے تھے کہ دشمن کو اس طرح گھیر کر علی الخصوص اس وقت جبکہ وہ بڑی شان و شوکت اور ساز و سامان کیساتھ آیا ہو جنگ کرنا دانش مندی نہیں ہے بلکہ جنگ ہمیشہ دشمن کیلئے راہ فرار رکھ کر کرنی چاہیے اس بنا پر حضرت خالدؓ نے واقوصہ کے بجائے دمشق کا رخ کیا۔ اب اسلامی فوجیں جو اس وقت تک واقوصہ میں رومیوں کا راستہ روکے بیٹھی تھیں وہاں سے ہٹیں تو رومیوں نے اجنادین میں مورچہ جما دیا اور تمام فوجیں لا کر یہاں جمع کر دیں۔ حضرت خالدؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو دمشق کا ارادہ ترک کر کے اجنادین پہنچ گئے۔ اور وہاں جو کچھ ہوا تم اس کا حال پڑھ ہی آئے ہو۔ اس تقریر کی روشنی میں دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یرموک میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ وہاں صرف دونوں طرف کی فوجوں کا اجتماع ہوا ہے۔ اس عہد میں سب سے بڑی جو جنگ ہوئی ہے وہ اجنادین کی ہے۔ چنانچہ طبری جو واقعہ یرموک کو خلافت صدیقی سے منسوب کرتے ہیں انہوں نے بھی علی بن محمد کی

اسناد سے صفحہ ۱۱۶ پر بعینہٖ یہی بات لکھی ہے جن لوگوں نے واقوصہ میں افواج کے اجتماع کو ہی جنگ یرموک سمجھ لیا ہے انہوں نے یرموک کو اجنادین پر مقدم کیا ہے۔ لیکن جن کی نظر اصل جنگ پر ہے انہوں نے یرموک کے واقعہ کو ۱۵ھ کا واقعہ لکھا ہے [1] واللہ اعلم۔

عراق میں بغاوت

حضرت خالدؓ کے عراق سے روانہ ہو جانے کے بعد مثنیٰ بن حارثہ نے ادھر ادھر چھاؤنیاں قائم کر دیں اور جاسوس جگہ جگہ متعین کر دیئے اور خود حیرہ میں مقیم ہو گئے۔ ایرانیوں نے میدان حضرت خالد سے خالی پایا تو ان کا حوصلہ بڑھا اور ادھر کچھ دنوں تک طوائف الملوکی کے بعد شہر براز [2] بن اردشیر بن شہریار کی بادشاہت پر سب ایرانیوں کا اتفاق ہو جانے کے باعث ایران میں ایک مضبوط حکومت قائم ہو گئی تھی اس بنا پر شہنشاہِ ایران نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ ہرمز جاذویہ کو حضرت مثنیٰ کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ اس لشکر کیساتھ ہاتھی بھی تھا جس کے ساتھ جنگ کرنا عربوں کا پہلا تجربہ تھا۔ مثنیٰ کو اس فوج کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو مختلف چھاؤنیوں پر جو فوج منتشر تھی ان سب کو یکجا کر لیا۔ اپنے بھائی معنیٰ اور مسعود کو فوج کے دونوں بازوؤں پر مقرر کیا اور بابل میں خیمہ زن ہو گئے۔ یہاں حضرت مثنیٰ کو کسریٰ کا خط ملا جس میں اس نے بڑے گھمنڈ اور غرور کے لہجہ میں لکھا تھا کہ تم لوگوں کی طرف جو لشکر بھیج رہا ہوں یہ مرغیاں اور خنازیر

---

[1] اب جبکہ شام کی فتوحات کا باب ختم ہو رہا ہے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس باب کو لکھتے وقت جو فتوح الشام واقدی کی طرف منسوب ہے وہ بھی ہمارے پیش نظر رہی ہے اس کتاب کو سر ولیم نسرلیس [SIR WILLIAM NASS ARLEES] نے جو اے اسپرنگر کے بعد ۱۸۵۱ء سے ۱۸۸۰ء تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے تھے بڑی تحقیق اور قابلیت سے اڈٹ کیا اور (رائل) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے اس کو شائع کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم اپنی کتاب میں اس سے کچھ زیادہ استفادہ نہیں کر سکے۔ کیونکہ اول تو اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ یہ کتاب درحقیقت واقدی کی ہے بلکہ اگر اس کا ثبوت ہو بھی تو اس میں افسانہ طرازی کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ وہ زیب داستان کا کام تو دیتی ہے تاریخ کا سرمایہ نہیں بن سکتی۔

[2] اس نام کو مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے شہر بازان۔ شہر باز۔ شہر براز اور شہر یران یہ سب روایات ہیں۔

چرانیوالوں کا لشکر ہے۔ اور تمہاری حیثیت یہ ہے کہ میں تمہارے مقابلہ میں اسی درجہ کے لوگ بھیجوں۔ مثنیٰ نے جواب لکھا تو یا تو باغی ہے یا کاذب ہے۔ اگر باغی ہے تو اس کا انجام تیرے حق میں برا ہوگا۔ اور ہمارے لیے اچھا۔ اور اگر کاذب ہے تو جن کاذبوں کو اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عذاب اور دنیا میں سب سے زیادہ رسوائی ہوگی وہ بادشاہ ہیں۔ اس کے بعد لکھا کہ رہی مرغیاں اور خنازیر چرانیوالوں کی بات! تو معلوم ہوتا ہے کہ اب کے دیکھے تیرے پاس اسی درجہ کے لوگ رہ گئے ہیں ہم کو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

کسریٰ کو یہ جواب ملا تو بڑا گھبرایا اور ادھر ایرانیوں کو کسریٰ کے خط کا علم ہوا تو انہوں نے ناراض ہو کر کسریٰ سے کہا کہ نہ آپ ایسا خط لکھتے اور نہ اس کے جواب میں ایسی باتیں سنتے۔ آئندہ کے لئے ان لوگوں نے کسریٰ کو تاکید کی کہ اب جس کسی کو بھی وہ خط لکھے ان سے پوچھ کر لکھے۔

بابل میں دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا ہوئے اور جنگ شروع ہوئی۔ لیکن ہرمز کا ہاتھی جس طرف رخ کرتا تھا مسلمانوں کی فوج کے بادل پھٹ جاتے تھے۔ حضرت مثنیٰ کیلئے یہ صورت حال بڑی تشویش انگیز تھی۔ آخر انہوں نے جو مسلمان ان کے ساتھ تھے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے حکم دیا کہ بیک وقت حملہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھی قتل ہو گیا اور ایرانی شکست خوردہ ہو کر بھاگے۔ مسلمانوں نے مدائن تک ان کا تعاقب کیا۔ جو ایرانی ان کے ہاتھ لگے انہیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا ایک شاعر عبدۃ ابن الطبیب السعدی اسی واقعہ کو اشعار ذیل میں بیان کرتا ہے

حلت خویلة فی حی عهد تهم … دون المدائن فیها الدیك والفیل

یقارعون رؤس العجم ضاحیة … منهم فوارس لا عزل ولا میل

فرزدق کا بھی ایک شعر جس میں اس نے مثنیٰ کے ہاتھوں ہاتھی کے قتل ہونے کا ذکر خصوصیت کیساتھ کیا ہے۔

وبیت المثنیٰ قاتل الفیل عنوةً … ببابل اذ فی فارس ملك بابل

شہر براز کو اس شکست کی اطلاع ملی تو بیمار پڑ گیا اور چند روز کے بعد ہی مر گیا۔ اب ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی دُخت کو بادشاہ بنایا۔ لیکن تاج و تخت اس کے سازگار نہیں آیا جلد ہی معزول کر دی گئی اس کے بعد سابور بن شہریزار بادشاہ ہوا۔

سابور نے فرخ زاد کو وزارت کیلیے منتخب کرلیا۔ اور اس پر اس درجہ مہربان ہوا کہ کسریٰ کی بیٹی آرزمیدخت سے اس کی شادی کر دینے کا ارادہ کرلیا۔ آرزمیدخت کو اس کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئی۔ اور بولی وہ کیا اے بھائی (ابن عم) آپ میرے ہی غلام سے میرا نکاح کرنا چاہتے ہیں،، لیکن سابور نے ذرا پروانہ کی اور آرزمیدخت کو برا بھلا کہہ کر خاموش کر دیا سیاد خش الرازی نام کا ایک بڑا مشہور حملہ باز ایرانی تھا۔ آرزمیدخت نے اس سے ساز باز کرلی۔ چنانچہ شب عروسی میں جب فرخ زاد۔ آرزمیدخت کے کمرہ میں داخل ہوا تو سیاد خش نے اچانک کمین گاہ سے نکل کر حملہ کر دیا اور فرخ زاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس کے بعد سیاد خش آرزمیدخت اور اُن کے ساتھیوں نے سابور کے محل میں گھس کر اُسے قتل کیا اور اس کی جگہ آرزمیدخت کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔

حضرت مثنیٰ کو اس افراتفری اور طوائف الملوکی کی خبریں پہنچیں تو اطمینان ہوا تاہم اگر آج یہ حالت تھی تو ضروری نہیں کہ کل بھی یہی رہے گی۔ اس لیے اس موقع کو غنیمت جان کر انہوں نے اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی اور مدائن جو ایران کا دارالسلطنت تھا اس کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ لیکن ان کے پاس جو فوج تھی وہ مدائن فتح کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کو خط پر خط لکھے کہ کمک روانہ فرما دیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اس وقت کیا کر سکتے تھے۔ پورا اسلامی لشکر تو شام کے محاذ پر کارزار تھا۔ اس لیے بارگاہ خلافت کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا۔ حضرت مثنیٰ کو اس خاموشی سے تشویش ہوئی اور وہ خود مدینہ پہنچ گئے۔ یہاں دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ سخت علیل ہیں اور صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس کے باوجود مثنیٰ کو شرف باریابی عطا فرمایا۔ عراق کے محاذ کی پوری روئیداد سنی اور فوراً حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین منتخب فرما چکے تھے۔ اب حضرت عمرؓ آئے تو ارشاد ہوا۔ "اے عمرؓ! جو کچھ میں کہتا ہوں تم اس کو سنو اور اس پر عمل بھی کرو۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں آج دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اگر واقعی ایسا ہو تو تم شام ہونے سے پہلے پہلے لوگوں کو مثنیٰ کے ساتھ روانہ کر دو۔ اور اگر میں نے شام پکڑ لی تو تم صبح ہونے سے پہلے ایسا

کر گزرو۔ اس کے بعد تاکید کی کہ کوئی مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو۔ بہر حال تم کو دین کے کام اور حکم خداوندی کی بجا آوری سے باز نہ رکھے۔ پھر خود حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عین وفات کے دن بیعت خلافت کے بارے میں جو کچھ کیا تھا اسے یاد دلایا۔ اور آخر میں وصیت کی کہ شام کا معرکہ سر ہو جائے تو خالدؓ کو پھر عراق واپس بُلا لینا [1]

اس کے بعد عراق میں جو فتوحات ہوئیں ان کا تعلق حضرت عمرؓ کے عہد خلافت سے ہے اس لیے وہ اس کتاب کے دائرہ بحث سے خالی ہے یا خارج ہے۔

فتوحات کے اسباب

عراق اور شام کی فتوحات کا حال پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر تاریخ کے ایک طالبعلم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا چاہیئے کہ ایرانی اور رومی یہ دونوں اس عہد کی نہایت عظیم الشان اور ترقی یافتہ سلطنتیں تھیں۔ مال و دولت۔ جاہ و حشم، فوج و سپاہ۔ ان چیزوں کے اعتبار سے مسلمانوں کو ان دونوں حکومتوں کیساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ شام کے معرکہ میں تم نے پڑھا ہے کہ مسلمان افواج کی کل تعداد مل ملا کر چھیالیس ہزار تھی اور اسکے مقابلہ میں کم و بیش دو لاکھ انسانوں کا پہاڑ تھا جو ان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر آلاتِ حرب کے اعتبار سے دونوں میں یہ فرق تھا کہ ایک ایک ایرانی اور رومی فوجی خود۔ زرہ۔ بکتر۔ جلتہ۔ جوشن چار آئینہ۔ آہنی دستانے۔ موزے۔ جہلم۔ برگستوان۔ گوپال۔ گرز۔ تیغ۔ سپر۔ درفہ۔ خنجر زوبین۔ تیر۔ خدنگ۔ کمند۔ سنان وغیرہ سے آراستہ ہوتا تھا۔ ان تمام آلات و اسلحۂ جنگ کی تفصیل فردوسی کے شاہنامہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا کیا حال تھا۔ اُن کے پاس زرہ ہوتی تھی وہ بھی چمڑے کی، رکاب لوہے کے بجائے لکڑی کے ہوتے تھے۔ آلات حرب میں عرب تلوار، نیزہ اور چھوٹے چھوٹے خنجر کے علاوہ کسی اور چیز کو جانتے تک نہیں تھے۔ گھوڑے تھے لیکن اکثروں کے گھوڑوں کو زین تک میسّر نہیں تھی۔ بس جب ان حکومتوں کے جاہ و جلال۔ تہذیب و تمدن۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۶۔

نظم وترتیب اور ترقی ووسعت کا یہ عالم تھا تو پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ چند ہزار بے سروسامان صحرا نشینوں نے ریگستان عرب سے نکل کر دونوں حکومتوں کا تختہ الٹ دیا ہے کہ قیصر وکسریٰ کے قصر عظمت وجلال میں خاک اڑنے لگی۔ ان کے صحیفۂ اقتدار وحکومت کا ورق ورق پریشان ہو گیا۔ اور وہ بھی صرف چند مہینوں کی مدت میں [1]

مغربی مصنفین کے نزدیک ان فتوحات کے اسباب

مغربی مصنفین نے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے جو مختلف جوابات دیئے ہیں ان کا خلاصہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں —

وان کریمر لکھتا ہے :-

"عرب اور عراق وشام کی سرحدوں پر جو عرب قبائل آباد تھے انہوں نے اپنا فائدہ اس میں دیکھا کہ وہ اپنے حلیف و سرپرست حکومتوں سے تعلق منقطع کر کے اپنے ہم قوم عربوں کے ساتھ مل کر ان کا مذہب قبول کر لیں اور اس طرح مال غنیمت میں ان کے شریک ہو جائیں اس طرح مدینہ کا چھوٹا سا لشکر جو عراق و شام میں گھس آیا تھا۔ یک بیک ایک کوہ آتش فشاں بن گیا اور اس کے راستہ میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو پارہ پارہ کر دیا [2]

ول دورنیٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے -

عربوں کی فتوحات کے اسباب بہت سارے ہیں۔ ان کا اقتصادی سبب ہیں۔ پیغمبر اسلام سے ایک صدی پہلے عربوں کا نظام آبپاشی بہت خراب ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے پیداوار بہت کم ہو گئی تھی اس لیے ان میں عراق وشام کی سرسبز زمینوں کو فتح کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ سیاسی سبب یہ تھا کہ رومی اور ایرانی دو حکومتیں اپنی باہمی جنگوں کے باعث تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔

[1] فتوحات کی تکمیل اگرچہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ہوئی ہے۔ جس میں کئی برس لگے۔ لیکن درحقیقت ایران و روم کو ضرب کاری حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی لگ چکی تھی۔ جس سے ان کا پنپنا آسان نہیں تھا۔

[2] THE ORIENT UNDER THE CALIPHS P. 97 -

نظم ونسق حکومت اور امن وامان مفقود تھے۔ لیکن اس کے باوجود مملکت میں بھاری بھاری ٹیکس لگے ہوئے تھے۔ پھر جو نسلی تعلقات حجاز کے اور شام وعراق کی سرحدوں پر آباد قبائل کے درمیان تھے ان کا بھی اس میں بڑا دخل تھا ان پر مزید یہ ہوا بازنطینیوں نے۔ موحدین۔ نسطوری اور دوسرے فرقوں کے ساتھ تعصب اور تشدد کی جس پالیسی پر عمل کیا تھا اس کی وجہ سے شام کی ایک بہت بڑی اقلیت تھی جو ان سے بیزار تھی۔ یہ بیزاری صرف شہری باشندوں میں نہیں تھی بلکہ شامی فوج کے دستے تک اس سے متاثر تھے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے لیڈر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار پیرو تھے۔ جتنا وہ لڑتے تھے اس سے زیادہ دعائیں کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ مقدس جنگ میں جو مارا جاتا ہے اس پر جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں، اس کے علاوہ عرب مسلمان اخلاقی اعتبار سے بھی بہت بلند تھے۔ مسیحی اخلاق اور عقیدہ تثلیث نے مشرق قریب میں جنگ کیلئے وہ آمادگی اور مستعدی باقی نہیں رکھی تھی جو اسلام کی تعلیمات اور عربوں کے جوہر فطری کا خاصہ تھی عرب فوجیں ڈسپلن اور جفاکشی میں ممتاز تھیں اور ان کے قائد بڑے قابل اور لائق تھے یہ لوگ بھوکے پیٹ جنگ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ وحشی نہیں تھے [1] پروفیسر فلنلی اور ویچ (PROF: FLEULEY, WEECH) لکھتے ہیں -

"ایک نئے مذہب (اسلام) نے عربوں میں باہمی اتحاد، جذبہ قیادت اور فتوحات کیلئے ایک زبردست محرک پیدا کر دیا تھا، اس کے علاوہ ان فتوحات کے کچھ اور بھی اسباب ہیں، مثلاً شام کے عربوں کا حجاز کے عربوں کے ساتھ نسلی تعلق اور عین اس وقت جبکہ عرب پھیل جانے کیلئے تیار کھڑے تھے مشرقی رومی سلطنت اور ایرانی حکومت کا مسلسل باہمی جنگوں کی وجہ سے شکستہ حال ہو جانا مشرقی رومی سلطنت نے اپنے دشمن دیرینہ ایران کو شکست فاش ضروری تھی -

[1] THE AGE OF FAITH P. 188 -

لیکن اس کا بہت بڑا خمیازہ اس صورت میں بھگتنا پڑا کہ خود رومی سلطنت میں مذہبی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے علاوہ عرب بڑے بہادر جنگ آزمودہ اور جفاکش زندگی کے عادی تھے" [1]

عہدِ حاضر کا مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز لکھتا ہے

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اسلام کا سیلاب۔ ایرانی۔ رومی۔ یونانی یا مصری بہتر تہذیب کو بہا کر لے گیا تو تم جس قدر جلد اس غلط خیال کو دماغ سے نکال دو اتنا ہی اچھا ہے اسلام کو جو غلبہ اور اقتدار حاصل ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانہ کا ایک بہترین معاشرتی اور سیاسی نظام تھا۔ اسلام جہاں کہیں پہنچا اس کو ایسے لوگ نظر آئے جو سیاسی اعتبار سے اپنی اپنی حکومتوں سے نفرت رکھتے تھے۔ یہ لوگ لٹے کھٹے تھے۔ مظلوم و پامال تھے۔ احمق بنائے ہوئے تھے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر منظم تھے اور جن کی خود غرض اور فاسد حکومتیں ان کیساتھ کوئی رابطہ و تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ اسلام وسیع ترین۔ تازہ ترین اور سب سے زیادہ صاف ستھرا اور پاکیزہ سیاسی فکر تھا جو دنیا میں آیا اور جس نے پوری انسانیت کو ایسا بہتر نظام دیا جو آج تک کسی نے نہیں دیا تھا۔ رومی شہنشاہت کا سرمایا دارانہ اور غلام ساز نظام۔ اور یورپ لٹریچر۔ کلچر۔ اور اس کی سوشل روایات یہ سب کے سب اسلام کے عروج و ارتقاء کے سامنے شکست کھا کر پارہ پارہ ہو گئے۔" [2]

پروفیسر فلپ۔ کے۔ ہٹی لکھتے ہیں۔

"اسلام کا نعرۂ جنگ بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ دنیا کی دو عظیم جنگوں میں نعرۂ جنگ جمہوریت تھا اس کے علاوہ اسلام نے ان قبائل میں اتحاد پیدا کر دیا تھا جو اس سے پہلے کبھی متحد نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کا یہ جوش اور ولولہ بڑی حد تک اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے نتیجہ میں حصولِ جنت کے جذبہ پر مبنی تھا

[1] ورلڈ ہسٹری [2] HISTORY OF THE WORLD P 329 (بقیہ صفحہ ۲۹۷)

تاہم ہلال خصیب کی سرسبز زمین کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہونے کی خواہش بھی بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھی اور ان کے جذبۂ جہاد کی محرک تھی [1]

فتوحات کے اصل اسباب | مغربی مصنفین نے مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا ہے اگرچہ وہ سب صحیح نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ صداقت سے بالکل دور بھی نہیں ہے مسلمان مصنفین اور خاص کر وہ حضرات جو قدیم طرزِ تعلیم کے حامل ہیں ان کا خاصہ ہے کہ اگر کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل مانتا ہے تو وہ چڑ سے جاتے ہیں حالانکہ خود صحابہ کے طرزِ عمل سے ثابت ہے کہ نوآبادکاری میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہونے میں اقتصادی وجوہ کو بڑا دخل ہوتا تھا۔

چنانچہ جنگ ولجہ کے موقع پر حضرت خالدؓ نے جو تقریر کی تھی اس کے متعلق طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

وقام خالد فی الناس خطیباً	حضرت خالد لوگوں کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے
یرغبهم فی بلادِ العجم و	ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو بلادِ عجم کی طرف رغبت
یزهدهم فی بلادِ العرب۔	دلائی اور بلادِ عرب کیطرف سے ان میں بے رغبتی پیدا کی۔

آپ نے عراق کی سرسبزی و شادابی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "کیا تم نہیں دیکھتے۔ یہاں مٹی کے تودوں کی طرح کھانے کے انبار لگے ہوئے ہیں! خدا کی قسم! اگر جنگ سے ہمارا مقصد اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا اور لوگوں کو اس کے دین کی طرف بلانا نہ ہوتا۔ اور صرف معاش ہوتا تب بھی صائب رائے کی بات یہ ہی ہوتی کہ ہم ان سرسبز و شاداب علاقوں کیلئے جنگ کرتے۔ تاکہ ہم ان کے مالک بن جاتے اور بھوک اور قلتِ طعام اُن لوگوں کیلئے چھوڑ دیتے جو سستی اور کاہلی کی وجہ سے تمہاری جدوجہد میں تمہارے شریک نہیں ہیں" [2]

[1] HISTORY OF SYRIA PAGE 419 مغربی مصنفین کے جو حوالے اوپر گزرے ہیں ان کو ڈاکٹر محی الدین نے اپنی قابل قدر کتاب "ابوبکرؓ" میں جو انگریزی زبان میں ہے اور جس کو فیروز سنز لاہور نے شائع کیا ہے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ ہم نے یہ حوالے اختصار کیساتھ اس کتاب سے اخذ کیے ہیں

[2] طبری ج۲ ص ۵۵۹۔

اسی طرح ایک مرتبہ جریر بن عبداللہ البجلی اپنے قبیلے کے سات سو آدمیوں کو لیکر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سب لوگ شام میں آباد ہونا چاہتے ہیں جہاں ہمارے آباؤ اجداد پہلے سے موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مدتم لوگ شام میں آباد ہو کر کیا کروگے۔ اللہ نے اہن کی شان و شوکت کم کر دی ہے۔ ہاں البتہ عراق جاؤ اہل عراق اور اس قوم سے جہاد کرو جو زندگی کی تمام راہوں پر خود قابض ہو کر بیٹھ گئے ہیں، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو انصاف پسندی سے عراق کے اسبابِ معیشت میں تم کو بھی ان لوگوں کا شریک بنا دے اور تم بھی اس کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کر سکو[1]۔

اس کے علاوہ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں ایران اور روم دونوں کی اخلاقی حالت انتہا درجہ سقیم اور زبوں تھی۔ حکمران طبقہ عوام پر ظلم و ستم کرتا اپنے عیش و آرام کیلئے ان پر بھاری بھاری ٹیکس لگانا اپنا موروثی اور طبعی حق سمجھتا تھا۔ ایران میں مزدکی تعلیم نے اور شام میں عیسائیت کی محرف شکل اور مذہبی پیشواؤں کی اقتدار پسندی نے ملک بھر میں منکرات و فواحش کو عام کر دیا تھا اور اس کے بالمقابل ہر ہر مسلمان عرب اخلاق و مکارم کا نمونہ تھا اس بنا پر بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے قانونِ فطرت کے مطابق مسلمانوں کے سامنے ان دونوں کا شکست کھانا یقینی امر تھا قرآن مجید میں ہے

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ

ہر قوم کی ایک مدت ہوتی ہے جب وہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو پھر نہ ایک گھڑی آگے ہو تے ہیں نہ پیچھے

ان اقتصادی اور اخلاقی اسباب کے علاوہ جہاں تک مادی اسباب کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ان فتوحات میں حضرت خالد بن الولید کی غیر معمولی شجاعت و بسالت۔ حیرت انگیز فوجی تدبر اور جنگی فراست و دور اندیشی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ تم پڑھ آئے ہو کہ واقعہ میں مسلمان اور رومی فوجیں کم و بیش تین ماہ تک ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور معمولی جھڑپوں کے علاوہ کسی طرف سے بھی کوئی بڑا اقدام نہیں ہوا۔ لیکن حضرت خالدؓ نے پہنچتے

[1] طبری ج ۲ ص ۶۴۷ ذکر واقعہ البویب۔

ہی میدان کارزار کا نقشہ بدل دیا اور کل چھیالیس ہزار فوج سے دو لاکھ سے زائد رومیوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔

یہ جو کچھ کہا گیا اپنی جگہ سب مسلم اور درست ہے۔ لیکن درحقیقت فتوحات کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی جنگ اللہ کیلئے۔ اور ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات کی تکمیل کی غرض سے تھی۔ اس بنا پر جو بے نفسی، بے غرضی، اور مخلصانہ جوش اور ولولہ ان میں ہو سکتا تھا کسی اور میں نہ تھا۔ پھر قرآن مجید کی آیات اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات جو عراق و شام کی فتوحات سے متعلق تھے ان سب نے مسلمانوں میں اس درجہ یقین و اطمینان اور اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ بڑے سے بڑے خطرات میں بھی محصور ہو کر گھبراتے نہیں تھے ایک انسان کو سب سے زیادہ خوف موت کا ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے عقیدہ میں یہ موت جو اللہ کے راستہ میں آئے موت نہیں بلکہ عین حیات اور اصل زندگی تھی۔ پھر فطرتاً و طبعاً جو جفا کشی۔ سخت کوشی اور مصائب میں نہ گھبرانے کا ملکہ عربوں میں تھا۔ ایران اور روم کے خوش عیش سپاہیوں سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

مرض الموت اور وفات

اتوار کا دن تھا جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کی ساتویں تاریخ تھی اس روز سردی شدید تھی حضرت ابوبکرؓ نے غسل کیا اور اس کے بعد ہی بخار ہو گیا جو وفات کے روز تک مسلسل پندرہ دن چڑھا رہا۔ ہر چند معالجہ کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لوگ حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کرتے تھے کہ آپ نے طبیب کو بھی دکھایا؟ فرماتے وہاں اس نے مجھ کو دیکھا ہے،، پھر پوچھتے وہ کیا کہتا ہے،، جواب دیتے وہ کہتا ہے کہ انی فعال لما اشاء،، جو میں چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ ضعف اتنا شدید ہو گیا کہ باہر نماز کیلئے بھی نہیں جا سکتے تھے تو حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں۔

بعض روایتوں میں مرض کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حارث بن کلدہ کیساتھ حضرت

ابوبکرؓ کو ایک یہودی نے چاول میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا۔ یہ سال بھر کے بعد اس زہر کا اثر تھا[1] حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ دراصل حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا غم اس قدر شدید ہوا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھلتے اور پگھلتے رہے انکو اس سے پنپنا نصیب نہیں ہوا تمام صحابہ کرام کو اس سے سخت تشویش تھی۔ عیادت کیلئے آتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ حضرت عثمانؓ پڑوس میں ہی رہتے تھے اس لیے صحابہ میں سب سے زیادہ تیمارداری کا شرف انہیں کو حاصل ہوا[2]

جانشینی کے لئے مشورہ لیکن بیماری کی اس شدت کے باوجود کیا مجال تھی کہ امورِ خلافت و امامت اور مسلمانوں کے اہم معاملات کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی۔ اس وقت سب سے اہم معاملہ آپ کی جانشینی تھا۔ آپ کے سامنے وقت کا اہم سوال تھا کہ اگر خود کسی کی نامزدگی نہیں کرتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ فتنہ و فساد ہو اور نامزدگی کریں تو کس کی؟ ایک سے ایک بڑھ کر معدنِ اسلام کا لعل و گوہر تھا۔ اگرچہ آپ کا ذاتی رجحان حضرت عمرؓ کی طرف تھا۔ لیکن اکابر صحابہ سے مشورہ کیے اور ان کی رائے معلوم کیے بغیر اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آئے تو ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ :۔ عمرؓ کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ :۔ آپ مجھ سے ایک ایسی بات پوچھتے ہیں جس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

ابوبکرؓ :۔ پھر بھی! آخر تمہاری رائے بھی تو معلوم ہو۔

عبدالرحمٰنؓ :۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ بہترین آدمی ہیں۔ لیکن مزاج میں سختی اور تشدد ہے۔

ابوبکرؓ :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھ کو نرم دیکھتے ہیں جب انکو خلافت مل جائے گی تو وہ خود سختی چھوڑ دیں گے۔

اس کے بعد حضرت عثمان بن عفانؓ آئے تو ان سے گفتگو اس طرح ہوئی۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۱ [2] طبری ۶۱۲۔

ابوبکرؓ :۔ عمرؓ کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟

عثمانؓ :۔ اس بات کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

ابوبکرؓ :۔ اے ابوعبداللہ! میں تم سے تمہاری اپنی رائے پوچھتا ہوں مجھ کو بتاؤ۔

عثمانؓ :۔ مجھ کو اتنی بات معلوم ہے کہ عمرؓ کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ان جیسا ہم میں کوئی نہیں ہے۔

پھر حضرت اسید بن حضیر آئے اور ان سے ان کی رائے دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا "میں آپ کے بعد عمرؓ کو بہترین آدمی سمجھتا ہوں، وہ خوش ہونے کی باتوں میں خوش اور ناراض ہونے کی باتوں پر ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے آپ کے بعد خلافت کا مستحق ان سے زیادہ قوی اور مضبوط دوسرا کوئی اور نہیں ہو سکتا"

ان کے علاوہ سعید بن زید اور اکابر مہاجرین و انصار سے بھی آپ نے مشورہ کیا اور سب نے حضرت عمرؓ کے حق میں رائے دی۔ لیکن باہر لوگوں میں اس کا چرچا ہوا کہ حضرت عمر خلیفہ ہونیوالے ہیں تو طلحہ بن عبداللہ آئے اور بولے "اے ابوبکرؓ! آپ کو معلوم ہے کہ عمر کے مزاج میں کس قدر تشدد اور سختی ہے، اس کے باوجود آپ ان کو اپنا جانشین نامزد کر رہے تو کل اپنے پروردگار کو جب وہ آپ سے باز پرس کرے گا کیا جواب دیں گے"

حضرت ابوبکر لیٹے ہوئے تھے۔ طلحہ کی زبان سے یہ بات سن آپ کو طیش آگیا، بولے "ذرا مجھ کو بٹھا دو"، لوگوں نے بٹھا دیا تو فرمایا "کیا تم مجھ کو میرے پروردگار سے ڈراتے ہو؟ میں جب اپنے رب سے ملوں گا اور وہ مجھ سے سوال کرے گا تو میں کہوں گا کہ اے خدا! میں نے تیرے بندوں پر ایک تیرے بہترین بندہ کو خلیفہ مقرر کیا ہے"[1]

حضرت عمر کی نامزدگی جب سب لوگ چلے گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا حضرت عمرؓ کی جانشینی کا پروانہ لکھیں، وہ قلم دوات لیکر بیٹھے تو حضرت نے کہا لکھو۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافۃ الی المسلمین۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲

امابعد : یہیں تک بولنے پائے تھے کہ غشی طاری ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ کو پہلے سے معلوم تو تھا ہی۔ انہوں نے اس خیال سے کہ اگر اس بے ہوشی کے عالم میں حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوگئی اور یہ پروانہ یوں ہی نامکمل رہا تو کہیں ملک میں کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے امابعد کے بعد از خود استخلفت علیکم عمر بن الخطاب ولم آل لکم خیرًا۔ (میں نے تم پر عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنادیا ہے۔ اور میں نے اس معاملہ میں تمہاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی) کی عبارت لکھ لی۔ اب حضرت ابوبکرؓ کو غشی سے افاقہ ہوا اور حضرت عثمان نے ان کو یہ عبارت پڑھ کر سنائی تو حضرت ابوبکرؓ نے خوشی میں اللہ اکبر کہا اور حضرت عثمان کو دعا دی۔ پھر حضرت عثمانؓ کو ہی حکم ہوا کہ لوگوں کو سنادیں۔ حضرت عثمان کی دعوت پر سب جمع ہوگئے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک خاص غلام کے ہاتھ یہ پروانہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے۔ مجمع میں شور و غل تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر کہ مسلمانو! خلیفہ رسول کا ارشاد سنو، ان کو خاموش کردیا تو حضرت عثمان نے پروانہ پڑھ کر سنایا۔ سب نے بطیب خاطر اسے قبول کیا اتنے میں خود حضرت ابوبکرؓ بالاخانہ پر تشریف لے آئے۔ اور پوچھا "لوگو! میں نے تم پر جس کو خلیفہ مقرر کیا ہے وہ میرا عزیز قریب نہیں بلکہ عمرؓ ہیں۔ تم ان کو قبول کرتے ہو؟ سب نے بیک آواز کہا "سمعنا واطعنا"

حضرت عمرؓ کو وصایا و نصائح

اس سے فارغ ہوکر حضرت عمرؓ کو بلایا اور فرمایا میں نے تم کو رسول اللہؐ کے اصحاب پر خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اس کے بعد اُن کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی وصیت کی اور پھر حسب ذیل تقریر کی جو فصاحت و بلاغت، جوشِ خطابت اور علم و حکمت کا گنجینہ ہے اس لیے ہم اصل تقریر مع ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

یاعمر ان للہ حقاً باللیل لایقبله فی النهار وحقاً فی النهار لایقبله باللیل وانه لایقبل نافلة حتی تودی الفریضة الم تر یاعمر انما ثقلت موازین من ثقلت موازینه

اے عمرؓ! یقین جانو کہ اللہ کا جو حق شب میں ہے وہ اس کو دن میں قبول نہیں کرے گا اور جو حق دن سے متعلق ہے اللہ اس کو شب میں قبول نہیں کرے گا (یعنی ہر عمل اس کے وقت پر کرنا چاہیئے) اور اللہ نفل اس وقت تک

یوم القیامة باتباعهم الحق وثقله علیهم، وحق المیزان ان لایوضع فیه غدًا الاحق ان یکون ثقیلا، الم تر یاعمر انما خفت موازین من خفت موازینه یوم القیامة باتباعهم الباطل؟ وخفته علیهم وحق للمیزان ان لا یوضع فیه الا باطل ان یکون خفیفًا الم تر یاعمر انما نزلت الرخاء مع الشدة وآیة الشدة مع الرخاء لیکون المومن راغبًا راهبًا، لایرغب رغبة یتمنی فیها علی اللہ مالیس له ولا یرهب رهبة یلقی فیها بیدیه الم تر یاعمر، انما ذکر اللہ اهل النار باسوأ اعمالهم فاذا ذکرتهم قلت انی لارجو ان لا اکون منهم؟ وانه انما ذکر اهل الجنة باحسن اعمالهم لانه تجاوز لهم عما کان من شیٔ فاذا ذکرتهم قلت این عملی من اعمالهم؟ فان حفظت وصیتی فلا یکون غائب احب الیك من حاضر من الموت ولست بمعجزه [1]

نہیں کرے گا جب تک تم فرض ادا نہ کرو۔ اے عمر! کیا تم نہیں دیکھتے کہ دراصل ترازو ان ہی لوگوں کی بھاری ہے جنکی ترازو قیامت کیدن حق کی پیروی کرنے کی وجہ سے بھاری ہو۔ اور حق بھی یہی ہے کہ کل قیامت کیدن جس ترازو میں حق کے سوا کچھ اور نہ ہو اس کو ہی بھاری ہونا چاہیے اس کے برعکس اتباع باطل کی وجہ سے جن لوگوں کی ترازو قیامت کے دن ہلکی ہوگی ان کی ترازو ہلکی ہوگی اور جس ترازو میں باطل کے سوا کچھ اور نہ ہو اس کو ہلکا ہی ہونا چاہئے۔ اے عمرؓ! کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا میں تنگی اور فراخی کی آیات ایک ساتھ اتری ہیں تاکہ مؤمن میں خوف بھی ہو اور رجا بھی مگر ہاں مومن کو اللہ سے ایسی ہی چیز کی تمنا اس کی رغبت کرنی چاہیے جو اس کا حق ہو اور اسی طرح اس کو ایسا خوف نہیں کرنا چاہیئے کہ پھر وہ خود ہی اپنے ہاتھوں اس میں واقع ہو جائے (یعنی آدمی خوف کرے تو اسے چاہیئے کہ اس سے بچے بھی) اے عمرؓ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اہل دوزخ کا ذکر انکے بدترین اعمال کیساتھ کیا؟ جب تم انکو یاد کروگے تو کہو گے میں امید کرتا ہوں کہ میں ان میں سے نہیں ہوں گا۔ اللہ نے اہل جنت کا ذکر انکی بہترین اعمال کیساتھ کیا ہے کیونکہ ان کے جو برے اعمال تھے اللہ نے ان سے درگزر فرمایا جب تم ان لوگوں کو یاد کروگے تو کہو گے میرا عمل ان جیسا کہاں ہے اگر تم نے میری وصیت یاد رکھی تو ایسا غائب جو تم کو حاضر کی نسبت زیادہ محبوب ہو موت کے سوا" اور کچھ نہ ہوگا (یعنی موت تم کو سب سے زیادہ محبوب ہوگی) درآں حالیکہ تم موت کو عاجز کرنے والے نہیں ہو

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲ - ۲۹۳ -

حضرت مثنیٰ جب عراق سے مزید امدادی فوج طلب کرنے کی غرض سے مدینہ آئے تو حضرت ابوبکرؓ اس وقت تک حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر چکے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰ کی طلب پر حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر عراق مزید فوج بھیجنے کا بندوبست کیا جائے۔

ذاتی معاملات کی طرف توجہ قوم وملت کے ان مسائل سے فارغ ہونے کے بعد ذاتی اور خانگی امور و معاملات کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ نے حضرت عائشہ کو ایک جاگیر دی تھی۔ اب خیال آیا کہ اس سے دوسرے وارثوں کی حق تلفی ہو گی اس لئے فرمایا "بیٹی! امیری اور غریبی دونوں حالتوں میں تم مجھ کو سب سے زیادہ عزیز رہی ہو۔ میں نے تم کو جو جاگیر دی تھی کیا تم اس میں اپنے بھائی بہنوں کو شریک کر سکتی ہو؟ حضرت عائشہ نے اس کو بخوشی کر لیا۔

اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ پوچھا "مجھ کو (خلیفہ ہونے کے بعد سے) اب تک بیت المال میں سے کل وظیفہ کتنا ملا ہے؟ حساب کر کے بتایا گیا "چھ ہزار درہم" ہندوستانی سکہ کے حساب سے کم وبیش ڈیڑھ ہزار روپیہ، حکم فرمایا کہ میری فلاں زمین فروخت کر کے یہ روپیہ بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔ پھر دریافت کیا "میرے مال میں بیعت کے بعد سے کتنا اضافہ ہوا؟ پتہ چلا کہ

(۱) ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھلاتا ہے "اور ساتھ ہی مسلمانوں کی تلواروں پر صیقل کرتا ہے

(۲) ایک اونٹنی جس پر پانی لایا جاتا ہے اور (۳) ایک چادر جو سوا روپیہ کے لگ بھگ دام کی ہو گی ارشاد ہوا کہ یہ تینوں چیزیں وفات کے بعد خلیفۂ وقت کی خدمت میں بھیجدی جائیں اس حکم کی تعمیل میں جب یہ چیزیں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہونچیں تو بیساختہ جی امنڈ آیا۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے "اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کیلئے کام بہت دشوار چھوڑ گئے"[1]

معیقیب دوسی ابوبکرؓ کے گھر کے منتظم تھے وہ خود بیان کرتے ہیں: حضرت ابوبکر کے مرض وفات میں حاضر ہوا تو میں نے سلام کیا اس وقت حضرت ابوبکرؓ استخلاف کے معاملہ میں مصروف تھے۔ اس سے فارغ ہو گئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "اے معیقیب تم ہمارے گھر کے منتظم تھے۔ بتاؤ میرا اور تمہارا کیا حساب ہے؟ میں نے عرض کیا "میرے

[1] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۱۳۹

پچیس درہم آپ کے ذمہ باقی ہیں وہ میں نے آپ کو معاف کئے" فرمایا "چپ رہو اور میرے توشہ آخرت کو قرض سے مت تیار کرو" یہ سن کر میں رونے لگا۔ صدیق اکبر نے فرمایا "معیقیب! آنسو نہ بہاؤ اور گھبراؤ نہیں۔ صبر کرو میں امید کرتا ہوں کہ میں اس جگہ جا رہا ہوں جو میرے لیے بہتر اور پائیدار رہے گا" ہے اس کے بعد عائشہ صدیقہ کو بلا کر حکم دیا کہ مجھ کو پچیس درہم ادا کر دیئے جائیں[1]

تجہیز وتکفین کے متعلق وصیت حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟ بولیں "تین کپڑوں میں" حضرت ابوبکرؓ اس وقت جو دو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "تو بس میرے یہ دونوں کپڑے ہیں ہی اور ایک تیسرا کپڑا بازار سے خرید کر مجھ کو کفن دیدینا" ام المؤمنین نے کہا "اباجان! ہم تینوں نئے کپڑے بازار سے خرید سکتے ہیں" ارشاد ہوا "بیٹی نئے کپڑوں کے زندہ لوگ بہ نسبت مردوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ کفن کے دونوں کپڑے تو لہو اور پیپ کیلئے ہیں (خراب ہونے کیلئے)"[2]

اپنی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس کو وصیت کی کہ مجھ کو غسل تم ہی دینا۔ انہوں نے کہا مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا" فرمایا "تمہارا بیٹا عبدالرحمٰن بن ابی بکر تمہاری مدد کرے گا وہ پانی ڈالتا رہے گا"[3]

اس کے بعد دریافت کیا کہ آج کون سا دن ہے" لوگوں نے کہا "دوشنبہ" پھر پوچھا رسول اللہ کی وفات کس روز ہوئی تھی؟ جواب ملا "دوشنبہ کے روز" ارشاد ہوا "تو پھر میں امید کرتا ہوں کہ میری بھی آج کے دن ہی موت ہو گی"[4] پھر وصیت کی کہ میری قبر رسول اللہ کے پہلو میں بنائی جائے۔

ان وصیتوں سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سکرات موت شروع ہو گئے عین اس وقت جبکہ جانکنی کا وقت تھا حضرت عائشہ جو سرہانہ بیٹھی تھیں حسرت سے یہ شعر پڑھنے لگیں

وابیض نستسقی الغمام بوجهه　　ثمال الیتامی عصمة للارامل

وہ پُر نور صورت جس کے چہرہ کا صدقہ دیکر بادلوں سے بارش مانگی جائے جو یتیموں پر مہربان ہو اور فقیروں کی پناہ ہو حضرت ابوبکرؓ کے کان میں یہ شعر پڑا تو چونکہ شاعر نے یہ شعر آنحضرتؐ کی شان

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۴۱ [2] طبری ج ۲ ص ۶۱۳ [3] ایضاً [4] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۱۲۶

میں کہا تھا اس لیے ان کے جذبۂ احترام و ادبِ نبوی ؐ نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہی شعر اُن کیلئے بھی پڑھا جائے۔ فوراً آنکھیں کھولدیں اور بولے "یہ شان تو صرف رسول اللہ ؐ کی تھی۔

اسی شدت و کرب کے عالم میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی زبان پر بےساختہ یہ شعر جاری ہوگئے۔

وکل ذی ابل موروث — وکل ذی سلب مسلوب
وکل ذی غیبة یؤوب — وغائب الموت لا یؤوب

(اور ہر اونٹ والے کو ایک دن اپنا مال وراثت کو سونپنا ہے اور ہر لوٹنے والے کو خود لٹنا ہے اور ہر غائب ہونے والا واپس آجاتا ہے۔ لیکن موت کا غائب واپس نہیں ہوتا)

حضرت ابوبکرؓ نے یہ شعر سنے تو فوراً فرمایا "نہیں بیٹی! بلکہ اصل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے"

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ

اور موت کی سجانکنی حق کیساتھ آگئی یہ وہی ہے جس سے تو کتراتا تھا۔

آخر وہ گھڑی بھی آگئی جو مقرر تھی۔ ایک ہچکی آئی اور خلافت و امامت کا آفتاب عالمتاب دنیا سے روپوش ہوگیا۔ آخر وقت زبانِ مبارک پر یہ دعا تھی۔

رَبِّ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ

اے رب تو مجھ کو مسلمان اٹھا اور صالحین کیساتھ حشر کر۔

۲۲ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳ھ بروز دوشنبہ مغرب اور عشاء کے درمیان وفات ہوئی تھی۔ شب میں ہی وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا۔ حضرت عمرؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر حضرت عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے قبر میں اتر کر اس طرح آنحضرت ؐ کے مرقدِ انور کے پہلو میں لٹا دیا کہ آپ کا سر حضورِ اقدس ؐ کے شانۂ مبارک تک آتا تھا اللہ اکبر آقائے دو شہنشاہِ کونین کا ادب و احترام کا مرنے کے بعد بھی یہ اہتمام ہے کہ برابر نہ ہوں بجائے ہمدوش ہونے کے زیرِ سایہ دوش ہی ہو کر رہیں گے

۱؎ طبری ج ۲ ص ۶۱۴

رضی اللہ عنہم و رضو عنہ وفات کے وقت عمر ۶۳ برس تھی۔ مدتِ خلافت دو برس تین مہینے اور گیارہ دن ہے۔

صحابۂ کرام میں صفِ ماتم

خلیفۂ رسول کی وفات آنحضرت ؐ کی وفات کے بعد پہلا حادثہ تھا جس نے مدینہ کے بام و در پر لرزہ ڈالدیا اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جو شخص حضرت ابوبکرؓ کے جتنا قریب تھا ان کی خوبیوں کے براہِ راست علم کی وجہ سے اسی قدر اس کو زیادہ ملال تھا۔ اس سلسلہ میں ہم چند اکابر صحابہ کی تقریروں کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی تقریر طویل ہے۔ لیکن ہم بعینہٖ اس کو اس لیے درج کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے باہمی تعلقات کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی ہے اس تقریر سے ان کے خیال کی اصلاح ہو گی۔

حضرت علیؓ کا تعزیتی خطبہ

حضرت علیؓ کو خلیفۂ رسول ؐ کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی تو فوراً اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ پڑھتے ہوئے مکان سے باہر تشریف لے آئے اور فرمایا۔

الیوم انقطعت خلافة النبوة — آج خلافتِ نبوت کا انقطاع ہوگیا۔

اور پھر جس مکان میں حضرت ابوبکرؓ کی نعش تھی اس کے دروازہ پر کھڑے ہو کر مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا جو فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہونے کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ کی حیاتِ طیبہ کا ایک نہایت حسین و جمیل اور ایمان افروز مرقع بھی ہے آپ نے فرمایا

یرحمك الله یا ابا بکر کنت الف رسول الله وانسه ومستراحة وثقته وموضع سره ومشاورته۔ کنت اول القوم اسلاماً واخلصهم ایماناً واشد هم یقیناً واخوفهم لله واعظمهم غناءً فی دین الله واحوطهم علی رسول الله صلی الله علیه وسلم واحد بهم

اے ابوبکر! خدا تم پر رحم کرے تم رسول اللہ کے محبوب مونس۔ راحت۔ معتمد اور ان کے محرمِ راز و مشیر تھے اور تم سب سے پہلے اسلام لائے اور تم سب سے زیادہ مخلص مومن تھے تمہارا یقین سب سے زیادہ مضبوط تھا تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف کرنے والے اللہ کے دین کے معاملہ میں سب سے زیادہ بےنیاز یعنی دوسری چیزوں کی پرواہ نہ کرنے والے رسول اللہ کے نزدیک سب

على الاسلام وامنهم على اصحابه و
احسنهم صحبة واكبرهم مناقبًا و
افضلهم سوابق وارفعهم درجة
واقربهم وسيلة واشبههم برسول الله
هديًا وسمتًا ورافة وفضلاً واشرفهم
منزلة واكرمهم عليه واوثقهم
عنده فجزاك الله عن الاسلام وعن
رسوله خيرًا كنت عنده بمنزلة
السمع والبصر صدّقت رسول الله
حين كذبه الناس فسماك الله عزوجل
فى تنزيله صديقًا فقال والذى جاء
بالصدق وصدّق به الذى جاء
بالصدق محمد وصدق به ابوبكر
واسيته حين بخلوا وقمت به عند
المكاره حين عنه قعدوا
وصحبته فى الشدة اكرم الصحبة
ثانى اثنين وصاحبه
فى الغار والمنزّل
عليه

سے زیادہ معتبر۔ اسلام پر سب سے زیادہ
مہربان۔ رسول اللہؐ کے ساتھیوں کیلئے سب
سے زیادہ بابرکت رفاقت میں اُن سب سے بہتر
مناقب اور فضائل میں سب سے بڑھ چڑھ کر
پیش قدمیوں میں سب سے افضل دیرتر درجہ
میں سب سے اونچے اور وسیلہ کے اعتبار سے
آنحضرتؐ سے سب سے زیادہ قریب اور آنحضرتؐ
سے سب سے زیادہ مشابہ سیرت میں عادت میں
مہربانی اور فضل میں، صحابہ میں سب سے
زیادہ اونچے مرتبہ والے اور حضورؐ کے نزدیک
سب سے زیادہ مکرم اور معتمد تھے۔ پس اللہ
اسلام اور اپنے رسولؐ کی طرف سے تم کو جزائے
خیر عطا فرمائے تم آنحضرتؐ کیلئے بمنزلہ گوش
وچشم تھے تم نے حضورؐ کی تصدیق اس وقت کی جبکہ
لوگوں نے آپ کی تکذیب کی۔ اس لئے اللہ
تعالیٰ نے اپنے کلام میں تم کو صدیق کہا ہے چنانچہ
فرمایا والذی جاء بالصدق وصدق بہ سچائی
لانے والے محمدؐ ہیں اور اس کی تصدیق کرنیوالے ابوبکر
تم نے حضورؐ کیساتھ غمخواری اس وقت کی جبکہ لوگوں
نے بخل کیا اور تم ناگوار باتوں کے وقت حضورؐ کیساتھ اس وقت بھی کھڑے رہے جبکہ لوگ آپ سے
بچھڑ گئے۔ تم نے سختیوں میں بھی حضورؐ کے ساتھ صحبت ورفاقت کا حق باحسن وجوہ ادا
کیا۔ تم ثانی اثنین اور رفیق غار (ثور) تھے اور تم پر سکون نازل ہوا تھا۔

السكينة ورفيقه الهجرة وخلفته
فى دين الله وامته احسن الخلافة
حين ارتد الناس وقمت بالامر
مالم يقم به خليفة نبى فنهضت
حين وهن اصحابك وبرزت
حين استكانوا وقويت حين
ضعفوا ولزمت منهاج رسول
الله صلى الله عليه وسلم اذا
هموا كنت خليفة حقًا لم
تنازع ولم تصدع
بزعم المنافقين وكبت
الكافرين وكره الحاسدين
وغيظ الباغين وقمت بالامر
حين فشلوا وثبتّ اذ تضعضعوا
ومضيت بنور الله اذ وقفوا
فاتبعوك فهدوا وكنت اخفضهم
صوتًا واعلاهم فوقًا واقلهم
كلامًا واصوبهم منطقًا و
اطولهم صمتًا وابلغهم قولا
واشجعهم نفسًا واعرفهم بالامور
واشرفهم عملا كنت والله للدين
يعسوبا اولا حين نفر

تم ہجرت میں آپ کے رفیق تھے اور اللہ کے
دین میں اور رسول اللہؐ کی امت پر۔ تم آپؐ کے ایسے
خلیفہ تھے جس نے اس وقت خلافت کا حق ادا کر دیا جبکہ
لوگ مرتد ہو گئے تھے اور تم نے خلافت کا وہ حق ادا
کیا جو کسی پیغمبر کے خلیفہ نے نہیں کیا تھا۔ چنانچہ تم نے
اس وقت مستعدی دکھائی جبکہ تمہارے ساتھی سست
ہو گئے اور تم نے اس وقت جنگ کی جبکہ وہ عاجز ہو گئے
تھے جب وہ کمزور تھے تو تم قوی رہے اور تم نے رسولؐ
اللہ کے راستہ کو اس وقت تھامے رکھا جبکہ لوگ پست
ہو گئے تھے تم بلا نزاع وتفرقہ خلیفۂ حق تھے اگرچہ
اس سے منافقوں کو غصہ، کفار کو رنج حاسدوں
کو کراہت اور باغیوں کو غیظ تھا۔ تم امر حق پر ڈٹے
رہے جبکہ لوگ بزدل ہو گئے اور تم ثابت قدم رہے
جب وہ ڈگمگا اُٹھے تم اللہ کے نور کو لیے بڑھتے
رہے۔ جب لوگ کھڑے ہو گئے آخر کار انہوں
نے آپ کی پیروی کی اور ہدایت پائی۔ آپ کی آواز
ان سب سے زیادہ پست تھی۔ مگر آپ کا مرتبہ
ان سب سے اونچا تھا۔ تمہارا کلام سب سے زیادہ
سنجیدہ تھا۔ سب سے زیادہ تمہاری گفتگو درست
تھی آپ سب سے زیادہ خاموش رہنے والے تھے
آپ کا قول سب سے زیادہ بلیغ تھا۔ شجاعت میں
آپ سب سے بڑھے ہوئے تھے معاملات کو سب سے زیادہ سمجھنے
والے تھے اور بخدا دین کے اولین سردار تھے۔ جب لوگ دین سے ہٹے تو آپ آخری سردار تھے جب وہ دین کی طرف متوجہ

رے گو کمزور لیکن اللہ
ں کے اعتبار سے متواضع
نکھوں اور دلوں میں
نسبت نہ کوئی طنز کرتا تھا
یں نہ کسی کو طمع تھی اور نہ
ں اور پست آدمی تمہارے
تھے اور قوی تمہارے
ں سے حق لیتے تھے اور دو
ی نگاہ میں یکساں تھے
ق ہوتا تھا وہی تمہارا سب
ان حق سچائی اور نرمی
لم بردباری اور دوراندیشی
ھا اب آپ دنیا سے رخصت
مشکل آسان ہو گئی آگ بجھ
ی ہو گیا اسلام اور مسلمان
لب آگیا۔ اگرچہ کافروں کو
لعنت پیش قدمی کی اور
تم خیر سے کامیاب ہوئے تم
لکا کیا تم نے تمہاری موت کی
ی طرح محسوس کی جا
بت نے تو تمام دنیا

عربی	اردو
فی السماء وھدت مصیبتک الانام	ہم سب اللہ کیلئے ہیں اسی کی طرف لوٹنے والے
فانا للہ وانا الیہ راجعون ورضینا	ہیں اللہ کی قضا پر ہم راضی ہیں ہم نے اپنا معاملہ اس کے سپرد
عن اللہ قضاہ وسلمنا لہ امرہ	کر دیا ہے بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے
فواللہ لن یصاب المسلمون بعد	بعد تمہاری موت جیسا کوئی حادثہ مسلمانوں پر کبھی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	نازل نہیں ہوا۔ تم دین کی عزت۔ جائے پناہ اور حفاظت
بمثلک ابدا کنت للدین عزا وحرزا و	گاہ تھے مومنوں کیلئے ایک گروہ۔ قلعہ اور دار الامن
کھفا و للمؤمنین فئۃ وحصنا وغیثا	تھے۔ منافقوں کے واسطے تشدد اور غضب
وعلی المنافقین غلظۃ وغیظا فالحقک	تھے۔ پس اللہ تم کو تمہارے نبی سے ملا دے
اللہ بنبیک صلی اللہ علیہ وسلم ولا	اور ہم کو تمہارے بعد تمہارے اجر سے
حرمنا اجرک ولا اضلنا بعدک فانا	محروم اور گمراہ نہ کرے
للہ فانا الیہ راجعون۔ [1]	فانا للہ وانا الیہ راجعون ط

جب تک حضرت علیؓ یہ خطبہ پڑھتے رہے سب لوگ جو وہاں موجود تھے خاموش رہے لیکن خطبہ ختم ہوتے ہی سب بے تحاشا اس طرح روئے کہ چیخیں نکل گئیں اور سب نے بیک آواز کہا " ہاں بیشک اے رسول اللہ کے داماد آپ نے سچ فرمایا "

حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

" اے ابا! اللہ آپ کو سرسبز و شاداب کرے اور آپ کو آپ کی بہترین کوششوں کا بدلہ عطا فرمائے۔ آپ نے دنیا سے منہ موڑا تو اس کو ذلیل کر دیا۔ اور آخرت کا رخ کیا تو آپ نے اس کو عزت بخشدی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کا حادثۂ وفات سب سے بڑا حادثہ ہے لیکن بہرحال اللہ کی کتاب ہم کو حکم کرتی ہے کہ ہم صبر کریں اور یہ صبر ہی آپ کی وفات کا سب سے اچھا عوض ہے اور میں اللہ سے امید کرتی ہوں کہ وہ مجھ کو میرے صبر کا بدلہ دے کر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

[1] الریاض النضرۃ المحب الطبری ج ۱ ص ۱۸۳ تا ۱۸۴

حضرت علیؓ کا یہ خطبہ تھوڑے سے بہت لفظوں کے اختلاف کیساتھ منتخب کنز العمال بر مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۴۶ پر بھی ہے

اے ابا! آپ اپنی اس بیٹی کا آخری سلام قبول کیجیے جس نے آپ کی زندگی میں کبھی آپ کے ساتھ پرخاش نہیں رکھی اور اب آپ کے مرنے پر وہ جزع و فزع نہیں کر رہی ہے "

حضرت عمرؓ فاروق گھر میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کی نعش کو خطاب کرکے فرمایا

" اے خلیفۂ رسول اللہ! آپ نے دنیا سے رخصت ہو کر قوم کو سخت محنت و مشقت میں مبتلا کر دیا۔ آپ کا سا ہونا تو درکنار۔ اب تو کوئی ایسا بھی نہیں جو آپ کی گرد تک پہنچ سکے "

آنحضرت ﷺ کی بشارت | یہ نوحۂ ماتم تو اس عالم آب و گل میں برپا تھا۔ لیکن عالم ملکوت میں اس وقت کیا ہو رہا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا۔ کہ خود حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی۔

عربی	اردو
یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ	اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف
اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً	ہنسی خوشی چلا آ۔

اور پھر عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا خوب ارشاد ربانی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ہاں! اے ابوبکر! جب تم کو موت آئیگی تو اس وقت جبرئیل امین تم سے یہی کہیں گے [1]

نظامِ حکومت

آج کل کا سب سے ترقی یافتہ اور مہذب طرز حکومت جمہوری ہے۔ اس لیے ہمارے مسلمان مصنفین اور ارباب قلم بھی عام طور پر یہی کہنے لگے ہیں کہ اسلام خود جمہوری طرز حکومت کا قائل ہے اور خلفائے راشدین کا طرزِ حکومت بھی جمہوری تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید، سنت رسول۔ اور خلفائے راشدین کے عمل سے جو طرزِ حکومت ثابت ہوتا ہے وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے آجکل کی دستوری اصطلاح میں نہ جمہوری ہے اور نہ شخصی۔ وہ نہ دینی (THEOCRATIC) ہے اور نہ اشرافی و خواصی (ARISTOCRATIC) بلکہ وہ یہ سب کچھ ہے اور ان سب سے الگ بھی ہے۔

[1] کنز العمال بر مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۴۵

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دینی حکومت (THEOCRATIC GOVARNMENT) میں بادشاہ کو خدا مانا جاتا ہے۔ جیسا کہ فراعنہ مصر کے ہاں دستور تھا یا اس کو ظل خداوندی تسلیم کیا جاتا ہے جیسا کہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں رواج پایا جاتا تھا ان دونوں صورتوں میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ اس کا ہر لفظ فرمودۂ الٰہی ہوتا ہے اور اس بنا پر اس سے انحراف کرنا تو کجا کوئی شخص اس پر تنقید بھی نہیں کر سکتا۔

اسلام میں اس تخیل کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حکمران و فرمانروا۔ یا ایک خلیفہ تو الگ رہا خود پیغمبر جس کے متعلق معصوم ہونیکا عقیدہ ہوتا ہے وہ بھی حقوق العباد یا دنیوی معاملات میں انہیں قوانین کا پابند ہوتا ہے جو عام لوگوں کیلئے ہوتا ہے اور ان امور میں بھول چوک کا احتمال دوسروں کی طرح پیغمبر کے ساتھ بھی لگا رہتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا انتم اعلم بامور دنیاکم ،، اور اس کے علاوہ احادیث و سیر کی کتابوں میں متعدد واقعات مذکور ہیں جن میں آپ نے خود اپنے خلاف مقدمات سُنے اور ان کے بارہ میں منصفانہ فیصلہ کیا[1] پس جب خود رسولؐ اللہ کے متعلق الوہیت کا عقیدہ نہیں ہو سکتا تو خلیفۂ رسولؐ اللہ کی نسبت یہ عقیدہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیعت کے بعد جب لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ "یاخلیفۃ اللہ" کہہ کر مخاطب کیا تو آپ نے فوراً اس کی تردید کی اور فرمایا۔ لست بخلیفۃ اللہ ولکنی خلیفۃ رسولؐ اللہ، میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں البتہ خلیفۂ رسول اللہ ہوں۔

بنو سقیفہ میں بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو خطبہ دیا تھا اور جس کو تم بیعت کے موقع پر پڑھ آئے ہو اس میں صاف صاف کہا تھا کہ اے لوگو! میں تم سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ میری تمنا تھی کہ یہ ذمہ داری کسی اور کو سپرد کی جاتی۔ لیکن بہر حال اب جبکہ تم نے مجھ کو منتخب کر لیا ہے تو اگر میں ٹھیک ٹھیک چلوں تو میری اطاعت کرو ورنہ اگر غلط راستہ پر گامزن ہوں تو تم مجھ کو ٹھیک اور درست کر دو

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آج کل کی مروّجہ دستوری اصطلاح میں جس طرز حکومت کو دینی

[1] دیکھو سیرت ابن ہشام ص ۴۴۴۔ سیرت شامی میں بھی اس طرح کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

حکومت کہا جاتا ہے۔ اس کے اعتبار سے اسلامی طرز حکومت ہرگز دینی نہیں ہے۔ البتہ ہاں اس حیثیت سے بے شبہ وہ دینی حکومت ہے کہ اس حکومت کا منشور اور دستور قانونِ الٰہی ہے۔ منزل من اللہ ہے جسکی رو سے فرماں روا اور سب مسلمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرتے ہیں اور آوامر و نواہی شریعت کے پابند رہتے ہیں

اسی طرح یہ طرزِ حکومت اشرافی یا خواصی طرزِ حکومت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حکومت اونچے طبقہ والوں کی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں پر خواص کی عوام پر یا ور لمرا کی غریبوں پر ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے خلافت کی حقیقت کی بحث میں بتایا ہے۔ اسلام میں سرے سے طبقاتی تقسیم کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہیں۔ ہر وہ مسلمان جو فرائض و واجبات خلافت کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خلافت کیلئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت حذیفہؓ کے غلام سالم کیلئے حضرت عمرؓ کا یہ فقرہ پہلے گذر چکا ہے۔ کہ آج سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو والی بناتا

اسلام میں شخصی حکومت کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنے اہل بیت میں سے کسی کی خلافت و نیابت کی وصیت نہیں کی۔ اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی رہا۔ پھر قرآن مجید میں مسلمانوں کی تو شان ہی یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ وہ کسی ایک معاملہ میں بھی استبداد کو راہ نہیں دیتے اور باہمی مشورہ سے اپنے معاملات انجام دیتے ہیں۔

والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوۃ وامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقنھم ینفقون ٥

اور جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا اور نماز قائم کی ہیں۔ اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں اور وہ خدا کے بخشے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں،

عبداللہ یوسف علی صاحب اپنے مشہور انگریزی ترجمہ قرآن مجید میں اس آیت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں۔

اِس آیت میں مشاورتِ باہمی کا جو اصول بیان کیا گیا ہے اُس پر آنحضرتؐ نے اپنے خانگی اور پبلک دونوں قسم کی زندگی میں پورے طور پر عمل کیا اور آپ کے بعد جو ابتدائی دور کے حکمران تھے انہوں نے بھی اسکی مکمل پیروی کی۔ موجودہ "نمائندہ حکومت" ریاستی امور میں اسی اصول پر عمل کرنے کی ایک نامکمل سی کوشش ہے۔[1]

[1] ص ۱۳۱۷ مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور۔

اس کے علاوہ خاص آنحضرتؐ کو خطاب کرکے حکم دیا گیا۔

وشاورھم فی الامر فاذا — اور آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ لیجئے
عزمت فتوکل علی اللہ — لیکن جب عزم کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ پیغمبر برحق تھے اس لئے آپ کو کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کو نمونہ قائم کرنا اور اسوہ بننا تھا۔ اسلئے قرآن میں آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور آپ برابر اس پر عمل کرتے رہے یہاں تک کہ عمال اور امراء کا تقرر بھی آپ مشورہ سے ہی کرتے تھے، ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود کی نسبت فرمایا۔

"لو کنت مؤمراً احداً بغیر مشورۃ — اگر میں کسی شخص کو مشورہ کے بغیر امیر بناتا تو
لامرت ابن ام عبد [1] — ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو بناتا۔

آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا عمل بھی یہی رہا، معمولی سے معمولی کوئی معاملہ بھی جس کا تعلق نظم و نسق اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہوتا تو مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔

بحرین میں بزاخر نام کا ایک مقام ہے یہاں کے لوگ بھی مرتد ہوگئے تھے، بعد میں ان کو پشیمانی ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر عفو خواہ ہوئے اور اپنے گزشتہ اعمال سے توبہ کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "تم اب تو جنگلوں میں جاکر اونٹ چراؤ، میں مہاجرین سے مشورہ کرکے تم کو جواب دوں گا"، چنانچہ آپنے ایک اجتماع طلب فرمایا اور جو کچھ ان کے اور آپ کے درمیان گفتگو ہوئی تھی وہ پبلک کے سامنے رکھدی [2]

مشورہ کے بعد مسلمانوں کی شان یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ مشورہ سے جو بات طے پائے اس کی پابندی کی جائے۔

طاعۃ و قول معروف فاذا — اطاعت اور قول معروف ہے۔ اور جب ایک بات
عزم الامر فلو صدقوا اللہ — طے ہوجائے تو پھر جو لوگ اللہ سے سچے ہوں گے

[1] سنن ترمذی ج ۲ کتاب المناقب [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۲ باب من نکث بیعتہ۔

لکان خیراً لھم — اُن کے لئے یقیناً بہتر ہوگا۔

اب رہا طرز جمہوری حکومت! تو اس میں شبہ نہیں کہ اپنی اصل اسپرٹ اور روح کے اعتبار سے اسلامی طرز حکومت جمہوری ہی ہے۔ چنانچہ:-

(۱) خلیفہ کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے، خلیفہ کی بیعت کی نوعیت بالکل وہی ہے جو آج کل ووٹ کی ہوتی ہے۔

(۲) ہر شخص کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کے کسی عمل یا فعل پر نکتہ چینی کرے۔

(۳) خلیفہ اپنے آپ کو لوگوں سے ممتاز یا برتر نہیں جانتا۔ بلکہ ان کا خادم سمجھتا ہے اور اسوجہ سے اس تک پہونچنے میں کسی کو دشواری نہیں ہوتی [1]

(۴) خلیفہ جب کبھی کوئی اہم کام کرتا ہے۔ تو رائے عامہ ضرور طلب کرلیتا ہے ارباب فکر و نظر سے مشورہ کرتا ہے۔ اور قطعاً استبداد نہیں برتتا۔

(۵) لیکن ہاں اس مشورہ کے بعد وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے پر عمل بھی کرے بلکہ اگر چاہے تو اپنا فیصلہ اسکے خلاف بھی دے سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کا معمول یہی تھا۔ قرآن میں بھی یہی فرمایا گیا ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا — اور آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیجئے
عزمت فتوکل علی اللہ — لیکن جب ارادہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے

تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرتؐ کی وفات کے فوراً بعد ہی صحابہ کرام کی عظیم اکثریت اسکے حق میں نہیں تھی کہ حضرت اسامہ کو عرب و شام کی سرحد پر بھیجا جائے لیکن حضرت

[1] اسی سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ بڑی عمدہ بات کہی۔ ایک مرتبہ آپنے اپنے مشیر خاص سے پوچھا کہ میں ایک شخص کو امیر بنانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کس کو بناؤں؟ لوگوں نے دریافت کیا آپ کو کس قسم کا آدمی چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ رجل اذا کان امیرھم کانہ رجل منھم واذا لم امیرھم کانہ امیرھم" (مجھ کو ایسا شخص چاہئے کہ جب مسلمانوں کا امیر ہو تو ایسا معلوم ہو کہ گویا انہیں میں کا ایک ہے۔ لیکن جب امیر نہ ہو تو (اپنے کمالات و اوصاف کی وجہ سے ان لوگوں کا) امیر ہی معلوم ہوتا ہو۔ (منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۴۳)

ابوبکر نے اسکو نہیں مانا۔ اسی طرح اکثر صحابہ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کے حامی نہیں تھے لیکن حضرت ابوبکر نے اس رائے کی مخالفت کی اور آخر وہی کیا جو خود ان کے نزدیک حق تھا اسکے بعد شام پر لشکر کشی کا ارادہ ہوا تو تمام صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا صحابہ پس و پیش میں تھے۔ لیکن حضرت علی نے حضرت ابوبکر کے موافق رائے دی اور آخر آپنے اسی پر عمل کیا

لیکن آج کل کی اصطلاح میں جس کو جمہوری نظامِ حکومت کہتے ہیں اسمیں اور اسلامی جمہوریت میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں عددی اکثریت ہی تمام فیصلوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی طرف اکاون ووٹ ہوں اور وہ سب کے سب جاہل، خود غرض اور معاملہ نافہم لوگوں کے ہوں اور اس کے برخلاف دوسری طرف ایک ووٹ کم یعنی انچاس ہوں، لیکن یہ سب معاملہ فہم اور صاحب الرائے لوگوں کے ہوں تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا جس کو ایک ووٹ کی اکثریت حاصل ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اس عددی اکثریت کی کوئی اہمیت نہیں ہے جیسا کہ خلیفہ کے انتخاب کے عنوان کے ماتحت گزر چکا ہے۔

علاوہ بریں موجودہ جمہوریت میں جتنے کام ہوتے ہیں پارٹی کی بنیاد پر ہوتے ہیں پارٹی کا ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ ہر معاملہ میں اپنی پارٹی کے حق میں ووٹ دے اور اس کی حمایت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس کے خلاف تادیبی کاروائی کی جاتی ہے[1] لیکن اسلامی جمہوریت میں اس پارٹی عصبیت کا کہیں وجود نہیں ہے حضرت ابوبکر کے عہد میں خود صحابہ میں پارٹیاں تھیں۔ ایک مہاجرین کی دوسری انصار کی اور تیسری بنو ہاشم کی لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محض پارٹی عصبیت کی بنیاد پر کسی نے کوئی رائے دی ہو جس بات کو جو شخص حق جانتا تھا اس کی حمایت میں رائے دیتا تھا۔

غرض کہ اسلام کا طرزِ حکومت کچھ اس قسم کا ہے کہ آج کل کے مروجہ طرز ہائے حکومت میں

[1] انہیں وجوہ کی بنا پر ہمارے زمانہ کی جمہوریت بھی درحقیقت ڈکٹیٹرشپ کی ہی ایک قسم ہو کر رہ گئی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ ڈکٹیٹرشپ میں فردِ واحد کی مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور اس جمہوریت میں ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے جو پارلیمنٹ یا اسمبلی میں اپنی عددی اکثریت کے بل

بوتے پر جو چاہتی ہے آزادی کے ساتھ کر تی ہے۔

سے ہر طرز میں جتنی خوبی اور عمدگی ہے وہ اسلام نے لے لی ہے اور اس میں جو حصہ مضر اور لائقِ مذمت تھا اس کو ترک کر دیا گیا ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک اسلامی طرزِ حکومت کے لیے موزوں پر "شورائی حکومت" کا نام ہوگا۔

حضرت ابوبکر کا دستورِ حکومت

اسلامی طرزِ حکومت پر ایک عام اجمالی تبصرہ کرنے کے بعد اب ہم کو بتانا چاہیے کہ حضرت ابوبکر کا دستور و آئینِ حکومت کیا تھا؟ چونکہ اسلامی حکومت یا خلافت کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہوتی ہے اس بنا پر حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو سب سے پہلے اس کا حکم قرآن مجید میں تلاش کرتے تھے اگر وہاں نہ ملتا تو حدیث کی طرف رجوع فرماتے۔ اگر اس خاص معاملہ کے متعلق حدیث میں بھی کچھ نہ ملتا تو مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب فرماتے ان میں سے اگر کسی کو کوئی حدیث یاد ہوتی اور وہ پڑھ کر سنا دیتا تو آپ کو بڑی خوشی ہوتی اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ سنتِ رسول کے جاننے والے ان کو مدد کو موجود ہیں۔ اگر کسی کو کوئی حدیث بھی یاد نہ ہوتی تو پھر اہل رائے سے مشورہ لیتے تھے۔

مجلس شوریٰ

صحابۂ کرام میں جو حضرات معاملہ فہمی اور تدبر و سیاست میں امتیاز رکھتے تھے حضرت ابوبکر نے ان کو اپنا مشیر خاص بنا رکھا تھا جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا ان حضرات سے مشورہ کرتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے

ان ابابکر الصدیق کان اذا نزل به	ابوبکر صدیق کو جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا
امر یرید فیه مشاورة اهل الرای	جس میں اہل رائے و فقہ سے مشورہ کی ضرورت ہوتی
واهل الفقه ودعا رجالا من المهاجرین	تھی اور اس مقصد کے لئے وہ مہاجرین اور انصار
والانصار دعا عمر وعثمان وعلیا و	میں سے کچھ لوگوں کو بلاتے تھے تو حضرت عمر عثمان
عبدالرحمن بن عوف ومعاذ بن جبل	علی، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب
وابی بن کعب وزید بن ثابت[1]	اور زید بن ثابت کو بلاتے تھے۔

ملکی نظم و نسق

یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر کی مدتِ خلافت کل دو برس تین مہینے[2] اور بہت

[1] طبقات ابن سعد قسم ثانی جزء ثانی ص ۱۰۹

[2] دو برس تین مہینے گیارہ دن ہے۔

بھی اسلامی مملکت کے اندرونی اور بیرونی استحکام اور فتوحات میں بسر ہو گئی لیکن اسکے باوجود حضرت ابوبکر نظم و نسق سے غافل نہیں تھے اور اسلامی مملکت کا رقبہ جتنا وسیع ہوتا جاتا تھا اسی قدر نظم و نسق کے دائرہ کو وسعت ہوتی جاتی تھی حضرت ابوبکر نے آجکل کی مہذب اور ترقی یافتہ حکومتوں کی طرح پوری مملکت کو مختلف صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ان میں سے ہر ایک کے لئے جدا جدا حاکم مقرر کئے تھے جیسا کہ نقشہ ذیل سے اسکی وضاحت ہو گی۔

مقام حکومت	حاکم کا نام	کیفیت
(۱) مکہ (حجاز)	حضرت عتاب بن اُسید	
(۲) طائف "	حضرت عثمان بن ابی العاص	
(۳) صنعاء (یمن)	مہاجر بن ابی امیہ	
(۴) حضرموت "	زیاد بن لبید انصاری	
(۵) خولان	یعلی بن منیہ	
(۶) زبید و رمع	ابو موسیٰ اشعری	(یمن میں ایک علاقہ کا نام ہے)
(۷) جند	معاذ بن جبل	
(۸) بحرین	علاء بن الحضرمی	
(۹) نجران	جریر بن عبداللہ البجلی	
(۱۰) دومۃ الجندل	عیاض بن الغنم	
(۱۱) عراق	مثنیٰ بن حارثہ	
(۱۲) جرش	عبداللہ بن ثور	
(۱۳) حمص (شام)	ابو عبیدۃ بن الجراح	
(۱۴) اردن "	شرحبیل بن حسنہ	
(۱۵) دمشق "	یزید بن ابی سفیان	
(۱۶) فلسطین "	عمرو بن العاص	
(۱۷) مدینہ		(یہ دارالحکومت تھا جو براہ راست خلیفہ کے ماتحت تھا)

عہدہ داران حکومت کا انتخاب

ایک حکومت کے بہترین نظم و نسق کا دارومدار بنیادی طور پر اس بات پر ہے کہ جس عہدہ کیلئے جس شخص کا انتخاب کیا جائے وہ بہمہ وجوہ اس کیلئے موزوں ہو اس سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ فرمانروائے وقت میں مردم شناسی کا جوہر ہونا چاہئے۔ مالک بن نویرہ کے واقعہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ حضرت خالد کے متعلق حضرت عمر کو کس قدر شدید اصرار تھا کہ ان کو معزول کیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ایک نہ سنی۔ آخر جب حضرت خالد کے جواہر کھلے تو حضرت عمر کو خود اقرار کرنا پڑا کہ صحابہ میں حضرت ابوبکر کے برابر کوئی مردم شناس نہیں تھا۔

انتخاب کے معاملہ میں حضرت ابوبکر کے اصول

اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر کے دو اصول تھے۔
(۱) جو شخص جس عہدہ پر آنحضرتؐ کے عہد میں مقرر تھا۔ حضرت ابوبکر اس کو اسی کو اسی عہدہ پر رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرتؐ سے زیادہ صحیح انتخاب کس کا ہو سکتا تھا چنانچہ جیش اسامہ کی روانگی کے وقت حضرت اسامہ کی امارت پر سب نے ہی اعتراض کیا مگر آپ نہ مانے۔ حضرت عمر نے جب حضرت خالد کی معزولی کا مطالبہ کیا تو آپ نے صاف فرمایا کہ "جس تلوار کو رسول اللہؐ نے نیام سے باہر کیا ہو میں اس کو کیونکر نیام میں رکھ سکتا ہوں" مکہ میں عتاب بن اسید، طائف میں عثمان بن ابی العاص۔ صنعاء میں مہاجر بن ابی امیہ۔ حضرموت پر زیاد بن لبید اور بحرین پر علاء الحضرمی۔ آنحضرتؐ کے عہد میں عامل تھے تو عہد صدیقی میں بھی اسی عہدہ پر رہے[1]

(۲) دوسرا اصول جس کی طرف حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں متعدد مواقع پر اشارہ کیا ہے یہ تھا کہ وہ اس شخص کا انتخاب کرتے تھے جس کو آنحضرتؐ کی فیضان تربیت سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہونے کا موقع ملا ہو۔ چنانچہ جو لوگ فتح مکہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو ترجیح دیتے تھے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۶۲۔

اقربانوازی سے اجتناب ایک فرماں روا کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ عہدوں کی تقسیم کے معاملہ میں اقربانوازی اور جنبہ داری سے اجتناب کرے اور عہدہ اس شخص کو ہی سپرد کرے جو بہمہ وجوہ اس کا اہل ہو۔ حضرت ابوبکر کا خود بھی اس پر بڑی سختی کے ساتھ عمل تھا اور اپنے عمال کو بھی اس کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔

یزید بن ابی سفیان کو شام کی امارت پر روانہ کیا تو فرمایا۔

یا یزید ان لک قرابۃً	اے یزید! وہاں تمہارے عزیز قریب ہیں ممکن
عسیت ان تؤثرھم بالامارۃ	ہے کہ تم ان کو امارت کے دینے میں ترجیح دو
وذالک اکبر ما اخاف علیک	یہ وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کا میں تم سے اندیشہ
فان رسول اللہ ﷺ قال من ولی	کرتا ہوں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو
من امر المسلمین شیئاً فامر علیھم	شخص مسلمانوں کے کسی کام کا ذمہ دار ہو اور وہ
احداً محاباۃً فعلیہ لعنۃ اللہ	محض رشتہ کی وجہ سے انپر کسی شخص کو امیر بنادے
لا یقبل اللہ عنہ صرفاً ولا عدلاً	تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی اور اللہ اس کی طرف
حتی یدخلہ جھنم [1]	سے کسی قدر بدلہ و کفارہ کو قبول نہیں کریگا یہاں تک کہ اسکو

جہنم میں بھیجدیگا۔

عمال کے تقرر میں عالی ظرفی ایک طرف اقربانوازی سے یہ اجتناب اور دوسری جانب عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی شخص کی نسبت یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ آپ کی ذات کے ساتھ رنجش رکھتا ہے لیکن آپ جو عہدہ اس کو دینا چاہتے اسکے لئے وہ آپکے رائے میں موزوں ہوتا تو اسکی ذاتی رنجش کا خیال اس کو عہدہ دینے میں مانع نہیں ہوتا تھا۔ شام کی مہم روانہ کرنے کے وقت خالد بن سعید کو بھی آپنے ایک علم عنایت فرمایا تو اگرچہ حضرت عمر نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ خالد آپ کی خلافت سے خوش نہیں تھے اور انہوں نے آپ کی برخلاف بنو ہاشم کو بھڑکایا تھا لیکن حضرت ابوبکر نے اس کی ذرا پرواہ نہیں کی اور تقرر بحال رکھا [2]

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶   [2] طبری ج ۴ ص ۵۸۴

عمال حکومت کی دلجوئی اور انکا احترام ایک حکومت کی شائستگی اور اسکے مہذب ہونیکی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عمال حکومت کا ان کے مرتبہ و منصب کے لحاظ سے پورا احترام ملحوظ رکھا جائے اور ان کے ساتھ جبر و تحکم کا برتاؤ نہ کیا جائے حضرت ابوبکر ان دونوں باتوں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ جیش اسامہ کو روانہ کرنے کے وقت حضرت ابوبکر چاہتے تھے کہ حضرت عمر اس جیش میں نہ جائیں اور مدینہ میں رہ کر ان کے خصوصی مشیر کار کی حیثیت سے کام کریں لیکن چونکہ امیر الجیش حضرت اسامہ تھے اسلئے آپنے حضرت عمر کے متعلق خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے اسامہ سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو حضرت عمر کو ان کے پاس ہی چھوڑ جائیں۔ پھر دلجوئی کا یہ عالم تھا کہ حضرت اسامہ کا لشکر روانہ ہوا تو اسامہ سواری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن خلیفۂ رسول دور تک ان کی مشایعت کو پیدل گیا اور حضرت اسامہ کے سخت اصرار کے باوجود نہ خود سواری پر بیٹھے اور نہ اسامہ کو سواری سے نیچے اترنے دیا۔ اسی طرح یزید بن ابی سفیان شام کی مہم پر روانہ ہوئے تو آپ نے دور تک ان کی پاپیادہ مشایعت کی۔

انتخاب میں احتیاط عربی کا مشہور مقولہ ہے "سل المجرب ولا تسأل الحکیم" اسکے مطابق جن لوگوں نے کسی وجہ سے اپنا اعتماد کھو دیا تھا حضرت ابوبکر تائب ہو جانے کے بعد بھی انکو ذمہ داری کا کام سونپنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت خالد کو عراق کی مہم پر روانہ کیا تو انکو جہاں اور ہدایات دیں ایک ہدایت یہ بھی کی کہ جو لوگ مرتد ہو گئے تھے ان کو فوج میں بھرتی نہ کیا جائے ان لوگوں کے ساتھ حضرت ابوبکر کا یہ معاملہ اس وقت تک رہا جب تک کہ ان کے صدق و خلوص اور ایمان کی پختگی کا آپ کو یقین نہیں ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کی مہم کے زمانہ میں ان لوگوں پر جو رکاوٹ تھی۔ شام کی مہم کے زمانہ میں باقی نہیں رہی تھی۔

آزمائشی تقرر آج کل کے عام قاعدہ کے مطابق جب تک کسی شخص کے متعلق اسکی حسن کارگزاری کی وجہ سے یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ وہ اس عہدہ کا اہل ہے اس کا تقرر عارضی طور پر کرتے تھے مستقل ہونے اور ترقی پانے کی شرط حسن کارکردگی ہوتی تھی۔ یزید بن ابی سفیان

کو شام کی مہم پر ایک دستہ فوج کا امیر مقرر کر کے روانہ کیا تو ان کو بہت سی ہدایات دیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے ان ہدایات کا آغاز اس طرح کیا تھا۔

انی قد ولیتك لابلوك	یعنی تم کو اس لئے والی بنایا ہے کہ میں تمکو آزماؤں
واجربك واخرجك	تمہارا تجربہ کروں اور تمام کو ٹریننگ دوں اگر تم نے
فان احسنت رددتك الی	اچھا کام کیا تو میں اس عہدہ پر تم کو برقرار رکھوں گا
عملك وزدتك وان	اور ترقی کر دوں گا۔ اور اگر تم نے برا کام کیا تو میں
اسأت عزلتك [1]	عہدہ سے الگ کر دوں گا۔

عمال کی معزولی تقرر کے بعد اگر کوئی عہدہ دار نااہل ثابت ہوتا تھا تو حضرت ابوبکرؓ اس کو فوراً معزول بھی کر دیتے تھے اور اس میں تاخیر روا نہیں رکھتے تھے۔ گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن سعید کو عرب و شام کی سرحد پر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جب تک ان کو اجازت نہ ملے پیش قدمی نہ کریں لیکن خالد بن سعید نے سرحد پر رومی افواج کا اجتماع دیکھا اور ادھر خالد کی مدد کیلئے مدینہ سے تازہ دم فوج پہونچ گئی تو انہوں نے پیش قدمی کی اجازت کا انتظار نہیں کیا اور حملہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج پسپا ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع ہوئی تو خالد بن سعید کو سخت تہدیدی خط لکھا اور ان کے عہدہ سے ان کو معزول کر دیا۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

اقم مكانك - فلعمري انك مقدم	تم اپنی جگہ ہی رکے رہو۔ تم بڑے پیشقدمی کرنے والے
محجام نجاء من الغمرات لاتخوضها	ہو لیکن گہرائیوں میں گھسنے سے بھاگتے ہو۔ نہ تم ان
الی حق ولا تصبر علیه ؛	میں درست طریقہ پر گھستے ہو اور نہ ان پر صبر کرنے ہو

پھر جب خالد مدینہ آئے تو ان سے زبانی کہا کہ تم لڑائی کے موقع پر بڑی بزدلی دکھاتے ہو۔ جب خالد چلے گئے تو اس وقت جو لوگ آپ کے پاس تھے ان سے فرمایا کہ عمر اور علی خالد سے اچھی طرح واقف تھے اگر میں ان کی بات مان لیتا تو خالد سے پہلے ہی بچتا۔[2] یعنی ان کو عامل نہ بناتا۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ [2] طبری ج ۲ ص ۵۹۰

گورنروں کے فرائض آج کل کی اصطلاح میں حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کو فوجی حکومت کہہ سکتے ہیں یعنی جو گورنر یا والی ہوتا تھا وہی فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا چنانچہ ایک گورنر کے فرائض حسب ذیل تھے۔

(۱) مسجد میں جماعت کی امامت اور خصوصاً جمعہ کے روز خطبہ دینا۔

(۲) فوج کی نگرانی اور ان کی تنخواہ وغیرہ کا بندوبست کر کے اسے تقسیم کرنا۔

(۳) تمام محصولات کا جمع کرنا اور درآمد و برآمد اشیاء کی نگرانی کرنا۔

(۴) اپنے علاقہ میں امن و امان کی حفاظت کرنا اور لوگوں کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرنا۔

(۵) حدود اللہ جاری کر کے مجرموں کو سزا دینا۔

(۶) فتنہ پردروں کے خلاف جنگ کرنا اور اس میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اس کو مسلمان فوجیوں میں تقسیم کرنا۔ اور اس کا خمس مرکز کو بھیجنا۔

(۷) ہر سال حج کیلئے جانیوالے مسافروں کے قافلوں کا بندوبست کرنا اور ان کو حفاظت کے ساتھ سہولت بہم پہونچانا۔

(۸) ضعیف العمر سپاہیوں کی پنشن اور ان کے متعلقین کی معاشی مدد کا انتظام و انصرام کرنا۔

(۹) کسانوں کا خاص طور پر خیال رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو علاقہ کی زراعت کو ترقی دینا۔

عہدوں کی تقسیم لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک گورنر ہی تن تنہا سب کام انجام دیتا تھا بلکہ انتظامی امور کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ کو الگ الگ ذمہ دار افسروں کی نگرانی میں دیدیا جاتا تھا۔ خود آنحضرتؐ کے عہد میں یہی دستور تھا۔ اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی پر عمل کیا۔ چنانچہ خلافتِ صدیقی میں عمال و ولات کے علاوہ اور جن عہدوں کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں۔

عہدۂ قضاء عام طور پر مشہور ہے کہ قضا کا محکمہ سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کیا مولانا شبلی نے الفاروق میں[1] اور پروفیسر ہٹی[2] "تاریخ عرب" میں یہی لکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود عہد نبوت میں قائم ہو چکا تھا۔ کتب حدیث میں "کتاب الاقضیہ"

---

[1] مطبوعہ فخر المطابع حصہ دوم ص ۴۸ [2] چوتھا ایڈیشن ص ۱۷۳

کے عنوان سے جو باب ہے اس میں ایسی احادیث و روایات مقبول ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے قاضی کے فرائض و واجبات۔ عہدہ کے شرائط و آداب شہادت کے احکام وغیرہا نہایت تفصیل سے بیان فرمائے تھے۔ اگرچہ معاملات خصومت میں آخری فیصلہ آپ ہی کا نافذ ہوتا تھا لیکن مملکت میں توسیع کے باعث ہر معاملہ اور مقدمہ آپ خود فیصل نہیں کر سکتے تھے اس لئے مختلف علاقوں میں اپنی جانب سے قاضی بھی مقرر فرما دیتے تھے۔ اور ان کو اس سلسلہ میں خاص خاص ہدایات دی تھیں چنانچہ حضرت علی کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو حضرت علی نے عرض کیا کہ میں تو کم عمر ہوں اور مجھ کو قضا کا کوئی علم نہیں ہے آنحضرت صلعم نے جواب دیا "اللہ تمہارے قلب کو راہ دکھلائیگا اور تمہاری زبان کو استواری بخشے گا جب تم دو آدمیوں کا جھگڑا چکانے بیٹھو تو جس طرح تم نے پہلے فریق کی بات سنی ہے اسی طرح جب تک دوسرے کی نہ سن لو۔ کوئی فیصلہ نہ کرو۔ یہی طریقہ ہے جس سے فیصلہ کرنا تمہارے لئے آسان ہوگا۔[1]

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو آنحضرت صلعم نے پوچھا "جب تمہارے سامنے خصومات آئیں تو تم کیونکر حکم (قضا) کروگے۔ انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں۔ پھر دریافت فرمایا۔ لیکن اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ عرض کیا سنت رسول اللہ کی روشنی میں اب سوال ہوا "اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ پاؤ"؟ انہوں نے جواب دیا "ایسی صورت میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا اور اسمیں کوئی کوتاہی نہ ہونے دونگا" یہ سن کر آنحضرت صلعم نے مسرت سے حضرت معاذ کا سینہ تھپتھپایا اور فرمایا "جمیع حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس کی توفیق دی جو رسول اللہ کا پسندیدہ ہے[2]"

حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے عہد میں حضرت علی اور حضرت معاذ اور بعض اور صحابہ کو جن کے نام آگے آتے ہیں، اس خدمتِ قضا پر مامور رکھا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کتب تاریخ و سیر میں ان حضرات کو عہد صدیقی کے ارباب افتا کہا گیا ہے اور جیسا کہ علامہ سرخسی نے تصریح کی ہے۔ صدر اول میں قاضی کو بھی مفتی کہتے تھے یہ حضرات قضا کا کام بھی کرتے

[1] سنن ابی داؤد باب کیف القضاء [2] سنن ابی داؤد باب اجتہاد الرای بالقضاء [3] المبسوط ج ۱۱ ص ۱۰۹

لیکن حضرت عمر فاروق قاضی القضاۃ۔ یعنی چیف جسٹس کے عہدہ پر مامور تھے اور اہم معاملات کا فیصلہ آپ ہی کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تاریخوں میں حضرت عمر کے لئے افتاء کا نہیں بلکہ صرف قضا کا لفظ آتا ہے۔

طبری میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو حضرت عمر نے خود فرمایا "انا اکفیک القضاء" میں آپ کیلئے قاضی کا کام کروں گا۔ لیکن چونکہ وہ خیر القرون کا دور تھا اس لئے سال بھر تک باہمی خصومت کا کوئی معاملہ ہی حضرت عمر کے سامنے پیش نہیں ہوا۔[1]

طبری کے علاوہ ابن اثیر میں ہے۔

وفیها استقضی ابوبکر عمر بن الخطاب	اور اس سال ابوبکر نے عمر بن الخطاب کو قاضی بنایا
کان یقضی بین الناس خلافته کلها[2]	اور خلافت صدیقی بھر قضا کا کام کرتے رہے۔

حضرت عمر اپنے اس حق قضا کو آزادی کے ساتھ استعمال کرتے تھے اور حضرت ابوبکر کی رائے کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ایک بے کار زمین جو ان کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس کا مطالبہ کیا۔ چونکہ یہ دونوں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اس لئے حضرت ابوبکر نے ان کی درخواست منظور کر لی اور زمین کا پٹہ انکے نام لکھ دیا۔ اب یہ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے تاکہ یہ پروانۂ خلافت کی ان سے توثیق کرالیں لیکن حضرت عمر اسے دیکھتے ہی سخت غضب ناک ہوئے اور پروانہ ان کے ہاتھوں سے لے کر چاک کر دیا۔ اور فرمایا رسول اللہ صلعم اس زمانہ میں تمہاری دل جوئی کرتے تھے جبکہ اسلام کمزور تھا اب اسلام کافی مضبوط ہے۔ تم سے جو کچھ ہو سکے کر دیکھو یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر سیدھے حضرت ابوبکر کی خدمت میں آئے اور بولے خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟" حضرت ابوبکر نے جواب دیا خلیفہ تو عمر ہی ہوتے اگر وہ چاہتے" یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت عمر بھی غصہ میں بھرے ہوئے آپہونچے اور حضرت ابوبکر سے باز پرس کرنے لگے کہ آپ نے یہ زمین کا ٹکڑا ان دونوں کو کس طرح دیا؟ یہ آپ کی ملکیت ہے یا مسلمانوں کی

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۷ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶ [3] الاصابہ ج ۳ ص ۵۶ ذکر عیینہ بن حصن الفزاری۔

حضرت ابوبکرؓ بولے "مسلمانوں کی" حضرت عمرؓ نے کہا "تو پھر آپ کو کیا حق تھا کہ ان دو آدمیوں کو بخشدیں" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس وقت جو لوگ میرے پاس موجود تھے میں نے ان سے مشورہ کرلیا تھا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کو بحال رکھا بلکہ ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی تحریر چاک کردی تھی۔ اس کے بعد عیینہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آیا اور درخواست کی کہ ایک دوسری تحریر لکھدیں تو آپ نے فرمایا "لا اجدد شیئاً ردہ عمرؓ" میں اس کی تجدید نہیں کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کردیا ہے [۱]

ایک نکتہ اس واقعہ سے ایک یہ نکتہ بھی ہاتھ آتا ہے کہ اگرچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس طرح صیغۂ عدالت (GUDICIAL) محکمہ امرو تنفیذ (EXECATIVE) سے باقاعدہ الگ قائم کردیا گیا تھا حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایسا نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک اصل اسپرٹ اور اس احساس کا تعلق ہے کہ یہ دونوں صیغے الگ الگ ہونے چاہئیں جیسا تہذیب و تمدن کے دورِ ترقی میں ہوتا ہے وہ بہر حال عہد صدیقی میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔

وزارت عظمیٰ اگرچہ اس زمانہ میں وزارت کا عہدہ باقاعدہ نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک وزارت کے فرائض کا تعلق ہے وہ بھی حضرت عمرؓ سے متعلق تھے۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے مشیر خصوصی اور امور مملکت میں دست راست تھے اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ ان کو اپنے ساتھ مدینہ میں ہی رکھتے تھے کسی مہم پر نہیں بھیجتے تھے۔ آنحضرتؐ نے جیش اسامہ میں شرکت کیلئے جن کو نامزد کیا تھا ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ لیکن لشکر کی روانگی سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہ سے درخواست کی کہ اگر وہ عمر فاروقؓ کو مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں تو بہتر ہے تاکہ وہ امور خلافت میں ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکیں [۲]

وزارت خزانہ بیت المال کا قیام آنحضرتؐ کے عہد میں ہی عمل میں آگیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا اہتمام و انتظام حضرت عبیدہؓ کے سپرد کیا جو بیت المال کی آمدنی اور خرچ کا پورا حساب رکھتے اور اس کی نگرانی کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفۂ اول کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہ

۱؎ کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۷۷ ۲؎ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۴ ۳؎ طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۳ ص ۱۵۱

سے پوچھا کہ شروع سے اس وقت تک خزانہ میں مال کس قدر آیا ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا۔ "دو لاکھ دینار" [۳]

عہدۂ کتابت چونکہ اہم فرامین و احکام کاتب کو ہی لکھنے ہوتے ہیں اس لئے کتابت کا عہدہ بھی بڑا اہم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس عہدہ کا کام وقتی طور پر ان لوگوں سے بھی لے لیتے تھے جو ضرورت کے وقت ان کے پاس موجود ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ جو حضرات خاص اسی کام پر متعین تھے۔ وہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت عثمان بن عفان ہیں

عمال کے نام احکام بھیجنے کا طریقہ عمال کو حضرت ابوبکرؓ کوئی حکم بھیجتے تھے تو آپ کا طریقہ وہی ہوتا تھا جو خود آنحضرتؐ کا تھا۔ یعنی من ابی بکر الی فلاں سے آغاز کرتے تھے۔ یہ طریقہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے ابتدائی دور تک قائم رہا۔ جب ولید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے اس کو بدل دیا۔ اور حکم دیا کہ لوگ ہم کو اس طرح خطاب نہ کریں۔ جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہیں۔ [۱]

عہدۂ افتاء افتاء یعنی شرعی حکم بتانے کے لئے تقوی و طہارت کے علاوہ تفقہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ محض ایک وہبی دولت ہے خدا جس کو چاہے بخشدے۔ ہر عالم دین اس سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جو حضرات فقیہ سمجھے جاتی تھے اور اس بنا پر افتاء کا عہدہ ان کے سپرد تھا ان کے نام یہ ہیں حضرت علی۔ حضرت معاذ بن جبل۔ ابی بن کعب۔ زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود [۲]

پولیس روزمرہ کے انتظام کیلئے غالباً مستقل پولیس کی شکل میں کوئی خاص جماعت نہیں تھی اور حق یہ ہے کہ اس زمانۂ خیر القرون میں اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تاہم ضرورت پیش آتی تھی تو فوری طور پر چند بہادر مردوں کو اس کام پر مامور کردیا جاتا تھا چنانچہ جیش اسامہ کی مدینہ سے روانگی کے بعد بعض قبائل کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ ہوا تو حضرت علی اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ کام لیا گیا۔

عمال کو ہدایات حضرت ابوبکرؓ جب کسی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپتے یا کسی عہدہ پر

۱؎ طبری ج ۳ ص ۲۶۱۷ ۲؎ العقد الفرید باب التوقیعات فصل استفتاح الکتب ۳؎ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۱

اسکو مقرر فرماتے تو اس کے متعلقہ فرائض ایک ایک کر کے بیان کرتے اور اس سے عہد لیتے کہ وہ ان پر عمل کریگا۔ حضرت اسامہ کی قیادت میں آپ نے جو لشکر عرب و شام کی سرحد پر روانہ کیا تھا جب وہ چلنے لگا۔ تو آپ نے اس کو روک کر دس ہدایتیں دیں۔ آپ نے فرمایا۔

ایها الناس قفوا اوصیکم بعشر فاحفظوها عنی ولا تخونوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا طفلاً صغیراً ولا شیخاً کبیراً ولا امرأة ولا تعقروا نخلاً ولا تحرقوه ولا تقطعوا شجرةً مثمرةً ولا تذبحوا شاةً ولا بقرةً ولا بعیراً الا لمأکلة وسوف تمرون باقوام قد فرغوا انفسهم فی الصوامع فدعوهم وما فرغوا انفسهم له وسوف تقدمون علی قوم یاتونکم بآنیة فیها الوان الطعام فاذا اکلتم منها شیئاً بعد شیئ فاذکروا اسم اللہ علیها وتلقون اقواماً قد فحصوا اوساط رؤوسهم وترکوا حولها مثل العصائب فاخفقوهم بالسیف خفقاً اندفعوا باسم اللہ افناکم اللہ بالطعن والطاعون ۱؎

لوگو! ذرا ٹھہرو میں تم کو دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں تم ان کو یاد رکھو دیکھو خیانت نہ کرنا فریب نہ کرنا۔ سرکشی نہ کرنا۔ دشمن کے ہاتھ پاؤں مت کاٹنا۔ چھوٹے بچے کو بوڑھے کو اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کو نہ اکھاڑنا اور نہ اس کو جلانا۔ پھلدار درخت کو مت کاٹنا۔ بکری گائے یا اونٹ کھانے کے سوا ذبح نہ کرنا۔ اور ہاں تم ایسے لوگوں سے دوچار ہوگے جنہوں نے اپنی زندگی عبادت خانوں کیلئے وقف کر دی ہے تم ان لوگوں کو کچھ نہ کہنا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ اور تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو تمہارے پاس الوانِ نعمت لیکر آئیں گے تم ان کھانوں میں سے یکے بعد دیگرے جب کچھ کھاؤ تو ان کھانوں پر اللہ کا نام لو۔ اور تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے سر بیچ میں سے منڈے ہوں گے تم ان کو تلوار سے کھٹکھٹانا۔ جاؤ اللہ کا نام لیکر خدا ناصر ہو۔ اللہ تعالیٰ تم کو دشمن کے نیزوں سے اور طاعون سے بچائے

اسی طرح شام کی طرف لشکر روانہ کئے تو ایک لشکر کے قائد حضرت یزید بن ابی سفیان کو مفصل ہدایات دیں۔ یہ اگرچہ طویل ہیں لیکن آئین دوستی کی دنیا کا شاہکار ہیں اسلئے ہم تفصیل میں تمامہا نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا۔

۱؎ طبری ج ۲ ص ۴۶۳

علیک بتقوی اللہ، فانه یری من باطنک مثل الذی من ظاهرک وان اولی الناس باللہ اشدهم تولیاً له واقرب الناس من اللہ اشدهم تقرباً الیه بعمله وقد ولیتک عمل خالدٍ فایاک وعبیة الجاهلیة فان اللہ یبغضها ویبغض اهلها واذا قدمت علی جندک فاحسن صحبتهم وابدأهم بالخیر وعدهم ایاه۔ واذا وعظتهم فاوجز۔ فان کثیر الکلام ینسی بعضه بعضاً واصلح نفسک یصلح لک الناس وصل الصلوات لاوقاتها باتمام رکوعها وسجودها والتخشع فیها۔ واذا قدم علیک رسول عدوک فاکرمهم واقلل لبثهم۔ حتی یخرجوا من عسکرک وهم جاهلون به۔ ولا ترینهم فیروا خللک ویعلموا علمک وانزلهم فی ثروة عسکرک وامنع من قبلک من محادثتهم وکن انت المتولی لکلامهم ولا تجعل سرک لعلانیتک فیختلط امرک واذا استشرت فاصدق الحدیث

تم اللہ سے تقویٰ کو لازم پکڑو۔ کیونکہ وہ تمہارے باطن کو تمہارے ظاہر کی طرح دیکھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بہتر آدمی وہی ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتا ہے۔ اور اللہ کا سب سے زیادہ مقرب بندہ وہی ہے جو اپنے عمل کے ذریعہ سب سے زیادہ اللہ سے قریب ہے۔ میں نے تم کو خالد کا کام سپرد کیا ہے اسلئے تم جاہلیت کی باتوں سے بچو۔ کیونکہ اللہ ان باتوں کو اور ایسے لوگوں کو مبغوض رکھتا ہے اور تم جب اپنے لشکر کے پاس پہنچو تو خوش خلقی کے ساتھ پیش آؤ اور بھلائی کے ساتھ اپنے معاملہ کا آغاز کرو اور ان سے اس کا وعدہ بھی کرو۔ اور جب ان کو نصیحت کرو تو اختصار سے کام لو کیونکہ کثرت کلام میں آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اپنے نفس کی اصلاح کرو تو لوگ تمہارے لئے ٹھیک رہیں گے اور نمازیں مع مکمل رکوع و سجود اور خشوع کے انکے اوقات میں ادا کرو۔ اور جب دشمن کے قاصد تمہارے پاس آئیں تو ان کا اکرام کرو۔ اور ان کا قیام مختصر رکھو تاکہ وہ تمہارے لشکر سے جائیں تو اس سے باخبر نہ ہوں اور ان کو اہل لشکر مت دکھاؤ ورنہ وہ تمہارا خلل دیکھ لیں گے۔ اور تمہارے حال سے واقف ہو جائیں گے۔ ان قاصدوں کو لشکر کی اچھی جگہ میں ٹھہراؤ

تصدق المشورة ولا تخزن عن المشير خبرك فتؤتى من قبل نفسك واسمر بالليل في اصحابك تاتك الاخبار وتنكشف عندك الاستار واكثر حرسك وبددهم في عسكرك واكثر مفاجاتهم في محارسهم بغير علم منهم بك فمن وجدته غفل عن محرسه فاحسن ادبه وعاقبه في غير افراط واعقب بينهم بالليل واجعل النوبة الاولى اطول من الاخرة فانها ايسرهما لقربها من النهار ولا تخف من عقوبة المستحق ولا تلجن فيها ولا تسرع اليها ولا تخذلها ولا تغفل عن اهل عسكرك فتفسده ولا تجسس عليهم فتفضحهم ولا تكشف الناس عن اسرارهم واكتف بعلانيتهم ولا تجالس العباثين وجالس اهل الصدق والوفاء واصدق اللقاء ولا تجبن فيجبن الناس واجتنب الغلول فانه يقرب الفقر ويدفع النصر وستجدون اقواما حبسوا انفسهم في الصوامع فدعهم وما حبسوا انفسهم له [1]

اور اپنے لوگوں کو ان سے بات چیت کرنے سے منع کرو۔ تم خود ہی ان سے گفتگو کرو۔ اپنے بھید کسی پر نہ کھولو ورنہ معاملہ گڑبڑ ہو جائیگا۔ بات سچ کہو تو مشورہ بھی سچ ہوگا۔ اور اپنی کوئی بات اپنے مشیر سے نہ چھپاؤ ورنہ بات تمہارے ہی سر آ پڑے گی۔ اور رات کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کیا کرو تاکہ تمکو خبریں معلوم ہوں اور پوشیدہ باتوں کا تم کو علم ہو۔ اپنے محافظین کی تعداد زیادہ رکھو اور اپنے لشکر میں ان کو پھیلا دو۔ اور بسا اوقات ان کی بے خبری میں ان کی چوکیوں پر پہنچ جایا کرو۔ پھر جس شخص کو اپنی چوکی سے غافل پاؤ اسکی اچھی طرح سرزنش کرو۔ اور بغیر زیادتی کے اس کو سزا دو۔ اور رات کو انکے درمیان باری مقرر کرو اور پہلی باری کو بہ نسبت دوسری کے زیادہ طویل کرو۔ کیونکہ دن سے قریب ہونیکے باعث یہ زیادہ آسان ہوگی۔ مستحق سزا کو سزا دینے میں نہ جھجکنا۔ اسکے معاملہ میں نہ زیادہ تردد کرو اور نہ جلدی کرو۔ اور نہ اسکو بے اثر کرو اور وہاں اپنے اہل لشکر سے غافل مت بیٹھو ورنہ تم اسکو خراب کر دوگے اور زیادہ انکی کھوج کرید بھی نہ کرو ورنہ تم انکو رسوا کر دوگے۔ لوگوں کے بھید معلوم کرنیکی کوشش نہ کرو۔ اور جو ان کے ظاہر احوال ہوں ان پر بس کرو۔ بیکار آدمیوں کے پاس نہ بیٹھو اور جم کر لڑو اور بزدلی نہ دکھاؤ ورنہ لوگ بزدلی دکھائیں گے۔ خیانت سے بچو کیونکہ خیانت فقر کا باعث ہوتی ہے اور مدد کو دور کر دیتی ہے۔ اور تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو عبادت گاہوں میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے ہیں تم انکو انکے حال پر چھوڑ دو۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۷

تقوی وطہارت کی عام تاکید یہ ہدایات وہ ہیں جو ہر شخص کو الگ الگ اس کے عہدہ اور منصب کے اعتبار سے دی جاتی تھیں ان کے علاوہ تقویٰ وطہارت۔ خوف خدا۔ فرائض کی انجام دہی میں امانت و دیانت ان چیزوں کی تاکید و ہدایت تو آپ ہر خطبہ میں، ہر فرمان اور خط میں، ہر مجلس اور محفل میں کرتے رہتے تھے۔

مثلاً عمرو بن العاص اور ولید بن عقبہ کو قبیلۂ بنو قضاعہ پر عامل صدقات مقرر کرکے روانہ کیا تو انکی مشایعت کے لیے کچھ دور تک خود تشریف لائے اور رخصت ہوتے وقت ہر ایک کو یہ ہدایت کی۔

اِتَّقِ اللّٰهَ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ فَاِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا فان تقوى الله خير ما تواصى به عباد الله - انك في سبيل من سبل الله لا يسعك فيه الادهان والتفريط والغفلة عما فيه قوام دينكم وعصمة امركم - فلا تن ولا تفتر [1]

باطن وظاہر میں اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ اس کیلئے سہولتیں پیدا کر دیتا ہے اور جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے اُس کو رزق دیتا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اس کا اجر بڑھاتا ہے۔ بے شبہ اللہ سے تقویٰ بندگانِ خدا کی آپس میں بہترین نصیحت ہے تم اللہ کے ایسے راستہ میں ہو جس میں افراط و تفریط اور مداہنت کی گنجائش نہیں ہے جس میں دین کا استحکام اور خلافت کی حفاظت کا راز مضمر ہے۔ پس تم سستی اور کاہلی مت اختیار کرو۔

یزید بن ابی سفیان کو ہدایات دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے لکھا

ومن اعطى احدا حمى الله فقد انتهك في حمى الله شيئا بغير حقه فعليه لعنة الله [2]

اور جو شخص کسی کو اللہ کی چراگاہ عطا کرے (کوئی عہدہ دے) اور وہ بغیر کسی حق کے اس چراگاہ میں ارتکاب محرمات کرے (عہدہ میں خیانت کرے) تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔

عمال وامراء سے احتساب مفصل ہدایات اور احکام دینے کے بعد کوئی عہدہ دار خواہ کتنی ہی دور اور نظروں سے اوجھل ہوتا حضرت ابوبکر بہر حال اسکی ایک ایک حرکت پر کڑی نگاہ رکھتے تھے

[1] طبری ج ۲ ص ۵۸۸ [2] مسند امام احمد ج ۱ ص ۶۔

اور جہاں اور جب کوئی نقص نظر آتا فوراً اس پر متنبہ فرماتے یا باز پرس کرتے تھے۔ چنانچہ مہاجر بن ابی امیہ کی نسبت معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک عورت جو مسلمانوں پر سب وشتم کرتی تھی اس کے دانت اکھڑوا دیئے ہیں۔ تو فوراً ان کو سخت سرزنش کا خط لکھا جس میں دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ ان کا یہ عمل صریح ظلم اور ناجائز ہے اور آخر میں تحریر کیا کہ چونکہ یہ تمہارا پہلا جرم ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔ ورنہ سزا دیتا [۱]

حضرت ابوبکرؓ حضرت خالد کے کس درجہ قدرداں اور مداح تھے؟ یہ صفحاتِ گزشتہ سے معلوم ہو چکا ہے بایں ہمہ جنگِ یمامہ کے فوراً بعد ہی انہوں نے مجاعۃ کی لڑکی سے نکاح کر لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو سخت تہدیدی خط لکھا کہ۔

لعمری یا ابن ام خالد انک	بے شبہ اے خالد کی ماں کے بیٹے! تیرا دل بڑا
لفارغ تنکح النساء وبفناء بیتک	بے رحم ہے تو عورتوں سے نکاح اس وقت کر رہا ہے
دمُ الفٍ ومائتے رجل من المسلمین	جبکہ تیرے گھر کے صحن میں بارہ سو مسلمانوں کا
لم یجفف بعدُ [۲]	خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے۔

طبری بیان ہے یہ خط اس درجہ غضب آلود تھا کہ گویا اس سے خون ٹپک رہا تھا۔

اسکے بعد عراق میں جنگِ فراض کے ختم ہوتے ہی حضرت خالد حضرت ابوبکر کی اجازت کے بغیر چھپ چھپا کر حج کر آئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع ہوئی تو سخت عتاب کا خط لکھا۔

طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد کو شام کی مہم پر جو روانہ کیا تھا وہ حضرت خالد کے اسی جرم کی پاداش میں تھا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ آئندہ وہ اس کا ارتکاب نہ کریں [۳]

معمولی غلطیوں سے اغماض ایک فرمانروا کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ عمال وکارکنانِ حکومت کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے اور جب ان سے کوئی غلطی ہو تو احتساب کرے ساتھ ہی اس میں اس درجہ تحمل ہونا چاہیئے کہ معمولی بھول چوک سے چشم پوشی کرے اور اگر ضرورت ہو تو تھوڑی بہت تنبیہ کر دے۔ معمولی معمولی باتوں پر سرزنش کرنا اصول حکمرانی کے خلاف ہے حضرت ابوبکرؓ میں احتساب کی قوت کے ساتھ یہ وصف بھی بدرجۂ اتم تھا۔ طبری میں ہے۔

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۵۰ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۱۹ [۳] ایضاً ص ۵۸۴

وکان ابوبکرٍ لا یقید من عماله	ابوبکر اپنے عمال اور کارپردازان حکومت پر زیادہ
ولا وزعته [۱]	داروگیر اور خردہ گیری نہیں کرتے تھے۔

عمال کی تنخواہ عمال وکارپردازانِ حکومت کی تنخواہ کا رواج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ تنخواہ کی مقدار کی تعیین میں عہدہ کی حیثیت اور اس کے ضروری اخراجات ولوازم کی رعایت بھی ہوتی تھی مثلاً گھوڑا۔ ہتھیار۔ خادم وغیرہ۔ حضرت علی فرمایا کرتے تھے۔ "ہم میں سے جو کوئی شخص بھی والی ہو" اگر اس کے بیوی نہ ہو تو بیوی کرے نوکر نہ ہو تو نوکر رکھے۔ گھر نہ ہو تو گھر بنائے یا کرایہ پر لے۔ سواری کا جانور نہ ہو تو وہ لے اس سے زیادہ جو لے گا وہ یا خائن ہے یا چور [۲]

گورنر یا کوئی اور عہدہ دار تو الگ رہا۔ خود خلیفہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ اللہ کے مال میں سے خلیفہ کے لیے صرف دو پیالے لینا جائز ہیں ایک پیالہ اہل وعیال کیلئے اور دوسرا لوگوں کی خاطر مدارت کے لیے [۳]

عتاب بن اسید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مکہ کے عامل تھے اور عہد صدیقی میں بھی اسی عہدہ پر فائز رہے۔ انکو تیس درہم ماہانہ تنخواہ ملتی تھی [۴] ظاہر ہے یہ قلیل تنخواہ ناگزیر ضروریاتِ زندگی کی ہی کفیل ہو سکتی تھی اس میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ پس انداز کر سکیں چنانچہ اس منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد اس زمانہ کی کمائی کی یادگار جو چیز ان کے پاس بچی تھی وہ صرف دو کپڑے تھے جو انہوں نے اپنے غلام کے سان کو پہنا دیتے تھے [۵]

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بہ نسبت عہدِ نبویؐ کے ریاستی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اس بنا پر تنخواہوں کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ بہرحال حضرت ابوبکر کا اصول یہ تھا کہ تنخواہیں (اصل ضروریات زندگی کے لحاظ سے) سب کی برابر رکھتے تھے۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے۔

وقسم ابوبکر بین الناس بالسویة	اور ابوبکر لوگوں میں برابر سرابر تقسیم کرتے تھے کسی
لم یفضل احداً علی احدٍ [۱]	کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۰۳ [۲] کنز العمال برحاشیہ مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۴۲ [۳] کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۲ ص ۱۴۲ [۴] التراتیب الاداریۃ الکتانی ج ۱ ص ۴۴۶ [۵] الاصابہ ج ۲ ص ۴۴۴ تذکرۂ عتاب بن اسید [۱] الاصابہ

ایک مرتبہ مال آیا اور آپ نے اس کو حسبِ معمول برابر برابر تقسیم کر دیا اور فرمایا "مجھ کو یہ پسند ہے کہ میں بقدرِ ضرورت لینے پر اکتفا کروں۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جہاد کیا ہے وہ خالص اللہ کے لیے رہے"[1]

حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ حضرت ابوبکرؓ شروع میں تو کوئی تنخواہ لیتے ہی نہیں تھے صبح میں جو تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی اسی پر گزر بسر کرتے تھے۔ لیکن جب امورِ خلافت میں انہماک بڑھا تو اب چونکہ تجارت میں مشغولیت فرائضِ خلافت کی بجاآوری میں رخنہ انداز ہو سکتی تھی اس لیئے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کے کہنے پر آپ نے بقدرِ ضرورت اپنی تنخواہ بھی مقرر کر لی لیکن اس تنخواہ کی مقدار کیا تھی؟ اس میں مختلف روایات ہیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ آپ تین درہم یومیہ لیتے تھے[2] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ہزار درہم سالانہ لیتے تھے اور ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے کل مدتِ خلافت میں بیت المال سے اپنے گھر کے خرچ کے لیے صرف چھ ہزار درہم لیے تھے۔ لیکن وفات کے وقت اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ کو وصیت کی کہ یہ رقم بھی ان کی جائیداد کو فروخت کر کے بیت المال میں جمع کر دی جائے[3]

اس بناء پر ہمارا خیال ہے کہ شروع میں حضرت ابوبکر نے صحابہ کے کہنے سننے سے اپنا وظیفہ مقرر ضرور کر لیا تھا لیکن اس کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ زندگی بہت سادہ اور گھر کی ضرورتیں مختصر تھیں۔ اس لیے صرف بقدرِ ضرورت لیتے تھے اور اگر کبھی گنجائش دیکھی اور کوئی غیر معمولی ضرورت اچانک پیش آگئی تو مقررہ رقم سے زیادہ بھی لے لیتے تھے اور یہ جو کچھ کرتے تھے اہلِ شوریٰ کے مشورہ اور اُن کی اجازت سے کرتے تھے۔

غور کرو! کیا اس سے بڑھ کر جمہوری سوشلسٹ گورنمنٹ دنیا کی تاریخ میں کوئی اور بھی ہوئی ہے۔

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۶۲ [2] یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۴ [3] کتاب الاموال ص ۲۶۷۔

مالی نظام

ریاست کے ذرائع آمدنی اور مصارف

حضرت ابوبکرؓ کا مختصر عہد خلافت جو کچھ بھی تھا تمامتر جزیرہ عرب کے اندرونی استحکام قومی وحدت اور بیرونی حملوں سے اس کی حفاظت کے کاموں میں مصروف رہا اس لیئے آپ کو اتنی فرصت نہیں ملی کہ حضرت عمرؓ فاروق کی طرح حکومت کے مختلف کاموں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک شعبہ کیلئے جدا جدا محکمہ قائم کرتے ہر محکمہ کے الگ الگ عہدہ دار مقرر فرماتے اور اس کیلئے آئین وضابطہ کی حدبندی کرتے۔ اس بنا پر عہدِ صدیقی کے نظم ونسق اور معاملات و مسائلِ حکومت وریاست میں وہی سادگی پائی جاتی ہے جو آنحضرت ؐ کے عہدِ مبارک میں پائی جاتی تھی۔ اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ کے مالی انتظامات کو سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ خود عہدِ نبوت میں مالی نظام کیا تھا۔

عہد نبوت میں نظام مالی دوسرے احکام کی طرح انفاقِ مال سے متعلق احکام دفعتہً نازل نہیں ہوئے بلکہ تدریجی طور پر حسب موقع و ضرورت نازل ہوئے یا زبان حق ترجمانِ نبوت سے ادا ہوتے رہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی منزل تو ترغیبؑ دعوت کی تھی۔ یعنی اس وقت تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آنحضرت ؐ مکہ میں قیام رکھتے تھے اور مختلف ضرورتوں کے لئے روپیہ درکار تھا چنانچہ آپ نے فرمایا، "اپنے آپ کو دوزخ سے بچانے کیلئے تم کو خرچ کرنا چاہیئے خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو"[1] اس کے علاوہ قرآن میں بھی

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۴۰۔

بہت سی ترغیبات ہیں اس کے بعد جب آپ نے ہجرت کی اور صحابہ کرام اپنا گھر بار چھوڑکر مدینہ آنے لگے تو اب سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی آبادکاری کا تھا اور ظاہر ہے روپیہ کے بغیر یہ حل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس پیچیدہ ترین گتھی کو اس خوبی کے ساتھ حل کیا کہ تاریخ میں اس جیسی نظیر مشکل سے ہی ملسکتی ہے آپ نے انصار اور مہاجرین میں مواخات کرا دی۔ اس مواخات میں یہ شرط تھی کہ مہاجر اور انصار دونوں ایک ساتھ مل کر کام کریں گے اور وراثت تک میں ایک دوسرے کے شریک رہیں گے۔ اس طرح مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ لیکن دوسرے کاموں کیلئے روپیہ کی بھی ضرورت تھی۔ اس لئے اب صدقات و خیرات کے کار خیر ہونے کا اعلان ہوا آنحضرتؐ نے اس کا یہ نظم قائم کیا کہ تمام صدقات و خیرات خود وصول فرماتے اور ارباب حوائج پر تقسیم فرما دیتے۔ لیکن یہ خیرات خود آپ کے اور بنو ہاشم کیلئے حرام تھی۔ اس طرح آنحضرتؐ نے ان بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا جو عام طور پر پبلک فنڈ کر نیوالوں سے صادر ہوتی ہے بلکہ دنیا کی عظیم الشان بادشاہتوں کا تو تخیل ہی یہ رہا ہے کہ پبلک کا جو روپیہ خزانہ میں آتا ہے وہ بادشاہ کی ملک ہے اور اس کو حق ہے کہ اس روپیہ کو اپنی ذات اور اپنے متعلقین پر جس طرح چاہے خرچ کرے

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا اس کے بعد صدقہ و خیرات کا عام حکم نازل ہوا۔ لوگوں نے پوچھا حضورؐ ہم کیا خرچ کریں تو ارشاد ہوا ضروریات زندگی پوری کرنے سے جو کچھ بچ رہے۔ "یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ۔ پھر جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں اور تجارتی کاروبار کو فروغ ہوا تو اب حکم ہوا"

یاایھاالذین آمنوا انفقوا من طیبات ماکسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض۔ (بقرہ) اے ایمان والو! جو اچھی چیزیں تم کماؤ اور جن کو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اس میں سے خرچ کرو

لیکن اس وقت تک چونکہ تمام عرب مطیع نہیں ہوا تھا، اسلام صرف ایک تحریک کی صورت میں تھا اور اور باقاعدہ کوئی ریاست (STATE) قائم نہیں ہوئی تھی۔

اس لیے انفاق مالی اور اس کے جمع و خرچ کا کوئی باقاعدہ نظم قائم نہیں ہوا۔ ۸ھ میں مکہ کی فتح کے بعد آخر اس کا بھی وقت آگیا اور اس کا پورا انتظام قائم کر دیا گیا اس سلسلہ میں پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ اے محمدؐ آپ ان لوگوں کے مالوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجئے تاکہ آپ انکو اس ذریعہ سے پاک وصاف بنا دیں۔

اس کے بعد ۹ھ کے آخر میں سورۂ توبہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں زکوٰۃ کے احکام اسکی اہمیت و ضرورت۔ اور اس کے مصارف اور ساتھ ہی جزیہ کا حکم۔ یہ سب کچھ نازل ہوا۔ ان کی روشنی میں ۹ھ میں آنحضرتؐ نے باقاعدہ عمال و محصلین کا تقرر فرمایا۔ زکوٰۃ کے احکام و قوانین مرتب فرمائے اور ان احکام کیساتھ عمال کو زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں روانہ کیا یہ وہ وقت ہے جب زکوٰۃ کی حیثیت ایک ریاستی ٹیکس (STATE DUTY) کی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بیت المال کا قیام بھی عمل میں آیا۔

زکوٰۃ کی شرح | دولت کے سرچشمے دراصل تین ہی ہیں۔ سونا۔ چاندی۔ جانور اور زمین کی پیداوار آنحضرتؐ نے ان میں سے ہر ایک کی شرحیں الگ الگ مقرر فرمائیں۔ سونے چاندی میں ۱/۴۰ حصہ جانوروں کی زکوٰۃ کی شرح ان کی مختلف قسموں کے لحاظ سے جدا جدا متعین ہوئی اور بڑی تفصیل کیساتھ۔ مثلاً اونٹ کیلئے نصاب زکوٰۃ پانچ مقرر کیا گیا۔ اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری نو اونٹوں تک، دس سے چودہ تک دو بکریاں، پندرہ سے انیس تک تین بکریاں بیس سے چوبیس تک چار بکریاں۔ پچیس سے پینتیس تک اونٹ کا ایک سال کا بچہ۔ چھتیس سے پینتالیس تک دو سال کا بچہ۔ چھیالیس سے ساٹھ تک تین سال کا۔ اکسٹھ سے پچھتر تک چار سال کا۔ چھہتر سے نوے تک دو برس کے دو بچے۔ اکیانوے سے ایک سو بیس تک تین سال کے دو بچے۔ ایک سو بیس کے بعد ہر چالیس پر دو سال کا بچہ اور پھر ہر پچاس پر تین برس کا بچہ اسی طرح کے مفصل احکام بکری، گائے، بھینس وغیرہ کے متعلق ہیں۔

یہ تمام شرحیں وہ ہیں جو آنحضرتؐ نے اپنے ایک فرمان خصوصی میں درج فرما دی تھیں۔ لیکن ابھی ان کو عمال کے ہاتھ روانہ نہیں کیا گیا تھا کہ دنیا سے تشریف لے گئے آپ کے بعد

حضرت ابوبکرؓ نے اسپر عمل کیا اور اس کی نقول عمالِ صدقات کے پاس بھیجدیں عبداللہ بن انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے والد انسؓ کو عامل صدقہ (مصدق) بناکر روانہ کیا تو انہیں اپنی ایک تحریر عنایت فرمائی جس پر آنحضرتؐ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ حضرت انسؓ نے اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مفصل احکام و ہدایات تھے۔

زمین پر محصول | زمین اگر مسلمانوں کی مملوکہ ہے تو وہ دو قسم کی ہو سکتی ہے ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے میں نہروں کے ذریعے آبپاشی یا موسمی خصوصیات کے باعث کاشتکار کو محنت نسبتاً کم کرنی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس کی آبیاری کیلئے کاشتکار کو کنویں سے پانی نکالنا ہوتا ہے اس لیے اس کو مشقت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ پہلی قسم کی زمین پر عشر یعنی پیداوار کا $\frac{1}{10}$ حصہ دینا ہوگا خواہ وہ روپیہ کی شکل میں ہو یا جنس کی صورت میں، دوسری قسم کی زمین کا محصول عشر کا آدھا یعنی $\frac{1}{20}$ ہے

لگان اجارہ | حکومت کی آمدنی کا ایک ذریعہ لگان اجارہ یا ٹھیکہ بھی تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ زمین کا کوئی ٹکڑا کسی کاروبار کیلئے ایک شخص کو دے دیا جاتا ہے اور یہ شرط ہوتی تھی کہ وہ اس کاروبار کے منافع میں سے ایک متعین رقم بیت المال میں داخل کرے گا۔ چنانچہ بنو متعان کا ایک شخص جس کا نام ہلال تھا اس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ ایک وادی جس کا نام سلبہ تھا۔ اس کیلئے مخصوص کردی جائے تاکہ وہ اس میں شہد کی مکھیوں کی پرورش کرسکے۔ آنحضرتؐ نے اس شرط پر کہ وہ شہد جو کچھ پیدا ہوگا اس کا عشر بیت المال میں جمع کرے گا اس کی درخواست منظور فرمائی حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں طائف کے گورنر سفیان بن وہب نے خلیفہ دوم سے ایک مرتبہ اس کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اگر یہ شخص شہد کا عشر اب بھی اسی طرح ادا کرے جسطرح وہ آنحضرتؐ کو ادا کرتا تھا تو یہ وادی اس کیلئے مخصوص رہنے دو۔ ورنہ اس وادی کی مکھیاں جنگل کی مکھیوں کی طرح ہیں جو شخص چاہے ان کا شہد کھا سکتا ہے

خراج | آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ جو اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ خراج بھی تھا۔ خراج مال یا زمین کی پیداوار کی اس مقدار معین کو کہتے ہیں جو مفتوحین کی زمین پر بطور محصول مقرر کر دی گئی

چنانچہ جب آنحضرتؐ نے خیبر فتح کیا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں اور ان کو جوتنا بونا تم سے زیادہ جانتے ہیں، اس لئے ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کرلو۔

آنحضرتؐ نے ان کی یہ درخواست منظور کرلی اور نصفا نصفی پر معاملہ ہوگیا، فدک کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کرنا چاہا۔ آنحضرتؐ نے ان لوگوں کی درخواست بھی قبول کرلی

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے دور خلافت میں ان لوگوں کیساتھ یہی معاملہ مقاسمت یعنی بٹائی کا رکھا[1] لیکن حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عراق اور شام کے جو حصے فتح ہوئے تھے۔ آپ نے ان پر سرسری طور پر کچھ رقم متعین کردی تھی اس سے یہ ثابت ہوا کہ امام کو اختیار کلی ہے وہ اگر چاہے تو مفتوحہ زمین پر بٹائی کا معاملہ کرسکتا ہے اور اگر چاہے تو ایک خاص رقم مقرر کردے۔ بہرحال یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ زمین بزور شمشیر فتح کی گئی ہو۔ اور امام نے اسکو مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کیا ہو

جزیہ | یہ ٹیکس بھی غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں اور خراج میں فرق یہ ہے کہ خراج کیلئے کوئی قرآنی نص نہیں ہے بلکہ آنحضرتؐ کی سنت اور آپ کے عمل سے ثابت ہے۔ اس کے برخلاف جزیہ کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ خراج زمین کا ٹیکس ہے۔ بعد میں گر مالک زمین مسلمان بھی ہوجائے تو زمین خراجی ہی رہتی ہے لیکن جزیہ فرد کا ٹیکس ہے اور اس حیثیت سے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مسلمان پر زکوٰۃ اگر یہ شخص مسلمان ہوجائے تو جزیہ اس سے ساقط ہوجائیگا۔

اگرچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جزیہ کی شرح متعین کردی تھی۔ لیکن عہد نبوی اور اس کے بعد عہد صدیقی میں اس کی کوئی شرح مقرر نہیں تھی۔ بلکہ سہولت کیساتھ جو شخص جتنا دے سکتا تھا اس سے اتنا ہی لیا جاتا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔

لیس فی اموال اهل الذمة الا العفو۔[3] — اہل ذمہ کے مالوں میں سے اتنا ہی لیا جائیگا جو ان کی ضرورتوں سے زائد ہو۔

اہل یمن تجارت پیشہ ہونیکے باعث مالدار اور خوش حال تھے اس لیے آنحضرتؐ نے ان پر فی کس ایک دینار جزیہ مقرر کیا تھا[4] نجران اور بحرین کے لوگوں کو آپ نے مکتوب گرامی ارسال فرمایا تھا اس کی تصریح تھی کہ اگر اسلام قبول نہیں کیا تو انہیں جزیہ دینا ہوگا۔

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۵۰ و ۵۱ [2] کتاب الخراج ص ۵۰ [3] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۲ [4] کتاب الاموال ابو عبید ص ۲۱

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حیرہ صلحاً فتح ہوا تھا اس لیے خراج کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ حضرت خالدؓ نے ان لوگوں سے فی کس دس درہم کے حساب سے جزیہ وصول کیا اور اس کو مدینہ روانہ کیا [1]

فے اور غنیمت آمدنی کا ایک ذریعہ فے اور غنیمت بھی تھا۔ دونوں میں یہ فرق ہے کہ فے اس مال کو کہتے تھے جو فریق محارب سے بغیر قتال و جدل کے حاصل ہوتا تھا، اور بحالت جنگ جو مال ملتا تھا وہ غنیمت کہلاتا تھا۔ آنحضرت صلعم کے عہد میں اس کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ چار حصے مجاہدین پر تقسیم ہو جاتے تھے اور ایک حصہ کو پھر پانچ حصوں پر تقسیم کر کے اس طرح بانٹ دیا جاتا تھا کہ ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کا۔ دوسرا آنحضرت صلعم کے ذوی القربیٰ کا۔ تیسرا یتیموں کا۔ چوتھا مسکینوں کا اور پانچواں مسافروں کا عہد نبویؐ میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

جاگیر بخشی عہد نبوت میں جاگیر بخشی کا رواج تھا اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کو زمین کا ایک ٹکڑہ اس شرط پر عطا فرما دیتے تھے کہ وہ اس کو جوت بو کر آباد کرے گا اور اس کی آمدنی کا ایک حصہ بیت المال میں داخل کرے گا [2] ایک مرتبہ آپ نے قبیلہ مزینہ کے چند لوگوں کو ایک زمین عطا فرمائی۔ لیکن ان لوگوں نے اس کو جوتنے بونے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے اسمیں کاشتکاری کر لی۔ اب مزینہ والوں نے اس زمین کو پھر واپس لینا چاہا۔ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے فیصلہ دیا جو شخص تین برس تک زمین کو یونہی ڈالے رکھے اور پھر کوئی شخص اس کو آباد کر دے تو یہ دوسرا ہی زمین کا زیادہ حقدار ہوگا [3]

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس طریقہ کو اسی طرح قائم رکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے یمامہ کے مجاعہ نامی ایک شخص کو ایک درخواست پر اپنے ایک فرمان خصوصی کیساتھ یمامہ کو کچھ زمینیں عطا فرمائی تھیں، اور فرمان میں یہ بھی لکھا تھا کہ "اگر تم سے کوئی شخص جھگڑا کرے تو میرے پاس آنا"، آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد مجاعہ بن مرارہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۷ [2] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۷۲ [3] الخطط ج ا ص ۱۸۲ اسکے علاوہ احکام السلطانیہ للماوردی میں از صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۵ ایسی زمینوں کا ذکر تفصیل کیساتھ مذکور ہے۔

اور مزید ایک زمین کی درخواست کی تو حضرت ابوبکرؓ نے ایک زمین جس کا نام خضرامہ تھا اس کو عطا فرما دی [1]

ایک مرتبہ آپ نے طلحۃ بن عبداللہ کو ایک جاگیر عطا فرما دی اور اس کیلئے ایک تحریر بھی لکھ دی طلحۃ یہ تحریر لیکر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس پر مہر لگا دیجیے۔ حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور بولے کہ رد کیا اور لوگوں کو چھوڑ کر یہ ساری زمین تم کو ہی ملے گی؟"، طلحۃ کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس واپس لوٹے اور کہا بخدا میں نہیں جانتا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "نہیں عمرؓ ہی خلیفہ ہیں۔ لیکن انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا [2]۔

لیکن اس موقع پر یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عہد نبوت میں اور اس کے بعد عہد خلفاء میں بھی جو زمین جاگیریں کسی کو دیجاتی تھیں وہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ ان زمینوں کو جوت بو کر کارآمد بنایا جائے اور ان سے وہ شخص اور اس کے متعلقین فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان زمینوں کو بیکار چھوڑ دیتا تھا تو وہ اس سے واپس لے لی جاتی تھی اور کسی اور کو دیدی جاتی تھیں، جاگیر اور زمین چونکہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی اس بنا پر ہر خلیفہ کے عہد میں بیشک تجدید کی ضرورت بھی ہوتی تھی چنانچہ آنحضرت صلعم نے تمیم بن اوس الداری کو جیرون اور بیت عینون نام کے دو قریے عنایت فرمائے تھے اور ایک فرمان کے ذریعہ اس کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں پھر اس کی تجدید ہوئی اور آپ نے بھی قریب قریب اسی مضمون کا ایک فرمان صادر کیا" [3]

معادن پر ٹیکس عہد نبوت میں یہ تو ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے معادن بعض لوگوں کو دیئے ہیں مثلاً بلال بن الحارث المزنی کو قبلیہ (ساحل سمندر پر مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر ایک علاقہ کا نام ہے) کے معادن عنایت فرمائے۔ اسی طرح صحیح حدیث میں حضرت ابوہریرۃ سے مروی ہے کہ رکاز (مدفون خزانہ یا معدن) پر ایک خمس واجب ہے۔ لیکن یہ ٹیکس خود آپؐ نے وصول کیا ہو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو سلیم کی معدن حضرت ابوبکرؓ کے

---

[1] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۸۱ [2] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۷۶ [3] کتاب الاموال ابوعبیدہ حاشیہ ص ۲۷۵

عہد میں فتح ہوئی تو اس کی آمدنی بیت المال میں داخل کی گئی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے پاس قبیلہ اور جہینہ کی معدنوں سے بھی کثیر مال آتا تھا[1]

بعض اور آمدنیاں مذکورۂ بالا ذرائع کے علاوہ آمدنی کے دوسرے ذرائع اور بھی تھے مثلاً کوئی شخص اگر لاوارث ہوتا تھا یا اس کا وارث تو ہوتا تھا لیکن غلامی یا وجوب قتل وغیرہ کوئی چیز اسکے لیے مانع وراثت ہوتی تھی تو متوفی کی پوری املاک وجائیداد حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی تھی اس کے علاوہ تجارتی اموال وبضائع پر بھی ٹیکس لگتا تھا اور اس سے حکومت کو آمدنی ہوتی تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں آمدنی کے بعض نئے ذرائع پیدا ہوئے جو عہد نبوت اور عہد صدیقی میں نہیں تھے۔ مثلاً اسلامی مملکت میں باہر کے ملکوں کا جو مال آتا تھا اس پر محصول درآمد[2] (IMPORT DUTY) کی وصولیابی عہدِ فاروقی کا کارنامہ ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ رحمت عالم کی شان اسی کی مقتضی تھی کہ بین المملکتی تجارت کو آزاد رکھا جائے اور اس پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے اور چونکہ عہد صدیقی درحقیقت عہد نبوت کا ہی آئینہ تھا اس لیے جو چیز آنحضرتؐ نے اختیار نہیں کی حضرت ابوبکرؓ اسے کیونکر مروّج کر سکتے تھے اور حضرت عمرؓ نے اپنے یہاں اس کو رائج کیا بھی تو اس مجبوری سے کہ دوسرے ممالک کی حکومتیں مسلمان تاجروں سے یہ ٹیکس وصول کرتی تھیں۔

البتہ ہاں سمندروں سے جو منافع حاصل ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر بھی ٹیکس لگایا لیکن عہد نبوت اور عہد صدیقی میں اس کا پتہ نہیں چلتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کا قبضہ سمندروں پر نہیں ہوا تھا۔

یہ وہ ریاستی آمدنی کے ذرائع تھے جو آنحضرتؐ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو جوں کا توں باقی رکھا اور اس میں جہاں کہیں کوئی رخنہ پڑتا نظر آیا اس کو پوری قوت کے ساتھ روکا اور بند کیا۔

زکوٰۃ کی حیثیت اسٹیٹ ڈیوٹی کی ہے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد منکرین زکوٰۃ کا جو فتنہ اٹھا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کا جس طرح قلع قمع کیا اس کا ذکر گزر چکا ہے اس سلسلہ میں یہاں

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵۱ [2] فقہا کی اصطلاح میں اس کو عشور کہتے ہیں۔

یہ جان لینا ضروری ہے کہ مانعینِ زکوٰۃ دراصل دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو سرے سے زکوٰۃ کی فرضیت کے ہی قائل نہیں رہے تھے اور دوسرے وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کو فرض تو مانتے تھے لیکن اس بات کیلئے آمادہ نہیں تھے کہ ان کی زکوٰۃ مدینہ بھیجی جائے۔ آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَائِهِمْ"، دوسرا گروہ اس ارشاد نبویؐ سے استدلال کرتا تھا کہ زکوٰۃ جس قبیلے کے امیروں سے وصول کی جائے گی۔ اسی قبیلے کے غریبوں پر خرچ ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ چونکہ آنحضرتؐ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس بنا پر آپ کو تو بیشک اس بات کا حق تھا کہ سب قبائل کی زکوٰۃ وصول کریں۔ لیکن آپؐ کے بعد یہ حق کسی اور کو نہیں پہونچتا۔ اس لیے ان پر ضروری نہیں کہ وہ اپنی زکوٰۃ مدینہ بھیجیں۔ زکوٰۃ کو مدینہ بھیجنا ان کے نزدیک ایک طرح کا ڈانڈ یا تاوان تھا۔ جیسا کہ قرۃ بن ہبیرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی گفتگو سے ظاہر ہے جس میں قرۃ نے زکوٰۃ کیلئے "اتاوہ" کا لفظ استعمال کیا ہے[1]

حضرت ابوبکرؓ کا جہاد ان دونوں گروہوں کے خلاف تھا آپ نے فرمایا کہ جس طرح آنحضرتؐ زکوٰۃ لیتے تھے اسی طرح میں بھی لوں گا۔ اور اگر انہوں نے اونٹ کی ایک رسّی جس کو عہد نبوی میں دیتے تھے مجھ کو اس کے دینے سے بھی انکار کیا (لو منعونی عقالا) تو میں ان سے جہاد وقتال کروں گا۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ ارشاد فقہی اعتبار سے نہایت اہم ہے جس کی طرف کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے۔ آپ نے یہ فرماکر جہاں پہلے گروہ کی خام خیالی کا رد کرکے یہ حقیقت واضح کردی کہ زکوٰۃ بھی اسی طرح فرض اور عبادت ہے جس طرح کہ نماز ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ساتھ ہی دوسرے گروہ کی تردید کرکے صاف بتلا دیا کہ زکوٰۃ دراصل اسٹیٹ ڈیوٹی یعنی اسلامی حکومت اگر قائم ہو تو یہ اس کا ٹیکس ہے۔ اس لیے جب تک آنحضرتؐ رہے آپ وصول فرماتے رہے اب صدر ریاست میں ہوں تو میں وصول کروں گا۔ پس زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت یہی ہے۔ کسی شخص یا کسی قبیلہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ نکالدے اور حکومت کے خزانے میں اس کو جمع نہ کرے۔

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۸۔

حضرت ابوبکرؓ کا یہ فیصلہ چونکہ نہایت اہم تھا اور دقیق و غامض بھی اسی لیے حضرت عمرؓ جیسے نکتہ شناس شریعت نے اس کی داد دی اور صاف طور پر فرمایا۔

فعرفت انه الحق [۲] پھر مجھ کو معلوم ہوگیا کہ واقعی حضرت ابوبکرؓ کی رائے ہی درست تھی۔

حکومت کے مصارف مذکورہ بالا ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ خلیفہ کے اختیار اور اس کی رائے سے حکومت کے تمام شعبوں پر خرچ کی جاتی تھی۔ عمال صدقات کا روزینہ تو انہی کے جمع کیے ہوئے صدقہ سے دیا جاتا تھا اس کے علاوہ باقی تمام کارپردازان حکومت کی تنخواہیں خلیفہ کی تنخواہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے فوج کیلئے سامانِ رسد، آلات حرب کی فراہمی انکی دیگر ضروریات سماجی اور معاشرتی کام۔ دینی اور مذہبی امور۔ رفاہ عامہ ان سب کی تکمیل بیت المال سے ہوتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں کی تکمیل چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جو علاقے فتح ہوئے ان میں سے بعض وہ تھے جن کی فتح کی پیشگوئی آنحضرتؐ کر چکے تھے اس لیے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضورؐ کا کسی سے وعدہ بغیر تکمیل کے رہ جائے آپ نے اعلان عام کرا دیا تھا کہ جس کسی شخص سے آپ نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ میرے پاس آئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بحرین کا مال آیا تو ایک شخص ابن ابی نجیح نے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھ سے آنحضرتؐ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر بحرین کا مال آیا تو (دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے) میں تم کو اتنا اور اتنا دونگا حضرت ابوبکرؓ نے کہا "اچھا تو یہ دونوں ہاتھوں سے اٹھالو"، اس شخص نے اٹھایا اور گنا تو پانچسو درہم تھے۔ چونکہ اس شخص نے ہاتھوں سے دو مرتبہ اشارہ کیا تھا اور ایک مرتبہ کی مٹھی بھرنے میں پانچسو درہم آئے تھے اس لئے اس رقم کو دگنا کر کے حضرت ابوبکرؓ نے اس کو ایک ہزار درہم عطا فرما دیئے [۲]۔

[۱] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ حکم اسی وقت تک کیلئے ہے جبکہ مسلمانوں کی اپنی کوئی حکومت اور اجتماعی نظام قائم ہو اور حکومت کی جانب سے زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے عمال و محصلین مقرر ہوں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک یہی نظام قائم رہا اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب حکومت بہت متمول ہوگئی اور روپیہ کی ریل پیل بڑھ گئی تو زکوٰۃ کو انفرادی طور پر ادا کر دینے کی اجازت دیدی گئی [۲] کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۲۳

تقسیم میں مساوات آنحضرتؐ کے وعدوں کی اس طرح تکمیل کرنے کے بعد باقی جو رقم بچتی تھی حضرت ابوبکرؓ اس کو عورت مرد، چھوٹا بڑا، غلام اور آزاد سب پر برابر تقسیم کر دیتے تھے کیونکہ یہی دستور آنحضرتؐ کا بھی تھا۔ ایک مرتبہ بحرین سے مال آیا آپنے اس کو علی السویہ تقسیم کیا تو فی کس سوا سات درہم آکر پڑا۔ دوسرے سال مال زیادہ آیا اور حسب سابق برابر تقسیم کیا گیا تو فی کس بیس درہم حصہ میں آئے بعض لوگوں نے ازراہ نکتہ چینی کہا کہ اے خلیفہ رسولؐ آپنے مال برابر تقسیم کر دیا ہے حالانکہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دوسروں پر تقدم اور تفوق حاصل ہے اگر آپ ان کے سبقت الی الاسلام اور فضیلت کی رعایت رکھتے تو بہتر ہوتا آپنے جواب دیا تمنے جن فضائل و سوابق کا ذکر کیا ہے ان کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے؟ لیکن یہ چیزیں وہ ہیں جن کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ یہ بہر حال معاش کا معاملہ ہے اس میں برابری کا معاملہ کرنا ترجیح دینے سے بہتر ہے [۱]

خمس مال غنیمت کی تقسیم پہلے گزر چکا ہے کہ عہد نبوت میں جو مالِ غنیمت آتا تھا اس کا خمس پانچ حصوں پر تقسیم کر لیا جاتا تھا اور اس میں سے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا اور دوسرا حصہ آنحضرتؐ کے ذوی القربیٰ کا ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی خمس کی تقسیم کے اسی قاعدہ کو باقی رکھا اور اسمیں ذرا کمی بیشی یا قطع برید نہیں کی۔ عہد نبوت میں حضرت علیؓ پورا خمس خود لیتے تھے اور پھر اس کو ذوی القربیٰ پر حسب مراتب و مدارج تقسیم کر دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چنانچہ خود حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں خمس آنحضرتؐ کی حیات میں تقسیم کرتا تھا۔ اس لئے ابوبکرؓ نے بھی مجھ کو اس کا متولی بنا دیا اور ان کی زندگی میں بھی خمس میں ہی تقسیم کرتا تھا [۲] ابو عبیدہ نے ابن شہاب الزہری کا ایک قول نقل کیا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق و تائید ہوتی ہے انہوں نے فرمایا

وکان ابوبکر یقسم من الخمس نحو قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۳] — ابوبکرؓ خمس کو اسی طرح تقسیم کرتے تھے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے

ایک غلط روایت اس پر یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ قاضی ابویوسف نے ایک روایت نقل کی ہے

[۱] کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۴۲ اصل کتاب میں "الاسوۃ" چھپا ہوا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے صحیح السویۃ ہے اور اصل فقرہ یوں ہے "السویۃ خیر من الاثرۃ" [۲] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲ [۳] کتاب الاموال ص ۳۳۱ باب سهم ذی القربیٰ من الخمس۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خمس میں سے رسولؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا۔ اور صرف تین حصے باقی رکھے تھے [1] لیکن یہ روایت بالکل لغو ہے۔ کیونکہ اس کا راوی محمد بن السائب الکلبی ہے اور وہ محدثین کے نزدیک مجروح اور ناقابلِ اعتبار ہے۔
حضرت سفیان الثوری کہا کرتے تھے

اتقوا الکلبی ___ کلبی سے بچو

لوگوں نے کہا "تو پھر آپ اس سے کیوں روایت کرتے ہیں؟" فرمایا "میں اس کے جھوٹ سچ کی پرکھ رکھتا ہوں" یزید بن زریع جو مشہور امام حدیث ہیں انہوں نے ایک مرتبہ کلبی سے کوئی روایت کی تو ساتھ ہی فرمایا کہ کلبی سبائی تھا حضرت اعمش نے یہ سنکر کہا کہ سبائیوں سے بچنا چاہیے میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ لوگ ان کو کذاب کہتے ہیں۔"

کلبی کا یہ حال تو عام ہے پھر روایت زیرِ بحث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اسناد یہ ہے۔
عن ابی صالح عن ابن عباس اور محمد بن السائب الکلبی کی اس خاص اسناد کے متعلق ائمہ حدیث کا اتفاق ہے کہ اس اسناد سے جو روایت ہوگی وہ جھوٹی ہوگی۔ چنانچہ خود حضرت سفیان جنہوں نے کلبی سے روایت کی ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک مرتبہ کلبی نے کہا تھا کہ میں ابوصالح سے جو روایت بھی کروں گا وہ جھوٹی ہوگی ابن عدی کا قول ہے۔

واما فی الحدیث فعنده مناکیر	حدیث کے سلسلہ میں کلبی سے بہت سی منکر
وخاصة اذا روی عن ابی	احادیث مروی ہیں اور خاص طور پر وہ روایت
صالح عن ابن عباس	جو ابن عباس سے بواسطہ ابوصالح مروی ہیں۔

حدیث کے علاوہ اس شخص کا تفسیر میں یہی حال تھا کلبی نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کیا محمد بن السائب الکلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ فرمایا "نہیں" [2]

غیر مسلموں کا سماجی تحفظ

غیر مسلم جب جزیہ دینے کی حامی بھر کر اسلامی حکومت کی اطاعت

[1] کتاب الخراج ص ۱۹ باب قسمة الغنائم [2] کلبی کے متعلق یہ تمام معلومات میزان الاعتدال فی نقد الرجال حافظ ذہبی ج ۳ ص ۶۱، ۶۲ حرف المیم سے ماخوذ ہیں۔

قبول کر لیتا ہے تو وہ ذمی کہلاتا ہے اور اس کے لیے اسلام کا صاف حکم یہ ہے "لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین" ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے اور ان پر وہ سب کچھ واجب ہوگا جو مسلمانوں پر ہوتا ہے اس مساواتِ حقوق کی بنا پر جس طرح مسلمان محتاجوں اور اپاہجوں کی خبرگیری اور ان کا معاشی تکفل اسلامی بیت المال کا فرض ہے ٹھیک اسی طرح ازکار رفتہ غیر مسلموں کی حفاظت اور ان کے روزینہ کا انتظام بیت المال کے ذمہ ہے۔ چنانچہ حیرہ کی فتح کے موقع پر خالد بن الولید نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کی طرف سے اہل حیرہ کے نام جو عہد نامہ لکھا تھا اور جو دنیا کی تاریخ جنگ و صلح میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اس میں اور چیزوں کے ساتھ ایک اہم دفعہ یہ بھی تھی۔

ایما شیخ ضعف عن العمل او	جو کوئی (غیر مسلم) بوڑھا ازکار رفتہ ہو جائے یا جس کسی غیر مسلم
اصابته آفة من الآفات او کان غنیا	کو کوئی آفت پہنچے یا وہ مالدار ہو اور پھر فقیر ہو جائے اور
فافتقر وصار اهل دینه یتصدقون	اس کے اہل مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا
علیه طرحت جزیته وعیل من	جزیہ معاف ہو جائیگا اور مسلمانوں کے بیت المال میں سے اس کا
بیت المال المسلمین وعیاله ما اقام	اور اس کے متعلقین کا اس وقت تک برابر تکفل کیا جائے
بدار الهجرة ودار الاسلام	گا جب تک لوگ مدینہ اور اسلامی ملک میں رہیں گے۔

عہد نامہ کے آخر میں یہ بھی تحریر تھا، جو بوڑھے، جوان، غریب اور امیر، تندرست اور بیمار سب غیر مسلموں کیلئے عام تھا۔

فان طلبوا عونا من المسلمین	یہ لوگ مسلمانوں سے اگر کوئی مدد طلب کریں گے تو ان کی
اعینوا به ومؤنة العون من	مدد کی جائے گی اور اس مدد کے سلسلہ میں جو اخراجات
بیت مال المسلمین [1]	ہوں گے وہ بیت المال کے ذمہ ہوں گے

جن چیزوں پر ٹیکس نہیں ہے

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو عطیۂ فطرت، سمجھا گیا ہے۔ یعنی یہ چیزیں خود پیدا ہوتی ہیں اور انسانی محنت کو

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۴

اس میں دخل نہیں۔ [1] ابن خلدون نے ان کو "الفلاحۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے [2] مثلاً گھانس۔ بانس۔ لکڑی۔ نمک۔ پانی۔ جنگلی جانور۔ جنگل وغیرہ۔ اگرچہ ہمارے زمانہ کی مہذب حکومتوں تک نے ان پر ٹیکس لگایا ہے۔ لیکن اسلام نے ان چیزوں کو ٹیکس سے بالکل آزاد رکھا ہے اور ہر شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم پوری آزادی ہے کہ وہ حسب ضرورت ان سے استفادہ کرے۔ اس سے کسی قسم کا کوئی محصول نہیں لیا جائیگا۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف اور کتاب الاموال ابو عبیدہ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ عہد نبوت اور اس کے بعد عہد صدیقی میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

---

[1] مشکوٰۃ مجتبائی پریس ص ۲۵۹ مالم تعمل یداک

[2] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۲۱ - ۳۲۲

فوجی نظام

یوں تو عرب پیدائشی جنگجو تھے لیکن ان کا باقاعدہ کوئی فوجی نظام نہیں تھا، وہ گریز پا جنگ جس کو آج کل کی اطلاع میں گوریلا وار کہتے ہیں۔ اسکے عادی تھے۔ لیکن آنحضرت صلعم نے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبۂ زندگی کی بھی تنظیم کی، اسی تنظیم کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں نے حضرت ابو بکر صدیق کے عہد میں اس زمانہ کی سب سے زیادہ مہذب، متمدن اور طاقتور حکومتوں ایران اور روم کی فوجوں کو اپنی قلت تعداد اور سامان کی کمی کے باوجود شکست پر شکستیں دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ یونہی بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ [1]

ہم نے عربوں کے جس طریقۂ جنگ کو گریز پا جنگ کہا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اس کو کرّ و فر کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس طریقہ کے برخلاف عجم میں صف بستہ ہو کر لڑنے کا (جس کو عربی میں زحف کہتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی آیا ہے) طریقہ رائج تھا۔ آنحضرت صلعم نے حسب موقع و محل دونوں طریقے اختیار کیئے" لیکن

---

[1] میجر جنرل محمد اکبر خاں صاحب نے حال ہی ایک بڑی قابل قدر کتاب "حدیث دفاع" کے نام سے لکھی ہے جو بڑی تقطیع کے ۳۲۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور فیروز سنز لاہور نے اسکو شائع کیا ہے۔ جدید فن حرب کے ماہر کی حیثیت سے میجر صاحب نے اس کتاب میں شائع کیا ہے کہ آنحضرت صلعم خالص فنی نقطہ نظر سے بھی دنیا کے سب سے بڑے فاتح جنرل اور اصول حرب و ضرب کے ماہر تھے آپ نے جنگ کے وہ اصول و ضوابط متعین کیئے صحابہ کو جنگ کرنیکی جسطرح تربیت دی اور پھر خود جسطرح فوج کی قیادت کی اور اسکے لئے جو طریقے اختیار کیئے، چودہ سو برس سے زیادہ گذرنے کے باوجود علوم و فنون کے اس دور ترقی میں بھی اس پر ایک حرب کا اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل انوکھی اور لائق مطالعہ ہے۔

جہاں دشمن کی فوجیں صف بستہ ہوتی تھیں وہاں زحف کا طریقہ بھی اختیار کرتے تھے قرآن مجید نے اسی کو "کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" "گویا وہ لوگ ایک مضبوط بنیاد ہیں" کہا ہے[۱]۔

لشکر کے مختلف حصے عربی میں لشکر کو خمیس بھی کہتے ہیں۔ جو خمس (پانچ) سے مشتق ہے یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لشکر پانچ حصوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک دستۂ فوج جس میں امیر لشکر ہوتا تھا۔ قلب کہلاتا تھا۔ امیر لشکر کے دائیں جانب والے حصہ کو میمنہ اور بائیں جانب والے حصہ کو میسرہ کہتے تھے۔ لشکر کا پچھلا حصہ ساقہ اور اگلا حصہ مقدمۃ الجیش یا طلیعہ کہلاتا ہے۔ لشکر کی ترتیب دو قسم کی ہوتی تھی ایک ترتیب قریب جس میں لشکر کے سب حصے پاس پاس ہوتے تھے۔ اس کو تعبیہ کہتے تھے اور دوسری ترتیب بعید جس میں لشکر کے مختلف حصے ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے تھے اس وقت لشکر کے ہر حصہ کو کردوس کہتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے عہد میں تعلیہ کا رواج تھا لیکن حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں حضرت خالد نے شام پہونچکر جب دیکھا کہ دشمن کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف چھتیس ہزار ہے۔ تو آپنے اسلامی فوج ۳۶ سے ۴۰ تک دستوں (کرادیس) میں بانٹ دیا۔ اسطرح گویا ہر دستہ میں ایک ایک ہزار مجاہد تھے۔ اور ہر دستہ کا ایک ایک امیر مقرر کر دیا۔ قلب کے جو دستے تھے اُن کے امیر ابو عبیدۃ بن الجراح۔ میمنہ کے دستوں کے امیر عمرو بن العاص اور شرحبیل بن حسنہ، میسرہ کے دستوں کے امیر یزید بن ابی سفیان تھے اور پھر ہر دستہ کا الگ الگ بھی ایک امیر تھا۔ جو شجاعت اور بہادری میں نامور تھا مثلاً قعقاع بن عمرو، عبداللہ بن مسعود۔ قباث بن اشیم[۲] دشمن کی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر کسی نے کہا کہ ہائے! رومیوں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے اور اسکے مقابلہ میں مسلمان کس قدر کم ہیں! حضرت خالد نے فرمایا، نہیں بلکہ مسلمان کس قدر زیادہ ہیں اور رومی کتنے تھوڑے ہیں،" اس کے بعد کہا کہ کثرت و قلت کا دار و مدار کامیابی اور ناکامی پر ہے۔

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون باب القسم السابع فی الحروب [۲] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۲

یعنی ان کو یقین تھا کہ نتیجۂ جنگ انہیں کے حق میں ہوگا۔[۱]

لشکر میں وعظ گو حضرت ابوبکر کے عہد میں اس کا بھی اہتمام ہوتا تھا کہ چند ایسے حضرات لشکر کے ساتھ بھیجے جاتے تھے جو اپنے ولولہ انگیز خطبوں اور قرآن مجید کی آیاتِ جہاد کی تلاوت سے مجاہدین میں جوش پیدا کر دیتے تھے چنانچہ شام کی جنگ کے موقع پر یہ خدمت ابو سفیان بن حرب کے سپرد تھی، ان کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے مقداد تھے طبری نے روایت کی ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد سے آنحضرت صلعم کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ دشمن کے بالمقابل صف آرا ہونے کے بعد آپ سورۂ انفال کی آیات تلاوت فرماتے تھے آپ کے بعد بھی یہ دستور باقی رہا۔[۲]

جنگ کے ہتھیار لشکر میں شہسوار اور پا پیادہ دونوں قسم کے لوگ ہوتے تھے اور جنگ میں یہ لوگ جو ہتھیار استعمال کرتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ زرہ۔ تلوار۔ رمح یعنی بڑا نیزہ حربہ (چھوٹا نیزہ) الخط البحرین کا ایک ساحلی علاقہ ہے۔ یہاں نیزے بہت عمدہ بنتے تھے اور الرمح الخطی کہلاتے تھے۔ اسی طرح ہند میں تلواریں بہت عمدہ بنتی تھیں اور السیف الھندی کہلاتی تھیں۔ یہ اسلحہ تو وہ ہیں جو عام طور پر معروف ہیں ان کے علاوہ آنحضرت صلعم سے جن اور دوسرے اسلحہ کا استعمال مروی ہے انکے نام یہ ہیں۔

منجنیق، اس کی شکل توپ یا کمان کی سی ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ دشمن پر پتھر پھینکے جاتے تھے جو گولہ باری کا کام کرتے تھے۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ اسلام میں منجنیق کا استعمال سب سے پہلے آنحضرت صلعم نے کیا ہے[۳]

دبابہ :۔ اس کا ایک بڑا خول ہوتا تھا۔ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد اس کے اندر بیٹھ جاتی تھی اور اس کو دھکیلتے ہوئے دشمن کے قلعہ کی دیوار تک لے جاتے تھے، اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان فوجیوں پر دشمن کے قلعہ کے اوپر سے اگر تیر بھی برستے تھے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور اسطرح وہ محفوظ طریقہ پر قلعہ کی دیوار تک پہنچ جانے کے بعد قلعہ پر حملہ کر سکتے تھے۔

---

[۱] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۲ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۹۴ [۳] سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۰۳

الضبور :۔ یہ بھی دبابہ کی طرح ہوتا ہے اور ایسی لکڑی سے تیار ہوتا تھا جس پر کھال چڑھی ہوتی تھی۔ اس کا فائدہ بھی یہی تھا کہ حملہ آور سپاہی اس کے خول میں چھپ کر بیٹھ جاتے تھے اور حفاظت سے دشمن کے قلعہ تک پہونچکر حملہ کرتے تھے۔ یہ دونوں ہتھیار خود آنحضرت ؐ نے استعمال کئے تھے۔ [1]

فوجی لباس | جہاں تک لباس کا تعلق ہے اگرچہ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خاص جنگ کے وقت کوئی لباس ملٹری یونیفارم کی طرح ہوتا تھا یا نہیں تاہم حفاظت کیلئے زرہ اور خود پہننے کا عام رواج تھا اور سپر بھی رکھنے کا دستور تھا۔ البتہ ڈاکٹر محمد حسن ابراہیم نے نقل کیا ہے کہ پا پیادہ سپاہی چھوٹی قبائیں جو گھٹنوں تک دراز ہوتی تھیں پہنتے تھے اور تہبند کی بجائے پاجامے اور جوتے جو ہمارے زمانہ میں اہل افغان کا شعار ہے پہنتے تھے۔ [2]

عورتیں بھی ساتھ ہوتی تھیں | فوج کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی تھیں جن کا کام زخمیوں کا مرہم پٹی کرنا اور پانی پلانا وغیرہ ہوتا تھا۔ دف اور طبل جنگ بھی بجاتی تھیں تاکہ فوج میں جوش پیدا ہو۔ اگر کوئی نازک موقع آتا تھا تو جنگ میں بھی حصہ لیتی تھیں چنانچہ عہد نبوت میں اور پھر عہد صدیقی میں اس قسم کے بعض مواقع پیش آئے تھے۔ [3]

فوج کا معائنہ | آنحضرت ؐ کا طریقہ جس کو آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر خاص طور سے برتا تھا یہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے قبل اسلامی لشکر کو قطاروں میں تقسیم کرکے باقاعدہ صف بندی کرتے اور ان کا معائنہ کرتے تھے اور جہاں کوئی آدمی آگے پیچھے نظر آتا تھا، چھڑی کے اشارے سے اس کو درست کر دیتے تھے۔ اس کے

---

[1] عربوں کے جنگی ہتھیاروں کی مفصل معلومات کیلئے دیکھو ابن قتیبہ کی عیون الاخبار ج ۱ ص ۱۲۸ تا ۱۳۲ [2] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۴۷۳۔ حضرت خالد بن الولید نے حضرت ابوبکر کی طرف اہل حیرہ کیلئے جو عہدنامہ لکھا تھا اسی میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ذمی جو لباس پہنتے ہیں، وہ پہنیں اور پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ البتہ وہ مسلمانوں کا سا جنگی لباس (زی الحرب) نہیں پہنیں گے۔ دیکھو کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۱۴۴) اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنگ کا لباس ضرور کوئی تھا جس میں پہننے والا چست اور چاق و چوبند رہتا تھا۔ [3] فتوح الشام للواقدی ذکر عہد صدیقی۔

ساتھ ہی آپ فوج کے مختلف حصوں پر افسر تعینات کرتے اور ان کے الگ الگ علمبردار بھی مقرر فرماتے تھے۔ اس کے بعد فوج کو ہدایات دیتے کہ جب تک اجازت نہ ملے صف بندی ہرگز نہ توڑیں۔ خود اپنی طرف سے لڑائی شروع کرنے میں پہل نہ کریں۔ دشمن اگر فاصلہ پر ہو تو تیر چلا کر اس کو ضائع نہ کریں، نزدیک آئے تو تیر چلائیں، قریب ہو تو منجنیق استعمال کریں اور زیادہ نزدیک آئے تو نیزوں سے روکیں۔ اور سب سے آخر میں تلوار نکالیں۔ لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن آپ نے منع فرما دیا تھا کہ منہ سے آواز تک نہ نکلے۔ [1]

کمانڈر انچیف کا عہدہ | عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت ؐ غزوات میں خود شریک رہتے تھے اس لئے فوج کی اعلیٰ قیادت۔ اس کا معائنہ اور اس کو ہدایات دینا یہ سب کام آپ ہی کرتے تھے لیکن عہد خلافت میں حضرت ابوبکر خود جنگوں میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اسلئے آپ کی حیثیت جنگ کے معاملہ میں وزیر جنگ کی سی تھی اور خاص محاذِ جنگ کے لئے آپ نے یہ انتظام کیا کہ ایک کمانڈر انچیف کا عہدہ قائم کیا جو پورے میدانِ جنگ کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا اور تمام فوج کی نقل و حرکت اس کے زیر حکم و قیادت ہوتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ گزر چکا ہے محاذِ شام پر حضرت ابوبکر نے ہر دستۂ فوج کا الگ الگ ایک امیر مقرر کیا تھا لیکن ان سب کے امیر حضرت خالد بن ولید مقرر کئے گئے تھے [2]

حضرت ابوبکر کو حضرت خالد پر کس قدر اعتماد تھا جو بالکل حق بجانب ثابت ہوا، اسکا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب محاذِ شام پر مسلمانوں کی اور رومیوں کی فوجیں بہت دنوں تک آمنے سامنے پڑی رہیں اور کسی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا تو حضرت ابوبکر نے فرمایا۔

واللہ لانسین الروم وساوس	خدا کی قسم! رومیوں کے دلوں میں جو وسوسے ہیں
الشیطان بخالد [1]	وہ سب میں خالد کو (عراق سے شام) بھیجکر بھلوا دونگا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] طبری ج ۲ ص ۲۰۱

فوج کیلئے انتخاب میں احتیاط عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں فوج کا کوئی مستقل اور الگ صیغہ نہیں تھا۔ اور نہ فوجی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام تھا بلکہ پوری قوم ہی ایک فوج تھی، ضرورت پڑنے پر اعلان کر دیا جاتا تھا اور جو لوگ رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرتے تھے ان کو لے لیا جاتا تھا۔ البتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مشتبہ لوگوں کو شریک فوج نہ ہونے دیں۔ چنانچہ شام کی مہم کو سر کرنے کیلئے آپ نے جو فوج ترتیب دی اس میں ابتداءً ان لوگوں کو شرکت کی اجازت نہ تھی جن کے دامانِ اطاعت و فرمانبرداری پر ارتداد کا داغ لگ چکا تھا، خالد بن سعید بن العاص کو روانہ کرتے وقت حکم دیا۔

وان یدعو من حولہ من العرب الا من ارتد۔ [1]

کہ تمہارے اِدھر اُدھر جو عرب ہیں انکو جنگ میں شرکت کی دعوت دینا مگر جو لوگ مرتد ہوگئے تھے انکو نہیں

مجاہدینِ اسلام کی قدر اندازی اگرچہ مسلمانوں کی فوجی تعلیم و تربیت کا اسوقت کا باقاعدہ انتظام نہیں ہوا تھا۔ لیکن درحقیقت اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ عرب فطرتاً جنگجو ہوتے تھے اور شمشیر زنی اور تیر اندازی ان کا خاص فن تھا، چنانچہ عراق میں انبار کی جنگ کے موقع پر ایرانیوں کا لشکر جو ایک نہایت تجربہ کار اور آزمودہ جنرل شیرزاد کے ماتحت تھا بڑی شان و شوکت اور طمطراق کے ساتھ تھا۔ اور اس کو اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالد بن ولید نے خندق کا چکر لگایا، اتنے میں گھمسان کا رن پڑنے لگا تو آپ تیر اندازوں کے دستہ کے پاس پہونچے اور ان سے کہا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ (دشمن) طریقۂ جنگ سے ناواقف ہیں تم اِن لوگوں کی آنکھوں کو نشانہ بنا کر تیر چلاؤ، قدر اندازوں نے اس حکم کی اس طرح تعمیل کی کہ دشمن کی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کی آنکھوں کو تیروں سے چھید دیا دشمن نے یہ منظر دیکھا تو چیخ اٹھا اور خبر اڑا دی گئی کہ اہلِ انبار سب کے سب اندھے ہوگئے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس جنگ کو "ذات العیون" آنکھوں

---

[1] طبری ج ۲ ص ۶۰۲

والی جنگ بھی کہتے ہیں۔ شیرزاد نے گھبرا کر صلح کی پیش کش کی۔ [1]

سامانِ جنگ کی فراہمی اسلحہ اور سامانِ جنگ کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے اپنے اسلحہ لیکر آتے تھے اور جو خود ان کا انتظام نہیں کر سکتے تھے ان کا انتظام چندہ کے ذریعہ کر دیا جاتا تھا تاہم حضرت ابوبکرؓ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ مختلف ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اُس کا ایک حصہ اسلحہ اور دوسرے سامانِ جنگ کی خریداری کیلئے وقف کر دیتے تھے قرآن نے مالِ غنیمت میں اللہ اور اُس کے رسول کا جو حصہ مقرر کیا تھا۔ اسکو بھی اسی کام میں لاتے تھے [2]

مدینہ میں ایک جگہ نقیع تھی۔ آنحضرتؐ نے اسکی چراگاہ کو جنگی گھوڑوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا [3] حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کو اسی طرح باقی رکھا، بعد میں البتہ حضرت عمرؓ نے ربذہ کی چراگاہ کو بھی صدقہ اور زکوٰۃ کے اونٹوں اور گھوڑوں کیلئے اس غرض سے مخصوص کر دیا تھا۔ اگرچہ اتنا کام حضرت ابوبکر بھی کرتے تھے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کے جو اونٹ دبلے پتلے ہوتے تھے ان کو ربذہ اور اس کے قرب و جوار میں بھیج دیتے تھے [4]

امرائے فوج کو ہدایات لیکن یہ سب فوج کے ظاہری اور مادی انتظامات تھے اصل چیز جس پر فوج کی کامیابی کا انحصار ہے وہ ہے اعلیٰ نصب العینِ زندگی اور بلند اخلاقی کردار اور کیرکٹر حضرت ابوبکر کو اس چیز کا خاص اہتمام رہتا تھا، اور جب فوج روانہ ہوتی تھی تو آپ پا پیادہ اس کو رخصت کرنے کیلئے مدینہ سے باہر دور تک تشریف لاتے تھے امرائے فوج کی سخت اصرار کے باوجود ان کو سواری سے اترنے نہیں دیتے تھے اور خود سواری پر بیٹھتے نہیں تھے۔ اور جب فوج روانہ ہوتی تھی تو آپ اس کو مفصل احکام و ہدایات دیتے تھے جن میں جہاد کا مقصد، اس کی اہمیت و ضرورت خلوص، وللہیت، اجر خداوندی و ثواب اخروی دنیا اور اس کی زندگی کی بے حقیقی وغیرہ جیسی چیزوں پر بڑے موثر انداز میں روشنی ڈالتے تھے اور ساتھ ہی ایسے جنگی احکام دیتے تھے جن سے آپ کی مہارتِ فنِ حرب، حسنِ تدبیر، بیدار مغزی اور دشمن اور اسکے ملک سے کمال واقفیت کا ثبوت ملتا تھا۔

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲۱ [2] کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۲۹۸ [3] کنز العمال ج ۵ ص ۳۵۹ رقم ۶۲۰۲ [4] طبری ج ۲ ص ۴۹۳

حضرت اسامہ اور یزید بن ابی سفیان کو آپ نے جو ہدایات دی تھیں انکا ذکر گزر چکا ہے حضرت خالد خود ایک نامور جنرل تھے۔ لیکن جب ان کو ذو القصہ کی طرف مرتدین سے جنگ کرنے کیلئے روانہ کیا ہے تو ان کو بھی ہدایات دیں اور فرمایا۔

”تمہارے اِدھر اُدھر قبیلہ طے پڑیگا، اگرچہ تمہارا رخ بزاخہ ہی کی طرف ہوگا۔ لیکن تم ابتدا طے ہی سے کرنا۔ بزاخہ سے فارغ ہو کر بطاح جاؤ، بطاح کا معرکہ سر کر لو تو اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹو جب تک میں تم کو کمک نہ بھیجدوں،،

حضرت ابوبکر نے ایک طرف تو حضرت خالد کو یہ ہدایت دیکر روانہ کیا۔ دوسری طرف تدبیر یہ کی کہ مشہور کر دیا کہ وہ خود خیبر جا رہے ہیں اور وہاں سے پلٹ کر وہ اکناف سلمیٰ میں خالد بن الولید کے لشکر سے آملیں گے۔ اس خبر کے اڑنے سے دشمنوں پر دہشت بیٹھ گئی اور قبیلہ طے کے سرکش لوگ رام ہونے لگے [1]

عراق کی مہم پر حضرت خالد اور عیاض بن غنم کو روانہ کیا تو حضرت خالد کو حکم دیا کہ وہ عراق کے حصہ زیریں سے جائیں اور عیاض کو ہدایت دی کہ وہ بالائی علاقہ سے سفر کریں اور پھر فرمایا کہ تم دونوں میں سے جو شخص بھی حیرہ پہلے پہنچ جائیگا وہی حیرہ کی مہم کا امیر ہوگا اس کے بعد آپ نے کہا کہ حیرہ پہونچتے پہونچتے تو تم لوگ عرب اور ایران کے درمیان جو فوجی چھاؤنیاں ہیں۔ ان کو برباد کر ہی چکے ہوگے اور اب تم کو اس بات کا اطمینان ہو چکا ہوگا۔ کہ مسلمانوں پر پشت کی جانب سے حملہ نہیں ہو سکتا اس بنا پر حیرہ پہنچنے کے بعد تم دونوں میں سے ایک شخص حیرہ میں ہی قیام کرے اور دوسرے آگے بڑھ کر دشمن سے جنگ آزما ہوں۔

یہ ہدایات تو خاص جنگی ہدایات تھیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوا۔ کہ !

”اور ہاں! اللہ سے مدد مانگنا۔ اس سے ڈرنا۔ آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنا تم ایسا کروگے تو دنیا اور آخرت تم کو دونوں چیزیں ملیں گی۔ اور دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینا۔ ورنہ دونوں کا خسارہ ہوگا۔ اور خدا نے تم کو جن چیزوں سے بچنے کا حکم کیا ہے ان سے بچتے رہنا

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۳ [2] طبری ج ۲ ص ۵۷۳ - ۵۷۴ -

معاصی سے الگ رہنا۔ اگر کوئی معصیت ہو جائے تو فوراً توبہ کرنا اور کبھی کسی گناہ پر مداومت کرنا [1]

حضرت ابوبکر کی بیدار مغزی اور واقفیت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ خود مدینہ میں ہوتے تھے لیکن سینکڑوں میل دور کا میدانِ جنگ نگاہ میں رہتا تھا اور حسب موقع و مصلحت اس کے لئے احکام بھیجتے رہتے تھے۔ خالد بن سعید کو تیمار روانہ کیا تو تاکید کر دی کہ جب تک ان کا حکم نہ پہونچے اقدام نہ کریں۔ لیکن خالد بن سعید اس کی پابندی نہ کر سکے تو ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا [1] حضرت خالد بن ولید حضرت ابوبکر کی ان معاملات میں اصابتِ رائے سے واقف تھے اسلئے حضرت ابوبکر کا کوئی حکم ان کی طبیعت کے خلاف بھی ہوتا تھا تو بھی اسکی پابندی کرتے تھے، چنانچہ حیرہ کی فتح کے بعد حضرت ابوبکر نے حکم بھیجا کہ اب پیش قدمی نہ کریں حضرت خالد اس حکم کی تعمیل کیلئے سال بھر تک معطل پڑے رہے اور اس سے اسقدر اکتا گئے تھے کہ اس سال کو وہ خود عورتوں کا سال کہتے تھے۔ لیکن ان کی مجال نہ تھی کہ بارگاہِ خلافت کے حکم کے خلاف عمل کر سکیں۔ ایک اور موقع پر بھی ایسا ہی ہوا اور اس کی وجہ سے بعض لوگوں میں کچھ چہ می گوئی ہوئی تو حضرت خالد نے ان لوگوں سے کہا کہ خلیفہ کی رائے یہی ہے، اور ان کی رائے پوری قوم کی رائے کے برابر ہے [2]

اسطرح شام کی طرف آپ نے متعدد لشکر بیک وقت روانہ کئے تو چونکہ آپکو معلوم تھا کہ رومیوں کی جنگی چالیں کیا ہیں اور انہوں نے کہاں کہاں محاذ بنایا ہے اسلئے امرائے عساکرِ اسلام کو ہدایت کی کہ کون کس راستے سے جائے۔ اس سلسلہ میں طبری کا بیان ہے کہ وسمی لھم امصار الشام۔ ان لوگوں کے لئے شام کے شہر تک متعین کر دئے۔ اسکے بعد فرمایا۔

ان الروم ستشغلهم فاحب ان یصعد	رومی تمکو ایک محاذ پر جمع کر کے تم سے مڈبھیڑ کرنا چاہیں گے
المصوب ویصوب المصعد لئلا	اسلئے میں چاہونگا کہ تم میں سے نشیبی علاقہ سے جانیوالا بالائی
یتواکلوا [3]	راستے سے جائے اور بالائی راستہ سے جانیوالا نشیبی راستہ سے

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۴ [2] طبری ج ۲ ص ۵۷۴ [3] طبری ج ۲ ص ۵۸۹ اسی طرح حضرت خالد جب عراق پہونچ گئے تو ان کو حکم لکھا کہ وہ کاروائی اور سندھ کی سرحد یعنی ابلہ سے شروع کریں اور طرفہ یہ کہ اس کاروائی کو شروع کرنے کیلئے دن تک کا تعین بھی خود ہی کر دیا تھا۔ (طبری ج ۲ ص ۵۵۴)

(یعنی راستے بدل بدل کر جاؤ) تاکہ رومی دستوں
کو مجتمع ہونے کا موقع نہ ملے۔

حضرت عروہ جو اس روایت کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جو کچھ فرمایا تھا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔

فوجی مراکز کا معائنہ حضرت ابو بکر صدیقؓ فوج کو صرف ہدایات بھیجدینے پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً خود بھی چھاؤنیوں اور فوجی مرکزوں کا معائنہ کرتے تھے اور جہاں کہیں کوئی خرابی نظر آتی تھی اس کا فوراً تدارک کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مہم کے سلسلہ میں مقام جرف میں فوجیں اکٹھی تھیں آپ معائنہ کیلئے پہونچ گئے، بنو فزارہ کے کیمپ میں پہونچے تو یہ لوگ سروقد کھڑے ہو کر تعظیم بجا لائے۔ حضرت ابو بکرؓ نے انکو خیر مقدم کہا اس کے بعد ان لوگوں نے کہا "یا خلیفۂ رسول اللہ! ہم لوگ گھوڑے کی سواری بہت عمدہ جانتے ہیں، اس لئے گھوڑے بھی ساتھ لائے ہیں۔ آپ بڑا جھنڈا ہمارے ساتھ کر دیجئے۔ ارشاد ہوا، خدا تم کو اور ہمت اور برکت عطا فرمائے۔ لیکن بڑا جھنڈا تم کو نہیں مل سکتا۔ وہ بنو عبس کے حصہ میں آچکا ہے۔ ایک فزاری کھڑا ہو کر بولا "ہم لوگ بنو عبس سے بہتر ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے خفا ہو کر کہا "چپ بدتمیز تجھ سے ہر عبسی بہتر ہے۔ ایک عبسی شخص بھی کچھ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ نے اس کو بھی جھڑک کر خاموش کر دیا۔ اور فرمایا فقد کفیت یعنی میں تمہاری طرف سے کہہ چکا ہوں[1]

حضرت ابو بکرؓ کے احکام و ہدایات کا اثر حضرت ابو بکرؓ کی اس بیدار مغزی، روشن ضمیری احکام و ہدایات اور غلطیوں پر بروقت تنبیہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پوری فوج اور اسکے امراء ہر وقت ہوشیار رہتے تھے۔ ان میں ڈسپلن قائم رہتا تھا۔ بلند تر نصب العین زندگی نظر کے سامنے رہتا تھا اور ان میں کبھی اخلاقی پست ماندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور حقیقت یہی ہے کہ مادی آلات و اسباب سے قطع نظر یہی چیزیں ایک فوج کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، چنانچہ۔

[1] کنز العمال ج ۵ ص ۲۶۱ رقم ۲۳۱۰

مغربی مصنفین کی رائے مغربی مصنفین نے بھی اسکا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں:
"مسلمان عرب فوجوں کی طاقت کا اصل راز نہ تو انکی اسلحہ جنگ کی برتری میں ہے اور نہ انکی اعلیٰ درجہ کی تنظیم میں ہے، بلکہ درحقیقت اس اعلیٰ کیرکٹر اور اخلاقی کردار میں ہے جس کے پیدا کرنے میں بے شبہ ان کے مذہب کا بہت بڑا حصہ تھا اور اس صبر و تحمل کی طاقت میں ہے جس کو ریگستانی زندگی سے بڑا سہارا ملا تھا،" [1]

مشہور ولندیزی مستشرق دخوئی (DR-GUEGE) اقرار کرتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے فوجوں کو جو ہدایات دی تھیں ان میں اعتدال اور معقولیت کی جو روح کارفرما ہے۔ اسکے باعث ان کی بجا طور سے داد دینی پڑتی ہے۔[2] یہ ہی مستشرق اپنی کتاب فتوحات شام میں (از صفحہ ۱۰۴ تا صفحہ ۱۰۶) لکھتا ہے کہ:۔

"درحقیقت شام میں لوگ عربوں کی جانب بہت مائل ہو گئے تھے، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ عربوں نے مفتوحین سے جو برتاؤ کیا اگر اسکا مقابلہ وہاں کے سابق مالکوں کے بے اصول ظلم سے کیا جائے تو بڑا ہی سخت فرق نظر آتا ہے۔ شام کے جو عیسائی فیصلۂ کالسی ڈون (CHALCEDON) کو نہیں مانتے تھے، قیصر روم کے حکم سے ان کے ناک کان کاٹے جاتے اور ان کے گھر ڈھائے جاتے تھے، اس کے برخلاف عرب مسلمان جو حضرت ابو بکرؓ کی ہدایتوں پر عمل کرتے تھے وہ مقامی باشندوں کا دل موہ لیتے تھے اور سب سے زیادہ اپنی بات کا پاس کرتے رہے، ان فتوحات کے پندرہ سال بعد ایک نسطوری پادری لکھتا ہے کہ یہ عرب جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں، مگر وہ عیسائی مذہب سے بالکل برسرپیکار نہیں۔ اسکے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور قدیسوں کا احترام کرتے ہیں۔ اور ہمارے گرجاؤں اور

[1] ہسٹری آف دی عربس چوتھا اڈیشن ص ۱۴۲ [2] بحوالہ رسول اللہؐ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۸۱

عبادت خانوں کو جاگیریں (DON) عطا کرتے ہیں۔" [1]

مشہور پادری کارالیفس (C. KARALEVSKS) فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا میں شہر انطاکیہ کے حالات لکھتے ہوئے رقم طراز ہوتا ہے۔

"مسلمان عربوں کو یعقوبی عیسائیوں (JACOBITES) نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا۔ یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے۔ اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیوی عدالتی اقتدار عطا کیا جائے" [2]

کسانوں کا خاص خیال ہدایات میں حضرت ابوبکر کی جہاں یہ تاکید ہوتی تھی کہ مذہبی پیشواؤں اور عبادت گزاروں سے تعرض نہ کیا جائے، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر تلوار نہ اٹھائی جائے، درخت نہ کاٹے جائیں، نخلستان برباد نہ کئے جائیں، ساتھ ہی جس ملک میں جنگ ہوتی تھی اس کے کسانوں اور اربابِ زراعت کی نسبت اس بات کی سخت تاکید ہوتی تھی "ان لوگوں کو ذرا ہاتھ نہ لگایا جائے۔ چنانچہ غزوات السلاسل کے ذکر میں طبری لکھتے ہیں۔

ولم یحرك خالدٌ و امراؤہٗ	اور خالد اور ان کے امرا نے اپنی فتوحات کے دوران
الفلاحین فی شئ من فتوحھم	میں کسانوں کو ذرا نہیں چھیڑا۔ کیونکہ ابوبکر ان لوگوں
لتقدم ابی بکر الیہ فیھم [3]	کے بارہ میں پہلے ہی حکم بھیج چکے تھے۔

اہلِ دیہات کے ساتھ معاملہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک پر حملہ ہوتا ہے تو شہری آبادی کی بہ نسبت اہلِ دیہات پر اس کا زیادہ برا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں حفاظت اور بچاؤ کے سامان ایسے نہیں ہوتے جیسے کہ شہروں میں ہوتے ہیں۔

---

[1] بحوالہ رسول اکرم ؐ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۸۲ [2] ایضاً ۲۸۳
[3] طبری ج ۲ ص ۵۵۲

لیکن حضرت ابوبکر اس بات کا برابر خیال رکھتے تھے کہ دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ ہو۔ چنانچہ حضرت عیاض بن غنم نے جب حران کو صلحاً فتح کیا تو اس شہر کے دیہات والوں نے کہا "نحن اسوۃ اھل مدینتنا ورؤسائنا" ہم سے وہی معاملہ کیجئے جو آپ نے اہل شہر اور ہمارے رؤسا سے کیا ہے۔" حضرت عیاض بن غنم نے اس کا کیا جواب دیا۔ قاضی ابو یوسف نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہے لیکن اسکے بعد ہی لکھا ہے کہ:

فامامن ولی من خلفاء المسلمین بعد	مسلمانوں کے جو خلفا اسکی فتح کے بعد اس کے
فتحھا فانھم قد جعلوا اھل الرساتیق	والی ہوئے انہوں نے گاؤں والوں کے ساتھ وہی معاملہ
اسوۃ اھل المدائن [1]	کیا جو اہلِ شہر کے ساتھ کیا تھا۔

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عیاض بن غنم کا جواب کیا ہوگا۔

فریقِ محارب سے برتاؤ ایک قوم کی اخلاقی بلندی اور اس کے کردار کی عظمت کا اندازہ زیادہ صحیح طور پر اس سے ہوتا ہے کہ فریقِ محارب کے ساتھ جنگ میں اسکا برتاؤ کیا ہوتا ہے، اس پر اس کو بزورِ شمشیر فتح حاصل ہوتی ہے تو اس وقت وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اور اگر فریقِ محارب مغلوب ہو کر صلح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اس کی طرف سے صلح کی شرائط کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور وہ ان شرائط کی پابندی کس حد تک کرتی ہے، قدیم زمانہ میں ایران اور روم کی حکومتیں دشمنوں کے ساتھ جنگ میں کیا معاملہ کرتی تھیں۔ اسکو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے یہ دیکھو کہ اس دورِ تہذیب و تمدن میں بھی گذشتہ دو عالمگیر جنگوں میں دُوَلِ متحدہ نے جرمنی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اٹلی اور جاپان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا؟ اور جب ان سے صلح کی گئی تو اس کے شرائط کیا تھے؟ ان مفتوح اقوام کی شہری آزادی کس حد تک باقی رکھی گئی، اُن کی قومی انفرادیت کہاں تک آزاد رہی؟ اور ان کے انسانی حقوق کا احترام کس درجہ تک ملحوظ رکھا گیا۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۳۰

حضرت خالد کی شجاعت و دلیری، اُنکی حربی قابلیت اور جنگی قیادت کی اعلیٰ صلاحیت کا حال تم پڑھ چکے ہو۔ اب یہ بھی سنو کہ یہی شیر بیشۂ شجاعت بحالت جنگ یا بحالت صلح دشمنوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا تھا، سواد (عراق) کے دیہات بانقیا باریما اور الیّس کا سردار ابن صلوبا تھا حضرت خالد سے وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو حضرت خالد نے جو صلحنامہ لکھا اس کا مضمون یہ تھا۔

انك آمن بامان الله اذ حقن دمك باعطاء الجزية وقد اعطيت عن نفسك وعن اهل خرجك وجزيرتك ومن كان في قريتك بانقيا وباروسما الف درهم فقبلتها منك ورضي من معي من المسلمين على ذالك ولك ذمة الله وذمة محمد صلى الله عليه وسلم وذمة المسلمين على ذالك ۔ [له]

تو اللہ کی پناہ میں ہے، جزیہ ادا کرنے کے بعد تیری جان محفوظ ہوگئی اور تونے اپنی طرف سے اپنی رعایا اپنے جزیرہ اور بانقیا اور باروسما کے لوگوں کیطرف سے ایک ہزار درہم جو دیئے وہ میں نے قبول کئے اور جو میرے ساتھ مسلمان ہیں وہ بھی اس پر رضا مند ہیں۔ اور اب تو اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی ذمہ داری میں آگیا ہے۔

صلح نامہ حیرہ | اہل حیرہ کے نام جو عہد نامہ حضرت ابوبکر کے حکم سے لکھا گیا تھا وہ کافی طویل تھا۔ اُس کے اہم دفعات یہ ہے۔

(۱) ان لوگوں کا گرجا یا عبادت گاہ یا کوئی قصر جس میں یہ لوگ جنگ میں قلعہ بند ہوتے تھے، منہدم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) ناقوس بجانے سے ان کو نہیں روکا جائے گا۔

(۳) نیز تہوار کے موقع پر صلیب کا جلوس نکالنے سے انکو منع نہیں کیا جائے گا۔

(۴) یہ لوگ جزیہ ادا کرتے رہے تو ان کے ساتھ معاہدے کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ اور ان کی حفاظت ہمارا فرض ہوگا۔

(۵) ان لوگوں کے مذہبی پیشوا اور عابد و زاہد جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

له طبری ج ۲ ص ۵۵۱

(۶) ان میں جو بڈھے اور ناکارہ اور اپاہج ہونگے ان کا خرچ بیت المال کے ذمہ ہوگا۔

(۷) ان کو مسلمانوں کے فوجی لباس کے علاوہ اپنا ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی ہوگی۔

(۸) ان کا کوئی غلام اگر مسلمان ہوجائے گا۔ تو بازار میں اس کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت ہوسکتی ہے اُس قیمت میں بغیر عجلت کے اور بغیر کسی گھاٹے کے اسکو فروخت کیا جائے گا اور وہ قیمت اس کے مالک کے حوالہ کردی جائے گی۔

(۹) یہ لوگ اگر مسلمانوں سے کسی قسم کی امداد طلب کریں گے تو ان کو وہ مدد بیت المال سے دی جائے گی۔

ان دفعات و شرائطِ صلح کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ سب کچھ کتنی رقم کے بدلہ میں ہوا تھا! ان لوگوں کی اصل تعداد سات ہزار تھی، ایک ہزار ان میں وہ تھے جو اپاہج، معذور یا مذہبی پیشوا تھے۔ ان کو خارج کرکے اب صرف چھ ہزار بچے ان پر جو جزیہ لگایا گیا وہ ساٹھ ہزار درہم سالانہ تھا یعنی دس درہم فی کس [له] غور کرو۔ رواداری اور دشمن کے ساتھ حسن معاملہ کی اس سے بہتر کوئی اور بھی مثال ہوسکتی ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صلح یا امان بخشی کا یہ معاملہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں حالتوں میں یکساں ہوتا تھا۔

اسلامی فوج کے اس فیاضانہ سلوک کا اثر یہ تھا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی اصل شہری زندگی پورے امن و اطمینان کے ساتھ لوٹ آتی تھی، کھیتی باڑی، باغات و نخلستان کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا تھا۔ مقامی باشندے آزادی کے ساتھ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہوجاتے تھے۔ اور ان کو مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کا خوف و ہراس یا بے اطمینانی نہیں ہوتی تھی۔

له کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۳ - ۱۴۴

تعزیرات و حدود

تعزیرات و حدود (سزائیں) کا اصل مقصد انسدادِ جرائم ہے لیکن مجرم مجرم میں فرق ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جرم کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک شریف اور نیک نفس انسان سے بحالتِ اضطراب کسی جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں عدالت و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مجرم خود اپنے جرم پر نادم اور پشیمان ہے اور سچے دل سے وہ اس سے توبہ کر رہا ہے تو حاکم کو چاہیے کہ اس سے اغماض کرے، اور سزا دیکر اس کو ارتکابِ جرم پر مزید جری نہ کرے۔ گویا ایسے مجرم کو سزا نہ دینا ہی تعزیرات و حدود کے مقصد کو پورا کر دیتا ہے۔ اور اس کے برعکس سزا دینے سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ بات ڈھکی چھپی ہو۔ اور اگر جرم فاش ہو جائے تو پھر سزا دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلعم کا معمول یہی تھا۔ جیسا کہ آپ نے ماعز بن مالک اور بعض دوسرے اشخاص کے بارے میں کیا، اس کے علاوہ خود آپ کا ارشاد یہی ہے کہ!

تعافوا الحدود فیما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب۔	تم حدود کو آپس میں نمٹا دیا کرو۔ لیکن جب بات مجھ تک پہونچے گی تو حدود واجب ہو جائیں گی۔

مجرم سے اغماض | اس ارشادِ نبوی کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کا دستور تھا کہ جب تک جرم فاش نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوشش کرتے کہ مجرم سزا سے بچ جائے، خود ان کا بیان ہے کہ ماعز بن مالک نے جب تیسری مرتبہ بھی اعتراف جرم کر لیا۔ اور آنحضرت صلعم نے اس کو بھی رد کر دیا تو اب خود حضرت ابوبکرؓ نے ماعز سے کہا کہ اگر تم نے چوتھی مرتبہ بھی اعتراف جرم کر لیا تو پھر رسول اللہ صلعم تم کو رجم کر دیں گے۔ [2] اس کہنے کا بالواسطہ منشا یہی تھا کہ ماعز چوتھی مرتبہ اقرار نہ کریں تاکہ سنگسار ہونے سے بچ جائیں۔ لیکن ان پر خوفِ خدا غالب تھا وہ نہ مانے اور آخر رجم ہونا پڑا۔

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۰ مصری [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸

مرتدین کے احوال میں تم پڑھ چکے ہو کہ اشعث بن قیس جب گرفتار ہو کر آیا ہے اور اس نے صدق دل سے توبہ کر لی تو حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف یہ کہ اس کی جان بخشی کی بلکہ اسکی درخواست پر اپنی بہن ام فروہ کا اس سے نکاح بھی کر دیا۔

عبرتناک سزا | لیکن اگر جرم کی نوعیت شدید ہوتی اور بجائے ذاتی ہونے کے قومی جرم ہوتا ہے تو پھر حضرت ابوبکرؓ اس کو معاف نہیں کرتے تھے بلکہ بے حد سخت سزا دیتے تھے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ ایاس السلمی جس نے ارتداد سے توبہ کرنے کے بعد بد عہدی کی اور مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے نہایت سخت حکم بھیجا کہ اس کو گرفتار کر کے آگ میں جلا دیا جائے[1]

حدِ شربِ خمر | آنحضرت صلعم کے عہد میں شارب خمر کے لئے کوئی خاص سزا متعین نہیں تھی، بلکہ حسبِ موقع و مصلحت کبھی اس کو پٹوا دیتے تھے تاکہ وہ نادم ہو کر آئندہ کیلئے توبہ کر لے۔ اور کبھی کوڑے لگواتے تھے۔ ان کوڑوں کی تعداد چالیس تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی بعینہٖ اسی کو جاری رکھا۔ اور اس میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں کیا۔ لیکن جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں اس طرح کے واقعات زیادہ ہونے لگے تو آپ نے کوڑوں کی تعداد دوگنی یعنی چالیس سے اسی ۸۰ کر دی۔

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے۔

عن السائب بن یزید قال کنا نؤتی بالشارب علی عہد رسول اللہ صلعم وامرۃ ابی بکر و صدرا من خلافۃ عمر فنقوم الیہ باید ینا	سائب بن یزید سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے عہد میں اور ابوبکر کے عہد خلافت اور عہدِ فاروقی کے آغاز میں کوئی شاربِ خمر ہمارے پاس لایا جاتا تو ہم اپنے ہاتھوں جوتوں اور

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۳۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بمقتضائے سیاست و مصلحت اسوقت تو ایاس کو یہ سزا دلوا دی، لیکن چونکہ کسی انسان کو آگ میں زندہ جلانا خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کو اس کا برابر ملال رہا۔ اور وفات کے وقت آپ نے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ اسے کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ اس کا مفصل ذکر آگے اپنے موقع پر آئے گا۔

ونعالنا وارديتنا حتى كان كان آخر امرة عمر يجلد اربعين حتى اذا عتوا وفسقوا جلد ثمانين [1]

چادروں کے ساتھ اسکی طرف کھڑے ہو جاتے تھے لیکن آخر عہدِ فاروقی میں حضرت عمر اس کو چالیس کوڑے مارنے لگے اس کے بعد جب ان لوگوں میں سرکشی اور فحش بڑھ گیا تو پھر اسی کوڑے مارنے لگے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کوڑوں کی سزا حضرت عمر نے ایجاد کی تھی حالانکہ یہ سزا خود عہد نبوت اور عہد صدیقی میں بھی دیجاتی تھی، چنانچہ عثمان بن عفان کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن عقبہ گرفتار ہو کر آیا اور دو شخصوں کی گواہی سے اس کا شراب نوشی کا جرم ثابت ہو گیا تو حضرت عثمان نے حضرت علی سے کہا کہ آپ اس پر حد جاری کیجیے، حضرت علی نے عبداللہ بن جعفر کو حکم دیا۔ انہوں نے ولید کے کوڑے مارنے شروع کئے، حضرت علی انہیں شمار کرتے جاتے تھے، جب پورے چالیس ہو گئے تو حضرت علی نے فرمایا۔ بس ختم کرو۔ کیونکہ رسول اللہ ؐ نے چالیس ہی کوڑے مارے ہیں۔ اور میں نے ان کو شمار کیا ہے اور اس کے بعد ابوبکر کے عہد میں بھی چالیس ہی کوڑے مارے گئے ہیں۔ البتہ عمر نے اسی کوڑوں کی سزا دی ہے۔ لیکن مجکو یہ اور اس کے علاوہ رسول اللہ ؐ کی دوسری سنتیں زیادہ محبوب ہیں [2] اور یہی روایت زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ لوگوں کا ہاتھوں یا جوتوں سے پیٹنا ایک ہنگامی تعزیر ہو سکتی ہے اس کو حد نہیں کہہ سکتے اسکے علاوہ اگر کوڑوں کی سزا عہدِ نبوی میں بالکل نہ ہوتی تو حضرت ابوبکر اپنے مذاقِ طبعی کے مطابق خود یہ بدعت ایجاد نہیں کر سکتے تھے۔

حدِ سرقہ سرقہ کی حد قرآن میں منصوص ہے اس لئے اسکی نسبت اختلاف نہیں ہو سکتا البتہ حاکم کو اس بات کا اختیار ہے کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ سارق نے بحالتِ اضطرار سرقہ کیا ہے تو اسکو معاف کر سکتا ہے چنانچہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں اسطرح کے متعدد واقعات پیش آتے تھے جن میں سارق پر حد سرقہ جاری نہیں کی گئی تھی حضرت ابوبکر کا بھی معمول یہ تھا نابالغ چور پر حد جاری نہیں کرتے تھے

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۲ [2] ابوداؤد باب الحد فی الخمر ج ۲ ص ۲۴۱ [3] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۷۵

حد زنا آنحضرت ؐ نے ایک غیر شادی شدہ شخص کو جس سے زنا صادر ہو گیا تھا کوڑے لگانے اور اس کے بعد جلا وطنی کی سزا دی تھی حضرت ابوبکر نے بھی اسپر عمل کیا اور ان کے عہد میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تو یہی سزا دی [1]

ذاتی معاملہ میں مسامحت اگرچہ حضرت ابوبکر قومی و اجتماعی جرم کے باب میں کسی قسم کی نرمی اور ملاطفت کو روا نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اگر کوئی جرم خود ان کی ذات یا شخصیت سے متعلق ہوتا تھا تو اس میں چشم پوشی یا اغماض سے کام لیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے کوئی ناگوار حرکت کی۔ تو ابوبکر اس پر سخت غضب ناک ہوئے۔ ایک شخص نے کہا "اے خلیفۂ رسول! حکم کیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں" یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر کا غصہ بالکل فرو ہو گیا۔ اور اس شخص سے تعجب سے کہا کہ اگر میں تم کو حکم کرتا تو کیا واقعی تم اس کی گردن اڑا دیتے"، اس کے بعد فرمایا "یاد رکھو! آنحضرت ؐ کے بعد یہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ [2]

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۳۸ بحوالہ بغوی [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۹۔

دینی خدمات

اصلاح عقائد اگرچہ حضرت ابوبکرؓ کا مختصر عہدِ خلافت اندرونی اور بیرونی استحکام کی مہمات میں مصروف رہا اور یہ جو کچھ بھی تھا دین کیلئے ہی تھا، تاہم عام اصطلاح میں جس کو دینی خدمات کہا جاتا ہے، آپ اس سے بھی غافل نہیں رہے، اس سلسلہ میں آپکی بڑی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اسلام اپنی اصل شکل و صورت میں قائم رہے۔ اور اس کے رخ روشن پر غلط افکار و توہمات اور بدعات کی گرد نہ پڑنے پائے چنانچہ وفاتِ نبوی کے وقت آپنے جو خطبہ دیا اُس نے یہ حقیقت ثبت کر دی کہ پیغمبر صاحبِ شریعت ہوتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس حیثیت سے اسکا ہر عمل اسوہ اور اس کا ہر قول واجب الاتباع ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال وہ ہوتا ہے بشر ہی اور اس کے لئے بشری حوائج و ضروریات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے اگر حضور دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو خلاف توقع ہو۔

پھر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپنے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں صاف صاف یہ بتا دیا کہ خلیفہ بھول چوک اور غلطی سے مبرا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پیغمبر کی طرح اس کے پاس وحی نہیں آتی۔ اس بنا پر اگر خلیفہ سے غلطی ہو جائے تو اسلامی جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس پر خاموش نہ رہے اور خلیفہ کی اصلاح کرے۔ آپنے صاف فرمایا۔

"وان زغت فقوّمونی" بتاؤ اس آزادیٔ ضمیر و قول کی مثال کسی جمہوریت میں مل سکتی ہے؟ کسی نے آپ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو اس کی بھی اصلاح کر دی کہ نہیں میں اللہ کا نہیں بلکہ رسول اللہ ؐ کا خلیفہ ہوں۔

تعیین زکوٰۃ کے خلاف آپ نے جو جہاد کیا وہ اس بات کی دلیل تھا کہ فرض فرض سب برابر ہیں۔ شریعت میں قطع و برید نہیں ہو سکتا جو اسکو قبول کریگا، کُل کو قبول کریگا

اور ایک جزء کا انکار کرنا کل کے انکار کے مرادف ہوگا۔

امر بالمعروف قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔

یا ایہا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضلّ اذا اھتدیتم ۵

اے ایمان والو تم اپنی خبر لو۔ اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو وہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا بشرطیکہ تم ہدایت یافتہ ہو۔

اس آیت سے غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ جب معاملہ اپنی اپنی ہی فکر کرنے کا ہے تو پھر اب امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر اور تبلیغ و دعوت الی الحق کی ضرورت ہی نہیں ہے، حضرت ابوبکر نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے یہ آیت پڑھی اور اس کے بعد فرمایا "تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو اور اس کی مراد صحیح نہیں سمجھتے، میں نے آنحضرت ؐ سے سنا ہے کہ اگر لوگ اپنے درمیان منکرات و فواحش ہوتے دیکھیں اور اس پر اپنی طرف سے ناراضگی کا اظہار نہ کریں تو بعید نہیں کہ ان گناہوں کی پاداش میں مرتکب اور غیر مرتکب دونوں ہی شامل کر لئے جائیں [۱]

بدعات پر تنبیہ ایک مذہب کے لئے سب سے بڑا فتنہ بدعات ہیں، حضرت ابوبکر کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اور جب ان کے علم میں کوئی بدعت آتی تھی تو فوراً اس پر تنبیہ فرماتے تھے ایک مرتبہ حج کے موقع پر آپ کو معلوم ہوا کہ قبیلۂ احمس کی ایک عورت جس کا نام زینب تھا حج کر رہی ہے اور اس دوران میں کسی سے بات نہیں کر رہی ہے آپ فوراً اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو بتایا کہ حج کے اثناء میں گفتگو نہ کرنا اور خاموش رہنا جاہلیت کا طریقہ ہے۔ [۲]

تبلیغ و اشاعت اسلام حضرت ابوبکر جو فوج یا دستہ کہیں بھیجتے تھے اس کو یہ تاکید ہوتی تھی کہ محض اعلاء کلمۃ اللہ اور اشاعتِ اسلام ان کا مقصد ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت عدی بن حاتم کی کوشش سے بنو طے خود بخود ارتداد سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئے مثنیٰ بن حارثہ کی دعوت پر بنو وائل کے بہت سے بت پرست اور عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام

---

[۱] مسند امام احمد ابن حنبل ج ۱ ص ۹ [۲] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۱ باب ایام الجاہلیہ

ہوئے، حضرت خالد کی مساعی سے عراقِ عرب اور حدود شام کے اکثر قبائل نے اسلام قبول کیا۔ طلیحہ جو خود مدعیِ نبوت تھا۔ شام میں پناہ گزین ہو کر مسلمان ہو گیا اور بطور معذرت یہ شعر لکھ کر بھیجے ؎

فهل يقبل الصديق انى مراجع	کیا ابوبکر صدیق اس کو قبول کریں گے کہ میں
ومعطٍ بما احدثت من حدث يدى	واپس آجاؤں، اور جو کچھ میں نے گناہ کئے ہیں
وانى من بعد الضلالة شاهدٌ شهادة	ان کی تلافی کردوں، اور گمراہی کے بعد میں سچی
حق لست فيها بملحد [1]	گواہی دیتا ہوں جس میں ہٹنے والا نہیں ہوں۔

اس کے علاوہ حیرہ کے متعدد عیسائی راہبوں نے خود بخود اسلام قبول کیا۔

جمع قرآن

اس سلسلہ میں آپ کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی کام قرآن مجید کا جمع کرنا ہے اس کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ جنگ یمامہ میں ایک ہزار دو سو مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں انتالیس (۳۹) کبار صحابہ اور حفاظِ قرآن شامل تھے، یہ صرف ایک جنگ کا حال تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اور دوسری جنگوں میں جو نقصان ہوا اگر اس کو بھی ملا لیا جائے تو تعداد کہاں تک پہونچتی ہے اس کا احساس یقیناً حضرت ابوبکر کو ہوگا لیکن وہ اپنے مذاقِ طبعی کی بنا پر کسی ایسے کام کو کرنے کیلئے آمادہ نہیں تھے۔ جو خود آنحضرت صلعم نے نہ کیا ہو۔ حضرت عمر نے جرأت کی اور خدمتِ صدیقی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یمامہ کی جنگ میں قراء و حفاظِ قرآن کا شدید نقصان ہوا ہے۔ اس لئے اگر آپ نے قرآن کو جمع کرنے کا بندوبست نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکر کا جواب وہی تھا کہ جس کام کو آنحضرت صلعم نے نہیں کیا میں اسے کیسے کر سکتا ہوں۔ حضرت عمر نے کہا یہ کام تو خیر ہے، انہوں نے بار بار یہی بات کہی تو حضرت ابوبکر کو اطمینان اور شرحِ صدر ہوا

[1] یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۵

اب انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو بلایا اور ان سے کہا، "تم جوان آدمی ہو سمجھدار ہو۔ ہم تم کو متہم نہیں کر سکتے"، تم رسول اللہ صلعم کے کاتب وحی تھے، اس لیئے قرآن کا تتبع (ادھر ادھر سے فراہم) کرو اور اسکو یکجا کر دو"۔ زید بن ثابت کا بیان ہے۔ کہ اگر حضرت ابوبکر مجھ کو کسی ایک پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دینے کا حکم کرتے تو وہ اس حکم سے زیادہ گراں نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے بھی وہی اشکال ظاہر کیا جو شروع میں حضرت ابوبکر نے کیا تھا۔ لیکن ان کے جواب میں حضرت ابوبکر نے وہی بات کہی جو حضرت عمر نے خود آپ سے کہی تھی یعنی یہ کام تو خیر ہی کا ہے آخر کچھ رد و کد کے بعد زید بن ثابت کو بھی اطمینان ہو گیا۔ اور انہوں نے قرآن مجید کے مختلف اجزا جو کپڑوں کے ٹکڑوں، درخت کی چھالوں اور کھجور کے پتوں پر لکھے ہوئے، یا سینوں میں محفوظ تھے ان سب کو بکمالِ احتیاط یکجا کر دیا۔ یہاں تک کہ خود زید بن ثابت کہتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی دو آیتیں "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ اور فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ" خزیمۃ الانصاری کے پاس ہی محفوظ تھیں وہ بھی ان سے لے لیں اس کے علاوہ سورۂ احزاب کی ایک اور آیت تھی جسکو زید بن ثابت آنحضرت صلعم سے سن چکے تھے، جب مصحف کی تدوین ہو چکی تو دیکھا کہ اس میں وہ آیت نہیں ہے آخر وہ بھی حضرت خزیمہ کے پاس ملی۔ دو آدمیوں کی شہادت لے کر اس کو بھی قرآن میں شامل کر دیا گیا۔ یہ تمام صحیفے جن میں قرآن یکجا کیا گیا تھا، حضرت ابوبکر کے پاس محفوظ تھے، آپ کے بعد حضرت عمر نے ان کی حفاظت کی، جب آپ کی بھی وفات ہو گئی تو یہ امانت حضرت حفصہ کے حصہ میں آئی [1]

ایک غلط روایت | ایک روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے جمع قرآن کا کام حضرت عمر بن خطاب نے کیا ہے [2] لیکن جیسا کہ ابھی معلوم ہوا یہ روایت صحیح نہیں ہے، اسمیں شک نہیں ہے کہ جمع قرآن کی سب سے پہلے تحریک کرنیوالے حضرت عمر ہی ہیں لیکن اس کی تکمیل خلافتِ صدیقی کا کارنامہ ہے، راوی نے غلطی سے تحریک جمع قرآن کو خود جمع قرآن سمجھ لیا ہے

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶ [2] کتاب المصاحف لابن ابی داؤد (طبع اوّل المطبعۃ الرحمانیہ مصر ص ۱۰

چنانچہ خود حضرت علیؓ سے منقول ہے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ابوبکر پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ جمع مصاحف کے باب میں ان کا اجر سب سے زیادہ ہے کیونکہ پہل انہوں نے ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کی شہادتیں اسی مضمون کی ہیں جو حدِ تواتر کو پہونچتی ہیں۔ [1]

جمع قرآن کی اصل حقیقت اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق عام طور پر خیال یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات تک قرآن کی آیات منتشر تھیں، وہ ایک دوسرے سے مربوط نہ تھیں اور نہ سورتوں میں کسی قسم کی ترتیب تھی اور نہ ان سورتوں کے نام متعین ہوئے تھے، اس لئے عہد صدیقی میں جو کام ہوا وہ انہیں آیات و سُوَر کی ترتیب تھی۔ اس خیال کو بعض مستشرقین اور خصوصاً سر ولیم میور اور آرتھر جیفرے جس نے کتاب المصاحف لابن ابی داؤد کو بڑی محنت سے اڈیٹ کر کے مصر سے شائع کیا ہے۔ بہت زیادہ پھیلا کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ موجودہ قرآن اس قرآن سے مختلف ہے۔ جو آنحضرتؐ کے عہد میں تھا۔

اس قسم کا خیال کرنا صرف علمی گمراہی نہیں بلکہ علمی بددیانتی بھی ہے کیونکہ قوی دلائل و براہین سے یہ ثابت ہے کہ قرآن کی آیات و سُوَر کی ترتیب خود عہد نبوت میں ہو چکی تھی۔ اور آنحضرتؐ کے حکم اور آپ کے ارشاد کے مطابق ہی ہوتی تھی زید بن ثابت کا بیان ہے کہ میں نے پورا قرآن رسول اللہؐ کے سامنے پڑھا ہے بخاری و مسلم میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ چار شخصوں نے آنحضرتؐ کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا اور یہ چاروں انصار تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید [2] محمد بن اسحاق نے الفہرست میں سات صحابہ کے نام لکھے ہیں۔ جنہوں نے عہدِ نبوت میں قرآن جمع کیا تھا۔ دراصل آنحضرتؐ کا معمول یہ تھا کہ آپ کے خاص خاص کاتب تھے جن پر آپ کو اعتماد تھا جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ ان کاتبین وحی سے فرما دیتے تھے کہ

[1] کتاب المصاحف ابن ابی داؤد ص ۵۔ [2] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸

اس آیت کو فلاں سورت میں شامل کر لو مذکورہ بالا روایت میں جن چار انصار کا ذکر آیا ہے۔ ان کا کام درحقیقت قرآن کی کتابت کر کے اپنے پاس محفوظ کرنا تھا۔ اسی حقیقت کو جمع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ حضرت انس نے چار شخصوں کی جو تخصیص کی ہے تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضرت عثمان، حضرت علی اور عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی اس شرف کے حامل تھے، اس بنا پر حضرت انس کی روایت کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ انصار میں بھی چار کاتب تھے، غیر انصار دوسرے بھی تھے۔

اس کے علاوہ روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ سال میں ایک مرتبہ قرآن مجید حضرت جبرئیل کو سنایا کرتے تھے۔ اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اس مرتبہ آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا ہے۔ [1]

سطور بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید آنحضرتؐ کے عہد میں منتشر اور پراگندہ نہیں تھا بلکہ مرتب تھا۔ چنانچہ خود قرآن بھی اپنے متعلق یہی کہتا ہے۔ قرآن کو جگہ جگہ الکتاب کہا گیا ہے جس کے معنی مرتب اور نوشتہ کے ہیں۔ سورۃ المزمل میں فرمایا گیا۔

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۔ اور آپ قرآن ترتیل کے ساتھ تلاوت کیجئے

ظاہر ہے اگر قرآن مرتب ہی نہیں تھا تو پھر ترتیل کس چیز کی ہو گی۔

ترتیب سُوَر عہد نبوت میں

اب رہی یہ بات کہ سورتوں کے نام بھی عہدِ نبوت میں متعین ہو گئے تھے۔ تو اس کے ثبوت میں ایک دو نہیں متعدد روایات صحیحہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔ میں نے آنحضرتؐ کے دہانِ مبارک سے تیس ۳۰ سورتیں پڑھی تھیں [2]

حضرت عمر فاروق کے اسلام لانے کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر پہونچے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک صحیفہ ہے اور اس میں سورہ طٰہٰ

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ [2] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸

طلہ لکھی ہوئی ہے۔

بعض اوقات کئی کئی آیات اک ساتھ نازل ہوتی تھیں اور آنحضرت ؐ ان آیات کو تلاوت فرمانے کے بعد کاتبین وحی کو حکم دیتے تھے کہ فلاں آیت فلاں سورت میں لکھی جائے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث میں ہے کہ آنحضرت ؐ نماز میں اور نماز کے علاوہ یوں بھی مکمل سورتیں پڑھتے تھے۔ مثلاً البقرہ۔ آل عمران۔ النساء وغیرہا پھر متعدد احادیث میں بعض خاص خاص سورتوں مثلاً سورۃ بقرہ۔ الکہف۔ سورۃ الرحمٰن اور سورۂ یٰسین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں ان کے علاوہ بعض خاص خاص سورتوں کا ذکر ہے کہ آنحضرت ؐ ان کو خاص خاص نمازوں میں پڑھتے تھے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے مغرب میں اعراف پڑھی، سورۂ اخلاص پڑھی، اور دوسری نمازوں میں آل عمران اور نساء تلاوت کی۔ یہ روایات اس کثرت سے منقول ہیں کہ حدیث کی کوئی کتاب مشکل سے ہی ان کے ذکر سے خالی ہوگی[1]

اوپر جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے امور ذیل صاف طور پر ثابت ہو گئے۔

(۱) قرآن کی کتابت آنحضرت ؐ کے عہدِ میمنت مہد میں ہوئی تھی اور اس شد و مد کے ساتھ کہ آپ نے فرمایا تھا۔

لا تکتبوا عنی غیر القرآن — قرآن کے علاوہ مجھ سے تم کچھ اور نہ لکھو۔

(۲) ایک سورۃ میں آیات کی ترتیب بھی عہدِ نبوت میں اور آپ کے حکم سے ہو گئی تھی۔ (۳) سورتوں کے نام کی تعیین بھی آنحضرت ؐ کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔

صدیقی کارنامہ کی نوعیت | اب دیکھنا چاہئے کہ جب یہ سب کچھ عہدِ نبوت میں ہی ہو چکا تھا تو پھر حضرت ابوبکر کے عہد میں جو جمع قرآن ہوا اس کی کیا حقیقت ہے۔

اصل یہ ہے کہ اگرچہ عہدِ نبوت میں نفسِ قرآن مرتب تھا، لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے، کسی کے پاس کوئی جز تھا اور کسی کے پاس کوئی اور جز۔ کسی کے

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹، ۷۵۰ و رسالہ فضائل القرآن ابن کثیر

پاس سورت کامل تھی اور کسی کے پاس ناقص اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس وقت تمام کاتبینِ وحی تو موجود ہوتے نہیں تھے جو قرآن کی آیات کو براہِ راست آپ سے ہی سن سکتے تھے۔ اس لئے ان تک وہ سُوَر یا آیات بالواسطہ پہونچتی تھیں اور وہ بھی کبھی پوری اور کبھی آدھی۔ غرض کہ آنحضرت ؐ کی وفات تک قرآن ایک مصحف کی شکل میں بین الدفتین موجود نہ تھا، وہ خود مرتب تھا، لیکن اس کے اجزاء یکجا نہیں تھے۔ متفرق حفاظ و قراء کے پاس متفرق اجزاء تھے، اسی وجہ سے یمامہ کی جنگ میں حافظ اور قاری کثرت سے شہید ہوئے تو حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے یعنی یہ ممکن تھا کہ جو حضرات شہید ہو جائیں قرآن کے بعض اجزاء صرف انہیں کے پاس ہوں اور کسی دوسرے کے پاس نہ ہوں اگر ایسا ہوا تو ان حضرات کی شہادت کے بعد وہ اجزاء پھر کہیں اور ملیں گے ہی نہیں اور دنیا ہمیشہ کے لئے ان سے محروم ہو جائے گی۔

یہاں ایک یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حضرت زید بن ثابت کو حضرت خزیمہ کے پاس سورۂ توبہ کی دو آیتیں یا سورۂ احزاب کی جو ایک آیت ملی تو آخر انہوں نے یہ کس طرح پہچانا کہ یہ آیات توبہ اور احزاب کی سورتوں کی تھیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے ناموں کی تعیین خود آنحضرت ؐ کی حیات میں ہی ہو گئی تھی[1]

بہر حال عہدِ صدیقی میں جو کام انجام پایا وہ یہی تھا کہ قرآن مجید کے متفرق اجزاء کو ایک مصحف کی شکل میں یکجا کر دیا گیا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

قد اعلم اللہ تعالیٰ فی القرآن — اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ

[1] یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت زید بن ثابت نے دو آدمیوں کی گواہی لیکر ان آیتوں کو جو مصحف میں داخل کر دیا۔ تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بس یہ دو گواہ تھے یقیناً اور بھی بہت سے لوگ اسکے شاہد ہونگے اور خود حضرت زید کو ان کے قرآنی آیات ہونیکا پورا علم تھا۔ اسی وجہ سے تو وہ انکی تلاش کر رہے تھے لیکن چونکہ قانون کا منشا دو آدمیوں کی گواہی پورا ہو جانا تھا اسلئے صرف دو کی گواہی پر اکتفا کر لیا گیا

بانه مجموع فی الصحف فی قوله تیلوا صحفا مطهرة الآیة وکان القرآن مکتوباً فی الصحف لکن کانت متفرقة فجمعها ابوبکرٍ فی مکانٍ واحدٍ [1]	وہ صحیفوں میں جمع ہے، چنانچہ اُس نے فرمایا تیلوا صحفاً مطہرة۔ اور قرآن صحیفوں میں لکھا ہوا تھا، لیکن وہ صحیفے (مختلف اجزا جو الگ الگ لکھے ہوئے تھے) منتشر تھے پس ابوبکر نے ان کو ایک جگہ جمع کر دیا۔

حضرت ابوبکر کے تأمل کی وجہ

غور کرو حافظ صاحب نے کیا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے، یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب جمع قرآن کی حقیقت اتنی ہی تھی تو پھر آخر حضرت ابوبکر کو اس میں پس و پیش کیوں ہوا؟ اور انہوں نے یہ کیسے فرمایا کہ "جس کام کو آنحضرت ﷺ نے نہیں کیا، میں اس کو کیونکر کر سکتا ہوں؟ حافظ صاحب کی تقریر بالاسے واضح ہو گیا کہ حضرت ابوبکر کے تأمل کی وجہ سے یہ تھی کہ قرآن نے آنحضرت ﷺ کی صفت یہ بیان کی ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے صحف (نہ کہ مصحف) کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن آپ کی وفات تک رہا بھی صحف کی ہی شکل میں نہ کہ مصحف کی صورت میں اب حضرت ابوبکر اسکو مصحف کی شکل میں جمع کرائیں گے تو وہ کہیں بدعت اور اسوۂ رسول سے تجاوز تو نہیں ہو جائیگا۔ پس یہ خیال تھا جس کے باعث حضرت ابوبکر کو تامل ہوا۔ لیکن بعد میں حضرت عمر کے بار بار کہنے سے آپ کو اطمینان ہو گیا۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کے جمع قرآن میں فرق

اگرچہ جمع قرآن دراصل حضرت ابوبکر کا کارنامہ ہے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت حضرت عثمان خلیفۂ سوم کی ہے اور عام طور پر اُن کو ہی جامع قرآن سمجھا جاتا ہے لیکن دونوں کے کارناموں میں بڑا فرق ہے۔

حضرت عثمان کے جمع قرآن کی حقیقت یہ ہے کہ شام اور عراق کی فتح کے بعد جب اسلامی مملکت کے حدود وسیع ہو گئے تو مختلف مصاحف جو مختلف صحابہ کے پاس محفوظ تھے وہ تمام مملکت میں پھیل گئے اور ہر شہر کے لوگوں نے اپنے اپنے مقامی

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۱۰

حفاظِ قرآن کی قرأت کے مطابق اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود کے نسخۂ مصحف کے مطابق قرأت کرتے تھے۔ اہل بصرہ ابوموسیٰ اشعری اہل دمشق مقداد بن الاسود، اور اہل شام ابی بن کعب کے نسخوں کے مطابق قرأت کرتے تھے یہ اختلاف اگرچہ قرأت کا تھا۔ لفظ اور عبارت کا نہیں تھا۔ لیکن قرأت کا یہ وسیع اختلاف لفظوں کے الٹ پھیر تک بھی وسیع ہو سکتا تھا۔ اور ضرورت تھی کہ اسکی حدبندی کی جائے۔ اور اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی قدم اٹھایا جائے۔ اسی اثنا میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ آرمینہ اور آذربائیجان کی سرحد پر جنگ ہو رہی تھی۔ وہاں حضرت حذیفہ بن الیمان نے دیکھا کہ اہلِ عراق اور اہلِ شام کی قرأت میں بڑا شدید اختلاف ہے یہ دیکھ کر ان کو بڑی تشویش ہوئی حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین قبل اسکے کہ یہ امت گمراہ ہو اور وہ اپنی کتاب (قرآن) میں ایسے ہی باہمدگر مختلف ہوں جیسے کہ یہود و نصاریٰ ہیں آپ اس کا سدِّباب کیجئے۔ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکر کا جمع کردہ) جو مصحف ہے اس کو بھیج دیجئے۔ ہم اس کے متعدد نسخے تیار کرالیں گے اور پھر آپ کے پاس آپ کا نسخہ واپس بھیج دیں گے۔ حضرت حفصہ نے تعمیل کی اب حضرت عثمان نے مصحف ابی بکر کی نقل پر حضرت زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبدالرحمٰن بن الحارث اور عبداللہ بن زبیر کو مقرر فرما دیا۔ اور ان حضرات میں تین جو قریشی تھے ان کو حکم دیا کہ جس قرأت کے متعلق تم میں اور زید بن ثابت میں اختلاف ہو اس میں قریش کی زبان کی پیروی کرو۔ کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے جب یہ سب نسخے تیار ہو گئے تو خلیفۂ ثالث نے ایک ایک نسخہ ایک ایک صوبہ میں بھیجدیا۔ ان کے علاوہ جتنے نسخے اور تھے ان کو سپردِ آتش کرنے کا حکم دیا۔ [1] اس تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ حضرت ابوبکر نے قرآن مجید کے مختلف اجزا

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶ باب جمع القرآن [2] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۲

کو جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے ان کو ایک جگہ بین اللوحین میں جمع کیا تھا اور اختلافِ قرأت سے تعرض نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف حضرت عثمان نے اسی مصحف ابی بکر پر اعتماد کرکے اور اس کو بنیاد قرار دے کر قرأتیں متعین کر دی تھیں جو سبعہ قرأت کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قرأتوں کو غیر مستند قرار دیا گیا۔ اور ان قرأتوں کے حامل جو نسخے تھے ان کو جلا دیا گیا۔

چنانچہ علامہ جلال الدین السیوطی نے قاضی ابوبکر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا

لم یقصد عثمان قصد ابی بکر فی جمع نفس القرآن بین اللوحین وانما قصد جمعہم علی القرأت الثابتة المعروفة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم والغاء مالیس کذالک [1]

ابوبکر نے نفس قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کرنے کا جو کام کیا تھا۔ عثمان نے اسکا ارادہ نہیں کیا بلکہ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ جو قرأتیں آنحضرتؐ سے ثابت اور معروف ہیں ان پر مسلمانوں کو جمع کریں اور ان کے علاوہ جو دوسری قرأتیں ہیں ان کو ضائع کریں۔

صدیقی کارنامہ کی اہمیت حضرت ابوبکر کے اس عظیم الشان کارنامہ کی اہمیت اور عظمت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں۔

یہی جمع قرآن در مصاحف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ منطبق ہوتا ہے اور جس کی بشارت "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ" میں موجود ہے [2]

جب تک دنیا میں قرآن اور ایک کلمہ گو بھی موجود ہے حضرت ابوبکرؓ احسان سے امت مسلمہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

عہدِ صدیقی میں تمدنی حالت

آنحضرتؐ کے عہد میں ہی اگرچہ عربوں کی تمدنی زندگی پر بداوت

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۲ -
[2] ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص ۵

کی جگہ حضارت کا رنگ چڑھنا شروع ہو گیا تھا، چنانچہ زمانہ قبل اسلام میں گھروں کے اندر بیت الخلا کا رواج نہیں تھا۔ مدینہ کی ہجرت کے بعد اسکا رواج ہوا اور اسمیں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ بیت الخلا گھر کے اندر تو نہ ہوں مگر ان سے متصل ہوں [1] اسکے علاوہ لباس میں وضع قطع میں، نشست و برخاست میں، تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی تاہم سادگی برابر قائم رہی اور تکلفات کا کبھی کوئی دخل نہیں ہوا۔ سادگی کا یہ انداز عہدِ صدیقی میں بھی رہا۔ تاہم عراق اور شام میں اس زمانہ کی دو مہذب اور ترقی یافتہ قوموں ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ اختلاط کے باعث کچھ کچھ تکلفات کا عمل دخل ہونا شروع ہو گیا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان اول الذکر کے مرضِ وفات میں جو مکالمہ ہوا ہے اس میں حضرت ابوبکر نے استخلافِ حضرت عمر کے سلسلہ میں بطور طنز و تعریض فرمایا ہے کہ تم لوگ دیبا کے گدے بچھونے اور ریشمین پردے استعمال کرنے لگے ہو اور آذربائیجانی اون کے بنے ہوئے کپڑوں سے تم کو تکلیف ہوتی ہے [2]۔

عرب زمانۂ قبل از اسلام سے ہی ایک درمیانی منزل تھے جس کے ذریعہ چین انڈونیشیا ہندوستان اور ایران کے مصنوعات اور پیداوار چیزیں مصر اور مغربی ممالک میں آتی جاتی تھیں۔ اس تقریب سے عربی شاعری میں ہندی تلواروں، ہندسالوں عود صندل، کافور اور زنجبیل وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیزیں عرب میں مستعمل تھیں۔

لباس عربوں کا لباس شروع میں عموماً ایک ردا، اور ایک ازار پر مشتمل ہوتا تھا لیکن بعد میں جب تمدن نے ترقی کی تو درع (کرتہ) قمیص۔ پاجامہ (سروال) اور بنیان وغیرہ بھی مستعمل ہونے لگا۔ جس پر عربی زبان کے الفاظ شعار اور دثار دلالت کرتے ہیں اس کے علاوہ مرد باہر نکلتے تھے تو سر پر عمامہ باندھتے اور جبہ پہنتے تھے اور عورتیں سر پر رومال باندھتی تھیں یا اوڑھنی اوڑھتی تھیں جس کو خمار یا معجر کہتے ہیں

[1] صحیح بخاری ج ۲ حدیث الافک
[2] الکامل للمبرد ج ۱ ص ۵

زیورات میں بازو بند کڑے، بالی اور انگوٹھی اور چھلّے کا استعمال کرتی تھیں، ہار لونگ کا بھی استعمال ہوتا تھا جسے سخاب کہتے ہیں۔ غزوۂ بنی مصطلق کے سفر میں حضرت عائشہؓ کا جو ہار گم ہو گیا تھا۔ مہرۂ یمانی کا تھا[1] سرمہ اور مہندی کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ ورس ایک قسم کی سرخ گھاس ہے جو کہ بطور غازہ چہرہ پر ملتی تھیں، خوشبو میں مشک، عنبر اور زعفران کا استعمال ہوتا تھا۔

غذا | غذا عام طور پر سادہ ہوتی تھی، دودھ، کھجور اور گوشت عربوں کی محبوب غذا تھی گوشت مختلف ترکیبوں سے پکایا جاتا تھا جس کا ثبوت ان کثیر التعداد الفاظ سے ہوتا ہے جو عربی میں گوشت کیلئے اس زمانہ میں مروج تھے، اور جن کی فہرست ثعالبی کی کتاب فقہ اللغۃ میں یکجا مل سکتی ہے۔ اسی طرح کھجور اور دودھ کو بھی متعدد طریقوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مکھن اور پنیر کا بھی رواج تھا۔ حریرہ بھی مستعمل تھا۔ ترکاریوں میں کدو چقندر کا ذکر احادیث میں بھی ہے، کدو حضور کو بھی بہت مرغوب تھا۔ باقلا کا بھی ذکر آیا ہے۔ سرکہ کو آنحضرت ؐ نے بہترین سالن فرمایا ہے۔ مزید تفصیلات بخاری کے باب کتاب الاطعمہ اور زاد المعاد ابن قیم سے معلوم ہو سکتی ہیں

ذرائع معاش | یورپین مصنفین کا عام خیال ہے کہ اسلام کے بعد مسلمانوں کی معاش کا سب سے بڑا ذریعہ مال غنیمت تھا، یہ بالکل غلط خیال ہے کیونکہ مال غنیمت میں حصہ دار صرف وہی لوگ ہو سکتے تھے جو جہاد میں شریک ہوتے تھے اور ظاہر ہے ان کی تعداد عام آبادی کی تعداد کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہوتی تھی۔ عہد نبوی اور اس کے بعد عہد صدیقی میں بھی اصل اسلامی معاشرہ کے عناصر ترکیبی مہاجرین اور انصار، یہی دو گروہ تھے اور ان میں سے ہر ایک کا طبقاتی ذریعہ معاش الگ الگ تھا۔ مہاجرین تجارت کرتے تھے اور انصار کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے چنانچہ حضرت ابوہریرہ پر جب کثرت روایت کی وجہ سے بعض لوگوں نے نکتہ چینی کی تو آپ نے فرمایا "میرے مہاجرین بھائی تجارتی کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔

[1] سنن ابوداؤد باب التیمم۔ [2] صحیح بخاری کتاب البیوع

اور میرے انصاری بھائی کھیتی باڑی کرتے تھے اور میں آنحضرت ؐ کی خدمت میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا[2] مہاجرین میں جو حضرات تجارت میں نامور تھے ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص خاص طور پر مشہور ہیں۔ مہاجرین کا اصل پیشہ اگرچہ تجارت تھا لیکن مدینہ میں انصار کے ساتھ مواخات کے باعث ان میں سے بعض کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔

آزاد تجارت | اسلام سے پہلے عرب کے مشہور بازار عکاظ۔ ذوالمجنہ اور ذوالمجاز تھے جہاں مختلف قبائل کے لوگ اپنا اپنا تجارتی مال لے کر آتے تھے اور بیچتے تھے، لیکن ان کی یہ تجارت آزاد نہیں تھی ان سے محصول لیا جاتا تھا۔ لیکن آنحضرت نے مدینہ میں ایک اور بازار قائم کیا تھا۔ اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑتا تھا۔ آپ نے جب اس کو قائم کیا تو فرمایا۔

هٰذا سوقكم لا خراج عليكم فيه[1] یہ تمہارا بازار ہے اس میں کاروبار کرنے پر کوئی ٹیکس نہیں ہے

گھریلو دستکاری اور آزاد پیشے | تجارت اور فلاحت کے علاوہ صحابہ کرام کا ذریعہ معاش گھریلو دستکاری اور دوسری قسم کے محنت مزدوری کے کام بھی تھے، اسلامی تعلیمات کے زیر اثر کسب حلال کا ادنیٰ ذریعہ اختیار کرنے میں بھی ان کو ذرا جھجک نہیں ہوتی تھی اور اس میں ان کو عار نہیں آتی تھی۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی چٹائی بنتے تھے[2] حضرت سعد الانصاری پتھر پر پھاوڑا چلاتے تھے[3] بعض صحابہ شہد کی مکھیوں کی پرورش اور ان کی نگہداشت کا کام کرتے تھے[4] حضرت سودہ طائف کے چمڑہ کا کاروبار کرتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی مالی حالت تمام ازواج مطہرات سے بہتر تھی، کچھ صحابہ حدادی اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے، بعض نے معادن کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ جس کا ذکر قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں ہے۔

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۲ [2] استیعاب تذکرہ حضرت سلمان فارسی [3] اسد الغابہ تذکرہ سعد الانصاری [4] سنن ابی داؤد باب زکوٰۃ العسل۔

عہدِ صدیقی میں وظائف نہ ہونے کی وجہ

حضرت عمر فاروق نے اپنے عہدِ خلافت میں سب لوگوں کے حسب مراتب وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکر اس نکتہ سے واقف تھے کہ وظائف کیوجہ سے لوگوں میں تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور محنت و جفاکشی کی عادت باقی نہیں رہتی، اس لئے آپ نے کسی تندرست آدمی کا وظیفہ مقرر نہیں کیا جو کچھ آیا اُس کو اسی وقت تقسیم کر کے برابر کر دیا۔ چنانچہ جب حضرت عمر نے سب مسلمانوں کے وظائف مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو اس پر حضرت ابوسفیان بن حرب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ

ان فرضت للناس اتکلوا علی الدیوان وترکوا التجارۃ [1]

آپنے اگر سب کا وظیفہ مقرر کر دیا تو لوگ اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اور کاروبار کرنا چھوڑ دینگے

عام سماجی حالت

اسلامی معاشرہ بہترین معاشرہ تھا جس میں عورتوں کو پورے حقوق حاصل تھے۔ غلاموں اور باندیوں کے ساتھ نہایت شریفانہ اور فیاضانہ معاملہ کیا جاتا تھا ملک میں مکمل امن و امان تھا حضرت عمر صدیقی دور میں چیف جسٹس تھے لیکن دو برس تک ان کے پاس کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا خلیفہ عمال حکومت اور عام مسلمان ان کے طرزِ رہائش میں کوئی فرق ہی نہیں تھا۔ ایک معمولی حیثیت کا مسلمان بھی بلا تردد خلیفۂ وقت کے کسی فعل پر بر سرِ عام نکتہ چینی اور خردہ گیری کر سکتا تھا، غیر مسلموں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل تھی اور مسلمانوں کے اور انکے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار اور ہمدردانہ تھے، اور ان کو ترقی کرنے، علم حاصل کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔

اجتہاد و قیاس

قیاس عہدِ نبوت میں

قرآن و سنت میں اگرچہ اصول و کلیات کے علاوہ سینکڑوں جزئی مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ تمدن اور اجتماع کی ترقی کے

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۳

ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ایسے مسائل پیش آتے رہتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ ایسے مسائل کو حل کرنے کا طریقہ اسکے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اجتہاد اور قیاس سے کام لیا جائے، چونکہ شریعت کی جامعیت اور عالمگیری کے ساتھ اس چیز کا بہت گہرا تعلق ہے اس لئے خود آنحضرت ؐ کے عہد میں اسکو صاف طور پر بتا دیا گیا تھا۔ چنانچہ تم پہلے پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت ؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو جب قاضی بنا کر یمن بھیجا تھا تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کے درمیان کس طرح فیصلہ کرو گے؟ متعدد سوال و جواب کے آخر میں انھوں نے کہا کہ اگر میں کسی حکم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں پاؤں گا تو اجتہد رائی "میں اپنی رائے استعمال کرونگا" [1] ظاہر ہے اس اجتہاد بالرائی کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جو معاملہ پیش آئیگا اس پر قیاس کر کے اس کا حکم قرآن و سنت میں تلاش کرونگا اور معاملہ زیرِ بحث کو اس پر قیاس کر کے اس کا حکم اسپر لگا دوں گا۔ اور یہی تعریف قیاسِ شرعی کی ہے جو استنباط احکام کے اصول اربعہ میں سے ایک اصل ہے۔ ورنہ کتاب و سنت سے قطع نظر محض رائے زنی کوئی دلیل شرعی نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت ؐ نے معاذ بن جبل کا یہ جواب سن کر ان کو آفرین کہی اور خوشی سے ان کے سینہ پر دستِ مبارک رکھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیاس کا وجود خود آنحضرت ؐ کے عہد میں پایا جاتا تھا اور اسکے دلیل شرعی ہونے کی توثیق خود آپنے کر دی تھی [2]

استنباط احکام کے اصولِ ثلاثہ

آنحضرت ؐ کے بعد حضرت ابوبکر کا معمول تھا کہ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا تو کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر اس میں مل گیا تو اس پر عمل کرتے تھے۔ ورنہ سنت رسول اللہ سے مراجعت کرتے تھے اگر اسمیں کامیابی نہ ہوتی تو پھر مسلمانوں کو جمع کر کے دریافت کرتے کہ کیا تم میں سے

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۳۰ [2] لیکن افسوس ہے مولانا شبلی محض اس شوق میں کہ قیاس کی ایجاد اور اسکو حجت شرعیہ بنانے کا سہرا حضرت عمر فاروق کے سر باندھتے ہیں اسکو تسلیم نہیں کرتے اور ساتھ ہی اسکے منکر ہیں کہ حضرت ابوبکر کے عہد میں قیاس کا وجود پایا جاتا تھا۔

کسی کو اسکے متعلق آنحضرتؐ کا کوئی عمل معلوم ہے۔ اگر ایسا کوئی شخص مل جاتا تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور اگر اس میں بھی ناکامی ہوتی تو منتخب اور اعاظم صحابہ کو جمع کرکے ان سے مشورہ لیتے اور جس پر سب متفق ہوجاتے اسی کا حکم دیتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش آیا، قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی حکم تھا نہیں اس لئے آپنے سنت کیطرف رجوع کیا حضرت مغیرہ بن شعبہ نے بتایا کہ آنحضرتؐ جدہ (دادی) کو ایک سدس یعنی ۱/۶ حصہ دلاتے تھے حضرت ابوبکر نے اس پر شہادت طلب کی۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے حضرت مغیرہ کی تصدیق کی اور آپ نے یہی حکم نافذ کردیا[1]

اصل رابع یعنی قیاس | ان روایتوں سے استنباطِ احکام کے اصول ثلاثہ یعنی قرآن وسنت اور اجماع کا عہد صدیقی میں معمول بہا ہونا ثابت ہوتا ہے، رہی اصلِ رابع یعنی قیاس تو حضرت ابوبکر اجماع نہ ہونے کی صورت میں قیاس سے کام لیتے تھے۔ اور جو بات حق معلوم ہوتی تھی اس کا اعلان کردیتے تھے، چنانچہ کلالہ کے متعلق آپ سے پوچھا گیا تو چونکہ قرآن وسنت میں اس کا مفہوم واضح نہیں تھا اسلئے آپ نے فرمایا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کردوں گا" اگر صواب ہوا تو اللہ کی طرف سے ہوگا۔ ورنہ شیطان کی طرف سے[2]، پھر مانعین زکوٰۃ کے معاملہ میں ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر فاروق تک کی رائے خلاف تھی لیکن حضرت ابوبکر نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا، کیونکہ فرضیت واہمیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا اور پھر جس طرح نماز کا منکر مرتد ہے اسی طرح مانعین زکوٰۃ کو مرتد قرار دے کر ان سے قتال کو واجب قرار دیا۔ غور کرو کیا یہ صورت بعینہ قیاس کی نہیں ہے؟ شاہ ولی اللہ حضرت ابوبکر کے طرزِ استدلال کے متعلق فرماتے ہیں۔

"آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ جب لوگ لاالٰہ الا اللہ کہدیں گے تو انکی جانیں اور مال محفوظ ہوجائیں گے۔ الا بحقہا۔ مگر ہاں اسوقت نہیں جب کہ وہ

[1] سنن ابی داؤد کتاب الفرائض باب فی الجدۃ [2] سنن الدارمی ج ۲ ص ۳۶۵ مطبوعہ دمشق

کسی ایسی چیز کا ارتکاب کریں جس کی وجہ سے ان سے قتال کرنا ضروری ہوجائے، اس حدیث کو حضرت عمر جو مانعین زکوٰۃ کیساتھ قتال کرنے کے حق میں نہیں تھے اپنے استدلال میں پیش کرتے تھے اور ان کے استدلال کی تقریر یہ تھی کہ نماز کا الا بحقہا کے ماتحت شامل ہونا مسلم ہے اور چونکہ زکوٰۃ بھی نماز کی ہی طرح ایک اہم فرض اور دین کی بنیاد ہے اس لئے زکوٰۃ کے منع کرنے والوں کا حکم بھی وہی ہوگا۔ شاہ صاحب کے آخر الفاظ یہ ہیں۔

"در زکوٰۃ مقیس است بروئے بقیاسِ جلی[1]"

اسی طرح حضرت ابوبکر سے ایک مرتبہ جد (دادا) کی وراثت کا حکم جو قرآن میں مذکور نہیں ہے اور جس کے متعلق آنحضرتؐ کا کوئی عمل بھی معلوم نہیں تھا پوچھا گیا تو آپ نے اس کو اب (باپ) پر قیاس کرکے فرمایا کہ میراث کے معاملہ میں دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے۔ اس کی مزید تشریح آگے آتی ہے۔ مالک بن نویرہ کے واقعہ میں حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کی طرف سے جو خونبہا ادا کیا تھا وہ بھی بربنائے قیاس تھا، کیونکہ آنحضرتؐ نے خود حضرت خالد کے اسی طرح کے ایک واقعہ میں ایسا کیا تھا[2]

خیبر و فدک کا مسئلہ | اسی ذیل میں خیبر و فدک کا مسئلہ آتا ہے، یہ مسئلہ ایک مدت تک مسلمانوں میں بحث وتکرار کا موضوع بنا رہا ہے اس سلسلہ میں حضرت علی اور حضرت عباس کو جو اصرار رہا اور جو ناگواری پیش آئی اس نے واقعہ کی اہمیت بڑھا دی ہے، اس لئے ہم اس پر تفصیل سے کلام کرتے ہیں۔

اصل واقعہ | اصل واقعہ یہ ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد آنحضرتؐ نے اس کو ۳۶ حصوں پر تقسیم کیا، ان میں سے ۱۸ حصے اپنے لئے مخصوص کئے اور باقی حصص دوسرے لوگوں پر تقسیم کردئے۔ اس سے فراغت کے بعد جب آپ واپس ہوئے تو محیصہ بن مسعود الانصاری کو دعوتِ اسلام کی غرض سے اہل فدک کے پاس بھیجا۔ یوشع بن نون ان کا سردار تھا، اہلِ فدک نے صلح کی درخواست کی اور نصف زمین

[1] ازالۃ الخفا حصہ دوم ص ۸۲ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۸

معاہدہ میں دینی منظور کی۔ آنحضرتؐ نے اس کو قبول فرمالیا اس وقت سے یہ زمین آپ کے لئے مخصوص ہو گئی[1] آپ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ اور حضرت عباس حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خیبر و فدک کی زمینوں میں آنحضرتؐ کا جو حصہ تھا اس کا بحیثیت وارث مطالبہ کیا، اسکے جواب میں حضرت ابوبکر نے کہا۔ "میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔ اور آل محمدؐ اس مال میں سے کھائیں گے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے کہا کہ آنحضرتؐ جس کام کو جس طرح کرتے تھے میں اس کو اسی طرح کروں گا۔ حضرت فاطمہ یہ سنکر کبیدہ خاطر واپس چلی گئیں اور جب تک زندہ رہیں حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا[2]

اصل واقعہ اسی قدر ہے لیکن طبری اور بلاذری نے اس سلسلہ میں جو اور چند روایات نقل کی ہیں ایک فن کا نکتہ شناس پہچان سکتا ہے، کہ وہ وقت کی رنگ آمیزی سے خالی نہیں بہر حال ہم کو اس وقت ان کی تنقید مقصود نہیں ہے صرف اسپر بحث کرنا ہے۔ کہ اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر نے جو فیصلہ کیا وہ کہاں تک حق بجانب تھا اور کیوں تھا؟

حضرت ابوبکر کے فیصلہ کے وجوہ اس میں شک نہیں کہ خیبر اور فدک میں آنحضرتؐ کا جو حصہ تھا وہ آنحضرتؐ کے لئے مخصوص تھا چنانچہ حضرت عمر کے سامنے جب یہ معاملہ آیا تو آپ نے آیتِ ذیل پڑھی۔

وما افاء اللہ علی رسولہ منھم فما	اور اللہ نے اپنے رسول کو جو چیز بہ طور فے کے دی ہے
اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب	تو تم نے اس پر اپنے گھوڑے یا سواریاں نہیں دوڑائی
ولکن اللہ یسلط رسلہ علی من یشاء	تھیں لیکن اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے رسولوں کو
واللہ علی کل شیئ قدیر۔	مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت والا ہے

خالصۃً رسول ہونے کا مطلب اور اس آیت میں جس فے کا ذکر ہے اوس سے خیبر اور فدک

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۳ و ۳۶ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۶ کتاب الفرائض یہی روایت بخاری میں تھوڑے بہت الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ باب الخمس اور باب المغازی میں بھی ہے۔

مراد لے اور ساتھ ہی فرمایا۔ فکانت ھذہ خالصۃً لرسول اللہ صلعم[1] لیکن ایک پیغمبر ایک بادشاہ اور ایک صدر ریاست کے لئے کسی چیز کے خاص ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کی ملکیت ذاتی ہو۔ اور دوسری یہ کہ صدر ریاست ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے اخراجات کے لئے وقف ہو۔ پہلی صورت میں صدر ریاست کے انتقال کے بعد وہ شے اس کے ورثہ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری صورت میں چونکہ وہ ذاتی نہیں ہوتی اس لئے وارثوں میں تقسیم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بعد جو شخص صدر ریاست ہوتا ہے اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر (اور حضرت عمر بھی) خیبر اور فدک کو بے شبہ آنحضرتؐ کے لئے خاص مانتے تھے، لیکن پہلی صورت کا خاص ہونا نہیں جسمیں وراثت چلتی ہو۔ بلکہ دوسری صورت کا جس کو لازمی طور پر خلیفۂ رسول کی طرف منتقل ہونا چاہیئے مسند امام احمد بن حنبل میں بسند صحیح مروی ہے کہ حضرت فاطمہ نے حضرت ابوبکر کے پاس پیغام بھیجا کہ رسول اللہ صلعم کے وارث آپ ہیں یا ان کی اولاد تو حضرت ابوبکر نے جواب دیا " میں نہیں بلکہ آپ کے متعلقین (اھل)!" اب حضرت فاطمہ نے کہلایا کہ اچھا! تو پھر رسول اللہ صلعم کا حصہ کہاں ہے؟ اس کا جواب حضرت ابوبکر نے یہ دیا کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ " اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کھلاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کو دنیا سے اٹھا لیتا ہے تو جو اس نبی کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ جو اس کا قائم مقام ہوتا ہے[2]"

اس کے علاوہ حضرت عروۃ بن الزبیر سے بھی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات حضرت عائشہ کے پاس آئیں اور خیبر و فدک میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کیا۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا " کیا تمکو خوف خدا نہیں ہے؟ کیا تم نے آنحضرتؐ سے نہیں سنا کہ " ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ باب الخمس [2] ج ۱ ص ۴

جبکہ میں دنیا میں نہ رہوں تو میرا حصہ اس شخص کیلئے ہوگا جو میرا خلیفہ ہو حضرت عائشہ کی یہ تقریر سن کر ازواج مطہرات نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ [۱]

حضرت ابوبکر کے بعد جب یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے آیا تو آپ نے بھی یہی فرمایا۔

هما صدقة رسول الله ﷺ كانتا لحقوقه التي تعروه ونوائبه وامرهما الى من ولى الامر قال وهما على ذالك اليوم [۲]	خیبر اور فدک دونوں رسول اللہ ﷺ کے صدقہ (وقف) تھی اور آپ کے ذمہ جو حقوق تھے انکے لئے اور آپ کی ضرورتوں کیلئے تھے اور انکا معاملہ اس شخص کے سپرد ہے جو خلیفہ ہو اور یہ دونوں آج تک اسی حالت اور حیثیت میں ہیں۔

خیبر و فدک کے مصارف | خیبر و فدک کی اس حیثیت کے متعین ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکر کو حق تھا کہ صدر ریاست اور خلیفہ رسول کی حیثیت سے خیبر و فدک کی آمدنی کو اپنی ذات اور اپنے بال بچوں کے اخراجات کیلئے مخصوص کریں۔ لیکن ادب و احترام نبوی اور اہلبیت اطہار کے ساتھ آپ کو جو محبت و عقیدت تھی۔ اس کا تقاضا تھا کہ آپ نے ان دونوں کی آمدنی کے مصارف بعینہ وہی قائم رکھے جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں تھے۔ اور اس کا حبہ بھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے روا نہیں رکھا عہد نبوی میں خیبر و فدک کا مصرف یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ اپنے متعلقین کا سال بھر کا خرچ اسی میں سے پورا کرتے تھے اور اس کے علاوہ مسلمانوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے [۳]

حضرت ابوبکر کا بھی یہی معمول رہا۔ جہاں تک اہل بیت کا تعلق ہے آپ نے فرمایا۔

والذی نفسی بیده لقرابة رسول الله ﷺ احب الی من ان اصل من قرابتی [۴]	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم رسول اللہ کے رشتہ دار مجھ کو اس سے زیادہ عزیز ہیں کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کروں

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۲ [۲] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الفرائض [۳] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۷ [۴] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۰

مزید ارشاد فرمایا۔

سمعت ان النبی لا یورث ولکنی اعول من کان رسول اللہ ﷺ یعول وانفق علی من کان رسول ﷺ ینفق [۱]	میں نے سنا ہے کہ نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود میں اُن سب کی سرپرستی کرونگا جن کی سرپرستی آنحضرت ﷺ کرتے تھے اور ان سب پر خرچ کروں گا جن پر آپ خرچ کرتے تھے۔

غور کرو فرض اور محبت کے درمیان حسنِ توازن و تناسب کی مثال کیا کوئی اس سے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔؟

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں۔

"مشکل آنکہ اگر میراث دہند مخالف قاعدہ شرع باشد و اگر ندہند ملال خاطر اہل بیت لازم آید۔ حضرت صدیق دریں باب حدیثے روایت کرد کہ میراث بردن را از پیغامبر ﷺ و بودن ایں قری مملوک وے ﷺ ہر دو مقدمہ را منع نمود و با حضرت فاطمہ و سائر اہل بیت آں قدر ملاطفت فرمود کہ جبر نقصان آن آزردگیہا شد [۲]"

حضرت فاطمہ زہرا کا طرز عمل | اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابوبکر کے اس سب کچھ کرنے کروانے کے بعد بھی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرا کا دل ان کی طرف سے صاف ہوا؟ اگرچہ متعدد روایات میں مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ نے آخیر عمر تک حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا، لیکن اوّل تو جن راویوں نے یہ نقل کیا ہے صرف ان کا ایک اندازہ اور قیاس ہے۔ پھر ان روایات کے جو راوی ہیں ان میں بعض وہ بھی ہیں جن میں تشیع پایا جاتا تھا۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں۔

ولعله روی بمعنی ما فهمه بعض الرواة وفيهم من فيه تشيع	اور شاید بعض راویوں نے جیسا سمجھا اسکو ہی بالمعنی روایت کر دیا اور یہ بھی معلوم رہنا

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۰ [۲] ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص ۲۹

فلیعلم ذالک [1] چاہئے کہ ان راویوں میں بعض وہ بھی ہیں جن میں تشیع تھا۔

جن راویوں نے حضرت فاطمہ کی تا وقت وفات ناراضگی بیان کی ہے وہ حضرت فاطمہ کا کوئی فقرہ ایسا نقل نہیں کرتے جو انہوں نے حضرت ابوبکر سے گفتگو کے بعد کہا ہو اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حدیث نبوی سننے کے بعد بھی ان کا ملالِ خاطر دور نہیں ہوا۔ اس بنا پر قیاس یہی ہو سکتا ہے کہ یہ محض راوی کا اپنا احساس ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ایک اور روایت ہے جس میں صاف طور پر مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر کی زبان سے حدیث نبوی سننے کے بعد حضرت فاطمہ نے فرمایا۔

فانت وما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم [1] تو پھر آپ نے رسول اللہ ؐ سے جو سنا ہے آپ اس کو زیادہ جانتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو کوئی ملال نہیں رہا تھا اور قرین قیاس و مقتضائے روایت بھی یہی ہے، حضرت ابوبکر کی زبان سے ارشاد نبوی سننے کے بعد حضرت فاطمہ کے سامنے صرف دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ اس حدیث کا انکار کرتیں اور یا اس کو صحیح تسلیم کرتیں، پہلی صورت ناممکن تھی اسلئے کہ اول تو خود حضرت ابوبکر کا کسی حدیث کو بیان کرنا اس کی صحت کی سب سے بڑی دلیل تھا۔ اور پھر یہاں تو حضرت صدیق تنہا نہیں تھے، بلکہ ازواجِ مطہرات، حضرت علی، عباس، عثمان، عمر فاروق، عبدالرحمن بن عوف، طلحۃ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، سعد ابن ابی وقاص، ابوہریرہ اور حضرت عائشہ یہ سب حدیث کی صحت کے گواہ تھے۔ جیسا کہ بخاری کتاب الفرائض کی روایت سے ظاہر ہے، اس بنا پر حضرت فاطمہ کے لئے حدیث کی عدم صحت کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔ اب لامحالہ دوسری صورت باقی رہتی ہے تو کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت فاطمہ کی نسبت باور کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی صحت تسلیم کرنے کے باوجود ان کا تکدرِ طبع دور نہیں ہوا اور انہوں نے اپنا مطالبہ بخوشی

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۸۹

واپس نہیں لے لیا، صاف و صریح ارشاد نبوی سننے کے بعد اپنے مطالبہ پر اصرار ایک ادنیٰ درجہ کے مسلمان سے متوقع نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ سیدۃ النساء حضرت زہرا بتول سے جو معدن الفقر فخری کا گوہر تابندہ اور فلکِ درویشی و بے نفسی کا ماہ درخشندہ تھیں، سرورِ عالم ؐ کی جس لختِ جگر نے چکی پیس پیس کر اپنے ہاتھوں پر گٹے ڈال لئے ہوں اور کبھی اُف نہ کی، کبھی دولت و ثروت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ہو کہ یہی استغنا اور یہی شانِ فقر اس خانوادۂ قدس کا طغرائے امتیاز تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چند قرصہائے سیم و زر کی وراثتی ملکیت کے داغ اپنے دامانِ فقر و استغنا پر گوارا کر سکتی تھی؟ فھل من مدکر [1]

حضرت ابوبکر کی مجتہدانہ بالغ نظری

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وقتی طور پر ایک معاملہ پیش آیا اور حضرت ابوبکر نے اس کا جواب دیدیا، بلکہ درحقیقت حضرت ابوبکر کا یہ فیصلہ جو فرمودۂ نبوت کی روشنی میں تھا آنحضرت ؐ کی پیغمبرانہ عظمت و شان کو قائم رکھنے کا ضامن تھا، حیاتِ انبیا کا جو عقیدہ ہے اس کی رسمی توضیح و تشریح سے قطع نظر یہ مسلم ہے کہ آنحضرت ؐ کی وفات پر وہ تمام احکام جاری نہیں ہوئے جو عام لوگوں کی موت پر طاری ہوتے ہیں، چنانچہ آپ کی ازواج مطہرات عدت میں نہیں بیٹھیں اور آپ کے بعد ان سے کسی اور کا نکاح کرنا جائز نہیں تھا۔ اس بنا پر حضرت

[1] اسکی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو حافظ عماد الدین ابن کثیر نے حافظ ابوبکر البیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی علالت کے دنوں میں عیادت کیلئے تشریف لیگئے تو حضرت فاطمہ نے آپکو گھر میں بلا لیا دونوں میں گفتگو ہوئی اور آخر حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر سے خوش ہو گئیں، ابن کثیر نے اس روایت کی سند کو جید قوی کہا ہے (البدایۃ ج ۵ ص ۲۸۹) اسپر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بہر حال اس روایت سے بھی یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ حضرت فاطمہ ناراض تھیں اگرچہ بعد میں ان کا دل صاف ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کو کچھ ناگواری ہوئی یا نہیں اس سے قطع نظر حضرت ابوبکر کا اسکا خیال ضرور ہوگا کہ جگر گوشۂ رسول نے ایک مطالبہ کیا اور وہ اسکی تعمیل نہ کر سکے بس صرف یہی خلش تھی جسکی وجہ سے حضرت فاطمہ کے پاس معذرت خواہی کیلئے گئے تھے

ابوبکر کو اس بات کا یقین تھا کہ وراثت بھی جو عام اہل دنیا کے عوائد رسمیہ میں سے ہے ایک پیغمبر آخر الزماں کے شایان شان نہیں۔ آنحضرت صلعم کی شان تو یہ تھی کہ جو کچھ آپکے پاس تھا اس کو آپنے صرف اپنی ذات اور اپنی صلبی اولاد کے لئے کبھی مخصوص نہیں رکھا بلکہ اس پر سب مسلمانوں کا حق تھا چنانچہ آپ نے فرمایا۔

انا اولی بالمؤمنین من انفسهم فمن مات وعلیه دین ولم یترك وفاءً فعلینا قضاءه و من ترك مالا فلورثته [1]

میرے اوپر مسلمانوں کا حق اتنا ہے کہ خود انپر بھی انکا نہیں ہے، اس لئے جو مسلمان مقروض مرجائے اور کافی ترکہ نہ چھوڑے تو اس قرض کو ادا کرنا ہمارے ذمہ ہے اور جو شخص کچھ مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کیلئے ہوگا۔

اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فدک کے متعلق ایک مرتبہ ایک جماعت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

فدک رسول اللہ صلعم کے لئے تھا، آپ اس میں سے خرچ کرتے تھے اور اسی میں سے بنو ہاشم کے فقرا پر خرچ کرتے تھے ان کی بن بیاہی لڑکیوں کا نکاح کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ نے ایک مرتبہ درخواست کی کہ آپ فدک ان کے نام ہبہ کردیں تو آپ نے انکار فرمادیا [2]

پس غور کرو جس رحمت عالم کی یہ شان ہو اور جس نے زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۷ [2] سنن ابی داؤد کتاب الفرائض باب فی صفایا رسول اللہ صلعم حضرت عمر نے حضرت علی و عباس وغیرہ ہما کے سامنے آیت وما افاء اللہ علی رسولہ الآیۃ پڑھی اور اس سے استدلال کیا کہ آنحضرت صلعم کے پاس جو کچھ تھا اسمیں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں تھا جس کا حق نہ ہو نیز یہ کہ آنحضرت صلعم اسی خیبر و فدک کی آمدنی سے مسلمانوں کیلئے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خریدتے رہتے اور اپنا اور اپنے متعلقین کا سال بھر کا خرچ پورا کرنیکے بعد قومی و ملی مصارف میں خرچ کرتے تھے اصل الفاظ جو بخاری میں بھی ہیں وہ یہ ہیں فیجعل مجعل مال اللہ بخاری ج ۲ ص ۱۰۴۱ و سنن ابی داؤد کتاب الفرائض

کو اپنے خاندان کے لئے ناجائز قرار دیدیا ہو، کیونکر ممکن تھا کہ اس کے دنیا سے روپوش ہوتے ہی اس کے ترکہ کے حصے بخرے کرلئے جاتے اور چند افراد خاندان میں اس کو محدود کرکے عام مسلمانوں کو اس کے انتفاع سے محروم کردیا جاتا، آپ کا ارشاد وماترکنا صدقۃ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ سب مسلمانوں کے لئے وقف ہوگا۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی گرہ کشائی خلیفہ رسول کے ناخن اجتہاد نے کی۔

حضرت علی اور حضرت عباس کا اصرار

جہاں تک اس واقعہ کے ساتھ حضرت ابوبکر کی ذات کا تعلق ہے مسئلہ بالکل صاف ہوجاتا ہے لیکن آخر میں بحث کو مکمل کرنے کی غرض سے مختصراً اس قدر لکھ دینا ضروری ہے کہ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھا مانا! حضرت فاطمہ کو حضرت ابوبکر کی زبان سے ارشاد نبوی سننے کے بعد اطمینان ہوگیا لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس کو پھر بھی اصرار رہا اور ان کی تشفی نہیں ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک وراثت کا معاملہ تھا اس کے متعلق ان دونوں حضرات کو بھی اطمینان اور اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ خیبر و فدک وقف ہیں لیکن وہ اس چیز کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ خلیفہ وقت ہی اس کا متولی ہو۔ ان کا ذاتی خیال تھا کہ آنحضرت صلعم کے اہل قرابت کو اس کا متولی ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ ان حضرات کا خیال یہ بھی تھا کہ یہ صرف آنحضرت صلعم کے اقربا کے لئے وقف ہیں نہ کہ تمام مسلمانوں کیلئے، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی و عباس میں جو طویل مکالمہ اکابر مہاجرین کی موجودگی میں ہوا ہے اور جو صحیح بخاری میں متعدد ابواب کے ماتحت مذکور ہے اس کو دیکھو تو صاف نظر آئیگا کہ مکالمہ کا موضوع وراثت نہیں بلکہ دراصل یہی دو چیزیں ہیں ان میں سے پہلی چیز یعنی وقف کا متولی ہونا تو چونکہ خلیفہ کا حق تھی اور ایک صاحب حق اگر چاہے تو وہ کسی دوسرے کے حق میں اس سے دست بردار ہوسکتا ہے اس بنا پر اہل بیت اطہار کی دلجوئی کی خاطر حضرت عمر نے خیبر فدک کی تولیت اور اس کا انتظام و انصرام حضرت علی اور حضرت عباس

کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ لیکن دوسری چیز یعنی مصارفِ وقف فدک تو چونکہ ماترکنا صدقۃ کے ارشاد نبوی کے ماتحت منصوص تھی اسلئے حضرت عمرؓ یا کسی اور شخص کو اس میں تغیر و تبدیل کرنے کا حق نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مذکورۂ بالا دونوں حضرات کو جب فدک کی ولایت سپرد کی تو ان سے صاف لفظوں میں اس بات کا عہد کرا لیا کہ وہ اس کی آمدنی ان تمام مصارف کے لئے کھلی رکھیں گے جن میں آنحضرتؐ اس کو صرف کرتے تھے اس کے بعد بتاکید فرمایا۔

فان عجزتما فادفعاها الی فانی اکفیکماها۔ — اگر تم دونوں اس شرط کو پورا نہ کر سکو گے تو تم یہ مجھے واپس کر دو۔ تمہاری طرف سے میں اس کا انتظام کر دوں گا۔

ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد میں بھی[1] فدک مسلمانوں کیلئے صدقہ ہی تھا۔

کلالہ کی بحث

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مجتہدات و قیاسات میں ایک مشہور مسئلہ دادا کی وراثت کا بھی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے:

یستفتونك - قل اللّٰہ یفتیکم فی الکلالۃ ان امرؤ ھلك لیس لہٗ ولد وّلہ اخت فلھا نصف ماترك وھو یرثھا ان لّم یکن لھا ولدٌ (نساء) — اے محمدؐ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہدیجئے کہ اللہ کلالہ کے بارہ میں تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد لاولد مرے اور اسکی بہن مرجائے اور اسکی اولاد نہ ہو تو یہ بھائی اس کا وارث ہوگا۔

اس آیت میں جو لفظ کلالہ آیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی وفات پر نہ اس کے باپ ہو اور نہ بیٹا۔ لیکن آگے چل کر اختلاف اس میں ہو گیا کہ کلالہ کے مفہوم میں دادا کا نہ ہونا

[1] صحیح بخاری ج ا ول طبع ۴۳ و ج ۲ ص ۹۹۶ بعض محدثین کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علی اور عباس کو جس کا متولی بنایا تھا وہ خیبر و فدک نہیں بلکہ مدینہ میں آنحضرتؐ کا جو خالصہ تھا وہ تھا لیکن بخاری کی روایات سے ایسی کوئی تخصیص ظاہر نہیں ہوتی۔

بھی داخل ہے یا نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس کی رائے یہی تھی کہ داخل ہے یعنی دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے۔ حضرت ابوبکر کے عہد میں تو کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی[1] لیکن بعد میں متعدد صحابہ کی رائے اس کے خلاف ہو گئی۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرض کرو ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس نے اپنے بعد ایک دادا اور بہن، بھائی، چھوڑے تو اب سوال یہ ہے کہ دادا کے ہوتے ہوئے بہن بھائی کو ورثہ ملیگا یا نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے۔ پس جس طرح باپ کی موجودگی سے بہن بھائی محجوب الارث ہو جاتے اسی طرح دادا کی موجودگی سے بھی ہو جائینگے۔

اس مسئلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا استدلال یہ تھا کہ۔

(۱) قرآن مجید میں ایک اور آیت ہے جس میں کلالہ کا لفظ آیا ہے۔

وان کان رجل یورث کلالۃً او امرأۃ ولہٗ اخ او اخت فلکل واحدٍ منھما السدس ط — اگر ایک مرد کلالہ ہونے کی حالت میں مر جائے یا کوئی عورت اور اس کے ماں شریک بہن بھائی ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اس آیت میں کلالہ سے مراد سب کے نزدیک وہ شخص ہے جس کے نہ باپ ہو اور نہ دادا، چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر دادا ہو گا تو پھر علاتی بہن بھائی محجوب الارث ہو جائیں گے۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ جب یہاں کلالہ کے معنی میں دادا کو باپ کے برابر رکھا گیا ہے تو یہی تشریح پہلی آیت میں ملحوظ نہ رکھی جائے۔

(۲) جہاں تک حاجب ہونے کا تعلق ہے ابن الابن یعنی پوتے کا وہی حکم ہے جو ابن کا ہے۔ پس جب فروع میں یہ حال ہے تو کیا وجہ ہے کہ اب الاب یعنی دادا کا حکم باپ کا سا اصول میں نہ ہو۔

[1] بخاری ج ۲ کتاب الفرائض

(۳) جد باپ کی طرح اصل نسب ہے اس لئے جو حکم باپ کا ہوگا وہی دادا کا ہونا چاہیے۔[1]

غرض کہ حضرت ابوبکر صدیق اسلام میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اجتہاد کیلئے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے۔ آج تک مسلمانوں کا عمل انہیں ضوابط پر ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

"اہم مہمات نزدیک حضرت صدیق آن بود کہ رائے امت آنحضرت ؐ قاعدہ مرتب فرماید تا در مسائل اجتہادیہ بکدام راہ سلوک نمائند و ترتیب ادلہ شرعیہ بچہ اسلوب عمل آرند الی یومنا ہذا۔ ہمہ مجتہدین برہمیں قاعدہ عمل می کنند و وے رضی اللہ عنہ شیخ و استاد جمیع مجتہدین شد"[2]

بچہ کس کو دیا جائے | کسی بچہ کے ماں باپ میں اگر جدائی ہو جائے تو بچہ کس کے سپرد کیا جائے۔ اس بارہ میں حضرت ابوبکر کا فیصلہ یہ تھا کہ ماں کے سپرد کیا جائے چنانچہ حضرت عمر نے ایک انصاریہ عورت سے شادی کی تھی۔ اور اس کے بطن سے ایک بچہ جس کا نام عاصم تھا پیدا بھی ہو چکا تھا۔ بعد میں حضرت عمر نے بیوی کو طلاق بھی دے دی۔ اس کے بعد ایک دن حضرت عمر قبا تشریف لے گئے تو دیکھا کہ عاصم مسجد کے صحن میں کھیل رہے ہیں۔ شفقت پدری نے جوش مارا۔ حضرت عمر نے بچہ کا بازو پکڑ کر اپنے پاس سواری پر بٹھا لیا۔ اتنے میں بچہ کی نانی آگئی اور اب دونوں میں کشمکش ہونے لگی آخر اسی حالت میں دونوں حضرت ابوبکر کی خدمت میں پہونچے اور ہر ایک نے کہا کہ بچہ میرا بیٹا ہے حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ بچہ نانی کے حوالہ کر دیں۔ حضرت عمر نے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور پلٹ کر کوئی بات نہیں کہی۔ امام مالک اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں "اس مسئلہ میں اس روایت کی وجہ سے میرا فتویٰ بھی یہی ہے"[3]

فراستِ ایمانی | کسی معاملہ یا قضیہ کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے بیرونی شہادتوں کے

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن ابوبکر جصاص از صفحہ ۱۰۴ تا صفحہ ۱۰۸ [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۳۱ [3] مؤطا امام مالک کتاب الاقضیہ باب من احق بالولد۔

علاوہ خود قاضی کی اپنی ذہانت اور فراست کی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ حدیث میں عام مومنین کی فراست کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم اس سے بچو۔ کیونکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے چونکہ حضرت ابوبکر صدیق سب سے زیادہ قوی الایمان تھے۔ اسلئے ان کے نورِ فراست کا یہ عالم تھا کہ مرض وفات میں حضرت عائشہ سے فرمایا۔ کہ بیٹی! میں نے تم کو جو جائیداد دی ہے میرے بعد تم کتاب اللہ کے قانون کے مطابق اس کو اپنے بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کر لینا، تو حضرت عائشہ بولیں" اباجان! میری بہن تو ایک ہی یعنی اسماء ہیں۔ پھر آپ نے "بہنوں" کیسے فرما دیا" اس وقت صدیق اکبر کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ حمل سے تھیں۔ حضرت ابوبکر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اُرَاھَا جَارِیَۃً میرا خیال ہے کہ بچی پیدا ہوگی[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

علمی مفاخر و کمالات[2]

اسلام سے پہلے عرب میں اگرچہ روحانیت کا فقدان تھا لیکن ان کا اپنا ایک ضابطہ اخلاق تھا جو المروۃ کہلاتا تھا، جو لوگ اس ضابطۂ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے وہ نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس کے علاوہ شاعری اور قوتِ تقریر و خطابت اور اعلی النسب میں جو لوگ ممتاز ہوتے تھے وہ قوم کے سردار مانے جاتے تھے حضرت ابوبکر ان تمام اوصاف و کمالات کے جامع تھے۔

[1] مؤطا امام مالک باب ما لا یجوز من النحل۔ [2] کتاب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ واقعات کی تکرار نہ ہونے پائے لیکن اس باب میں بعض اوقات جو ضمنی طور پر پہلے گزر چکے ہیں مکرر آگئے ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ کیونکہ جس واقعہ کا جس عنوان سے خاص تعلق ہے۔ اگر اسکے ماتحت اسکو صرف اس بنا پر ذکر نہ کیا جاتا کہ اسکا ذکر اجمالی طور پر پہلے آچکا ہے تو یہ عنوان بڑا ظلم ہوتا۔

علم الانساب میں مہارت علم الانساب حضرت ابوبکر کا خاص فن تھا حضرت علی فرماتے ہیں

وکان ابوبکر مقدمًا فی کل خیرٍ وکان رجلاً نسابةً [1]

ابوبکر اچھے کام میں آگے آگے رہتے تھے اور علم الانساب میں بڑے ماہر تھے۔

اس سلسلہ میں حضرت علی ہی اپنا ایک چشم دید واقعہ سناتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ قبائل میں جاکر اسلام کی تبلیغ کریں تو ایک دن آپ۔ ابوبکر اور میں ہم تینوں عربوں کے ایک اجتماع میں پہونچے۔ حضرت ابوبکر نے ان سے پوچھا دو آپ لوگ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ بولے "ربیعہ" سے اسکے بعد حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ابوبکر:۔ ربیعہ کے اونچے طبقہ سے یا ادنیٰ طبقہ سے؟

اہل قبائل:۔ اونچے طبقہ سے۔

ابوبکر:۔ اونچا طبقہ کونسا؟ ذہل الاکبر یا ذہل الاصغر؟

اہل قبائل:۔ ذہل الاکبر۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر نے چند ناموران عرب کے الگ الگ نام لے کر پوچھا کہ کیا یہ شخص تمہارے ہی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا؟ یہ لوگ ہر ایک کا جواب نفی میں دیتے رہے آخر حضرت ابوبکر نے کہا "تو پھر تم لوگ ذہل الاکبر سے نہیں۔ بلکہ ذہل الاصغر سے تعلق رکھتے ہو"۔

ان لوگوں میں ایک سبزہ آغاز نوجوان تھا، اب وہ آگے بڑھا اور بولا "آپنے تو ہم سے سوالات کر لیے لیکن اب ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ سے کچھ پوچھیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا شوق سے لیکن اب اس نوجوان نے سوالات کا جو سلسلہ شروع کیا وہ کہیں جاکر رکتا ہی نہیں تھا۔ آخر حضرت ابوبکر تنگ آکر اونٹنی پر بیٹھ چلدیئے۔ اس پر نوجوان نے ایک شعر پڑھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ کبھی چت اور کبھی پٹ۔ آنحضرتؐ کو یہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی [2]

جبیر بن مطعم نسب دانی میں تمام عرب میں ممتاز تھے مگر وہ بھی کہتے تھے کہ میں نے یہ فن حضرت ابوبکر سے سیکھا ہے [3]

---

[1] العقد الفرید ج ۲ ص ۲۷۴ [2] ایضاً ج ۲ ص ۲۷۵ [3] سیرت ابن ہشام باب سیاقة النسب من ولد اسماعیل

حضرت ابوبکر کی یہ نسب دانی اسلام کے بھی کام آئی۔ قریش کے مشرکین میں سے بعض لوگ آنحضرتؐ کی ہجو میں اشعار کہتے ہیں۔ دربار نبوت کے خاص شاعر حضرت حسان بن ثابت نے اجازت چاہی کہ وہ بھی قریش کی ہجو کریں۔ آنحضرتؐ نے پوچھا "جب میں خود قریش میں سے ہوں تو تم ان کی ہجو کیسے کروگے۔ حسان بولے "میں آپ کو ان سے اس طرح الگ کرلوں گا جس طرح بال کو آٹے میں سے نکال لیتے ہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے اس کو مشورہ دیا کہ حضرت ابوبکر کے پاس جائیں کیونکہ وہ ان (حسان) سے زیادہ قریش کے انساب سے واقف ہیں چنانچہ حسان حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ درس لیتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش حضرت حسان کے اشعار سنتے تھے تو فوراً پہچان جاتے تھے کہ انکی تصنیف ہیں۔ حضرت ابوبکر کا مشورہ شامل ہے۔ [1]

ایام العرب علم الانساب کی طرح ایام العرب یعنی عربوں کی خانہ جنگی کی تاریخ کے بھی بہت بڑے عالم تھے حضرت عائشہ جو اپنے زمانہ میں اعلم بحدیث العرب والنسب سمجھی جاتی تھیں انکا یہ علم و فضل بھی درحقیقت حضرت ابوبکر کا ہی فیضان تعلیم و تربیت تھا، چنانچہ حضرت ہشام بن عروہ روایت کرتے ہیں۔

کان عروة یقول لعائشة یا امتاه لا اعجب من فهمك، اقول زوجة رسول الله صلی الله علیه وسلم و بنت ابی بکر ولا اعجب من علمك بالشعر وایام الناس اقول ابنة ابی بکر کان اعلم الناس ولکن اعجب من علمك بالطب کیف هو ومن این هو؟ قال فضربت علی منکبه

عروہ حضرت عائشہ سے پوچھا کرتے تھے کہ اماں! مجھ کو آپ کی سمجھ پر تو حیرت نہیں ہوتی، کیونکہ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہؐ کی بیوی اور ابوبکر کی بیٹی ہیں، اور نہ مجھ کو آپکے علم شعر و تاریخ پر تعجب ہوتا ہے، میں کہتا ہوں کہ آپ ابوبکر کی بیٹی ہیں جو ان چیزوں کے سب سے بڑے عالم تھے مگر ہاں مجھ کو آپکے علم طب پر بڑی حیرت ہے کہ یہ علم آپکو کیونکر حاصل ہوا؟ راوی کا

---

[1] استیعاب ابن عبد البر باب حسان

وقالت ای عروة ان رسول اللہ کان یسقم عند آخر عمرہ فکانت تقدم علیہ وفود العرب من کل وجہ فتنعت لہ الانعات فکنت اعالجھا لہ فمن ثم [1]

بیان ہے کہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے حضرت عروہ کے ساتھ مہارت طب میں تعجب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ سنو! رسول اللہؐ آخر عمر میں بیمار رہتے تھے اور آپ کے پاس عرب کے وفد آیا کرتے تھے وہ طرح طرح کی دوائیں اور انکے اوصاف بیان کرتے تھے اور میں ان دواؤں کو تیار کرتی تھی پس میرا علم طب اسی وجہ سے ہے۔

ذوقِ شعر وسخن شعر وشاعری کا ذوق عرب کے بچہ بچہ کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جو انکے لطافت وجودتِ طبع کی دلیل تھا۔ حضرت ابوبکر بھی اس سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ چنانچہ ابن سعد نے آپ کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جو آپ نے رسول اللہؐ کی وفات پر کہے تھے۔ ابن رشیق نے پندرہ اشعار کی ایک نظم نقل [2] کی ہے۔ جو آپ کی طرف منسوب ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت میں شعر کہتے ہونگے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے کوئی شعر نہیں کہا اور حق یہ ہے کہ جس رسول برحق کیلئے قرآن میں ہے:

وماعلمناہُ الشعرَ ومایَنبغی لہٗ

ہمنے اس پیغمبر کو شعر نہیں سکھایا اور یہ انکے لئے موزوں بھی نہیں

کہا گیا ہو اسکے خلیفۂ اولین کی شان سے یہ بعید بھی تھا، چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں

ان ابا بکر ماقال بیت شعر فی الاسلام حتی مات [3]

بے شبہ ابوبکر نے اسلام کے زمانہ میں اپنی وفات تک کبھی ایک شعر بھی نہیں کہا۔

ابن رشیق نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے متعلق ابن ہشام اور سہیلی دونوں نے بیان کیا ہے کہ اکثر اہل علم حضرت ابوبکر کی طرف ان کا انتساب صحیح نہیں مانتے۔ البتہ کبھی کبھی شعر پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ آپ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے جو خود آپ کے حسب حال تھا۔

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۶۷ [2] کتاب العمدہ ج ۱ ص ۱۹ [3] استیعاب حرف العین [4] الروض الانف ج ۲ ص ۵۵

اذا اردت شریف الناس کلھم فانظر الی ملک فی زی مسکین [1]

اگر تم لوگوں میں سب سے شریف انسان کو دیکھنا چاہو تو اس بادشاہ کو دیکھو جو فقیر کی گدڑی میں ہے۔

تقریر وخطابت شاعری کی طرح تقریر وخطابت کا فن بھی عربوں کا خاص فن تھا۔ جس میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز تھے، قرآن نے ایک خاص اسلوبِ بیان ایک نیا اندازِ فکر، ایک وسیع مگر ٹھوس نقطۂ نظر دیا تھا اس لئے اسلام کے بعد عربوں کے اس فن کو غیر معمولی ترقی ہوئی اور انکی فطری صلاحیتِ خطابت اسلام کی سان پہ جلا پاکر شمشیر دو دم بن گئی۔ تاہم شاعری کی طرح تقریر وخطابت کا فن بھی کسبی سے زیادہ وہبی اور ایک ملکۂ خداداد ہے جو فطری استعداد و مناسبت کے بغیر محض مشق وتمرین سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس میں امتیاز وکمال پیدا نہیں ہو سکتا حضرت ابوبکر صدیق میں بھی یہ ملکہ خداداد تھا، اس سلسلہ میں عہدِ جاہلیت کا تو کوئی ایسا واقعہ نظر سے نہیں گزرا جس میں انہوں نے اپنی اس قابلیت کا مظاہرہ کیا ہو۔ البتہ زندگی کے اسلامی دور میں انہوں نے جو تقریریں کیں اور خطبے دیئے وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے بلند پایہ اور نہایت ممتاز خطیب تھے۔

ایک تقریر یا خطابت کا سب سے بڑا معیار کامیابی یہ ہے کہ مقرر کی زبان سے جو لفظ نکلے سامعین کے دلوں میں گھر کرتا چلا جائے اور بڑے سے بڑا مخالف بھی اسکو سننے کے بعد محسوس کرے کہ مقرر نے جو کچھ کہا ہے وہ گویا خود اسکے اپنے دل کی بات تھی، چنانچہ قرآن مجید میں آنحضرتؐ کو خطاب کرکے فرمایا گیا۔

وقل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً ٥

اے پیغمبر! آپ ان لوگوں کے دل میں اتر کر ان سے بلیغ کلام میں خطاب کیجئے۔

اسی مضمون کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

---

[1] کنز العمال برحاشیہ مسند امام احمد ج ۲ ص ۱۴۳

ایک تقریر میں یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ حسب ذیل چیزیں پائی جائیں
(۱) مقرر جو کچھ کہے اس کو خود پہلے اس کا کمال یقین اور اذعان ہو اور اس کے متعلق وہ کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ ہو۔
(۲) سامعین کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو کہ انکو کونسی چیز زیادہ اپیل کر سکتی ہے۔
(۳) تقریر فصیح و بلیغ ہو یعنی کلام مقتضائے حال کے مطابق اور الفاظ بھی عام فہم دلنشین اور مؤثر ہوں۔
(۴) آواز میں عزم و اعتماد اور ذمہ داری کا پورا احساس پایا جائے۔

حضرت ابوبکر کی خطابت میں یہ تمام اوصاف تمام و کمال پائے جاتے تھے اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کو سننے کے بعد کوئی شخص ان کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا سامعین کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اب تک ان کی فہم و بصیرت پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ تقریر سنکر وہ سب پردے اٹھ گئے ہیں۔

صحابۂ کرام کیلئے وفاتِ نبوی سے بڑھکر اور کونسا حادثہ ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر فاروق جیسے شیر دل انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہے تھے۔ اس عالم میں بے ربط باتیں عموماً زبان سے نکل جاتی ہیں۔ اور شدتِ غم کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی تقریر کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن صدیق اکبر کی تقریر سنتے ہی بادل چھٹ گئے اور مطلع یک قلم صاف ہو گیا۔ جس کا اعتراف خود حضرت عمر نے کیا ہے۔ سقیفۂ بنو ساعدہ کا معرکہ کس قدر سخت تھا۔ حضرت عمر اس کے لئے پہلے سے تقریر سوچکر اور اسکو دماغ میں جما کر گئے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر نے فی البدیہہ جو تقریر کی وہ اس درجہ مؤثر اور دلنشین تھی کہ حضرت عمر کو محسوس ہوا کہ جو باتیں سوچ کر وہ آئے تھے۔ حضرت ابوبکر نے وہ سب نہایت خوبی اور بلاغت سے ادا کر دی ہیں۔

حضرت ابوبکر کے بعض خطبوں کے ٹکڑے اپنے مواقع پر ہم پہلے نقل کر آئے ہیں ذیل میں چند خطبوں کے اقتباسات اور نقل کرتے ہیں ان سے زورِ کلام فصاحت

و بلاغت۔ اور حکیمانہ اسلوبِ بیان کا اندازہ ہوگا۔ ایک موقع پر آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا۔

اوصیکم بتقوی اللہ وان تثنوا علیه	میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں اللہ تعالی
بما هو اهله وان تخلطوا الرغبة	سے ڈرتے رہنے کی۔ اور اس بات کی کہ تمہیں
بالرهبة وتجمعوا الالحاف بالمسئلة	اسکی شایانِ شان تعریف کرنی چاہئے اور
فان اللہ اثنی علی زکریا وعلی اهل	اس کی طرف رغبت کے ساتھ تمہارے دلوں
بیته فقال "انهم کانوا یسارعون	میں اسکا ڈر بھی موجود ہے۔ اور اس سے سوال
فی الخیرات ویدعوننا رغباً ورهباً	کرنے میں خوب الحاح و زاری کیا کرو۔ اسلئے
وکانوا لنا خاشعین" ثم اعلموا	کہ اللہ تعالی حضرت زکریا اور انکے اہلِ بیت
عباد اللہ ان اللہ قد ارتهن بحقه	کی تعریف میں فرماتا ہے۔ یہ لوگ نیکیوں میں
انفسکم واخذ علی ذالك مواثیقکم	ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے
وعوض بالقلیل الفانی الکثیر الباقی۔	اور ہم سے اپنی حاجت چاہتے تھے گڑگڑا
وهذا کتاب اللہ فیکم لا تفنی عجائبه	کر اور عجز و انکسار سے اور یہ لوگ ہمارے
ولا یطفأ نوره فثقوا بقوله وانتصحوا	حضور میں فروتنی کرنے والے تھے۔
بکتابه فانه خلقکم بعبادته ووکل	بندگانِ خدا۔ تمہیں یہ بھی جاننا چاہئے کہ
بکم الکرام الکاتبین یعلمون ما	اللہ تعالی نے اپنے حق کے عوض تمہاری
تفعلون ثم اعلموا عباد اللہ انکم	جانیں گروی رکھی ہیں۔ اور اس معاملہ کا تم
تغدون وتروحون فی اجل قد	سے پختہ عہد لیا ہے اور کم تر فانی چیز کا عوض کثیر
غیب عنکم علمه۔ فان استطعتم	باقی سے دیا ہے۔ اور یہ کتاب اللہ تمہارے درمیان
ان تنقضی الآجال وانتم فی عمل اللہ	جس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں اور جسکی روشنی ماند
ولن تستطیعوا ذالك الا باللہ۔	نہیں پڑے گی۔ پس اللہ کے فرمان پر ایمان رکھو
فاتقوا فی مهل باعمالکم فان اقواماً	اور اسکی کتاب سے فائدہ اٹھاتے رہو۔ اس نے تم
جعلوا آجالهم لغیرهم فانهاکم	بندگی کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور تم پر کاتبین فرشتوں
ان تکونوا امثالهم فالوحا	کو مقرر کر دیا ہے۔ جو تمہارے افعال کو جانتے ہیں

الوحا ثم النجا النجاءَ فان وراءكم طالبا حثيثا امره سريعا ميره ۱

خدا کے بندو تم یقین مانو کہ تمہاری صبح و شام اس مقررہ وقت میں ہوتی رہتی ہے کہ جس کی حد تمہیں معلوم نہیں پس اگر تم سے یہ ہو سکے کہ اللہ کی اطاعت میں رہتے ہوئے تمہارا وقت پورا ہو جائے (اور ایسا ہونا توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں) تو زندگی کی فرصت میں سے عمل میں پیش قدمی کرو اسلئے کہ بہت سی قومیں فرصت کے لمحات دوسروں کی نذر کر چکی ہیں تمہیں انکی مانند نہ ہونا چاہئے۔ پس تمہاری رفتار تیز ہونی چاہئے۔ بہت ہی تیز اسلئے کہ تمہارا پیچھا کرنے والا بڑا ہی تیز رفتار ہے۔

ایک مرتبہ خطبہ دیا تو حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔

انی اوصیکم بتقوی اللہ العظیم فی کل امر و علی کل حال ولزوم الحق فیما احببتم وکرهتم فانه لیس فیما دون الصدق من الحدیث خیر من یکذب یفجر ومن یفجر یهلك - وایاکم والفخر وما فخر من خلق من تراب والی التراب یعود، هو الیوم حی وغداً میت فاعملوا وعدوا انفسکم فی الموتی وما اشکل علیکم فردوا علمه الی اللہ وقدموا لانفسکم خیراً تجدوه محضراً - فانه قال عز وجل

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ بزرگ و برتر کا ڈر ہر کام میں اور ہر حال میں تمہارے پیش نظر رہے۔ اور اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے بارہ میں حق کا التزام رہے۔ سچائی سے بڑھکر خیر نہیں۔ دروغ گو حق سے انحراف کرتا ہے۔ اور حق سے انحراف کرنیوالا (انجام کار) ہلاک ہو جاتا ہے۔ خبردار! اپنی بڑائی نہ کرنا، خاکی مخلوق جو پھر خاک میں ملجائیگا اسے بڑائی کب زیب دیتی ہے؟ جو آج زندہ ہے اور کل مردہ۔ عمل جاری رکھو اور اپنا شمار مرجانے والوں میں کرتے رہو جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے اسے اللہ کے حوالے کردو

۱ العقد الفرید ج ۴ ص ۱۴۶

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِن سُوٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ اَمَدًا بَعِيدًا ۱

اپنے فائدے کیلئے اچھے اعمال پہلے سے کر رکھو کل یہی ذخیرہ تمہارے پاس ہوگا، خدائے برتر فرماتا ہے "جس دن ہر شخص اپنے اچھے اعمال کو سامنے پائے گا اور اپنے برے اعمال کا سامنا کرتے وقت یہی چاہیگا کہ کاش اسکی بدی اس سے کوسوں دور ہوتی۔

حضرت ابوبکر چونکہ فطرۃً خطیب تھے اس لئے آپ کی معمولی گفتگو بھی فصاحت و بلاغت کی جان ہوتی اور خطبہ سے کم نہیں ہوتی تھی عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ میں ایکدن حضرت ابوبکرؓ کے مرض وفات میں عیادت کیلئے حاضر ہوا اور کہا اے خلیفۂ رسول اللہ ﷺ اب تو آپ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ تو فرمایا۔

انی علی ذالك لشدید الوجع ولما لقیت منکم یا معشر المهاجرین اشد علی وجعی انی ولیت خیرکم فی نفسی فکلکم ورم انفه ان یکون له الامر من دونه واللہ لتتخذن نضائد الدیباج وستور الحریر ولتألمن النوم علی الصوف الاذربی کما یألم احدکم علی حسك السعدان والذی نفسی بیده لان یقدم احدکم فتضرب عنقه فی غیر حد خیر له من ان یخوض غمرات الدنیا یا هادی الطریق جرت انما هو واللہ الفجر او البحر ۲

سنو! میں اسکے باوجود شدید درد میں مبتلا ہوں اور جو کچھ اے گروہ مہاجرین میں نے تمہارا برتاؤ دیکھا ہے وہ میرے درد سے زیادہ میرے لئے وجہ تکلیف ہے میں نے اپنے نزدیک جو تم میں سب سے زیادہ بہتر تھے (حضرت عمرؓ) انکو تمہارا ولی بنایا لیکن تم میں سے ہر ایک کی ناک پھول گئی۔ کہ خلافت اسکے علاوہ کسی اور کو کیوں ملے۔ بخدا تم لوگ دیبا کے گدے اور ریشمین پردے پسند کروگے اور آذربائی جانی اون سے تمکو تکلیف ہوگی جیسے کسی کو چراگاہ سعدان کے کانٹوں سے ہوتی ہے جسکے قبضہ میں میری جان ہے اسکی قسم! تم میں سے کسی شخص کی گردن بغیر کسی جرم کے اڑا دیجائے۔ یہ اسکے لئے اس سے بہتر ہے کہ وہ دنیا کی گہرائیوں میں گھسے۔ اے رہنما!

۱ العقد الفرید ج ۴ ص ۱۴۶ ۲ الکامل للمبرد ج ۱ ص ۵ -

تو نے حد سے تجاوز کیا ہے بس اب صورتیں صرف دو ہی ہیں یا تو صبح کے وقت روشنی میں چلو یا اندھیرے میں چل کر مصیبت میں پڑو۔

تحریر و کتابت جو رنگ تقریر و خطابت کا تھا وہی تحریر و کتابت کا تھا۔ حضرت خالد عراق کی مہم سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکر کی اجازت کے بغیر چپ چپاتے حج کر آئے تھے حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو حضرت خالد کے نام ایک عتاب نامہ لکھا۔

سر حتی تاتی جموع المسلمین بالیرموک فانهم قد شجوا واشجوا۔ وایاك ان تعود لمثل ما فعلت فانه لم یشج الجموع من الناس بعون الله شجاك ولم ینزع الشجی من الناس نزعك فلیهنك ابا سلیمان النیة والحظوة فاتمم یتمم الله لك ولا یدخلنك عجب فتخسر وتخذل وایاك ان تدل بعمل فان الله عز وجل له المن وهو ولی الجزاء۔

تم چل پڑو یہاں تک کہ یرموک میں مسلمانوں کے لشکروں سے مل جاؤ۔ کیونکہ وہ پریشان ہیں، غمزدہ ہیں اور مشکلات میں پھنس گئے ہیں اور خبردار پھر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا (یرموک جانے کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے) کہ دشمن کی فوجوں کو تم زیادہ زک پہونچا سکتے ہو۔ (اگر اللہ کی مدد شامل رہی) اور لوگوں کی مشکلات کا ازالہ تم سے بہتر کسی اور سے ممکن نہیں پس اے ابوسلیمان تمہاری نیت اور منزلت باعث برکت ہو۔ تم پوری خدمت انجام دو۔ اللہ تمہیں پوری جزا دیگا۔ تمہارے عمل میں پندار نہ پیدا ہو ورنہ گھاٹے میں رہوگے اور تائید الٰہی سے محروم ہو جاؤ گے۔ اور اپنے کسی کارنامہ پر خبردار نہ اترانا اسلئے کہ احسان جتانا صرف اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے اور وہی بدلہ دینے والا ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین نامزد کیا تو پروانۂ نیابت کی عبارت یہ تھی۔

هذا ما عهد به ابوبکر خلیفة محمد رسول الله ﷺ عند آخر عهده بالدنیا

یہ وہ پروانہ ہے جو ابوبکر محمد رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ اس وقت لکھ رہا ہے جب کہ دنیا کیسا تھ

واول عهده بالآخرة فی الحال التی یومن فیها الکافر ویتقی فیها الفاجر انی استعملت علیکم عمر بن الخطاب فان بر وعدل فذالك علمی به ورائی فیه۔ وان جار وبدل فلا علم لی بالغیب والخیر اردت۔ ولکل امرئ ما اکتسب وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۰

اس کے تعلق کی آخری گھڑی اور آخرت کے ساتھ اسکی تعلق کی پہلی گھڑی شروع ہو رہی ہے اور یہ تحریر ایسے عالم میں لکھائی جا رہی ہے جب کہ کافر بھی مومن ہو جاتا ہے اور گنہگار فاجر بھی ڈرنے لگتا ہے۔ میں نے عمر کو تم پر حاکم بنایا ہے اگر انہوں نے نیکی کی راہ اختیار کی اور عدل کیا تو یہ وہی بات ہوگی جو میں انکے متعلق جانتا ہوں اور جو میری رائے انکے بارہ میں ہے لیکن اگر انہوں نے ظلم کیا اور وہ بدل گئے تو مجھ کو غیب کا علم نہیں ہے اور میں نے تو خیر خواہی کا ارادہ کیا ہے۔ بہر حال ہر انسان جیسا کریگا ویسا پائیگا۔ اور جو لوگ کہ ظالم ہیں انکو جلد پتہ چل جائیگا کہ وہ کیسی پلٹی کھاتے ہیں۔

اہل ارتداد و بغاوت کے نام جنگ شروع کرنے سے قبل جو ایک طویل تحریر بھیجی تھی جس کی حیثیت چیلنج کی تھی اس میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

وانی اوصیکم بتقوی الله وحظکم ونصیبکم من الله وما جاء به نبیکم وان تهتدوا بهدیه وان تعتصموا بدین الله عز وجل فانه من لم یهد الله ضل۔ وکل من لم یعافه مبتلی وکل من لم ینصره مخذول فمن هداه الله کان مهدیا ومن اضله الله کان ضالا ولم یقبل منه فی الدنیا عمل حتی یقربه فلم یقبل له فی الآخرة صرف ولا عدل فمن امن فهو خیر له ومن ترکه فلن یعجز الله۔

میں تم لوگوں کو سمجھاتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ کی طرف سے جو تمہارا حصہ مقرر ہوا ہے اور تمہارے نبی تمہارے پاس جو چیز لائے ہیں اسکو قبول کرو اور نبی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو اور اللہ کے دین کی رسی کو مضبوط پکڑو۔ کیونکہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہیں دیتا وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور ہر وہ آدمی جسکو اللہ تندرست نہیں رکھتا وہ بیمار ہو جاتا ہے اور جس کی مدد اللہ نہیں کرتا وہ رسوا ہو جاتا ہے جس کو اللہ ہدایت دیتا ہے۔ وہ ہدایت

یافتہ ہوتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کر دیتا ہے وہ
گمراہ ہو جاتا ہے اور (پھر) دنیا میں اس کا کوئی عمل
مقبول نہیں ہوتا جو اسکو خدا سے قریب کر دے
اور آخرت میں اسکی طرف سے کوئی فدیہ یا بدلہ نہیں لیا
جاتا پس جو شخص ایمان لائیگا وہ اس کیلئے بہتر
ہوگا اور جو اسکو چھوڑ دیگا تو اسکو معلوم رہنا چاہئے کہ
وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔

فن کتابت | اسلام سے پہلے عرب میں چند ہی لوگ تھے جو لکھنا جانتے تھے اور اس وجہ سے وہ سب میں ممتاز تھے، انہیں چند لوگوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق بھی تھے چنانچہ آپ کا شمار خود کاتبین وحی کے زمرہ میں بھی ہے [1]

علم القرآن | ابتک جن کمالات کا ذکر ہوا وہ تھے جن کی استعداد حضرت ابوبکر میں فطری اور طبعی طور پر تھی، اب ہم ان علوم و کمالات کا ذکر کرتے ہیں جو آپ میں اسلام کے بعد پیدا ہوئے حضرت ابوبکر چونکہ آنحضرت صلعم کی صحبت و معیت میں آغازِ بعثت سے لیکر آخری لمحہ حیات تک جلوت میں اور خلوت میں، سفر میں حضر میں، رزم اور بزم میں، ہر جگہ اور ہر موقع پر برابر ساتھ رہے تھے، اس بنا پر آپ کا سینہ درحقیقت علوم و کمالاتِ نبویہ کا گنجینہ بن گیا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صلح حدیبیہ کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"ازیں جا دانستہ شد کہ حضرت صدیق را با پیغامبر چہ نسبت بود و علوم پیغامبر در نفس وے رضی اللہ عنہ چگونہ منطبع می شد" [2]

اسی خصوصیت کے باعث صحابہ عام طور پر کہا کرتے تھے کہ ھو (ابوبکر الصدیق) اعلمنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [3] ظاہر ہے کہ ان علوم و کمالات میں سب سے اول نمبر علوم قرآنی کا ہے۔ حضرت ابوبکر ایک آیت کو سننے کے بعد اس کی اصل روح اور اسپرٹ کو معلوم کر لیتے تھے اور اس سلسلہ میں ان کا ذہن ان نکات و رموز تک پہنچ جاتا تھا

[1] استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ حضرت ابوبکر [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۱ [3] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۰

جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی تھی حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلعم کو مکہ کے لوگوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو حضرت ابوبکر صدیق نے کہا اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ان لوگوں نے اپنے نبی کو ترک وطن پر مجبور کیا ہے۔ یہ ضرور ہلاک ہوں گے، اس پر یہ آیت اتری۔

اُذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وانّ اللہ علی نصرھم لقدیر۔ — جو لوگ قتال کرنا چاہتے ہیں اسلئے کہ وہ مظلوم ہیں انکو اسکی اجازت دی جاتی ہے۔ اور اللہ انکی مدد کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

حضرت ابوبکر اس کو سننے کے بعد ہی سمجھ گئے کہ جہاد کا حکم نازل ہوگا [1] وفاتِ نبوی کے وقت ایک کہرام برپا تھا۔ بعض کی سمجھ میں تو آ ہی نہیں رہا تھا کہ پیغمبر کی بھی وفات ہو سکتی ہے۔ لیکن جونہی حضرت ابوبکر نے قرآن کی آیت انک میت وانھم میتون پڑھی سب کی آنکھیں کھل گئیں اور حضرت عمر تک کو یہ محسوس ہوا کہ گویا انہوں نے یہ آیت اس سے پہلے سنی ہی نہیں تھی [2]

ہر وقت کی معیت کی وجہ سے حضرت ابوبکر کو یہ موقع تھا کہ جس آیت کے متعلق ان کو کچھ پوچھنا ہوتا تھا بے تکلف پوچھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ دریافت کیا کہ یارسول اللہ اس آیت کے بعد اب کیا چارہ ہے۔ کیا ہم کو ہر برے کام کا بدلہ دیا جائے گا؟

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجزبہ۔ — (نجات) نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر جو شخص برا کام کریگا اسکو اسکا بدلہ ملیگا

آنحضرت صلعم نے فرمایا "اے ابوبکر! خدا تمہاری مغفرت کرے۔ کیا تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تم کو کوئی رنج اور صدمہ نہیں ہوتا؟ کیا تم کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی؟ یہ سب انہیں اعمال بد کا نتیجہ اور بدلہ ہے [3]

ایک مرتبہ کسی نے قسم کھا کر اس کو توڑ دینا بند لی اور غیر مستقل مزاجی کی دلیل ہے اسو جہ سے

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۰ [2] حضرت عبداللہ بن عمر کے الفاظ یہ ہیں فوالذی نفسی بیدہ فکانما کانت علی وجوھنا اغطیۃ فکشفت یہ روایت طبری کے حوالہ سے پہلے گذر چکی ہے [3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۱

حضرت ابوبکرؓ بھی قسم کھاکر توڑتے نہیں تھے۔ لیکن جب قرآن میں کفارۂ یمین کی آیت نازل ہوگئی تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس سے بہتر کوئی دوسری چیز ہو تو قسم توڑ دی جائے۔ محض بات کی پیچ کی وجہ سے اپنی قسم پر قائم رہنا کوئی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

ان ابابکر لم یکن یحنث فی یمین قط حتی انزل اللہ کفارۃ الیمین فرأیت غیرھا خیراً منھا الا اتیت الذی ھو خیر و کفرت عن یمینی [1]

ابوبکرؓ ایک قسم کھا اس کو توڑتے نہیں تھے لیکن جب کفارۂ قسم کا حکم نازل ہوا تو کہا کہ اب میں قسم کھانے کے بعد اس سے بہتر کوئی چیز پاؤنگا تو میں اس کو اختیار کرلوں گا اور قسم کا کفارہ ادا کردونگا۔

حضرت ابوبکرؓ کے اس ارشاد سے فقہا نے استدلال کیا ہے کہ صورتِ مذکورہ میں حنث بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں اگرچہ کفارہ ادا کرنا بہرحال ضروری ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ جس کا ذکر کرنا بے محل نہیں ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے گھر چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ رات ہوئی تو میرے والد ابوبکر صدیقؓ نے مجھ سے کہا کہ میں اس وقت رسول اللہؐ کی خدمت میں جا رہا ہوں واپسی میں دیر ہوجائے گی۔ تم مہمانوں کو کھانا کھلا دینا۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں نے اس حکم کی تعمیل میں مہمانوں سے درخواست کی کہ کھانا کھالیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک صاحبِ خانہ نہیں آئیں گے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس میں رات زیادہ ہوگئی، اب حضرت ابوبکرؓ گھر آئے۔ اور معلوم ہوا کہ مہمانوں نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے تو سخت برہم ہوئے اور اسی برہمی میں قسم کھالی کہ اب اس رات کھانا ہی نہیں کھائیں گے۔ یہ دیکھ کر مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ جب تک آپ کھانا نہیں کھائیں گے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ فوراً کھانا طلب کیا اور قسم توڑ کر پہلے خود دوچار لقمے تناول فرمائے اور پھر مہمانوں کو شریک کیا [2]

قرآن فہمی میں حضرت ابوبکرؓ کو جو مقامِ رفیع حاصل تھا اسکی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ اگر

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۸۰

قرآن کے کسی ایک لفظ کی مراد متعین کر دیتے تھے تو اکابر صحابہ تک کو اسکی مخالفت کی جرأت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کلالہ کے لفظ کی مراد اور اسکے صحیح مفہوم و معنی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے جب اسکے ایک معنی متعین کر دیئے اور اسکے بعد حضرت عمر فاروقؓ سے ان کے عہدِ خلافت میں اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو فرمایا۔

انی لاستحیی اللہ ان ارد شیئاً قالہ ابوبکر [1]

مجھ کو اللہ سے اس بات میں شرم آتی ہے کہ جو ابوبکرؓ نے کہا ہے میں اسکو رد کروں

صحیح بخاری کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں کلالہ کی تفسیر کے بارہ میں کسی نے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت نہیں کی۔

حدیث | علومِ نبوت میں قرآن کے بعد حدیث کا مرتبہ ہے۔ ظاہر ہے نبوت کی صبح و شام کے تمام جلوے حضرت ابوبکرؓ کی نگاہ میں بسے ہوئے تھے اس بنا پر آنحضرتؐ کے اعمال و اقوال کا جو خزانہ ان کے سینہ میں محفوظ ہوگا کوئی دوسرا مشکل سے ہی اس میں ان کا حریف ہوسکتا تھا۔ لیکن اس باب میں وہ حد درجہ محتاط تھے۔ علامہ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ "تم لوگ رسول اللہؐ سے احادیث روایت کرتے ہو اور پھر ان میں اختلاف کرتے ہو۔ جب تمہارا یہ حال ہے تو تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ تم سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس لئے تم رسول اللہؐ سے کوئی چیز نقل مت کرو مگر ہاں جب تم سے لوگ کچھ دریافت کریں اس وقت بیشک تم کچھ ضرور کہو اور دیکھو تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے، پس جو چیز کتاب اللہ میں حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور جو چیز اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھو [2]

غور کرو خلیفۂ رسول نے اس ارشاد میں کس بلاغت کے ساتھ حدیث کا مرتبہ اور اسکے نقد کا معیار بیان کر دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ آنحضرتؐ نے کسی وقت کسی ضرورت سے کوئی حکم دیا ہے اور کسی وقت کسی ضرورت سے کوئی اور پھر سننے والے اعرابی اور غیر اعرابی ذہین اور غیر ذہین، قریب التعلق اور بعید التعلق ہر قسم کے لوگ تھے کسی نے کوئی بات پوری

[1] سنن الدارمی ج ۲ ص ۳۶۶ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲

سنی اور کسی نے ادھوری، کسی نے کسی جملہ کا مطلب لیا اور کسی نے کچھ اور، پھر آنحضرت صلعم کے الفاظ عین وہی کس کو یاد رہے ہوں گے اس لئے جو روایت ہوگی وہ عموماً روایت بالمعنی ہوگی اور اس میں ایک دو لفظوں کا اِدھر اُدھر ہو جانا مستبعد نہیں ہے لیکن ان دو ایک لفظوں کے الٹ پھیر سے معنی کچھ سے کچھ ہو سکتے ہیں ان وجوہ کی بنا پر حضرت ابوبکر یہ سمجھتے تھے اور بالکل صحیح سمجھتے تھے کہ اگر روایات کی کثرت شروع ہو گئی اور جس کسی نے آنحضرت صلعم سے تھوڑا بہت جو کچھ بھی سنا ہے اس کو وہ بغیر حزم و احتیاط کے نقل کرنے لگا تو اس سے طرح طرح کے اختلاف پیدا ہونگے۔ اور ان کا اثر اصل دین اور شریعت کے استحکام پر پڑے گا، اس صورتِ حال کا انسداد کرنے کی غرض سے ہی آپ نے ایک طرف تو اس کی تاکید کی کہ وقت ضرورت ہی روایت کریں اور دوسری جانب اسکی تصریح فرمادی کہ کسی حدیث کے صحت و سقم کو پرکھنے کی اصل کسوٹی قرآن مجید ہے۔ جو روایت قرآن کی نص صریح کے خلاف ہوگی مقبول نہیں ہوگی۔

حافظ ذہبی نے حضرت عائشہ کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے پانچسو احادیث جمع کی تھیں۔ لیکن ایک شب دیکھا کہ وہ بہت مضطرب اور بے چین تھے۔ آخر صبح ہوتے ہوتے اس ذخیرہ کو نذرِ آتش کر دیا۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "مجھ کو اس کا اندیشہ تھا کہ میں مر جاؤں اور اس ذخیرہ کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں کہ اس میں کچھ احادیث ایسی بھی ہوں جن کو میں نے ایک ایسے شخص سے لیا ہو جس کو میں ایماندار اور معتبر سمجھتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ روایت ایسی نہیں تھی جیسی کہ اس نے مجھ سے بیان کی تھی، تو اب ایسی صورت میں اس روایت کو بیان کرنے کی ذمہ داری درحقیقت میرے سر ہوگی [1]

اگرچہ حافظ صاحب نے اس روایت کو غیر صحیح کہا ہے لیکن حضرت ابوبکر کا جو مزاج اور نقطۂ نظر تھا اس کے پیش نظر اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو درایت

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳

کے خلاف ہو خود آنحضرت صلعم نے قرآن جو کہ اصل و اساس شریعت ہے اس کو معرض سفسطہ و اوہام بننے اور التباس مع الغیر سے بچانے کے لئے ایک مرتبہ حکم دیا تھا کہ "لا تکتبوا عنی غیر القرآن" قرآن کے علاوہ تم مجھ سے کوئی روایت مت لکھو، حق یہ ہے کہ حدیث کی روایت کے بارے میں حضرت ابوبکر کی یہ غایت حزم و احتیاط اسی ارشادِ نبوی کی اصل روح اور اسپرٹ کی آئینہ دار تھی اور بس ورنہ ان کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ روایت حدیث کا باب ہی سرے سے بند کر دیا جائے بلکہ مقصد یہ تھا کہ جس طرح بے ضرورت روایتِ حدیث سے اجتناب کرنا چاہئے اسی طرح عند الضرورت خاموش بھی نہیں رہنا چاہئے۔

چنانچہ خود حضرت ابوبکر کا اپنا عمل بھی یہی تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ ان سے جو مرفوع احادیث مروی ہیں وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں [1] کیونکہ بلا ضرورت وہ روایت بیان ہی نہیں کرتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ ضرورت پڑتی تھی تو پھر خاموش بھی نہیں رہتے تھے اور فوراً حدیث بیان کرتے تھے تم پڑھ آئے ہو کہ سقیفۂ بنو ساعدہ میں جب انصار و مہاجرین کے درمیان ہنگامہ برپا ہوا تو آپنے حدیث "الائمۃ من قریش" سنا کر اسپر قابو پایا، وفاتِ نبوی کے وقت اسپر گفتگو ہوئی کہ جسدِ اطہر کو دفن کہاں کیا جائے تو آپنے ہی ارشادِ نبوی سنا کر اسکا قطعی فیصلہ کیا۔ حضرت فاطمہ اور حضرت علی و عباس کیجانب سے فدک و خیبر کا مطالبہ ہوا تو آپنے حدیث نبوی پر ہی اپنے جواب کی بنیاد رکھی، عمال و محصلین صدقات کے نام نصاب و مقدار زکوٰۃ کے متعلق مفصل ہدایات روانہ کیں تو انکی اساس احادیث نبویہ پر ہی تھی۔

[1] شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں حضرت ابوبکر کی قلتِ روایت کے وجوہ یہ لکھے ہیں کہ (۱) رسول اللہ صلعم کے بعد بہت کم زندہ رہے (۲) وہ مختصر مدت بھی مہمات امور کے انصرام و انجام میں گذر گئی (۳) انکے ہمعصر سب صحابہ تھے اور وہ خود حاملین روایات تھے اس لئے صدیق اکبر کو استغنا تھا ہم کو اس سے انکار نہیں کہ حضرت ابوبکر کی قلت روایت میں ان ہر سہ امور کا دخل ہے لیکن اس کا اصل سبب وہی ہے جو ہمنے بیان کیا اور درحقیقت یہ چیز حضرت ابوبکر کی غایت ژرف نگاہی اور دقیقہ شناسی شریعت کی دلیل ہے بعد میں مسلمانوں میں جو فتنے کھڑے ہوئے طرح طرح کے فرقے پیدا ہوئے اور انمیں تحزب و تشتت عام ہوا غور کرو تو اسکی تہ میں یہی کثرت و بے احتیاطی روایت نظر آئیگی

خبر واحد کے متعلق اصول اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہی کہ انہوں نے خبر واحد کے متعلق ایک یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ ایسی روایت اسوقت تک قابلِ قبول نہیں ہو گی جبتک کہ اُس روای کیلئے کوئی دوسرا شخص گواہ ہو یعنی اس روایت کی تائید کسی اور طریق سے نہ ہوتی ہو۔ چنانچہ تم پڑھ آئے ہو کہ میراثِ جدہ کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سننے کے بعد ان سے گواہ طلب کیا اور جب انہوں نے محمد بن مسلمہ کو بطورِ گواہ پیش کر دیا تو وہ روایت قبول کی اسی طرح جمع قرآن کے سلسلہ میں کوئی آیت اگر کسی ایک صحابی کے پاس ملتی تھی تو آپ بغیر شہادت کے اسے قبول نہیں کرتے تھے اسکے علاوہ ابھی گزر چکا ہے کہ خبر واحد سے قرآن پر زیادتی یا اس میں کمی کرنے کو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے [1]

حضرت ابوبکرؓ کی روایات کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ایک سو بیالیس ۱۴۲ روایتیں یکجا جمع کی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہیں۔ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی روایات حضرت ابوبکرؓ کی روایت کردہ ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں صحابہ میں حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابن عمرؓ، ابن عمروؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، حذیفہؓ، معقل بن یسارؓ، عقبہ بن عامرؓ، انسؓ، ابوہریرہؓ، ابوامامہؓ، ابو برزہؓ، ابوموسیٰؓ اور آپ کی دونوں صاحبزادیاں حضرت عائشہؓ اور اسماءؓ اور کبارِ تابعین میں الصنابحی، مرۃ بن شراحیل، واسط البجلی، قیس ابن ابی حازم اور سوید بن غفلہ کے اسمائے گرامی لکھے ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حدیث کی روایت کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اصل رُواۃ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے یہ صرف کبار صحابہ و تابعین کے نام ہیں۔

[1] استنباطِ احکام کے اصولِ اربعہ کی طرح خبر واحد کے قبول سے متعلق اس قاعدہ کی تاسیس و ایجاد بھی مولانا شبلی نے الفاروق میں حضرت عمر فاروقؓ کی ہی طرف منسوب کی ہے، حالانکہ حدیث اور فقہ کے باب میں قواعد و ضوابط کی تعیین کا جہاں تک تعلق ہے وہ سب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے لئے ہیں اور اس معاملہ میں وہ انہیں کے نقشِ قدم پر چلے ہیں، ہاں البتہ حضرت عمرؓ نے انکی توسیع اسطرح ضرور کی ہے کہ بعد میں یہی چیزیں فنلکی بنیاد بن گئیں۔

فقہ استنباط احکام فقہیہ کے اصول چار ہی ہیں۔ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس ان چاروں اصولوں کی تشخیص و تعیین سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے کی اور آج تک مسلمانوں کا اسی پر عمل ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اصولِ اربعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وکانت هذه الاصول مستخرجة عن صنيع الاوائل وتصريحاتهم [1]	اور یہ اصول اوائل صحابہ کے عمل اور ان کی تصریحات سے مستنبط ہیں۔

یہ اوائل کا عمل اور ان کی تصریحات کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے تعامل کے متعلق میمون بن مہران کی وہ روایت نقل کی ہے جو ہم اجتہاد و قیاس کے باب میں سنن الدارمی کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں حضرت عمر فاروقؓ نے اس بارہ میں جو کچھ کیا اور ولاۃ و قضاۃ کو جو ہدایات بھیجیں وہ سب درحقیقت اسی متن کی شرح تھیں جو حضرت ابوبکرؓ نے تیار کیا تھا۔ وکفیٰ بہ فخراً۔

فقیہ کے لئے سب سے ضروری وصف تفقہ ہے جو محض ایک وصفِ خدا داد ہے۔ حضرت ابوبکرؓ میں یہ وصف کس درجۂ کمال کا تھا کتاب میں جگہ جگہ عموماً اور اجتہاد و قیاس کے زیرِ عنوان خصوصاً اس کی مثالیں گزر چکی ہیں یہاں انکے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تعبیر رویا علومِ نبوت میں ایک علم تعبیر رویا بھی ہے۔ خود رویائے صالحہ کو صحیح حدیث میں نبوت کا چالیسواں حصہ اور بعض میں سترواں جز کہا گیا ہے تعبیر رویا میں یوسفؑ کو جو کمال حاصل تھا اسکا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ چونکہ اس فن کا تعلق عالم مادیات کے بجائے عالم روحانیت سے زیادہ ہے۔ اس لئے جس شخص میں روحانی لطافت و نظافت زیادہ ہو گی اسی قدر اس کو اس فن میں دستگاہ ہو گی۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس میں بھی کمال حاصل تھا فنِ تعبیر کے امام ابن سیرینؒ کا قول ہے

كان ابوبكرٍ اعبر هذه الامة بعد النبي صلى الله عليه وسلم۔	ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے بعد تعبیر رویا کے فن کے سب سے بڑے عالم تھے۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۱۹ باب الفرق بین اہل الحدیث واصحاب الرائ۔

آنحضرتؐ جب کبھی کوئی اہم خواب دیکھتے تھے تو حضرت ابوبکرؓ سے اسکا تذکرہ کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ اس خواب کی جو تعبیر بیان کرتے تھے آپ اسکی توثیق و تصدیق فرماتے تھے چنانچہ غزوۂ طائف کے موقع پر جبکہ صحابۂ کرام شہر کا محاصرہ کئے پڑے تھے آپ نے ایک خواب دیکھا کہ آپکو ایک پیالہ بھرا ہوا ہدیہ کیا گیا ہے لیکن ایک مرغ نے اسمیں ٹھونگ ماردی اور اسکی وجہ سے پیالہ میں جو کچھ تھا گر پڑا۔ حضرت ابوبکرؓ نے سنتے ہی عرض کیا "یارسول اللہ! میں نہیں سمجھتا کہ اس موقع پر آپ کو کامیابی ہوگی" ارشاد ہوا "ہاں میرا خیال بھی یہی ہے" [1]

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے حجرہ میں تین چاند گر پڑے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ سے اس کا ذکر آیا اور پھر جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں آپؐ دفن ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا بیٹی! ایک چاند تو رسول اللہؐ ہی ہیں جو تمہارے حجرہ میں مصروف استراحت ہیں[1] شاہ ولی اللہؒ نے اور بھی اسی طرح کے متعدد واقعات لکھے ہیں جن حضرات کو اسکا ذوق ہو وہ مراجعت کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا یہ فقرہ بہت اہم ہے لکھتے ہیں۔

"تعبیر وے (صدیق اکبرؓ) خوابہائے مردم را واصابت عجیبہ در آن تا آنکہ آنحضرتؐ خوابہائے خود را بر صدیق اکبرؓ عرض می فرمود و درخواست تعبیر می نمود"[2]

تصوف دین کے دو پہلو ہیں ایک صوری دوسرا معنوی۔ صوری پہلو کا نام شریعت ہے جس کا تعلق احکام ظاہری کے اتباع و امتثال سے ہے اور معنوی پہلو کا نام طریقت یا تصوف ہے جس کا تعلق قلبی سوز و گداز روحانی لطافت و طہارت سے ہے اور جسکا مقصد یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعہ ایک انسان اپنے جذبات اور امیال و عواطف کو مرضیاتِ خداوندی کے اسطرح تابع کردے کہ احکام الٰہی خود اسکا جذبہ اور داعیۂ نفس بن جائیں اور وہ سراپا عبدیت و بندگی ہوجائے۔ شریعت اور طریقت دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ہے اور ایک وجود دوسرے کے بغیر جہاں تک کہ دین کی اصل روح کا تعلق ہے بے معنی ہے اگر صرف ظاہری اور رسمی طریقہ پر نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج ہو لیکن دل حبِّ الٰہی اور عشقِ ربانی کی نعمت سے محروم ہو تو وہ اُس پھول کی مانند ہے جو خوش رنگ اور موزوں ہونے کے باوجود بغیر خوشبو کے ہو۔ اور اگر محض حبِ الٰہی ہو تو اسکی مثال اس نغمہ کی ہے جو بے آہنگ اور بے سرہو۔ اس بنا پر دینی نقطۂ نظر

[1] طبری ج ۲ ص ۳۵۵ [2] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۰ بحوالہ موطا امام مالک دوسرے اور تیسرے چاند حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔ جو اسی حجرہ میں آنحضرتؐ کے پہلو میں مدفون ہیں [3] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۰

سے جب کبھی اسلام کی کسی بڑی شخصیت کا جائزہ لینا ہو تو لازمی طور پر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ تصوف اور طریقت کے اعتبار سے اس کا کیا مقام اور مرتبہ تھا ورنہ اس کی اصل شخصیت کا مرقع مکمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تصوفِ صدیقی پر ایک طویل بحث کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ کمالِ طریقت کیلئے جن اوصاف و ملکات نفسانی کی ضرورت ہے مثلاً توکل، احتیاط، کفِ لسان، تواضع، شفقت بر خلقِ خدا، رضا، نفیِ ارادہ، زہد، خشیت، عجز و انکسار، رقتِ قلب، تحمل، فقر و درویشی یہ سب حضرت ابوبکرؓ میں بتمام و کمال پائے جاتے تھے اور اس بنا پر آپ طائفۂ اصفیاء و اہلِ طریقت کے سرخیل و امام تھے۔ علامہ ہجویری کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ تصوف کی جڑ اور بنیاد صفا ہے۔ اس صفت کی ایک اصل ہے اور ایک فرع، اصل انقطاع عن الاغیار ہے اور فرع دینا سے دل کا خالی ہونا ہے اور چونکہ صفا صدیقیت کی صفتِ لازمہ ہے۔ اس بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ "امام اہل این طریقہ" ہیں" [1]

حضرت ابوالعباس بن عطاء جو اکابر و مشائخ صوفیہ میں سے ہیں اُن سے کسی نے پوچھا کہ "کونوا ربانیین" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "اس سے مراد یہ ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کی طرح ہو جاؤ۔ کیونکہ ربانی درحقیقت وہی شخص ہے کہ دونوں جہان زیر و زبر ہوجائیں لیکن اسمیں کوئی تشویش اور اضطراب پیدا نہ ہو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان یہی تھی چنانچہ آنحضرتؐ کی وفات کے وقت تمام صحابہ ہی مضطرب اور پریشان تھے لیکن صدیق اکبرؓ میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا انہوں نے نہایت جرأت اور دلیری سے فرمایا "لوگو تم میں جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا اسکو معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ کا انتقال ہوگیا ہے لیکن ہاں البتہ جو شخص اللہ کی پوجا کرتا ہے تو اسے باور کرنا چاہئے کہ اللہ حی ہے اور اسکو کبھی موت نہیں آئیگی"

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا تمام اثاثہ سرورِ عالم کے قدموں پر لاکر ڈالدیا تھا جب آنحضرتؐ نے پوچھا کہ ابوبکر! تم نے اپنے بال بچوں کیلئے کیا چھوڑا ہے؟ تو بولے "اللہ اور اسکے رسول کو چھوڑا ہے" حضرت ابوبکر الواسطی فرماتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ کا یہ فقرہ طریقت و معرفت کی دنیا میں وہ پہلا فقرہ ہے جس سے صوفیائے کرام نے بڑے اہم لطائف و رموزِ تصوف کا استخراج کیا ہے [2]

حضرت بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت ہے کہ ابوبکر صدیقؓ جو تمام صحابۂ کرام سے افضل تھے تو نماز روزہ کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ اس ایک چیز کی وجہ سے تھے جو ان کے قلب میں تھی اور وہ تھی اللہ کی محبت اور اس کیلئے جینا اور مرنا [3] حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ توحید سے متعلق سب سے زیادہ بلند وہ مقولہ ہے جو ابوبکرؓ کی زبان سے ادا ہوا تھا اور وہ یہ ہے۔

[1] بحوالہ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۱ [2] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لیدن ص ۱۲۱
[3] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لندن ص ۱۲۱ [4] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لیدن ص ۱۲۲

سبحان من لم یجعل للخلق طریقا الی معرفتہ الا العجز عن معرفتہ [1] — پاک ہے وہ ذات جس نے مخلوق کیلئے اپنی پہچان کا راستہ اسکے سوا اور کچھ بتایا ہی نہیں کہ لوگ اسکی معرفت سے عاجز ہیں

معرفت و طریقت میں حضرت ابوبکر صدیق کا یہی وہ مرتبہ و مقام اعلیٰ ہے جس کی وجہ سے وہ ارباب تصوف کے امام و پیشوا ہیں اور صوفیا کے اکثر بڑے بڑے سلسلوں مثلاً چشتیہ اور نقش بندیہ وغیرہ کی انتہا خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر اور حضرت علی انہی دو پر ہوتی ہے۔

عشق نبوی | بایں ہمہ اوصاف و کمالات حضرت ابوبکر صدیق کا اصل سرمایۂ فخر و نازش وہ عشق تھا جو آپ کو محبوب رب العلمین کی ذات ستودہ صفات کیساتھ تھا۔ اور جو در حقیقت رگ رگ میں جان کے عوض ہر وقت ساری رہتا تھا۔ یہ عشق ہی درحقیقت وہ سرچشمہ تھا جس سے دوسرے کمالات پیدا ہوئے تھے جب تک رسالت و نبوت کا آفتاب جہاں تاب اس عالم ناسوت میں ضوفگن رہا اس سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ وفات کے بعد حالت یہ ہو گئی تھی کہ زبان پر نام مبارک آیا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ وفات نبوی کے دوسرے برس حضرت ابوبکر ایک مرتبہ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو ابھی اتنا ہی کہا تھا۔

قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الاول — رسول اللہ پہلے سال جب خطبہ دینے کھڑے ہوئے

کہ حضور کی وفات کا سانحہ یاد آ گیا اور بلک بلک کر رونے لگے سنبھل کر پھر خطبہ شروع کیا۔ لیکن پھر ہچکی بندھ گئی۔ آخر تیسری بار ضبط سے کام لے کر خطبہ تمام کیا [2]

حضرت ام ایمن نے آنحضرت ؐ کو گود کھلایا تھا۔ اس رشتہ سے آپ ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر نے بھی یہ وضع قائم رکھی۔ چنانچہ ایک دفعہ وہ اور حضرت عمر وہاں پہونچے تو ام ایمن ان کو دیکھتے ہی رونے لگیں، یہ دونوں بولے، "روتی کیوں ہو؟ اللہ کے رسول کیلئے بہتر یہی تھا کہ اللہ سے تقرب ہو جائے" حضرت ام ایمن نے کہا۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن صدمہ اس بات کا ہے کہ اب وحی کا آنا بند ہو گیا۔ یہ سن کر

---

[1] کتاب اللمع فی التصوف ص ۳۴ ادیکھو اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے کس بلاغت سے ادا کیا ہے شعر۔
تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا — بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے۔ [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں پر یہ اثر ہوا بے ساختہ رونے لگے [1]

طبری اور ابن اثیر میں ایک روایت ہے کہ دراصل حضرت ابوبکر کی وفات کا باعث ہی یہ ہوا کہ آنحضرت ؐ کی جدائی کا غم برداشت نہ ہو سکا۔ وہ سوز درد دل سے اندر ہی اندر پگھلتے رہے اور آخر اپنے محبوب سے جا ملے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ؐ کے کاشانۂ قدس میں داخل ہو رہے تھے کہ حضرت عائشہ کو دیکھا بلند آواز سے بول رہی ہیں۔ چونکہ آنحضرت ؐ کے سامنے رفع صوت خلاف ادب تھا اس لئے غصہ آ گیا اور حضرت عائشہ کو مارنے کیلئے طمانچہ اٹھایا [2]

واقعۂ افک میں حضرت ابوبکر کو اپنی بیٹی کی بے گناہی کا یقین تھا۔ بایں ہمہ جب آنحضرت ؐ حضرت ابوبکر کے مکان پر تشریف لائے۔ اور حضرت عائشہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اگر تم اس تہمت سے بری ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری برأت کا اعلان کر دے گا۔ اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو تم اللہ سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ کیونکہ بندہ جب توبہ کر لیتا ہے تو اس کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ آنحضرت ؐ کی یہ تقریر سننے کے بعد حضرت عائشہ نے اپنے پدر بزرگوار سے درخواست کی کہ میری طرف سے رسول اللہ کو جواب دیجئے لیکن فرط ادب و احترام کے باعث حضرت ابوبکر کی زبان نہ کھلی اور بولے "میں نہیں جانتا کہ کیا کہوں [3]؟ واقعۂ ایلا میں ازواج مطہرات نے نان نفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اور آنحضرت ؐ نے ناراض ہو کر ایلا کر لیا تھا اس سے تمام صحابہ سخت پریشان تھے خاص طور پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جن کی صاحبزادیاں ازواج مطہرات میں شامل تھیں زیادہ پریشان تھے آخر دونوں بزرگ در دولت پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو دونوں (عائشہ حفصہ) کی گردن اڑا دیں [4]

حضرت حفصہ بنت عمر پہلے شوہر سے بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۷۵
[2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۵
[3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۹۶
[4] صحیح مسلم کتاب الایلاء

پیش کش کی کہ وہ ان سے نکاح کرلیں حضرت ابوبکر سنکر خاموش رہے حضرت عمر کو اس پر ناگواری ہوئی تو جب آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہ سے نکاح کرلیا ایک مرتبہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے فرمایا کہ تم نے مجھ کو حفصہ کی جو پیش کش کی تھی میں نے اسے صرف اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کی ایک گفتگو سے مجھ کو یہ محسوس ہوا تھا کہ حضور خود ان سے نکاح کرنا چاہتے تھے اسوقت میں نہیں چاہتا تھا کہ رسول اللہ کا بھید ظاہر کروں۔[1]

ایک مرتبہ عید کے دن حضرت ابوبکر آنحضرت صلعم کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہ کے پاس دو لڑکیاں بیٹھی ہیں جو گانا نہیں جانتی تھیں لیکن لشٹم پشٹم ایک گیت گا رہی تھیں، حضرت ابوبکر سے چپ نہ رہا گیا بولے "ارے رسول اللہ کے گھر میں یہ گانے" آنحضرت صلعم منہ پھیرے لیٹے تھے حضرت ابوبکر کو یہ کہتے سنا تو فرمایا "اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے۔ آج یہ ہماری عید ہے"[2] بعض مصنفین نے اس واقعہ کو حضرت ابوبکر کے تقویٰ کے واقعات کے ماتحت درج کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کا خیال آنحضرت صلعم سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا، اصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اس چیز کو ادب واحترام نبوی کے خلاف سمجھتے تھے اور اسی لئے انہوں نے اسپر سخت الفاظ میں اپنی ناگواریٔ خاطر کا اظہار کیا تھا۔

ناموس نبوی کی حفاظت و رعایت

اس غایت تعلق کی بنا پر آپ کے علم میں اگر کوئی ایسا واقعہ آتا جس کا اثر آنحضرت صلعم کی عزت و ناموس پر پڑتا تو سخت غضب ناک ہو جاتے تھے قتیلہ بنت قیس بن معدیکرب ایک خاتون تھی جو اشعث بن قیس کی بہن تھیں۔ آنحضرت صلعم نے مرضِ وفات میں یا اس سے دو ماہ پہلے (علی اختلاف الروایات) نکاح کیا تھا لیکن ابھی باقاعدہ حرم نبوی میں داخل نہیں ہوئی تھیں کہ حضور صلعم دنیا سے رخصت ہوگئے اس کے بعد انہوں نے عکرمۃ بن ابی جہل سے نکاح کرلیا۔ حضرت ابوبکر کو اسکا علم ہوا تو غصہ سے برہم ہوگئے اور ارادہ کیا کہ دونوں کو نذر آتش کردیں لیکن عمر مزاحم ہوئے انہوں نے کہا کہ قتیلہ امہات المؤمنین میں داخل نہیں ہیں، وہ حرم نبوی میں شامل

[1] بخاری ج ۲ ص ۵۷۱ [2] بخاری ج ۱ ص ۱۳۰ [3] الاستیعاب ابن عبدالبر باب القاف۔

نہیں ہوئیں اور نہ ان کے لئے حجاب کا حکم ہوا[1]

رسول اللہ صلعم کی طرف سے قرض کی ادائیگی

حضرت ابوبکر خلیفۂ رسول بھی تھے اور عاشق رسول بھی اس بنا پر آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد اعلان کرادیا تھا کہ جس شخص سے آنحضرت صلعم نے کوئی وعدہ کیا ہو یا جس کسی کا آپ کے ذمہ کوئی قرض ہو وہ میرے پاس آئے[2]

اہل بیت کے ساتھ محبت

آنحضرت صلعم کی ذات قدسی کیساتھ غیر معمولی عشق و محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو اہل بیت اطہار کے ساتھ بھی بڑی محبت تھی اور ان کا خود اپنے متعلقین سے زیادہ خیال رکھتے تھے، فدک و خیبر کی بحث میں ان کا یہ قول گزر چکا ہے کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے رسول اللہ صلعم کے اہل قرابت مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہیں کہ میں اپنے اہل قرابت کیساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کروں

خلیفہ ہونے کے بعد جب حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں علی نے رسول اللہ صلعم سے اپنا تعلق بیان کرنا شروع کیا تو حال یہ تھا کہ حضرت علی اور بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ ایک ایک بات کرتے جاتے تھے اور ادھر حضرت ابوبکر اُسے سُن سُن کر روتے جاتے تھے[3]

وفاتِ نبوی صلعم کے چند ہی روز بعد کا ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر نمازِ عصر سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ حضرت حسن بن علی نظر آگئے جو محلہ کے بچوں کیساتھ کھیل رہے تھے حضرت ابوبکر نے جگر گوشۂ بتول کو دوش پر اٹھا لیا[4]

فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت خالد نے جو مالِ غنیمت مدینہ بھیجا اس کے ساتھ ایک قیمتی طیلسان بھی تھا جو حضرت ابوبکر کے پاس بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر نے وہ طیلسان امام حسین ابن علی کی نذر کردیا[5]

حضرت ابوبکر اہل بیت اطہار کیساتھ لطف و مدارات کا معاملہ خود تنہا نہیں کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کو بھی عام طور پر اسکی تاکید کرتے تھے کہ ان کا خاص طور پر خیال رکھیں

[1] الاستیعاب ابن عبدالبر باب القاف [2] بخاری ج ۱ ص ۳۰۴ و ج ۲ ص ۶۲۹ [3] طبری ج ۲ ص ۹۴۹ [4] بخاری ج ۱ ص ۵۳۰ والبدایۃ ج ۵ ص ۲۸۶ [5] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۴۔

ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ "ارقبوا محمداً ﷺ فی اھل بیتہٖ" [1]

عام روایت ہے کہ حضرت فاطمہ کی وفات ہوئی تو حضرت علی نے راتوں رات انکی تجہیز و تکفین کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کو دفن کر دیا۔ لیکن جعفر بن محمد نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ جب حضرت فاطمہ کی وفات ہوئی تو حضرت ابوبکر و عمر مکان پر حاضر ہوئے جنازہ تیار ہو کر آیا تو صدیق اکبر نے ہی حضرت علی سے کہا چلئے نماز جنازہ پڑھائیے۔ انہوں نے انکار کیا اور فرمایا "آپ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں آپ آگے بڑھئے اور نماز پڑھائیے" چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابوبکر نے امامت کی۔" [2]

یہی روایت قرین قیاس اور مقتضائے درایت ہے، ہم صفحاتِ گزشتہ میں ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے بیعت عامہ کے دن ہی بیعت کی تھی اور حضرت علی برابر حضرت ابوبکر کے رفیق اور انکے معاون بنے رہے۔ حضرت فاطمہ بھی ناراض نہیں رہی تھیں اور خلیفۂ رسول کے تعلقات خانوادہ نبوت سے ہرگز کشیدہ نہیں تھے، بلکہ خوشگوار تھے ان سب امور کے پیش نظر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ جگر پارۂ رسول کی وفات ہو جائے اور جانشین رسول کو اسکی خبر بھی نہ ہو اور وہ ان کے جنازہ تک میں نہ شریک ہوں اصل یہ ہے کہ بنو امیہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کا آئینۂ قلب گرد کدورت سے صاف نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے وہ لگائی بجھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے، عام مجلسوں میں اسکا تذکرہ ہوتا ہوگا اور اس سے بدگمانیاں پھیلتی ہوں گی، یہی وہ بدگمانیاں ہیں جنکا اثر روایات میں ظاہر ہے ایک نکتہ شناسِ نفسیات معلوم کر سکتا ہے کہ ان روایات میں کتنی بات واقعی ہے۔ اور کتنی وہ ہے جو اس طرح کی عام بدگمانیوں کے ذریعہ افراد کا اپنا اضافہ اور خود انکے اپنے احساس یا قیاس کا نتیجہ ہے۔

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۲۰ [2] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۵۵

مکارم اخلاق

اسلام کا اصل مقصد تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کے ذریعہ اعلیٰ اخلاق و صفات سے متصف کرنا ہے آنحضرت ﷺ نے اپنی غرض بعثت ہی مکارم اخلاق کی تکمیل و تتمیم بیان فرمائی ہے

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

حضرت ابوبکر کی فطرت چونکہ سعید تھی اسلئے آپ عہد جاہلیت میں بھی اخلاقِ حمیدہ سے متصف تھے اس زمانہ میں بھی کبھی آپ نے ام الخبائث کو منہ نہیں لگایا۔ قمار کی مجلس میں کبھی شریک نہیں ہوئے کسی بت کے آگے سر کبھی خمیدہ نہیں ہوا حالانکہ یہ تینوں چیزیں عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں اس کے علاوہ غریبوں کی خبر گیری، بے کسوں اور اپاہجوں کی مدد۔ مسافر نوازی اور مہمان داری آپکے خاص اوصاف تھے، پھر شرف اسلام سے مشرف ہوئے تو ان اوصاف پر اور جلا ہوئی اور آپ مکارم و محامدِ اخلاق کے پیکر اتم بن گئے۔

تقویٰ و طہارت | آپ کے صحیفۂ اخلاق میں سر فہرست تقویٰ و طہارت کا وصف تھا جسطرح ایک تندرست معدہ مکھی یا اسی طرح کی کوئی اور نجس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا حضرت ابوبکر کا معدہ کسی ایسی چیز کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ جو معنوی نجاست و گندگی رکھتی ہو چنانچہ حضرت ابوبکر کا ایک غلام تھا اس نے ایک مرتبہ کوئی چیز لا کر دی حضرت ابوبکر نے جب اسکو کھا لیا تو غلام بولا "آپ جانتے ہیں وہ کیا چیز تھی؟" پوچھا کیا تھی؟" اس نے جواب دیا کہ میں عہد جاہلیت میں جھوٹ موٹ کہانت کا کام کرتا تھا یہ چیز اسی کا معاوضہ تھی، حضرت ابوبکر نے یہ سنتے ہی قے کر دی اور جو کچھ پیٹ میں تھا خارج کر دیا [1]

ایک دفعہ حضرت ابوبکر آنحضرت ﷺ اور دوسرے صحابہ کیساتھ سفر کر رہے تھے، درمیان میں ایک جگہ پڑاؤ ہوا سب حضرات مختلف لوگوں کے ہاں ٹھہر گئے حضرت ابوبکر، ابو سعید الخدری وغیرہ کیساتھ ایک اعرابی کے گھر میں فروکش ہوئے انکے ساتھ ایک اعرابی اور تھا میزبان کی بیوی حاملہ تھی، اس اعرابی نے میزبان کی بیوی سے شرط کسلی کہ اگر وہ ان سب کو بکری

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۲ ۔

کھلائیگی تو اُس کے لڑکا پیدا ہوگا۔ عورت نے یہ شرط منظور کرلی اور بکری ذبح کردی جسپر اعرابی نے الٹم شٹم کچھ مسجع جملے پڑھ دیئے۔ بکری کا گوشت کھانیکے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کو پورا قصہ معلوم ہوا تو انسے برداشت نہ ہوسکا فوراً قے کردی ۱؎

غایتِ تقویٰ وطہارت کے باعث جسطرح صدیق اکبرؓ کا معدہ کسی نامشروع چیز کو گوارا نہیں کرسکتا تھا اسی طرح انکے قدم اس راہ میں بھی نہیں اٹھ سکتے تھے جس میں فساق وفجار رہتے ہوں، ایک مرتبہ ایک شخص آپکو ایک راستہ سے اپنے گھوڑے پر جارہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اس سے واقف نہیں تھے پوچھا یہ کونسا راستہ ہے؟ اس شخص نے کہا اس راستے میں ایسے لوگ رہتے ہیں جنکے پاس سے گزرتے ہوئے بھی ہمکو شرم آتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "کیا خوب! اگر تمکو گزرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور پھر بھی اسی راہ سے جارہے ہو۔ تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا ۲؎

حضرت ابوبکرؓ کے تقویٰ کا یہ اثر تھا کہ انکے گھر کی مستورات تک اسی رنگ میں رنگ گئی تھیں آپکی صاحبزادی حضرت اسماؓ کی ماں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا اور اسلئے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو طلاق دیدی تھی، ایک مرتبہ ماں کی ممتا نے جوش مارا تو بیٹی کے لئے کھانے کی چیزیں بطور تحفہ لائیں چونکہ اسلام قبول نہ کرنیکے باعث ماں کا تحفہ مشکوک تھا اس لئے حضرت اسماؓ نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا لیکن بعد میں جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلعم سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے قبول کرنیکی اجازت دیدی۔

خوفِ خدا بحکم راس الحکمۃ مخافۃ اللہ تقویٰ وطہارت اور تمام دوسری نیکیوں کی جڑ خوفِ خدا ہے حضرت ابوبکرؓ پر خوفِ خدا کا اسدرجہ غلبہ تھا کہ ایکمرتبہ ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو خطاب کرکے کہنے لگے واہ واہ! اے چڑیا تو کتنی خوش نصیب ہے اے کاش میں بھی تیرے جیسا ہوتا تو درخت پر بیٹھتی ہے پھل کھاتی ہے۔ اور پھر اڑجاتی ہے تجھ سے نہ کوئی حساب ہے اور نہ کتاب۔ آہ اے کاش میں ایک سر رہگزر عام ایک درخت ہوتا اونٹ وہاں سے گزرتا مجھ کو پکڑتا اپنا منہ مجھ میں مارتا۔ مجھ کو چباتا اور اسطرح میری تحقیر کرتا اور پھر مینگنی کی شکل میں مجھ کو نکال کر دیتا۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر میں بشر نہ ہوتا ۳؎

ندامت اور پشیمانی اس خوفِ خدا کا یہ اثر تھا کہ اگر کبھی کوئی معمولی بھول چوک بھی ہوجاتی تھی تو بعد میں سخت ندامت اور پشیمانی ہوتی تھی اور جبتک وہ اسکی تلافی نہیں کرلیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا ایکمرتبہ حضرت ابوبکرؓ اور ربیعہ بن کعب الاسلمی میں زمین کے ایک ٹکڑہ

۱؎ مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ ص ۱۵۱ ۲؎ کنز العمال بر مسند احمد ج ۲ ص ۳۴۷ ۳؎ منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۱

کے بارے میں کچھ جھگڑا ہوگیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے غصہ میں کوئی سخت بات کہہ دی۔ بعد میں ان کو خود احساس ہوا تو ربیعہ سے بولے "تم بھی مجھ کو ایسی ہی سخت بات کہہ کر مجھ سے بدلہ لے لو" لیکن ربیعہ نے انکار کیا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ بولے "اگر تم مجھ سے اپنا بدلہ نہیں لوگے تو میں رسول اللہ صلعم سے جاکر تمہاری شکایت کرونگا" ربیعہ نے کہا "میں ہرگز ایسا نہیں کرسکتا اور مزید برآں یہ کہاکر زمین جس کی گانٹھ تھی اس سے ہی دست برداری دیدی۔ حضرت ابوبکرؓ نہ ملتے، آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہونیکے لئے چل پڑے آگے آگے تو وہ تھے پیچھے ربیعہ آرہے تھے، ربیعہ کے قبیلہ والوں نے یہ دیکھا تو وہ بھی ربیعہ کی حمایت کیلئے اکٹھے ہوگئے اور کہنے لگے "کیا خوب! ایک تو ابوبکرؓ نے تم کو ایسی ناسزا بات کہدی اور پھر الٹے وہی رسول اللہ صلعم سے شکایت کرنے جارہے ہیں" ربیعہ نے کہا "چپ رہو تم کو دیکھ لیا تو غضب ناک ہوجائیں گے انکے غضب کیوجہ سے رسول اللہ صلعم کو غصہ آئیگا اور ان دونوں کے غصہ کیوجہ سے اللہ غضبناک ہوجائیگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ربیعہ تباہ وبرباد ہوجائیگا، چنانچہ یہ سب لوگ واپس ہوگئے، اب حضرت ابوبکرؓ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر پورا ماجرا سنایا۔ آنحضرت صلعم نے جب حضرت ربیعہ کا بیان بھی سن لیا تو فرمایا "ربیعہ! تم نے اچھا کیا کہ ابوبکر کو وہی بات پلٹ کر نہیں کہی جو انہوں نے تم سے کہی تھی۔ لیکن ہاں اب یہ کہو کہ اے ابوبکر اللہ آپ کی غلطی معاف کرے"

حضرت ربیعہ نے تعمیل ارشاد کی تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور اسی حالت میں واپس ہوگئے۔

اسی طرح ایکمرتبہ حضرت عمرؓ کیساتھ کسی بات پر تیز کلامی ہوگئی اور انہیں سخت سست کہہ گزرے بعد میں اس کا احساس ہوا تو سخت ندامت ہوئی حضرت عمرؓ سے بولے "تم مجھ کو معاف کردو" حضرت عمرؓ نے انکار کیا تو تہمد کا ایک کونہ پکڑے ہوئے جس سے آپ کے گھٹنے ظاہر ہورہے تھے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور پوری روئداد کہہ سنائی۔ آنحضرت صلعم نے تین دفعہ فرمایا "ابوبکر خدا تمہاری خطا معاف فرمائے۔" اب حضرت عمرؓ کو بھی افسوس ہوا، دوڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر آئے تو وہ وہاں تھے نہیں، سیدھے خدمتِ نبوی میں پہونچے، حضرت عمرؓ کو دیکھتے ہی سرورِ عالم صلعم کے چہرۂ مبارک کے تیور بگڑنے لگے حضرت ابوبکرؓ کو

۱؎ مسند امام احمد ج ۴ ص ۵۹

اندیشہ ہوا کہ کہیں حضرت عمرؓ پر عتاب نہ ہو اسلئے فوراً دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور بڑی لجاجت سے عرض کیا "اے رسول اللہ صلعم خدا کی قسم اظلم تو میں نے کیا تھا"[1]

ایک مرتبہ کسی اپنے غلام سے کسی بات پر خفا ہو کر اس کو لعن طعن کر دیا۔ آنحضرت صلعم اسوقت موجود تھے، دو یا تین بار فرمایا "اے ابوبکر صدیقین اور لعانین دونوں ہرگز ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے" حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنتے ہی بطور کفارہ چند غلام آزاد کر دیئے اور عرض کیا اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔[2]

حضرت ابوبکرؓ سے بربنائے بشریت زبان سے کبھی کبھی اسطرح کی لغزش ہو جاتی تو اب اس پر نادم ہوتے تھے چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ آپکے پاس آئے تو دیکھا کہ اپنی زبان پکڑ کر کھینچ رہے تھے بولے خدا آپکو معاف کرے ایسا نہ کیجیے حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "اسی زبان نے مجھ کو تباہ کیا ہے"[3]

زہد و ورع خدا کے خوف اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے انسان کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا نقش جم جاتا ہے اور لازمی طور پر زہد و ورع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی دنیا نے اپنا سر مسلمانوں کے قدموں میں جھکا دینا شروع کر دیا تھا لیکن آپکے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے پینے کیلئے پانی مانگا لوگوں نے پانی اور شہد ملا کر پیش کیا۔ آپنے پیالہ منہ سے لگا کر ہٹا لیا اور رونے لگے جو لوگ پاس بیٹھے تھے ان پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ بھی رونے لگے آپ تھوڑی دیر کیلئے چپ ہو گئے اور پھر رونا شروع کیا۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں ایک دن آنحضرت صلعم کے ساتھ تھا میں نے دیکھا کہ آپ کسی کو دور دور کہہ رہے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ صلعم آپ کس چیز کو دور دور کہہ رہے ہیں میں تو یہاں کوئی چیز دیکھتا نہیں ہوں ارشاد ہوا "دنیا میرے سامنے مجسم ہو کر آگئی تھی میں نے اس سے کہا کہ میرے سامنے سے ہٹ جا، وہ ہٹ گئی مگر پھر دوبارہ آئی اور کہا کہ آپ مجھ سے بچکر نکل جائیں تو نکل جائیں لیکن آپکے بعد جو لوگ آئیں گے وہ بچکر نہیں جاسکتے" یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس وقت مجھ کو یہی بات یاد آگئی اور مجھ کو خوف ہوا کہ کہیں مجھ سے چمٹ نہ جائے۔[4]

حضرت رافع بن ابی رافع سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ سفر کر رہا تھا انکے پاس ایک فدکی چادر تھی اور جب وہ پڑاؤ ڈالتے تھے تو ہم دونوں اسکو ہی استعمال کرتے تھے[5] ایکمرتبہ حضرت خالد بن الولید کو نصیحت فرمائی

فر عن الشرف یتبعک الشرف واحرص ... برائی سے بھاگو تو بڑائی تمہارے پیچھے آئیگی اور موت کی

---

[1] الادب المفرد باب من لعن عبدہ فاعتقہ [2] ایضاً [3] موطا امام مالک باب ما جاء فیما یخاف من اللسان [4] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۷ [5] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۲ بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ [6] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶

علی الموت توھب لک الحیاۃ[1] ... آرزو کرو تو تم کو زندگی بخشی جائیگی۔

تواضع اور سادگی حضرت ابوبکرؓ اگرچہ نہایت جلیل القدر خلیفہ تھے لیکن غریبوں اور ضرورتمند لوگوں کا معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی ان کو دریغ نہیں ہوتا تھا اور نہایت خاموشی سے وہ ایسے کام کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے، مدینہ میں ایک نابینا عورت تھی جس کا کام کاج حضرت عمرؓ آکر کر دیتے تھے لیکن چند روز کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے کوئی اور شخص آکر اس عورت کے تمام کام کاج کر جاتا ہے ان کو اب یہ معلوم کرنے کا شوق ہوا کہ یہ کون شخص ہے ایک شب وہ اسکی گھات میں کہیں چھپے بیٹھے رہے تو یہ دیکھ کر انکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ شخص حضرت ابوبکرؓ تھے جو خلیفہ ہونے کے باوجود پوشیدہ طور پر اس نابینا عورت کے گھر آتے تھے اور اسکے تمام گھریلو کام کر جاتے تھے[2]

مسند خلافت پر جلوہ فروز ہونے سے پہلے محلہ کی لڑکیوں کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے تھے خلیفہ ہونیکے بعد سب سے زیادہ ایک بھولی بھالی لڑکی کو فکر ہوئی کہ اب ہماری بکریوں کا کیا ہوگا؟ حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو فرمایا خدا کی قسم! میں اب بھی بکریاں دوہونگا خلافت مجھ کو خدمت خلق سے باز نہ رکھ سکیگی[3]

خلافت سے قبل آپ کا ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ انتخاب کے کچھ دنوں بعد تک بھی اسکو قائم رکھا ایکدن حسب معمول کندھے پر کپڑوں کے کچھ تھان رکھے ہوئے بازار جا رہے تھے کہ راہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ مل گئے انہوں نے کہا "اے خلیفۂ رسول! آپ کہاں جا رہے ہیں" بولے "بازار" انہوں نے کہا اب آپ مسلمانوں کے والی ہیں چلیے! ہم آپکے لئے وظیفہ مقرر کر دیں گے[4] لیکن ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کچھ روز تو تجارت کا مشغلہ جاری رکھا لیکن جب آپ کو یہ محسوس ہوا کہ اس سے فرائض خلافت کی انجام دہی میں یکسوئی باقی نہیں رہتی اور اس میں خلل پڑتا ہے تو آپنے خود صحابۂ کرام کے مشورہ سے بقدر ضرورت اپنا وظیفہ مقرر کر لیا۔[5]

انکسار و تواضع اور فروتنی کی انتہا یہ تھی کہ لوگ خلیفۂ رسول ہونیکی حیثیت سے تعظیم و تکریم کے آداب بجا لاتے تھے تو دل میں شرمساری محسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ "تم لوگوں نے مجھ کو بہت بڑا چڑھا دیا ہے" اگر کسی سے مدح و ستائش کے الفاظ سن لیتے تو دل میں کہتے کہ "اے خدا تو

---

[1] مختصر العقد الفرید ص ۳ [2] ابن اثیر جلد ۲ ص ۲۹۰ [3] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکرؓ و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱ [4] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ [5] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

مجھ کو ان لوگوں کے حسنِ ظن کے مطابق بنا میرے گناہوں کو معاف کر دے اور ان لوگوں کی بیجا تعریف پر میری پکڑ نہ کر[1]

غیر طبعی طور پر اگر تکبر کی کوئی علامت آپ میں پائی جاتی تھی تو آپ پریشان ہو جاتے تھے ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "جو شخص اپنے کپڑے از راہِ تکبر گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے اللہ قیامت کے دن اسکی طرف نظر نہیں کریگا۔ صدیق اکبر رض نے کہا یا رسول اللہ صلعم! میرے کپڑوں کا ایک پہلو کبھی کبھی لٹک جاتا ہے اور مجھ کو اس کا خیال نہیں رہتا۔ ارشاد ہوا "تم تو از راہِ تکبر ایسا نہیں کرتے -

خود داری | اگرچہ دوسروں کا معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی آپ کو عار نہیں آتی تھی لیکن خودداری کی وجہ سے دوسروں سے اپنا ذرا سا کام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ بسا اوقات چلتے چلتے حضرت ابوبکر کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل چھوٹ کر گر پڑتی تھی تو اونٹ کو بٹھا کر نکیل اٹھاتے تھے ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا، آپ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں ہم کو حکم کیا کیجیے ہم اٹھا دیں گے "، فرمایا، میرے حبیب رسول اللہ صلعم نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کروں[2]

فقر و درویشی | حضرت ابوبکر بیت المال سے اپنے لئے وظیفہ لیتے تھے لیکن اسکی مقدار کتنی تھی اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ انکی بیوی کا جی چاہا کہ حلوہ کھائیں، شوہر سے فرمایش کی تو انہوں نے جواب دیا کہ گنجایش نہیں ہے، بیوی نے کہا "کہ اچھا! آپ روزمرہ کے خرچ کیلئے جو مجھے دیتے ہیں اب میں اسی میں پس انداز کرونگی یہاں تک کہ حلوہ کی قیمت کے برابر ہو جائے، حضرت ابوبکر نے کہا " اچھا کرو"، چند روز میں اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ حلوہ خریدا جا سکے اب خلیفۂ رسول کو اس کا علم ہوا تو فرمایا "معلوم ہوا کہ روزمرہ کا خرچ ان چند پیسوں کو کم کر دینے کے بعد بھی پورا ہو سکتا ہے جو تم روزانہ پس انداز کرتی تھیں، اس لئے اب آئندہ تم کو گھر کا خرچ اسی قدر کم کر دیا جائیگا اور جو رقم حلوہ کے نام سے پس انداز ہوئی تھی وہ بیت المال میں داخل کر دی[3]

انفاق فی سبیل اللہ | پہلے گزر چکا ہے اسلام قبول کرنیکے وقت آپکے پاس چالیس ہزار درہم تھے مدینہ پہنچتے پہنچتے کل پانچ ہزار رہ گئے وہ بھی سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دئیے، یہاں حضرت

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۷ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷ [3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص [4] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

خارجہ کی شرکت میں تجارت پھر شروع کی۔ اس سے بھی جو کچھ آمدنی ہوئی غزوۂ تبوک میں سب حضور صلعم کے قدموں میں لا کر رکھدی، اور بال بچوں کے لئے صرف اللہ اور اسکے رسول کو چھوڑ دیا۔ یہ واقعات تو خلافت سے پہلے کے تھے خلیفہ ہوئے تو تجارت ختم کر دی اور بہت معمولی طور پر گزر بسر کرنے لگے مرضِ وفات میں حضرت عائشہ سے فرماتے ہیں "جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں میں نے مسلمانوں کا کوئی ایک درہم کھایا نہ دینار، موٹا جھوٹا وہ جو کھاتے اور پہنتے ہیں وہی میں نے کھایا اور پہنا ہے اور اس وقت لے دے کے میرا جو کچھ اثاثہ ہے وہ یہ ایک اونٹ ایک غلام اور یہ ایک چادر ہے خود تنگی ترشی سے گزر کرتے تھے لیکن غریبوں اور محتاجوں کا اتنا خیال تھا کہ موسم سرما میں ان کو کپڑے تقسیم کرتے تھے[1]

شجاعت | شجاعت ایک ایسا وصف ہے جو عجز و مسکنت اور تواضع و بے نفسی کیساتھ بہت کم جمع ہوتا ہے لیکن اصلاح جو تزکیۂ نفس کے ذریعہ اخلاق و ملکات کے اعتدال کا نام ہے اس کی تعلیمات اور آنحضرت صلعم کے خاص فیضِ تربیت کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کی تصویر تھے شبنم کی لطافت کیساتھ سورج کی حرارت اور شیشہ کی نزاکت کے ساتھ پتھر کی سختی رکھتے تھے حضرت ابوبکر اس وصفِ خاص میں بھی سب سے نمایاں تھے۔ محمد ابن عقیل کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی بن ابی طالب نے خطبہ دیتے دیتے پوچھا کہ بتاؤ " دنیا کا سب سے بڑا بہادر کون ہے ؟ -

ہم نے کہا " آپ" فرمایا "نہیں! اس کے بعد ارشاد ہوا أشجع الناس حضرت ابوبکر تھے، غزوۂ بدر کے موقع پر ہم نے آنحضرت صلعم کیلئے ایک کیمپ بنا دیا تھا جسمیں آپ قیام فرمائیں پھر ہم نے پوچھا کہ اس کیمپ میں حضور صلعم کی چوکیداری کی خدمت کون انجام دیگا تو کسی نے پیش قدمی نہیں کی۔ البتہ حضرت ابوبکر نے سبقت فرمائی اور شمشیر بدست آنحضرت صلعم کی خدمت میں اس مستعدی اور آمادگی کے ساتھ پہرہ دیتے رہے کہ جہاں کسی نابکار نے ادھر کا رخ کیا اور ابوبکر اس پر جھپٹ پڑے۔ اسی طرح مکہ میں ایک مرتبہ قریش نے جب رسول اللہ صلعم کو اپنے نرغہ میں لیکر طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کیں تو اس وقت بھی نہایت

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۰ [2] ایضاً

ابوبکر تھے۔ جو اس ہجوم میں گھسے چلے گئے کسی کو دھکا دیا، کسی کے تھپڑ رسید کیا۔ کسی کو لات ماری اور کسی کو پیٹا اور مارا اور آخر یہ کہتے ہوئے کہ ارے ظالمو! کیا تم اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے رسول اللہ کو زغنہ میں سے نکال لائے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہیں تک کہہ پائے تھے کہ جی بھر آیا اور آنسوؤں کا دریا امنڈ پڑا جس سے ریش مبارک تر بتر ہو گئی [1]

حلم اور بردباری

اعلیٰ کمال شجاعت کیساتھ حلم اور بردباری کا ہونا بھی ضروری ہے ایک مرتبہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ اور بعض صحابۂ کرام کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کو سب وشتم کیا۔ آپ سن کر پی گئے اس شخص نے دوبارہ پھر وہی بدتمیزی کی۔ آپ اس مرتبہ بھی خاموش رہے لیکن جب تیسری بار اسنے پھر یہی حرکت کی تو آپنے اس کا جواب دیا۔ تاہم آپکو رسول اللہ ﷺ کی رضا طلبی کا اتنا خیال تھا کہ حضرت ابوبکر کا جواب سنتے ہی آپ کھڑے ہو گئے تو معاً خیال آیا کہ آپ کہیں ناراض تو نہیں ہو گئے عرض کیا "وجدت علی یا رسول اللہ" ۔ اے رسول اللہ! کیا آپ کو مجھ پر غصہ آگیا۔ ارشاد ہوا "یہ شخص تمکو جو کچھ کہہ رہا تھا۔ آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہو کر خود اسکی تکذیب کر رہا تھا لیکن جب تمنے اس سے بدلہ لے لیا تو بیچ میں شیطان آدھمکا پھر میرے لئے مناسب نہ تھا کہ میں وہاں بیٹھا رہوں جہاں شیطان ہو۔ [2]

حضرت ابوبرزہ کی روایت سے یہ واقعہ پہلے ہی گزر چکا ہے کہ عہد خلافت میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر کو انکے منہ پر برا بھلا کہا اس پر ایک صحابی نے اس شخص کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تو آپنے سختی سے منع کیا اور فرمایا رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے علاوہ اور کسی کی گردن اڑانا جائز نہیں ہے۔

حسن خلق

اسلامی اخلاق کا اصل عنوان ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے، "میزان قیامت میں حسن خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہے" نیز فرمایا "تم میں سب سے زیادہ بہتر وہی ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے۔" حسن خلق کا مظاہرہ سب سے پہلے ملاقات کے وقت علیک سلیک میں ہوتا ہے اس بارہ میں حضرت ابوبکر کا طریقہ یہ تھا کہ سلام کرنے میں پہل

[1] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۵۹ [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الانتصار

کرتے تھے اور اگر کوئی اس سلام کا جواب بڑھ چڑھ کر دیتا تھا تو آپ اسمیں مزید اضافہ کرکے پھر سلام کی تکرار کرتے تھے، حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوبکر کے ساتھ ایک ہی سواری پر بیٹھا جا رہا تھا کہ راستہ میں کچھ لوگ ملے۔ حضرت ابوبکر نے کہا "السلام علیکم" ان لوگوں نے جواب دیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اب حضرت ابوبکر نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو ان لوگوں نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آخر حضرت ابوبکر نے فرمایا "آج یہ لوگ ہم سے بازی لے گئے۔" [1]

حضرت عبداللہ بن عمر خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں ایکمرتبہ ایک جھگڑا چکانے کیلئے آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو میرے ساتھ روانہ کیا تو راستہ میں جو لوگ ملتے تھے وہ مجھ کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے حضرت ابوبکر صدیق نے یہ دیکھ کر مجھ سے کہا "کیا تم نہیں دیکھتے کہ لوگ تمکو سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں تو ثواب کے مستحق وہی ہوتے ہیں تم خود سبقت کرو تاکہ تم کو ثواب ملے۔ [2]

حُسن خلق کی دوسری علامت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درد و غم میں شریک ہو حضرت ابوبکر اسکا اسقدر اہتمام کرتے تھے کہ عبداللہ بن سہیل ایک قریشی تھے، غزوۂ بدر کے موقع پر کفار کے ساتھ آئے تھے لیکن یہاں توفیق ایزدی نے دستگیری کی اور مسلمانوں کیساتھ آملے یہانتک کہ آخر جام شہادت بھی نوش کیا۔ حج کے موقع پر حضرت ابوبکر کی انکے والد سہیل بن عمرو سے ملاقات ہوئی تو آپنے بیٹے کی تعزیت کی۔ [3]

حسنِ خلق میں یہ بھی داخل ہے کہ دوسروں کے عیب سے چشم پوشی کیجائے اس وصف میں حضرت ابوبکر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ فرمایا "اگر میں چور کو پکڑتا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی کہ خدا اس کے جرم کی پردہ پوشی کرے۔ [4]

لیکن جہاں امر بالمعروف کا موقع ہو وہاں لین و ملاطفت کے کوئی معنی نہیں، ایسے موقع پر تشدد برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایکمرتبہ صحابۂ کرام کسی جنازہ کیساتھ آہستہ آہستہ جا رہے تھے، حضرت ابوبکر وہاں آنکلے تو کوڑا اٹھا کر فرمایا "ہم لوگ آنحضرت ﷺ کیساتھ تیز رفتاری سے جایا

[1] الادب المفرد ص ۱۴۵ باب فضل السلام [2] الادب المفرد باب من بدأ بالسلام
[3] فتوح البلدان بلاذری ص ۹۲ [4] ابن سعد تذکرہ زبید بن الصلت

کرتے تھے [1]

مزاح | مزاح یعنی لطیف قسم کا مذاق شگفتہ مزاجی اور جودتِ طبع کی دلیل ہے خود آنحضرتؐ کے مزاح کے متعدد واقعات حدیث و سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ خلیفۂ رسول میں یہ وصف نہ ہوتا چنانچہ ایک مرتبہ آپ مسجد نبوی سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ امام حسن جو اس وقت کم سن تھے محلہ کے بچوں کیساتھ کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ حضرت ابوبکر نے جگر گوشۂ رسول کو فرطِ محبت سے گود میں اٹھا لیا اور حضرت علی جو وہیں تھے انکی طرف اشارہ کرکے فرمایا

یا بابی شبہ النبی لیس شبیہا بعلی [2] (اے وہ جو کہ نبی کے مشابہ ہے اور علی کے مشابہ نہیں تجھ پر میرا باپ فدا ہو)

حضرت علی نے یہ سنا تو ہنسنے لگے۔

احتسابِ نفس | جو کچھ کرتے تھے ایک نقاد کی حیثیت سے خود ہی اس کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے چنانچہ مرض الوفات میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے بولے کہ "مجھ کو کسی بات کا غم نہیں ہے البتہ تین کام ایسے ہیں جو میں نے کئے ہیں لے کاش کہ نہ کئے ہوتے، تین کام ایسے ہیں جو میں نے نہیں کئے لے کاش میں نے کئے ہوتے اور تین باتیں ایسی ہیں کہ اے کاش وہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھی ہوتیں پہلی تین باتوں میں سے ابو عبیدہ نے ایک کا ذکر نہیں کیا باقی دو باتوں کے متعلق فرمایا "میری تمنا ہے کہ سقیفۂ بنو ساعدہ کے روز میں نے ایک عمر یا ابو عبیدہ بن الجراح کو خلیفہ بنایا ہوتا اور میں ان کا وزیر ہوتا دوسری بات یہ ہے کہ جب میں نے خالد بن الولید کو مرتدین سے جنگ کرنے کیلئے بھیجا تھا تو میں خود ذوالقصہ میں قیام کرتا۔ دوسری قسم کی تین باتیں یہ ہیں کہ اے کاش اشعث بن قیس جب گرفتار ہوکر آیا تھا تو میں نے اس کی گردن اڑا دی ہوتی۔ الفجاءۃ کو میں نے زندہ آگ میں جلوا دیا تھا اے کاش ایسا نہ کرتا اور قتل کر دیتا یا رہا کر دیتا اور خالد کو جب میں نے شام روانہ کیا تھا تو عمر کو میں عراق بھیجتا اس طرح اللہ کی راہ میں میں نے اپنے داہنے اور بائیں دونوں ہاتھ دراز کر دیئے ہوتے رہی وہ تین باتیں جو لے کاش میں نے رسول اللہؐ سے دریافت کی ہوتیں تو ان میں سے ایک تو خلافت کا معاملہ ہے۔ دوسری یہ کہ کیا انصار کا اس میں کوئی حصہ ہے تیسری یہ کہ پھوپھی اور بھتیجی میں کتنا حصہ ہے؟ [3]

---

[1] ابو داؤد کتاب الجنائز باب الاسراع بالجنائز [2] صحیح بخاری ج ا ص ۴۰۰ [3] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فضائلِ و مناقب

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل و مناقب کے مآخذ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) آنحضرتؐ کے ارشادات جو خاص حضرت ابوبکر کے متعلق ہیں یا حضرت ابوبکر کیساتھ حضرت عمر یا کسی اور صحابی کیساتھ حضوصاً یا عمومی طور پر مہاجرین سے متعلق ہیں۔

(۳) صحابۂ کرام کے وہ اقوال وارشادات جو حضرت ابوبکر سے متعلق ہیں۔

استحقاقِ خلافت کے زیرِ عنوان ہمنے جو بحث کی ہے اسکے ضمن میں بہت کچھ فضائل و مناقب کا ذکر آچکا ہے جو مذکورۂ بالا تینوں مآخذ سے ثابت ہیں اس موقع پر عنوانِ باب کی مناسبت سے صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ حضرت ابوبکر کی فضیلت کی سب سے بڑی دلیلیں دو ہیں

(۱) ایک یہ کہ قرآن میں جس کثرت اور تکرار سے حضرت ابوبکر کے بعض خاص خاص اعمال مثلاً التصدیق بما جاء النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام انفاق فی سبیل اللہ اور رفاقت نبوی کا ذکر آیا ہے کسی اور کا نہیں آیا

(۲) اور دوسری دلیل یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو جو محبت تعلقِ خاطر آپکے ساتھ تھا اور جس درجہ کا اعتماد آپ پر تھا وہ کسی پر نہیں تھا۔ صحیح بخاری اور ترمذی کے کتاب المناقب میں اس مضمون کی ایک دو نہیں متعدد روایات موجود ہیں لیکن دراصل حضرت ابوبکر کی سب سے بڑی فضیلت اور منقبت جس پر دوسرے تمام فضائل و مناقب متفرع ہوتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے آپ کو صدیق کا لقب دیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

مقامِ صدیقیت | حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے متعدد مکتوبات میں مقامِ صدیقیت پر بحث کرکے بتایا ہے کہ سلوک و معرفت کے بہت سے مدارج ہیں مثلاً ولایت شہادت لیکن ان میں سب سے اعلیٰ مقام صدیقیت کا ہے اور اس مقام میں اور نبوت میں کوئی واسطہ نہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) [3] کتاب الاموال ابو عبید ص ۱۳۱ یہی روایت ابن جریر طبری جلد ۴ ص ۵۲ (پرانا ایڈیشن) میں بھی ہے لیکن الفاظ میں کافی اختلاف ہے، ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں۔

وفوق آن (صدیقیت) مقامے نیست الا النبوۃ علیٰ اھلھا الصلوٰت والتسلیمات
ونشاید کہ میان صدیقیت ونبوت مقامی بودہ باشد بلکہ محالست واین حکم بمحالیت او بکشف صریح صحیح معلوم گشتہ[1]

بعض ارباب معرفت کا خیال تھا کہ صدیقیت سے بھی اوپر ایک اور مقام ہے جس کا نام قربت ہے اور فرماتے ہیں کہ جیسا کہ خواجہ بزرگ (خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی) نے فرمایا ہے درحقیقت وہی علوم و معارف ہیں جن کا علم اگر نظری اور استدلالی ہو تو وہ علوم شریعت ہیں اور اگر انکا علم کشفی اور بدیہی طریقہ پر ہو تو وہ علوم سلوک و معرفت ہیں اسطرح سلوک اور شریعت میں جو فرق ہے وہ صرف اجمال و تفصیل کا یا نظر و ضرورت کا اور یا استدلال و کشف کا ہے لیکن سلوک کا مرتبہ جو بداہت و ضرورت کا ہے یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور اسی کا نام صدیقیت ہے اسکے بعد جو مقام ہے وہ صرف نبوت کا ہے ایک پیغمبر کو وحی کے ذریعہ جن حقائق کا علم ہوتا ہے اور وہ اسکو دوسروں تک پہونچاتا ہے۔ ایک صدیق اسکی تصدیق بے چون وچرا کرتا ہے پیغمبر کی بیان کی ہوئی حقیقت کیسی ہی مابعد الطبیعی اور بالائے فہم و قیاس ہو بہرحال صدیق کیلئے وہ بدیہی سی چیز ہوتی ہے۔ اور وہ اسکو سنتے ہی قبول کر لیتا ہے[2]

مجدد صاحب نے جو لکھا ہے کہ نبوت اور صدیقیت کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے اسکی تائید خود قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔

ومن یطع اللّٰہ والرسول فاولٰئک مع	اور جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرتے
الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین	ہیں وہ نبیوں صدیقوں اور شہداء صالحین جنپر
والشھداء والصالحین وحسن اولٰئک	اللہ نے انعام کیا ہے ان کیساتھ ہونگے اور کیا خوب
رفیقاً (المائدہ)	ہونگے یہ سب لوگ ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی۔

اسکے علاوہ بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کے ساتھ جبل احد پر چڑھے تو پہاڑ پر زلزلہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا۔

اسکن احد فلیس علیک الا نبی وصدیق — اے احد ٹھہر کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی ایک صدیق

---

[1] مکتوب مجدد الف ثانی حصہ اول دفتر اول مکتوب نمبر ۴ [2] حضرت مجدد صاحب مکتوب نمبر ۴ اول دفتر اول و مکتوب چہل و یک حصہ دوم دفتر اول میں مقام صدیقیت کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے ہمنے اسکا خلاصہ اپنے الفاظ میں دیدیا ہے

وشہیدان[1] — اور دو شہید ہی تو ہیں۔

دیکھو اس حدیث میں بھی نبی صدیق اور شہید میں ترتیب وہی ہے جو قرآن مجید میں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے بعد جو مرتبہ ہے وہ صدیق کا ہی ہے اور درمیان میں کوئی اور مقام حائل نہیں ہے حضرت مجدد صاحب نے اسی حقیقت کی توضیح کرتے ہوئے صاف صاف یہ بھی لکھدیا ہے کہ ایک نبی اور ایک صدیق کے علوم میں فرق صرف اسقدر ہے کہ نبی کے علم کا سرچشمہ وحی ہوتا ہے جسمیں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن اسکے برخلاف صدیق کا علم الہامی ہوتا ہے اس بنا پر ظاہر ہے مظنون اور غیر قطعی ہوتا ہے۔[2]

چونکہ فرق صرف ذریعۂ علم کا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جہاں تک قوائے علمیہ و عملیہ اور اخلاق و ملکات کا تعلق ہے ایک صدیق بہت کچھ نبی کے مشابہ اور مماثل ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے مقام صدیقیت پر بڑی عمدہ اور بسیط بحث کی ہے چونکہ یہ مقام بڑا نازک اور ذرا سی تبدیلی سے غلط فہمی کا امکان ہے اسلئے ہم اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر صرف شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ نقل کرتے ہیں[3]

تصوف کے مقامات و احوال کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں جب کوئی شخص اللہ کی کتاب اور اسکے رسولوں پر اسطرح ایمان لاتا ہے کہ اسکے تمام قوائے قلبیہ و نفسیہ کی رگ رگ میں وہ سرایت کر جاتا ہے اسکے بعد ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے اور اعضاء و جوارح کیساتھ حق عبودیت ادا کرتا ہے اور ان اعمال کو برابر بجا لاتا رہتا ہے تو ان تینوں لطیفوں (عقل، قلب، النفس) میں عبودیت کی روح حلول کر جاتی ہے اب یہ تینوں لطیفے عبودیت میں شرابور ہو کر اصل فطرت ہی بن جاتے ہیں اور چونکہ فطرت انسانی کے غلبہ کی حالت میں عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس چیز کے مناسبت اسکے سامنے آئیں وہ اس کی تصدیق کرے اس بنا پر عقل کی تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ احکام شرعیہ پر اسطرح یقین کرے کہ گویا وہ اسکو صاف صاف نظر آ رہے ہیں جو مقامات اور احوال عقل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اصل چیز یقین ہے اور یقین سے ہی مختلف مقامات مثلاً توحید، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محدثیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

---

[1] ج ۱ ص ۵۲۱ باب مناقب عثمان [2] مکتوبات حصہ دوم دفتر اول مکتوب چہل و یک [3] شاہ صاحب کی تقریر کا یہ خلاصہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ باب بقیۃ مباحث الاحسان سے ماخوذ ہے شاہ صاحب نے یہ باتیں ازالۃ الخفا مقصد دوم میں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت لکھی ہیں لیکن وہ منتشر ہیں اور حجۃ اللہ البالغہ میں سب ایک جگہ جمع ہیں اسلئے ہمارا ماخذ یہی ہے۔

اسکے بعد شاہ صاحب نے یقین کے مختلف مراتب پر گفتگو کی ہے اور اس ذیل میں لکھتے ہیں

یقین کی تیسری شاخ صدیقیت اور محدثیت ہے اور ان دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ امت میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فطرتاً پیغمبروں سے مشابہ ہوتے ہیں اب اگر یہ مشابہت قوائے عقلیہ میں ہو تو اس شخص کو صدیق اور محدث کہتے ہیں۔ اور اگر قوائے عملیہ میں ہو تو وہ شہید یا حواری کہلاتا ہے۔

لیکن پھر صدیق اور محدث میں فرق یہ ہے کہ صدیق کی روح پیغمبر کا اثر بڑی تیزی سے قبول کرتی ہے جیسے گندھک آگ سے بہت جلد اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر ایک صدیق جب پیغمبر کی زبان سے کوئی بات سنتا ہے تو وہ فوراً اسکے دل میں اتر جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا اس چیز کا علم اسکو خود بخود بغیر کسی کی تقلید کے حاصل ہو گیا ہے حضرت ابوبکر صدیق کی نسبت یہ جو روایت ہے کہ جب آنحضرت ؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو وہ جبرئیل امین کی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے تو اس سے بھی دراصل اسی بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔

اسکے علاوہ صدیق کے چند اور خصائص بھی ہیں مثلاً وہ اس حق کی جو نبی پر نازل ہوتا ہے محبت میں اپنی جان ومال تک قربان کر دیتا ہے۔ حق سے محبت کیوجہ سے کسی امر میں اسکی مخالفت نہیں کرتا۔ چنانچہ آنحضرت ؐ نے ابوبکر کی ان تمام فداکاریوں کا اظہار فرمایا ہے حضرت ابوبکر کی یہ خصوصیت اسکے لئے تھی کہ وحی کے انوار آنحضرت ؐ کی روح مبارک سے چھن چھن کر ابوبکر صدیق کی روح پر عکس فگن ہوتے تھے اور اس بنا پر جب تاثیر وتأثر اور فعل وانفعال کے اس عمل میں شدت وتکرار پیدا ہوئی تو اس سے فنا اور فدا کا مقام حاصل ہو گیا۔

صدیق کی علامتیں متعدد ہیں مثلاً اسکا عالم بالرویا ہونا۔ بغیر معجزہ کے سب سے پہلے ایمان لانا حب الٰہی میں غرق رہنا خوف وخشیت سے مغلوب رہنا۔ ظاہر ہے یہ تمام صفات بکمال وتمام حضرت ابوبکر میں پائے جاتے تھے اس بنا پر آنحضرت ؐ کی براہ راست خلافت کا مستحق آپکے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا " [1]

اسکے بعد شاہ صاحب نے تجلیات کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر کا کیا مقام تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت غامض اور دقیق ہے جسکے عام قارئین متحمل نہیں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم از صفحہ ۹۸ تا صفحہ

ہو سکتے اسلئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں بہرحال اس تمام بحث سے اندازہ ہوا ہوگا کہ حضرت ابوبکر کا مقام صدیق ہونے کی حیثیت سے کس قدر اونچا تھا اور درحقیقت انکی سب سے بڑی فضیلت سب سے بڑی منقبت اور سب سے بڑی تعریف ان کا صدیق ہونا ہی ہے۔ اور یہ ایک اتنا بڑا وصف کمال ہے جسمیں حضرت ابوبکر اپنی نظیر آپ تھے۔ چنانچہ جب حضرت حسان بن ثابت نے آپ کی شان میں یہ شعر آنحضرت ؐ کی فرمائش پر سنائے۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد طاف العدو به اذ صعد الجبلا

وکان حب رسول اللہ قد علموا من البریۃ لم یعدل به رجلا

ترجمہ:۔ اور ابوبکر بلند غار (ثور) میں دو میں کے ایک تھے۔ حالانکہ جب دشمن پہاڑ پر چڑھا تو اس نے ان کا محاصرہ کر لیا تھا اور آپ رسول اللہ ؐ کے محبوب تھے۔ تمام صحابہ اس بات کو جانتے تھے کہ اس خصوصیت میں دنیا کا کوئی ایک شخص بھی آپ کا حریف نہیں ہے۔

تو سرور عالم کو فرط مسرت سے ہنسی اسطرح آ گئی کہ دندان مبارک نظر آنے لگے اور ارشاد ہوا " ہاں حسان! تم نے سچ کہا۔ بیشک ابوبکر ایسے ہی ہیں "۔ [1]

آپ کی یہ فضیلت بھی کچھ کم نہیں ہے کہ آپ کی چار نسلوں کو آنحضرت ؐ کیساتھ صحبت ومعیت کا شرف حاصل ہوا۔ ان چاروں کی ترتیب یہ ہے

(۱) حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ۔ (۲) خود حضرت ابوبکر۔ (۳) حضرت ابوبکر کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن۔ (۴) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے صاحبزادہ حضرت محمد بن عبدالرحمٰن [2]

اولیات

محدثین ومورخین نے حضرت ابوبکر صدیق کے اُن کارناموں کا الگ الگ ذکر کیا ہے جنہیں آپنے سب سے پہلے سبقت کی ہم ذیل میں ان کی فہرست یکجا دیتے ہیں۔

(۱) مردوں میں سب سے پہلے اسلام آپ نے قبول کیا۔

(۲) قرآن مجید کا نام سب سے پہلے آپ نے مصحف رکھا۔

(۳) قرآن مجید کو سب سے پہلے آپ نے جمع کرایا۔

---

[1] ابن سعد ج ۳ القسم الاول ص ۷ ۔ [2] الاستیعاب تذکرہ محمد بن عبدالرحمٰن

(۴) سب سے پہلا شخص جس نے کفار قریش کیساتھ آنحضرت ؐ کی حمایت میں جنگ لڑی اور ضربات شدیدہ برداشت کیں حضرت ابوبکرؓ ہیں۔

(۵) اسلام میں سب سے پہلے جس نے مسجد بنائی وہ حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ "حضرت صدیق اول کسے است کہ مسجد بنا کرد و اعلام اسلام نمود" [۱]

(۶) آنحضرت ؐ کی حیات میں جسکو سب سے پہلے حج کی امامت کا شرف حاصل ہوا وہ آپ ہی ہیں۔

(۷) آنحضرت ؐ نے جسکو باصرار نماز کی امامت کا حکم فرمایا اور خود بھی اسکے پیچھے اقتداء کی وہ حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں۔

(۸) سب سے پہلے خلیفہ راشد ہیں اور سب سے پہلے شخص ہیں جو اس لقب سے پکارے گئے۔

(۹) سب سے پہلے خلیفہ ہیں جن کو باپ کی زندگی میں خلافت ملی۔

(۱۰) سب سے پہلے خلیفہ ہیں جس کا نفقہ رعایا نے مقرر کیا [۲]

(۱۱) سب سے پہلے بیت المال آپ نے قائم کیا۔

(۱۲) سب سے پہلے اجتہاد و استنباطِ احکام کے اصول اربعہ آپنے مقرر کئے۔

(۱۳) سب سے پہلے دوزخ سے نجات کی خوشخبری آنحضرت ؐ نے آپ کو ہی دی اور عتیق کے لقب سے مشرف فرمایا۔

(۱۴) سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے بارگاہِ نبوت سے کوئی لقب حاصل کیا۔

(۱۵) سب سے پہلے آپ نے ہی فرمایا "البلاء موکل بالمنطق"۔

ذاتی حالات و سوانح

حلیہ | حضرت عائشہؓ سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا حلیہ کیا تھا؟ آپنے فرمایا۔ وہ گورے چٹے دبلے پتلے آدمی تھے۔ دونوں رخسار ستے ہوئے تھے کمر ذرا خمیدہ تھی تہمد کمر پر رک نہیں سکتا تھا۔ نیچے کھسک جاتا تھا، چہرہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں، پیشانی بلند۔ انگلیوں کے جوڑ گوشت سے خالی تھے پنڈلیاں اور

---

[۱] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۱ [۲] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

رانیں پر گوشت نہیں تھیں۔ قد موزوں تھا، مہندی کا خضاب لگاتے تھے [۱]

لباس و غذا | نہایت سادگی پسند تھے کپڑے بھی موٹے جھوٹے پہنتے اور کھانا بھی سادہ کھاتے تھے۔ بعض اوقات فاقہ کی نوبت بھی آجاتی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت ؐ نے انہیں اور حضرت عمرؓ کو مسجد میں دیکھا کہ بھوک سے بیقرار ہیں، ارشاد ہوا "میں بھی تمہاری طرح سخت بھوکا ہوں" حضرت ابو الہیثم انصاری کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کھانے کا انتظام کیا۔

ذریعہ معاش | آپکا اصل ذریعۂ معاش تجارت تھا اس کے علاوہ آنحضرت ؐ نے ان کو خیبر میں ایک جاگیر بھی عنایت فرمائی تھی، بحرین میں بھی آپکو جاگیر ملی تھی اور اطراف مدینہ میں اموال بنی النضیر سے بیر حجر تھا جو آنحضرت ؐ نے آپکو عطا فرمایا تھا۔ آپنے اس کی اصلاح کی اسمیں کھجور کے درخت لگائے اور پھر حضرت عائشہؓ کو دیدیا۔ اسطرح بحرین کی جاگیر بھی حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دی تھی لیکن وفات کے وقت ان سے واپس لے لی تھی تاکہ بہن بھائیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ [۲]

روزینۂ خلافت | خلیفہ ہونیکے بعد قوم نے آپ کیلئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا؛ لیکن اس کی مقدار کتنی تھی؟ اسمیں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے یہ تمام روایتیں نقل کر دی ہیں ہماری رائے میں ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کا وظیفہ دو ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا تھا لیکن جب دیکھا کہ گزر نہیں ہوتی تو اسمیں اضافہ ہونے لگا اور ادہر فتوحات کے باعث اسلامی ریاست کی مالی حالت بھی بہتر ہوتی جا رہی تھی اس بنا پر شدہ شدہ آپکا وظیفہ چھ ہزار درہم سالانہ ہو گیا اور اسکے علاوہ پہننے کیلئے آپکو دو چادریں دی جاتی تھیں جب وہ پرانی ہو جاتی تھیں تو انکی جگہ دو اور چادریں دیدیتے تھے۔ اور وہ پرانی واپس لے لیتے تھے۔ سفر کرتے تھے تو سواری اور اہل و عیال کیلئے اتنا ہی خرچ ان کو ملتا تھا جو خلیفہ ہونے سے پہلے انکے اس کام کیلئے کافی ہوتا تھا [۳]

خلیفہ ہونیکے بعد کے معمولات | جب آپ خلیفہ منتخب ہوئے تو اس زمانہ میں مدینہ کے قریب ایک مقام "سنح" میں اپنی بیوی حبیبہ بنتِ خارجہ کیساتھ رہتے تھے۔ بیعت کے بعد بھی چھ مہینے تک آپ کا قیام وہیں رہا۔ اس مدت میں صبح کیوقت کبھی پیادہ اور اکثر گھوڑے پر بیٹھ کر مدینہ آتے تھے، جسم پر تہمد اور چادر ہوتی تھی جو گیرو رنگ کی ہوتی تھی، پورا دن آپ مدینہ میں گزارتے

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۶۱۵ [۲] طبقات ابن سعد سیرت خلفاء راشدین [۳] ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر صدیقؓ

اور نمازوں میں امامت کرتے تھے، جب آپ نہیں ہوتے تھے تو حضرت عمر نماز پڑھاتے تھے[1] چھ مہینوں تک یہی معمول رہا۔ اس کے بعد مدینہ میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔

عبادت | جب نماز پڑھتے تھے تو خشوع و خضوع کا اس درجہ غلبہ ہوتا تھا کہ ایک لکڑی کی طرح سیدھے کھڑے رہتے تھے۔[2]

حقوق العباد کا خیال | حق اللہ کے سوا حقوق العباد کا بھی اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے صحابۂ کرام سے دریافت فرمایا کہ آج تم میں سے روزہ دار کون ہے؟ حضرت ابوبکر بولے "میں یا رسول اللہ!" پھر پوچھا "تم میں سے آج کس نے جنازہ کی مشایعت کی ہے؟ تم میں سے کس نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ کس نے مریض کی عیادت کی ہے؟" جس شخص نے ان سب سوالات کا جواب اثبات میں دیا وہ صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات تھی۔ آنحضرت صلعم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا "جس نے ایک دن اتنی نیکیاں کی ہیں وہ یقیناً جنت میں جائیگا"۔[3]

رقتِ قلب | قلب نہایت رقیق تھا۔ قرآن مجید جب پڑھتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور اسطرح بلک بلک کر روتے تھے کہ جو لوگ اس وقت موجود ہوتے ان کا جی بھر آتا اور رونے لگتے تھے۔ سنہ ۱۲ھ میں جب حج کیلئے تشریف لے گئے تھے تو مکہ میں حضرت عکرمہ بن ابی جہل اور کچھ دوسرے لوگ آنحضرت صلعم کی تعزیت کیلئے آپ کے پاس آئے تو آپ کا حال یہ تھا کہ یہ حضرات تعزیت کرتے تھے اور حضرت ابوبکر روتے جاتے تھے، بات بات پر سرد آہ کھینچنے کی وجہ سے آپ کا لقب ہی "اَوَّاہٌ مُنِیْبٌ" ہو گیا تھا۔

قسم کسطرح کھاتے تھے | آپ کی بعض خاص خاص عادتیں تھیں جو صحابۂ کرام میں مشہور تھیں، مثلاً اگر انکو قسم کھا کر یہ کہنا ہوتا تھا کہ "ایسا ہرگز نہیں ہوگا"، تو فرماتے تھے "لاھا اللہ اذاً"[4]

ازواج | طبری میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے کل چار نکاح کئے ہیں دو اسلام سے قبل اور دو اسلام کے بعد، اسلام سے پہلے آپ نے جن خواتین سے عقد کیا تھا انکے نام (۱) قتیلہ بنت عبد العزیٰ اور (۲) ام رومان بنت عامر بن عمیرہ ہیں اور اسلام قبول کرنیکے بعد جن خواتین سے شادی کی

[1] ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکر صدیق [2] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۰
[3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۴ [4] ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ [5] بخاری ج ۱ ص ۵۵۸

انکے نام (۱) حضرت اسماء بنت عمیس اور (۲) حبیبہ بنت خارجہ ہیں[1] یہ سب ملکر چار بیبیاں ہوئیں لیکن بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ نے بنو کلب کی ایک عورت سے بھی جس کا نام ام بکر تھا شادی کی تھی اور ہجرت کے وقت انکو طلاق دے دی تھی[2]

ام رومان | قتیلہ بنت عبد العزیٰ کا اسلام مشکوک ہے۔ حافظ ابن حجر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ فتح مکہ تک زندہ رہیں تو غالب یہی ہے کہ مسلمان ہو گئی ہونگی۔ البتہ ام رومان کو یہ شرف حاصل تھا ام رومان سب سے پہلے عبد اللہ بن الحارث نامی ایک شخص کی بیوی تھی۔ عہد جاہلیت میں مکہ آکر اس شخص نے حضرت ابوبکر سے مخالفت کر لی تھی، چنانچہ جب اسکا انتقال ہو گیا تو حضرت ابوبکر نے ام رومان کیساتھ شادی کر لی، ہجرت کیوقت حضرت ابوبکر انکو مکہ میں چھوڑ گئے تھے بعد عبد اللہ بن ارقیط کو بھیجکر ان کو بھی مدینہ بلوا لیا۔ حضرت ام رومان کے سال وفات میں بڑا اختلاف ہے ابن سعد ماہ ذی الحجہ سنہ ۶ھ لکھتے ہیں بعض محدثین سنہ ۴ھ یا سنہ ۵ھ کو ان کا سال وفات بتلاتے ہیں[3] لیکن صحیح ابن سعد کی ہی روایت ہے کیونکہ حدیث افک میں حضرت ام رومان کا نام آتا ہے۔ اور یہ واقعہ بے شبہ ہجرت سے پانچ سال بعد کا ہے۔ حضرت ام رومان کی فضیلت اس سے بڑھکر کیا ہو گی کہ جب آنحضرت صلعم نے انکی نعش کو قبر میں اتارا تو ان کیلئے دعائے مغفرت کی اور فرمایا "اے خدا تجھ پر پوشیدہ نہیں ہے کہ ام رومان نے تیرے لئے اور تیرے

اسماء بنت عمیس | قبیلۂ خثعم سے تعلق رکھتی تھیں آنحضرت صلعم کی زوجہ حضرت میمونہ کی ماں شریک بہن تھیں انہوں نے شروع میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا حضرت علی کے بھائی حضرت جعفر سے ان کا پہلا نکاح ہوا تھا جب حبش کی ہجرت کا حکم ہوا تو میاں بیوی بھی دونوں حبش ہجرت کر گئے تھے۔ جعفر کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر نے نکاح کر لیا۔ ایک مرتبہ حضرت اسماء نے آنحضرت صلعم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! لوگ ہمارے مقابلہ میں اپنی بڑی فضیلتیں جتاتے ہیں آپ نے فرمایا "اب سے اگر کوئی تم سے ایسی بات کہے تو تم کہنا کہ "تم لوگوں نے تو ایک مرتبہ ہجرت کی ہے مجھ کو دو مرتبہ ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہے"، غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر بھی انکی فضیلت اور بزرگی کے قائل تھے۔ چنانچہ آپ نے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ ان کو غسل جنازہ حضرت اسماء دیں۔[5] حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت اسماء نے حضرت علی سے نکاح کر لیا تھا۔

[1] طبری ج ۴ ص ۲۱۶۱ ابن اثیر میں بھی یہی ہے [2] بخاری ج ۱ ص ۵۵۴ [3] ایضاً [4] اصابہ ج ۸ ص ۲۲۵ - ۲۲۶ [5] اصابہ ج ۸ تذکرہ ام رومان

حبیبہ بنت خارجہ ان کے حالات کچھ زیادہ نہیں ملتے۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ مدینہ کی ہجرت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جن حضرت خارجہؓ کے ساتھ مواخات کی تھی حضرت حبیبہ انہیں کی بیٹی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ انکے ساتھ شادی کے بعد سنح میں انہیں کیساتھ رہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد انہوں نے اساف بن عتبہ بن عمرو سے نکاح کرلیا تھا۔ [1]

اولاد حضرت ابوبکرؓ کی اولاد چھ تھیں۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں۔ عبدالرحمنؓ۔ عبداللہؓ۔ محمد۔ اسماءؓ۔ عائشہؓ اور ام کلثوم صاحبزادیوں کے نام ہیں

عبدالرحمنؓ حضرت ابوبکرؓ کے سب سے بڑے صاحبزادہ ہیں۔ حضرت ام رومان کے بطن سے پیدا ہوئے غزوۂ بدر کے موقع پر کفار مکہ سے قریش کے ساتھ آئے تھے۔ میدان جنگ میں یہ آگے بڑھے اور مبارز طلب ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مقابلہ پر جانے کی اجازت طلب کی لیکن آنحضرتؐ نے اجازت نہیں دی اس کے بعد غزوۂ احد میں بھی یہ مشرکین کے ہمراہ تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام سے مشرف ہوئے اور مدینہ آکر اپنے والد کے ساتھ رہنے لگے۔ شجاعت اور تیراندازی میں تمام قریش میں ممتاز تھے اسلام قبول کرنے کے بعد انکے یہ جوہر دین حق کی حمایت و نصرت میں صرف ہونے لگے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد عہد نبوت میں جو غزوات پیش آئے ان میں برابر شریک رہے لیکن جنگ یمامہ میں تو انہوں نے کمال ہی کر دکھایا۔ دشمن کے سات بڑے بڑے جنگی افسروں کو تنہا انہوں نے اپنے تیر کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا تھا اسی طرح قلعہ یمامہ کی دیوار میں ایک شگاف تھا مسلمان اسکے ذریعہ اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن محکم بن طفیل نام کا ایک سردار اسکی حفاظت کر رہا تھا حضرت عبدالرحمنؓ نے تاک کر اسکے سینہ پر ایسا تیر مارا کہ تڑپ کر خاک کا ڈھیر تھا۔ اور مسلمان قلعہ میں داخل ہوگئے [2] حضرت عائشہؓ اور یہ دونوں سگے بہن بھائی تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ چنانچہ ۵۳ھ میں انکا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھے

---

[1] الاستیعاب تذکرۂ اسماء بنت عمیس [2] الاصابہ ج ۴ ص ۲۶ [3] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۲۹۲۔ [4] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۲۹۳۔ یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی ہیں۔

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ ۔۔۔ من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکا ۔۔۔ لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معاً [1]

عبداللہؓ یہ قتیلہ کے بطن سے تھے اور حضرت اسماءؓ کے حقیقی بھائی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب اسلام قبول کیا تو عبداللہ نے بھی قبول کرلیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں جب آنحضرتؐ اپنے رفیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے تو یہ خدمت حضرت عبداللہ ہی کے سپرد تھی کہ دن بھر کی قریش کی جو خبریں ہوتی تھیں وہ شام کو یہاں پہنچا دیتے تھے عبداللہ بن اریقط جس نے ہجرت مدینہ کے وقت رہبری کی خدمت انجام دی تھی انہوں نے جب مکہ واپس پہنچکر اطلاع دی کہ حضور بخیر و عافیت مدینہ پہونچ گئے ہیں۔ تو اب حضرت عبداللہ بن ابی بکر بھی حضرت ام رومان حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ کو لے کر مدینہ کیلئے روانہ ہوگئے۔ فتح مکہ اور حنین وطائف کے غزوات میں شریک رہے ہیں۔ اس آخری معرکہ (طائف) میں ہی ان کو ایک تیر آکر لگا جس سے شدید زخم پہونچا علاج معالجہ کے بعد زخم مندمل ہوگیا تھا کہ آنحضرتؐ کی وفات کے چالیس روز بعد پھر پھوٹ پڑا اور وہ اس سے جانبر نہ ہوسکے [2]

محمد بن ابی بکرؓ یہ اولاد ذکور میں سب سے چھوٹے تھے حجۃ الوداع کے سال ماہ ذی قعدہ کے اواخر میں بمقام ذوالحلیفہ حضرت اسماءؓ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام قاسم تھا۔ اسی نسبت سے حضرت عائشہؓ نے انکی کنیت ابوالقاسم رکھدی تھی حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جب انکی والدہ نے حضرت علیؓ سے شادی کرلی تھی تو اس تقریب سے محمد بن ابی بکر کو آغوش مرتضوی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے خون ناحق کے دھبوں سے محمد بن ابی بکر کا دامن بھی پاک نہیں تھا۔ لیکن حافظ ابن عبدالبر نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے لم یند محمد بن ابی بکرٍ من دم عثمان بشیءٍ [3] حضرت عثمانؓ کے خون سے محمد بن ابی بکر کا دامن ذرا بھی تر نہیں ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے جب یہ کہا کہ محمد! اگر تیرا باپ تجھ کو اس حالت میں دیکھتا تو ہرگز لے پسند

---

[1] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۳۹۳ یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی ہیں۔ [2] الاصابہ ج ۲ ص ۲۷۵ [3] ایضاً۔ [4] الاستیعاب ج ۳ ص ۳۲۹

نہیں کرتا، تو محمد بن ابی بکر فوراً باہر نکل گئے۔
وفات نہایت اندوہناک طریقہ پر ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ۳۸ھ میں مصر کا والی بنا کر بھیجا تھا۔ جب یہ مصر پہونچے تو امیر معاویہ نے عمرو بن العاص کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کر دیا دونوں میں جنگ ہوئی۔ محمد بن ابی بکر شکست کھا گئے اور سپرد تیغ کر دیئے گئے۔ حضرت عائشہ کو خبر ہوئی تو بحید ملال ہوا اور انکے بیٹے قاسم کو اپنی تربیت میں لے لیا[1] حضرت عائشہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ حضرت قاسم کا شمار اپنے عہد کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔

اسماء بنت ابی بکر | حضرت اسماء بہنوں میں سب سے بڑی تھیں انکی والدہ کا نام قتیلہ یا قتیلہ تھا حضرت ابوبکر کے ساتھ یہ بھی اسلام لے آئی تھیں، حافظ ابن عبدالبر کی روایت کے مطابق اسلام لانے والوں میں انکا نمبر اٹھارھواں تھا۔ حضرت زبیر بن عوام سے شادی ہوئی تھی ہجرت کے سلسلہ میں جب یہ مدینہ روانہ ہوئی ہیں تو عبداللہ بن زبیر سے حاملہ تھیں قبا پہونچکر ان کی ولادت ہوئی۔ آپ کا لقب "ذات النطاقین" کیوں تھا؟ اس کا ذکر ہجرت کے باب میں گزر چکا ہے
خلیفۂ رسول کی صاحبزادی ہونیکے باوجود بڑی محنت اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتی تھیں اپنے شوہر حضرت زبیر کے گھوڑے کیلئے دانہ دلتی تھیں اور اسے سر پر رکھ کر دو میل پیدل چلتی تھیں[2] حضرت ابوبکر کو اسکی اطلاع ہوئی تو ایک غلام عطا فرما دیا۔
حجاج ثقفی نے حضرت اسماء کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کر کے انکی لاش تختہ دار پر لٹکی رہنے دی تھی۔ جب تین دن گزر گئے تو حضرت اسماء ادھر سے گزریں اور بیٹے کی لاش کو دیکھ کر بولیں کہ کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دولہا تختِ عروسی پر سے اتر آئے۔ حجاج نے یہ سنکر اگرچہ گستاخی کی لیکن بہرحال لاش اتروا لی، اسکے چند روز بعد ہی حضرت اسماء نے کم و بیش سو برس کی عمر میں ۷۳ھ میں مکہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئیں[3] رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہ | ام المؤمنین حضرت عائشہ حضرت ام رومان کے بطن سے بعثت نبوی سے چار پانچ برس بعد پیدا ہوئیں، حضرت ابوبکر کی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی اور آنحضرت ﷺ کی محبوب

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۴۵۱ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۱۸ [3] الاستیعاب بر الاصابہ ج ۴ ص ۲۲۸، ۲۲۹

ترین بیوی تھیں۔ حضرت عطاء بن ابی رباح کا قول ہے کہ۔
کانت عائشة افقه الناس واعلم الناس | حضرت عائشہ تمام لوگوں سے زیادہ
واحسن الناس رایاً فی العامة [1] | فقیہ صاحب علم اور صائب الرائے تھیں۔
امام زہری کا قول ہے کہ اگر تمام ازواج مطہرات اور سب عورتوں کے علم کا موازنہ حضرت عائشہ کے علم کے ساتھ کیا جائے تو حضرت عائشہ کا علم ان سب کے علم سے افضل ثابت ہوگا[2] آپ کی کس کس خوبی اور کمال اور کس کس فضیلت و منقبت کو بیان کیا جائے۔
اردو میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ایک مستقل اور مستند کتاب "سیرتِ عائشہ" کے نام سے موجود ہے۔ اس کی مراجعت کرنی چاہئے۔ فقہی اور اجتہادی مسائل میں مرجعِ انام تھیں۔ اور علوم کے علاوہ طب اور شعر کا بھی بہت صاف ستھرا مذاق رکھتی تھیں اپنے عہد کی بلند پایہ خطیبہ تھیں جب تقریر کرتی تھیں تو سننے والوں پر سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ۵۷ھ میں دوشنبہ کے دن ۱۷ ماہ رمضان کو وفات حسرت آیات ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں[3] رضی اللہ عنہا

ام کلثوم | حضرت حبیبہ بنت خارجہ کے بطن سے حضرت ابوبکر کی پیشین گوئی کے مطابق آپ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ اسلئے حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد امجاد میں صرف یہی ایک ایسی تھیں جو تابعیہ تھیں۔ ان سے متعدد روایات مروی ہیں۔ جابر بن حبیب طلحہ بن یحییٰ اور مغیرہ ابن حکیم وغیرہم نے ان سب سے روایت کی ہے۔[4]

انگوٹھی | حضرت ابوبکر ایک انگوٹھی بھی رکھتے تھے جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔
"نعم القادر اللہ"[5]

[1] الاصابہ ج ۴ ص ۳۴۹ [2] ایضاً [3] الاصابہ ج ۴ ص ۳۵۰ [4] الاصابہ ج ۴ ص ۴۶۹ [5] طبری ج ۲ ص ۶۱۷

تبصرہ

رسول اللہؐ کے خلیفۂ اول کی حیاتِ طیبہ کا پورا مرقع اب تمہارے سامنے ہیں۔ اسکو غور سے دیکھو تو تمکو اس آئینہ میں ایک ایسے انسان کی شکل وصورت نظر آئیگی جو ہر حیثیت سے مکمل ہے جس میں انسانی کمالات واوصاف بیک وقت سمٹ کر جمع ہوگئے ہیں۔ ایک انسان کی تکمیل کا دارومدار اسکی ان باطنی قوتوں کی اعلیٰ تربیت وتہذیب پر موقوف ہے جو قدرت نے اسکے اندر ودیعت رکھدی ہیں یہ قوتیں اصولی طور پر دو ہیں ایک قوت نظری اور دوسری قوت عملی" پہلی قوت کے اعتدال سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ذکاوتِ حسنِ فہم اعتدال فکر، شہامت وغیرہ ہیں اور قوتِ عملی کے استعمال سے جو اوصاف وکمالات پیدا ہوتے ہیں وہ شجاعت۔ سخاوت۔ عفت۔ غیرت وحلم خودداری وغیرہ ہیں کسی شخص میں ان تمام اوصاف وکمالات کا بیک وقت جمع ہوجانا انسانی سعادت وخوش نصیبی کی معراج کمال ہے۔ اور قرآن مجید میں اسی کو خیر کہا گیا ہے اور فرمایا گیا" ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیراً "، اگرچہ عمومی طور پر اس وصفِ خاص میں دوسرے صحابۂ کرام بھی حضرت ابوبکرؓ کے شریک ہیں لیکن جسطرح نیکی نیکی اور حسن حسن میں فرق مراتب ہوتا ہے اسی طرح حکمت حکمت میں بھی مدارج ومنازل کا بڑا فرق وامتیاز ہے اسی فرق کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا مقام سب سے اونچا تھا اور وہ حکمت وسعادت کے اس نقطۂ عروج پر فائز تھے جو نبوت سے نیچے اور سب سے اونچا ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق کو وسعتِ فتوحات، تمدن وادین نظم ونسق اور حکومت کے داخلی وخارجی انتظامات کی وجہ سے تاریخ اسلام میں جو اہمیت وعظمت حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی مدت خلافت دس برس ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی کل سوا دو برس، اور اس سوا دو برس میں آپنے جو خدمات انجام دی ہیں وہ فاروقی کارناموں کیلئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فتوحات کی وسعت اور حکومت کا نظم ونسق اسوقت تک ناممکن ہے جب تک کہ قوم کے اندر وحدت نہ پیدا ہو اسمیں کسی قسم کا داخلی انتشار اور طوائف الملوکی نہ ہو، یہ قومی وحدت کس نے پیدا کی؟ پورے عرب کو متحد کس نے کیا؟ اور قومی یک جہتی کا صور کس نے پھونکا؟ آنحضرتؐ کی وفات کے فوراً بعد ارتداد وبغاوت کا سیلاب چاروں طرف سے جس زور وشور سے اٹھا تھا اسکے مقابلہ میں مادی اسباب وحالات کے ماتحت ان صحابۂ کرام کی جو مدینہ میں محصور ہو کر رہ گئے کیا بساط تھی؟ اکابر صحابہ یہاں تک کہ خود حضرت عمرؓ کی جبلی استقلال وپامردی پر اضطراب وتشویش کی شکن پیدا ہوگئی تھی چنانچہ انھوں نے مشورہ دیا کہ جیش اسامہ کو شام کے سرحدی قبائل کی طرف بھیجنا ملتوی کردیا جائے۔ مانعین زکوٰۃ سے جہاد وقتال نہ کیا جائے۔ لیکن خلیفۂ رسول نے جس ہمت واستقلال سے عزم وعالی حوصلگی کیساتھ ان سب حالات وحوادث کا مقابلہ کیا وہ انسانی تدبر وعزم کی تاریخ کا ایک بلند ترین شاہکار ہے۔ تدبر کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے مغربی مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ ان حالات میں جیش اسامہ کا روانہ کرنا ایک عظیم الشان سیاسی حربہ تھا جس نے قبائل عرب کو اور ایران اور روم کی طاقتوں کو نفسیاتی طور پر مرعوب کردیا۔ عزم واستقلال اور ہمت وپامردی کی یہ کیفیت ہے کہ وہی رقیق القلب اور پیکرِ تقدس انسان جو آنحضرتؐ کا نام آتے ہی رو پڑتا تھا۔ حضرت عمرؓ جیسے انسان کو طعنہ دیتا ہے کہ تم عہدِ جاہلیت میں تو بڑے مضبوط تھے مگر اب تم کمزور ہوگئے غرض کہ صحابۂ کرام کی اکثریت کے برخلاف وہ جیش اسامہ کی مہم بھی سر کرتا ہے۔ مانعین زکوٰۃ سے جنگ بھی کرتا ہے اور پھر اس سے فارغ ہوکر مرتد اور باغی قبائل کی سرکوبی کیلئے اپنے گیارہ لشکر پورے جزیرۃ العرب میں پھیلا دیتا ہے جسکا چند مہینوں کے اندر ہی اندر نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ارتداد وبغاوت کے تمام تیر بادل یکقلم چھٹ جاتے ہیں اور پورا جزیرۃ العرب ایک دینِ حق کے علم کے نیچے آکر جمع ہوجاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ۔

"عالم تمام مطلعِ انوار ہوگیا۔"

پھر خود اعتمادی۔ اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کی مثال اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ ابھی مرتد قبائل کی مہم سے پورے طور پر فراغت بھی نہیں ہوئی ہے کہ عرب کے خارجی استحکام وحفاظت کی مصلحت کے تقاضے سے ایران وروم کو جو اسوقت دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تھیں چیلنج کرتا ہے

اور یہ سب کچھ یونہی دفعۃً وبغتۃً نہیں ہو جاتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے نہایت منظم اور منضبط طریقہ
پر کرتا ہے۔ خود خلیفۂ رسول عراق و شام کے محاذِ جنگ سے سیکڑوں میل دور مدینہ میں اپنے
ایک چھوٹے سے اور غیر آراستہ مکان میں بیٹھا ہے۔ اور یہیں سے اسلامی فوجوں کی کمانڈ کر رہا
ہے۔ ان کو راستوں کے نشیب و فراز سمجھا رہا ہے۔ فریق محارب کے مورچوں کی خصوصیات
بتا رہا ہے اور ان کے پیشِ نظر خود عساکر اسلام میں ترتیب و تہذیب قائم کر رہا ہے واقعات
جنگ ایک ایک جزئیہ پر اسکی کڑی نگاہ ہے۔ اور اس کے لئے حسب موقع و مصلحت
وہ احکام و ہدایات روانہ کر رہا ہے۔ شام کے محاذ پر جب جمود و تعطل پیدا ہوا تو فوراً حضرت
خالد کو حکم ہوتا ہے۔ کہ عراق سے شام پہونچیں اور وہاں جو اسلامی فوجیں ہیں انکی کمانڈ اپنے
ہاتھوں میں لیں، اس حکم کی فوراً تعمیل ہوتی ہے۔ اور صورتِ حال یک بیک بدل جاتی ہے
غرض کہ اگر عرب میں یہ اتحاد نہ پیدا ہوتا اور حیرہ کے میدان جنگ میں ایرانی فوج کو
شکستِ فاش نہ ہوتی تو عہدِ فاروقی میں جو فتوحات ہوئیں کیا وہ پھر بھی ہو سکتی تھیں! یہی وجہ
ہے کہ حضرت عمر کی نسبت فرمایا گیا کہ وہ حَسَنَةٌ مِّنْ حَسَنَاتِ اَبِیْ بَكْرٍ تھے۔ اور خود حضرت
عمر نے اقرار کیا کہ وہ حضرت ابوبکر کے سینہ کے ایک بال ہیں۔"

تاریخ کا ایک طالب علم کہہ سکتا ہے۔ کہ دنیا میں سکندرِ اعظم، ہنی بال، چنگیز خاں اور
تیمور اور بھی بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں جنہوں نے نہایت عظیم الشان فوجی کارنامے انجام
دیئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عظیم الشان فاتح ایسا بھی گزرا ہے جس نے دنیا
کی تاریخ کا ورق الٹ دیا ہو۔ لیکن اسکے باوجود نہ اس کے سر پر تاجِ زر فشاں ہو اور نہ اقتدار
سلطانی معمولی سے معمولی آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہو۔ اس میں اور دوسرے لوگوں میں شان
و شوکت اور وجاہت و سطوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہو، وہ محلہ کی بکریوں کا دودھ
بھی دوہ دیتا ہو۔ رات کے وقت چھپ چھپ کر نابینا عورت کے گھر کا سارا کام بھی کر آتا ہو،
معمولی کپڑے پہنتا ہو۔ موٹا جھوٹا کھاتا ہو۔ اسکے پاس نہ خدم و حشم ہوں۔ اور نہ محلات و قصور
نہ خزانے ہوں۔ اور نہ زر و سیم کے انبار، نہ چوکیدار، نہ دربان نہ ملٹری گارڈ اور نہ پولیس کا خاص
دستہ۔ ایک معمولی سے معمولی انسان بھی برملا اسکو سرِ راہ ٹوک سکتا ہو۔ ایک ادنیٰ حیثیت شخص

بھی بھرے مجمع میں اس سے باز پرس کر سکتا ہو اور جب وہ اپنی فوج کو کسی مہم پر روانہ کرنے
کے لئے کچھ دور تک مشایعت کے لئے جائے تو اس شان سے کہ وہ خود پیادہ ہو اور اسکا
نوعمر نوجوان امیر فوج گھوڑے پر سوار ہو اسکی بیٹی اپنے شوہر کے گھوڑے کا دلیہ خود دلتی ہو
اور پھر نو نو میل لے سر پر رکھ کر پیدل چلتی ہو۔ اور خود اسکا اپنا حال یہ ہو کہ وہ کپڑوں کا
گٹھر اپنے سر پر رکھ کر بازار میں پھرتا ہو، بتاؤ فتحی و حربی کامگاری کے ساتھ یہ جمہوریت
اور یہ مساوات و برابری۔ یہ تواضع و فروتنی پوری تاریخ عالم میں کہیں اور بھی نظر
آتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جمہوریت اور مساوات کی جو مثال حضرت عمر نے اپنے
عہد خلافت میں قائم کی وہ اپنی جگہ بے نظیر ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق کی اس بے نفسی
اور انتہائی سادگی کو دیکھ کر حضرت عمر بھی کہہ پڑے کہ "اے ابوبکر آپ نے اپنے بعد میں آنے
والوں کیلئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں" یعنی تمہارے نقشِ قدم پر چلنا کسی کے بس کی بات نہیں
پھر فاتحین و کشور کشایان عالم میں کتنے ہیں جن کے لشکروں نے شہروں کے
کو نہ اجاڑا ہو۔ آبادیوں کو ویرانہ میں تبدیل نہ کر دیا ہو۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں
پر ترس کھایا ہو۔ کھیتوں کو آگ نہ لگائی اور درختوں کو نہ کاٹا ہو۔ لیکن یہاں کیا عالم تھا
فوج روانہ ہوتی تھی تو بڑی تاکید سے ان امور کی نسبت ہدایات دی جاتی تھیں
اور کسی کی مجال نہ تھی کہ فرمان خلافت سے ذرا سرتابی کر سکے۔ ان سب چیزوں کا اثر یہ تھا کہ
جو لوگ میدان جنگ میں شمشیر آزما بن کر آتے تھے جب ہوا کا رخ پلٹتا تھا تو انہیں کی زبانی
فاتحین کیلئے دعائیں کرتی تھیں۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ کی ہولناکیوں کا نام
و نشان میدان جنگ سے باہر کہیں نظر نہیں آتا تھا اور ملک میں پہلے سے زیادہ خوش حالی اور
اور آسودگی پیدا ہو جاتی تھی۔

یہ جو کچھ لکھا گیا حضرت ابوبکر صدیق کے کارناموں کا صرف ظاہری اور مادی پہلو تھا اگر
خالص شرعی و دینی اور معنوی و باطنی پہلو کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئیگا
کہ جو کام آنحضرت ﷺ کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہونچا تھا خلیفۂ اول کے ہاتھوں اسکی تکمیل ہوئی
یعنی عرب قوم کو متحد کرنے کے علاوہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اسکو ضیاع سے بچا لینا یہ شبہ

ایک پیغمبرانہ کارنامہ ہے۔ جس کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ
پورا ہوا۔ قرآن جس پر اسلامی شریعت کی اساس قائم ہے اسکو جمع کرکے ہمیشہ کیلئے
محفوظ کر دینا۔ زکوٰۃ وصدقات کے احکام کی تبلیغ واشاعت اور انکی تفصیل وتشریح
جیش اسامہ کی روانگی، مرتدوں باغیوں کی سرکوبی، مدعیان نبوت کا استیصال ایران
اور روم کی ان کے اسلام دشمن منصوبوں کی بنا پر گوشمالی۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت
قبائلِ عرب کا باہمی اتحاد واتفاق پر لگا دینا۔ یہ سارے اہم کام جو کل سوا دو برس کی
مدت میں حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے اور کن ناساعد ناموافق
حالات میں ہوئے اور کس طرح ہوئے؟ ان سب کو سامنے رکھو اور بتاؤ کہ کیا ان سے صاف
طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر پیغمبر نہیں تھے۔ اور نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن انکے یہ
تمام کارنامے پیغمبرانہ تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ نے ایک مرتبہ فرمایا "اگر ابوبکر نہ ہوتے تو
خدا کی عبادت نہ کی جاتی"، گویا قرآن نے "ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ" کہہ کر پیغمبر آخر الزماں
کے ساتھ جس کی جسمانی معیت ورفاقت پر مہر تصدیق ثبت کی تھی ازل میں اس کے لیے
یہ سعادت بھی مقدر کر دی گئی تھی کہ جسمانی رفاقت کے ساتھ معنوی اشتراک عمل اور باطنی
رفاقت کا بھی اس سے مظاہرہ ہو۔

اسی خصوصیت کی بنا پر شاہ ولی اللہ دہلوی حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت کو صرف خلافت
نہیں بلکہ خلافت خاصہ کا عہد کہتے ہیں، یہ مقام چونکہ بہت نازک ہے اسلئے ہم خود اپنی طرف
سے اس کی کوئی تفصیل نہیں کریں گے۔ بلکہ شاہ صاحب کی تقریر کے متفرق اقتباسات نقل
کرکے انہیں پہ کتاب بھی ختم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں

از میانِ امت جمعے ہستند کہ جوہر نفس الشان
قریب بجوہر نفوس انبیا مخلوق شدہ واین
جماعۃ دراصل فطرت خلفائے انبیا اند درامت
بمثال آنکہ آئینہ آہنی از آفتاب اثرے قبول
می کند کہ خاک وچوب وسنگ را نیست، این

امت میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نفس کا
جوہر انبیا کے جوہر نفوس کے قریب ہی مخلوق
ہوتا ہے۔ یہ لوگ پوری امت میں فطرتاً انبیا کے
خلیفہ ہوتے ہیں اور ان کی مثال اس آئینہ جیسی
ہوتی ہے جو آفتاب سے براہ راست اثر قبول کرتا

فریق کہ خلاصۂ امت اند از نفس قدسیہ پیغامبر ﷺ
بوجہے متاثر می شوند کہ دیگران را میسر نمی آید
وآنچہ از آنحضرت ﷺ فراگرفتہ اند بشہادت دل
فراگرفتہ اند۔ گویا دلِ ایشان آن چیزہا را
اجمالاً ادراک کردہ بود وکلام آنحضرت ﷺ شرح
وتفصیل آن معانی اجمالی بود۔۔۔ پس خلافت
خاصہ آنست کہ این شخص چنانکہ در ظاہر حال
رئیس مسلمین شود بحسب وضع طبیعی کہ مراتب
استعدادات افراد بنی آدم ست در ضبط وعلو
فطرت الامثل فالامثل نیز رئیس امت باشد
تا ریاستِ ظاہر ہمدوش ریاست باطن گردد
(ازالۃ الخفا مقصد اول ص ۹)

ہے درآں حالیکہ مٹی لکڑی اور پتھر کو یہ بات
میسر نہیں، ایسے لوگ امت کا حاصل ہوتے ہیں
اور وہ آنحضرت ﷺ سے اخذ کیا ہے خود اپنے
دل کی شہادت سے اخذ کیا ہے۔ گویا ان
حضرات کے دل نے اجمالاً ان چیزوں کو پہلے
ہی دریافت کر لیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے تو بس اس
کی شرح وتفصیل بیان فرمادی۔۔۔ پس خلافت
خاصہ یہ ہے کہ یہ شخص جس طرح ظاہری طور
پر مسلمانوں کا رئیس ہوتا ہے۔ وضع طبیعی یعنی
مراتب استعداد میں افراد بنو آدم کے اختلافات
وتفاوت کے اعتبار سے فطرت کی صفائی اور
بلندی میں بھی رئیس امت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ
رئیس کی ریاست ظاہر ہمدوش ریاستِ باطن ہوتی ہے

جب ایک خلیفہ اس مرتبۂ عالی پر متمکن ہوتا ہے کہ تو اگرچہ وہ خود پیغمبر نہیں ہوتا
لیکن پیغمبر کا دست وبازو ہوتا ہے۔ اس کے اعضا وجوارح ہوتا ہے اور اس بنا پر اسکے
تمام کارنامے خود گویا پیغمبر کے کارنامے ہوتے ہیں۔ یہ خلیفہ تو صرف ایک واسطہ اور ذریعہ
ہوتا ہے جیسے نغمہ سرائی وزمزمہ آفرینی دراصل نے نواز کا کمال ہے اگرچہ نغمہ نکلتا ہے نے
سے ہی۔ چنانچہ اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

آنچہ از تقاسیم رحمتِ الٰہی نصیب پیغامبر گشتہ
وپیغامبر ﷺ قبل از مباشرت آن برفیقِ اعلیٰ
پیوستہ بوجہے از وجوہ سببیۃً واناً بۃً
آن معانی را بدستِ خلفاء اتمام ساختہ اند وبحقیقت
آن ہمہ راجع ست بہ پیغامبر ﷺ ایشان

رحمت خداوندی کی تقسیم سے جو کچھ بھی آنحضرت ﷺ
کے حصہ میں لکھ دیا گیا تھا اور آپ اسکو سرانجام
دینے سے پہلے ہی دنیا سے تشریف لے گئے تو اب
ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اصالتاً یا نیابتاً
ان چیزوں کو خلفا کے ہاتھ سے پورا کرایا ہے۔

بمنزلۂ جوارح پیغامبر شدہ اند لاغیر پس
خلافت خاصہ آنست کہ از خلیفہ کارہائے
کہ نصیب آنحضرت صلعم و منسوب بایشان ست
در قرآن عظیم و حدیث قدسی بدست وے سرانجام
شود و آنحضرت صلعم اثبات ادراتصریحاً و تلویحاً
مراتِ کثیرہ اظہار فرمودہ باشند تا آن ہمہ کارہا
در جریدۂ اعمال حضرت پیغامبر صلعم مرقوم گردد۔
و ایشان شرف وساطت حاصل نمودہ باشند
لاغیر۔ (ص ۱۰)

اور در حقیقت یہ تمام کارنامے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی
کارنامے کہلائیں گے اور خلفاء پیغمبر کے اعضاء کی طرح ہونگے اور
بس پس خلافتِ خاصہ کے معنی یہ ہیں کہ جو کام
قرآن مجید یا حدیثِ قدسی میں آنحضرت صلعم کے حصہ
میں لکھے ہوئے ہیں وہ خلیفہ کے ہاتھوں سرانجام
ہوں اور آنحضرت صلعم نے صراحۃً و اشارۃً اس
کی خلافت کا اظہار بار بار کر بھی دیا ہو، اس
کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ کے یہ تمام کارنامے
حضرت پیغامبر صلعم کے دفترِ اعمال میں درج کر دیئے
جاتے اور خلیفہ کو بس وساطت کا شرف حاصل ہوتا ہے

دو سو عقلی دلائل سے قرآنِ مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت،
اپنے موضوع پر منفرد کتاب، جو ایک عرصہ سے نایاب تھی۔

حضرت مولانا محمد مسلم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
استاذ دار العلوم دیوبند

ادارۂ اسلامیات
۱۹۰۔ انارکلی ○ لاہور